مختصر دینی وعلمی اورادبی وسیاسی اَحوال وآثار

ممتاز علماے انقلاب

(۱۸۵۷ء)

مؤلِّف

یٰسٓ اختر مصباحی

بانی وصدر دارُالقلم، ذاکرنگر، نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر

دارالقلم، قادری مسجد روڈ، ذاکرنگر، جامعہ نگر، نئی دہلی- **110025**

فون: **011-26986872**

ای میل: misbahi786.mk@gmail.com

تفصیلات

نامِ کتاب.......................... **ممتاز علماے انقلاب** (۱۸۵۷ء)

مؤلّف.......................... یٰسٓ اختر مصباحی

زیراہتمام.......................... دارُالقلم، ذاکرنگر، نئی دہلی ۲۵

طبعِ اوّل.......................... ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء۔ دارالقلم، دہلی

طبعِ ثانی (مع نظرِ ثانی واِضافہ)... ۱۴۴۰ھ/۲۰۱۹ء۔ رضوی کتاب گھر، دہلی

صفحات.......................... پانچ سو، اٹھائیس (528)

قیمت..........................

تقسیم کار

رضوی کتاب گھر، ۴۲۳۔ اردو مارکیٹ، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی 110006

فون نمبر: 011,23264524۔ موبائل: 9350505879

ای میل: kanzuliman@yahoo.co.in

طابع و ناشر

دارالقلم، قادری مسجد روڈ، ذاکرنگر، جامعہ نگر، نئی دہلی- **110025**

فون: **011-26986872**

ای میل: misbahi786.mk@gmail.com

فہرستِ کتاب

تہدیہ

دہلی و میرٹھ و مرادآباد و بریلی و بدایوں و فیض آباد و لکھنؤ
والہ آباد و کانپور و شاہجہاں پور و بجنور و آگرہ اور دہلی، وغیرہ

کے اُن عُلَما و قائِدین اور مُجاہِدین و شُہَدَاے قوم و مِلّت

کی خدمت میں

جنھوں نے اپنی سرفروشی و جاں بازی اور اپنے خون کے قطرات سے متحدہ ہندوستان کی آبیاری کی اور برطانوی سامراج کے سامنے، سینہ سپر ہوکر، اُس کے ظلم و اِستبداد اور حکومت واِقتدار کو چیلنج دیتے ہوئے اپنی بہادرانہ جنگِ آزادی کے ذریعہ، فرزندانِ ملک وقوم کے سینوں میں آزادی کی حرارت وتپش پیدا کی اور انھیں اِس جذبۂ بے کراں سے سرشار کر دیا کہ:

سرفروشی کی تمنا، اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا، بازُوے قاتل میں ہے

۱۸۵۷ء کے اِس نعرۂ انقلاب نے شمالی ہند کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ہزاروں عُلَما و مجاہدین کفن بردوش اور سر بکف ہوکر میدان میں نکل آئے۔

تاہم، کچھ اسباب کے تحت انھیں پسپائی سے دوچار ہونا پڑا۔ اور اِس آخری ہچکی اور کلمۂ وَداع کے ساتھ اُن کی یہ صداۓ انقلاب ایک عرصہ تک کے لئے خاموش ہوکر رہ گئی کہ:

شکست و فتح تو قسمت سے ہے، وَلے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

مگر، اِسی خاکستر سے وہ چنگاری بھڑکی، جس نے بیسویں صدی عیسوی کی دوسری تیسری دَہائی میں تحریکِ آزادیِ ہند کی طوفانی شکل، اختیار کرلی اور اگست ۱۹۴۷ء میں برطانوی سامراج کو متحدہ ہندوستان سے ہمیشہ کے لئے بیک بنیِ و دوگوش، نکال باہر کر دیا گیا۔

تو دلِ سوزاں کے ذَرّوں کو حقارت سے نہ دیکھ
پھونک دینے کے لئے چنگاریاں بھی کم نہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

کلمۂ حق

طبع دوم
۲۰۱۹ء

متحدہ ہندوستان کی مسلم تاریخ میں تیرہویں صدی ہجری کی قابلِ افتخار شخصیتوں میں قائدِ جنگِ آزادی، علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کا نام، نہایت ممتاز و نمایاں اور شہرۂ آفاق ہے۔

جن کی خاندانی وجاہت، فطری ذہانت وفطانت، تدبُّر و بصیرت، علم وفن اور فضل وکمال اپنے اَقران واَماثِل کے درمیان اپنی مثال، آپ ہے۔

علاّمہ فضلِ امام، فاروقی، خیرآبادی اور آپ کے فرزندِ بلند اقبال، علاّمہ فضلِ حق، فاروقی خیرآبادی، متحدہ ہندوستان کے اُس شجرِ علمی کی بار آور شاخ ہیں

جو صدیوں سے ''خانوادۂ فرنگی محل''، لکھنو کے نام سے مشہورِ اَنام اور شہرۂ آفاق ہے۔

عُلماے فرنگی محل، لکھنؤ، صرف معقولات نہیں بلکہ منقولات میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔

ان حضرات کے اَحوال وآثار و خدمات کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ:

منطق وفلسفہ کے ساتھ، فقہ واصولِ فقہ وغیرہ میں، یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔

اور تصوف وطریقت سے بھی انھیں گہرا لگاؤ تھا۔

خانوادۂ فرنگی محل، اپنے قابلِ رشک علم وفضل کے ساتھ، نسبتِ بیعت و اِرادت سے بھی مالا مال تھا۔ اور استاذُ الھند، **ملاّ نظام الدین محمد، فرنگی محلی، بانیِ درسِ نظامی**

اپنے عہد وعصر کے عارفِ کامل، حضرت سید عبدالرزّاق، قادری، بانسوی (بانسہ شریف اَودھ۔ موجودہ ضلع بارہ بنکی۔ صوبہ اتر پردیش) کے دست گرفتہ اور آپ کے عاشقِ صادق تھے۔ اور بیشتر عُلماے خانوادۂ فرنگی محل اپنے اپنے وقتوں میں اسی سلسلۂ عالیہ قادریہ رَزّاقیہ سے وابستہ اور منسلک رہے۔

اس عظیم دینی وعلمی خانوادے کے چند ممتاز عُلما کے اسماے گرامی، درج ذیل ہیں:

بحرالعلوم، مُلاّ عبدالعلی، فرنگی محلی، مُلاّ حَسَن، فرنگی محلی، مُلاّ محمد ولی، فرنگی محلی، مُلاّ احمد حسین

فرنگی محلی، مفتی محمد یعقوب، فرنگی محلی، مُلّا مُبین، فرنگی محلی، مولانا انوارُالحق، فرنگی محلی، مولانا نورُالحق فرنگی محلی، مفتی ظہور اللہ، فرنگی محلی، مولانا جمالُ الدین، فرنگی محلی، مولانا نورُ اللہ، فرنگی محلی، مولانا امینُ اللہ، فرنگی محلی، مولانا خادم احمد، فرنگی محلی، مولانا نعیم اللہ، فرنگی محلی، مولانا عبدالحلیم، فرنگی محلی مفتی محمد یوسف، فرنگی محلی، مولانا عبدالحیٔ، فرنگی محلی، مولانا رحمتُ اللہ، فرنگی محلی، مولانا عبدالرزّاق فرنگی محلی، مولانا محمد نعیم، فرنگی محلی، مولانا لُمعانُ الحق، فرنگی محلی، مولانا عبد الباری، فرنگی محلی **وَغَیرھُم۔ رِضْوَانُ اللّٰہِ عَلَیْہِمْ اَجْمَعِین۔**

خاندانی عظمت ووجاہت یہ ہے کہ:

علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی کا شجرۂ نسب، خلیفۂ دوم، حضرت عمر بن خطاب رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ سے جاملتا ہے۔ **اور حُسنِ اتفاق، یہ ہے کہ:**

اُوپر کی پشت میں جا کر آپ کا، اور سراجُ الھند، شاہ عبدالعزیز، محدِّث دہلوی کا بواسطۂ شیر ملک بن عطا ملک، فاروقی، شجرۂ نسب، ایک ہوجاتا ہے۔

اور سرزمینِ اَوَدھ ودہلی کا، یہ فاروقی خانوادہ، منقولات ومعقولات کا جامع بن کر متحدہ ہندوستان کے لئے ایک عظیم نعمت اور سراپا خیر وبرکت، بن جاتا ہے۔

علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی (ولادت ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء۔ وصال ۱۲/صفر ۱۲۷۸ھ/۲۰/اگست ۱۸۶۱ء) اپنے نامور والد ماجد، علاّمہ فضلِ امام، خیرآبادی (وصال ۱۲۴۴ھ/۲۹-۱۸۲۸ء) صدرُ الصُّدور دہلی، اور ساٹھ (۶۰) سال تک علمِ حدیث کا درس دے کر متحدہ ہندوستان کے ہرخطّے میں برکاتِ حدیث، تقسیم کرنے والے سراجُ الھند، شاہ عبدالعزیز، محدِّث دہلوی (وصال ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) نیز، اُن کے بھائی، شاہ عبدالقادر، محدِّث دہلوی (وصال ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء) سے اَخذ واِکتسابِ علوم وفنونِ نقلیہ وعقلیہ کر کے اپنی مختلف ذِمّہ داریوں کے ساتھ
زندگی بھر، مصروفِ درس وتدریس وتصنیف وتالیف رہے۔

۲۰۱۱ء میں ڈیڑھ سو سالہ جشنِ قائدِ انقلاب، علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کے دَوران
مَیں نے اِختصار واِجمال کے ساتھ، اِس طرح ایک تعارف تحریر کیا۔

جو مختلف کتب ورسائل وجرائد میں شائع ہوکر مقبولِ عام ہوچکا ہے کہ: **وہ علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی:**

☆ جو منقولات ومعقولات، بالخصوص علمِ حدیث میں شاہ عبدالعزیز، محدِّث دہلوی وشاہ عبدالقادر، محدِّث دہلوی اور معقولات میں اپنے والد ماجد، علاّمہ فضلِ امام، فاروقی، خیرآبادی

صدرُ الصُّدور دہلی کے تربیت یافتہ اور پروردہ ہیں۔

☆ جن کے مذہبی وعلمی "**سلسلۂ خیرآباد**" سے وابستہ عُلماے کرام کے فیضان سے ہندوپاک کا چپہ چپہ، سیراب وشاداب اور گوشہ گوشہ، روشن ومنور ہوتا رہا ہے۔

☆ جن کے قلم کا شہکار "**تَحقِیقُ الْفَتْوٰی فِی اِبْطَالِ الطَّغْوٰی**"
اور "**اِمْتِنَاعُ النَّظِیر**" جیسی ایمان افروز اور روح پرور کتابیں ہیں۔

☆ جن کے تلامذہ اور شاگردوں میں جلیلُ القدر عُلما، مثلاً: علاّمہ عبدالحق خیرآبادی ومولانا ہدایت اللہ، جون پوری ومولانا عبدالقادر، عثمانی، بدایونی ومولانا فیض الحسن، سہارن پوری جیسے مشاہیر اور خواجہ الطاف حسین حالؔی کے استاذ، مولانا قلندر علی، زبیری، پانی پتی، مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مولانا خیرالدین، دہلوی اور مولانا مناظر احسن، گیلانی کے جدِّ امجد، مولانا محمد احسن، گیلانی جیسے حضرات شامل ہیں۔

جنھوں نے تقدیسِ اُلوہیّت وتعظیم نبوت اور اِحیاے مِلّت کی راہ میں
اپنی ذہنی وفکری اور علمی وقلمی توانائی، صَرف کر کے حضرت شیخ عبدالحق، محدِّث دہلوی
اور مجدِّد الفِ ثانی، شیخ احمد، فاروقی، سرہندی کی یاد، تازہ کردی۔

☆ جو آخری مغل تاجدار، بہادر شاہ ظفر کے مُعتمد مُشیر اور ان کی "**رِنگ کونسل**" کے ڈائرکٹر تھے۔

☆ جنھوں نے انقلابِ ۱۸۵۷ء کے بحرانی حالات میں مسلم اقتدار کے اِستحکام ومرکزیت کے لئے دستورِ حکومت کا تحریری خاکہ، مرتّب کیا۔

☆ جنھوں نے انقلابِ ۱۸۵۷ء کے دَوران، شاہجہانی جامع مسجد، دہلی میں انگریزوں کے خلاف، وَلولہ انگیز تقریر کر کے اہلِ وطن کے سینوں میں جذبۂ حُرّیّت پیدا کیا۔

☆ جن کے تحریر کردہ فتواے جہاد اور تصدیقاتِ عُلماے کرام کے نتیجے میں نوے ہزار (۹۰۰۰۰) انقلابی سپاہ، دہلی کے اندر جمع ہوکر انگریزوں کے خلاف، صف آرا ہوگئی۔

☆ جنھیں، جنوری ۱۸۵۹ء میں اُن کے وطن (خیرآباد۔اَوَدھ) سے گرفتار کر کے لکھنؤ کورٹ میں مقدمہ سے دوچار کیا گیا اور حبسِ دوام بعبور دریاے شور، کالا پانی کی سزا دی گئی۔

☆ اور جزیرۂ انڈمان/کالا پانی ہی میں بتاریخ ۱۲/صفر ۱۲۷۸ھ/۲۰/اگست ۱۸۶۱ء آپ اپنے خالق ومالکِ حقیقی کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔ **رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ رَحْمَۃً وَّاسِعَۃً۔**

زیرِ نظر کتاب میں یہ حقیقت، وَاشگاف انداز میں بیان کی گئی ہے کہ:

علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی نے ۱۸۵۷ء کے مرکزی کردار، جنرل بخت خاں اور بہادر شاہ ظفر کو اپنے مشوروں اور ہدایات سے نواز کر اور اُس وقت کی اعلیٰ قیادت وحکومت پر اثرانداز ہوکر، انقلابِ ۱۸۵۷ء کی فکری قیادت اور عملی رہنمائی کی تھی۔

چنانچہ، انقلاب کے دَوران، مختلف مواقع کی ملاقات وگفتگو کا تذکرہ، لال قلعہ، دہلی کی سرگرمیوں کی رپورٹنگ کرنے والے اہل کاروں اور مُخبِروں نے اپنی اپنی یادداشتوں میں کیا ہے۔

اور یہ وہ معاصر داخلی شہادت ہے، جس کی تائید وتوثیق علاّمہ خیرآبادی کے احوال وقرائن سے بھی، بخوبی ہوجاتی ہے۔

اِسی طرح فَتوائے جہاد ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں بھی، دست یاب مَواد کے ذریعہ اصل حقائق، بیان کردیے گئے ہیں۔ اور دیگر مشاہیر عُلما و قائدینِ انقلابِ ۱۸۵۷ء کے اَحوال وخدمات بھی، تاریخی حقائق کے ساتھ، قارئین کی خدمت میں پیش کردیے گئے ہیں۔

راقِم سطور کی متعدد کتب، مثلاً (۱) قائدِ انقلاب، علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی (۲) ممتاز عُلمائے انقلاب ۱۸۵۷ء (۳) ۱۸۵۷ء پس منظر وپیش منظر، وغیرہ میں علاّمہ خیرآبادی کے دینی وعلمی اَحوال وآثار اور انقلابِ ۱۸۵۷ء کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

امید ہے کہ ’’**علاّمہ فضل حق خیرآبادی کی فکری قیادت اور فَتوائے جہاد ۱۸۵۷ء**‘‘ کے مطالعہ سے علاّمہ خیرآبادی کے بنیادی سیاسی کردار کے بارے میں قارئین کی معلومات میں بیش قیمت اضافہ ہوگا۔ اور اعترافِ حقیقت سے ان کی آنکھیں، روشن اور دل، شادکام ہوجائیں گے۔

جو، اِس تحریر کا مطلوب ومقصود ہے۔ **وَمَاتَوْفِیْقِی اِلَّا بِاللّٰہ۔**

یٰسٓ اختر مصباحی — مؤرخہ
بانی وصدر دارُالقلم، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی — **۴؍رمضان ۱۴۴۰ھ**
موبائل: 9350902937 — **۱۰؍مئی ۲۰۱۹ء**
9560848408 — **جمعہ مبارکہ**
ای میل: misbahi786.mk@gmail.com

طبعِ اول ۲۰۰۷ء	

آہٹ سی آرہی ہے کسی انقلاب کی

متحدہ ہندوستان کے اندر، کچھ شاطر دماغ برطانوی تاجروں کی ’’**ایسٹ انڈیا کمپنی**‘‘ اوراس کی سازشوں وریشہ دوانیوں اور مسلسل چیرہ دستیوں کے نتیجے میں رونما ہونے والے انقلابِ ۱۸۵۷ء پر، بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور بہت کچھ لکھا جانا، ابھی باقی ہے۔

مطبوعہ مَواد کے علاوہ نیشنل آرکائیوز، نئی دِلی (انڈیا) نیز، اسلام آباد (پاکستان) میں ہزاروں ایسے منتشر اوراق وصفحات، موجود ہیں، جن کی تحقیق وریسرچ اور چھان بین کی جائے تو تاریخ کی بہت سی گم شدہ کڑیاں، مل سکتی ہیں اور بہت سے نئے حقائق، سامنے آسکتے ہیں۔

مذہب، تعلیم، تجارت، صنعت، زراعت، تہذیب وتمدن، و دیگر شعبہائے حیات اور ہندوستانی معیشت کے وسائل وذرائع کو ’’**ایسٹ انڈیا کمپنی**‘‘ نے کس طرح اپنی گرفت میں لیا اور کس طرح ہندوستانیوں ہی کے ذریعہ، ہندوستانی ریاستوں اور دارُالسَّلطنت، دہلی کو بے دست وپا کیا، **پھر، ایسٹ انڈیا کمپنی کا نقاب، اُتار کر ۱۸۵۷ء میں حکومتِ برطانیہ براہِ راست پورے متحدہ ہندوستان پر قابض ومسلَّط ہوگئی؟**

اس کی خونچکاں داستان سے تاریخ کے صفحات، رنگین ہیں۔ جنہیں دیکھ کر آج بھی اہلِ ہند وپاک کا لہو، گرم ہوجاتا ہے اور ظالم اَنگریزوں کے وحشیانہ کردار کے خلاف اُن کے دلوں میں نفرت کے جذبات، اُمنڈنے لگتے ہیں۔

انقلابِ ۱۸۵۷ء کی قیادت، اُس دَور کے مشاہیر عُلما ومشائخِ کرام نے صرف فَتوائے جہاد نہیں بلکہ اپنی عاجلانہ منصوبہ بندی اور عملی کوششوں کے ذریعہ بھی کی تھی۔ بہادر شاہ ظفر و جنرل بخت خاں روہیلہ وشہزادہ فیروز شاہ اور نواب مُجدُ الدین، عُرف مَجّو خاں، مرادآبادی وغیرہ نے جو کچھ عسکری اقدامات کیے، اُن کے پیچھے، جن عُلمائے کرام کا ہاتھ تھا ان میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی، درج ذیل ہیں:

مفتی صدرالدین، آزردہ، دہلوی، علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی، مولانا فیض احمد، بدایونی، مولانا سید احمدُ اللہ شاہ، مدراسی، مفتی مظہر کریم، دریابادی، مولانا سید کفایت علی، کافی مرادآبادی، مفتی

عنایت احمد، کاکوروی، مولانا رحمت اللہ، کیرانوی، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں، اکبرآبادی
مولانا وہاج الدین، مرادآبادی، امام بخش، صہبائی، دہلوی
منشی رسول بخش، کاکوروی، غلام امام شہید، امیر مینائی، منیر شکوہ آبادی، وغیرھُم۔

انقلابِ ۱۸۵۷ء میں اہم کردار ادا کرنے والے عُلما و قائدین کے اپنے جذبات و خیالات کے علاوہ، ماضی کے جن مشاہیر عُلما و مشائخ کرام کی ہدایات و ملفوظات و مکتوبات وغیرہ کے ذریعہ ان حضرات کی ذہن سازی ہوئی اور انھیں فکری و نظریاتی غذا اور تحریک ملی، ان میں مندرجہ ذیل حضرات کے نام، خصوصیت کے ساتھ، نمایاں اور تاریخی اہمیت کے حامل ہیں:

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ، محدّث دہلوی (متولّد ۴؍شوال ۱۱۱۴ھ/ فروری ۱۷۰۳ء۔ متوفی ۲۹؍محرم ۱۱۷۶ھ/ اگست ۱۷۶۲ء)

(۲) حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں، مجدّدی، دہلوی (متولد ۱۱۱۰ھ/ ۱۶۹۹ء۔ متوفی ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء)

(۳) حضرت شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی (متولد ۱۱۵۹ھ/ اکتوبر ۱۷۴۶ء۔ متوفی شوال ۱۲۳۹ھ/ جون ۱۸۲۴ء)

(۴) حضرت قاضی ثناء اللہ، مجدّدی، پانی پتی (متولد ۱۱۴۳ھ/ ۱۷۳۰ء۔ متوفی ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء)

(۵) حضرت شاہ رفیع الدین، محدّث دہلوی (متولد ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۴۹ء۔ متوفی ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء)

(۶) حضرت مفتی محمد عوض، عثمانی، بدایونی ثُمَّ بریلوی (متوفی ۱۲۳۶ھ/ ۱۸۲۱ء)

(۷) حضرت مفتی شرف الدین، رام پوری (متوفی ۵؍شعبان ۱۲۶۸ھ؍مئی ۱۸۵۲ء)

یہاں، دو نکتے، معزّز قارئین، خصوصی طور پر پیشِ نظر رکھیں، جن کا تعلق
گذشتہ حقائق سے ہی نہیں، بلکہ موجودہ حالات سے بھی ہے اور انہیں اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد
ہر، باشعور شخص، بہت سی اُلجھی اور اُلجھائی ہوئی گتھیوں کو، خود بخود سلجھا سکتا ہے۔

(۱) انقلاب کی کمان، حقیقی طور پر عُلما کے ہاتھوں میں تھی اور یہ عُلما اپنے وطن اور مسلم جذبات وخیالات، دونوں کی بیک وقت، نمائندگی کر رہے تھے۔

اِس لئے انقلاب کی ناکامی کے بعد، سب سے زیادہ، یہی عُلما و قائدین، انگریز مظالم کا شکار ہوئے اور انہیں، ہر طرح مصلوب و مجروح و مطعون کیا گیا۔ اور ان کے خلاف، مسلسل دار و گیر اور سزا و ایذا کی مہم چلائی گئی۔

ٹھیک یہی روَیّہ، عہدِ حاضر میں بھی عُلما اور ان کی تربیت گاہ **''مدارسِ اسلامیہ''** کے خلاف اپنایا گیا ہے اور مسلم مخالف عناصر، ہر قدم پر انہیں ہی نشانۂ تنقید و ملامت اور ہر ممکن طریقے سے ان کے خلاف، ماحول سازی کی سازش و کوشش میں شب و روز، مصروف رہتے ہیں۔

(۲) انگریزوں نے بہت سوچ سمجھ کر، یہ طے کیا تھا کہ:
مسلمانوں اور ہندوؤں کو، اگر، باہم، متصادم رکھا جائے
تو ہمارے اقتدار کی بنیاد، مستحکم اور مدتِ اقتدار، دراز ہو سکتی ہے۔

اِسی ذہنیت کے ساتھ انھوں نے متحدہ ہندوستان کی نئی تاریخ لکھی، جس میں اسلام اور مسلمانوں کا چہرہ، مَسخ کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ خصوصیت کے ساتھ یہاں کے مسلم حکمرانوں کو ظالم و جابر اور متعصّب و مندر شکن حکمراں کی شکل میں پیش کیا گیا۔

انھوں نے اپنے مذموم و مکروہ عزائم کی تکمیل کے لئے، دو بنیادی قدم اُٹھائے:
سب سے پہلے، انھوں نے ہندوؤں کے درمیان یہ اَفواہ پھیلائی کہ:
سومنات مندر (گجرات) منہدم کر کے، محمود غزنوی
اس کا جو دروازہ اپنے ساتھ، افغانستان لے گیا تھا
اسے انگریز، واپس لا کر، پھر سومنات کی زینت بنائیں گے۔
چنانچہ، زہریلی تشہیر کے ساتھ ۱۸۴۲ء میں ایک دروازہ لایا بھی گیا۔
اگر چہ، بعد میں اس کی قلعی اُتر گئی اور تحقیق سے ثابت ہو گیا کہ:
یہ دروازہ، صدیوں بعد، خود انگریزوں نے ہی بنوا کر
اسے اصل شکل میں پیش کرنے کی حرکت کی تھی۔

دوسری حرکت، انگریزوں نے یہ کی کہ:
بے بنیاد اور خود ساختہ تاریخ کے ذریعہ، مشہور کیا کہ:
اجودھیا کی رام جنم بھومی توڑ کر مغل بادشاہ، ظہیرالدین بابر نے، اس کی جگہ
ایک عالیشان مسجد کی تعمیر کرائی تھی۔ جب کہ آج تک کسی قدیم مذہبی و تاریخی کتاب سے
اس پروپیگنڈے کی ذرا بھی تصدیق نہیں ہو سکی۔

قارئینِ کرام! اگر، اکتوبر ۱۹۹۰ء کی وہ تاریخ یاد کریں، جب سومناتھ سے اجودھیا تک کی رَتھ یاترا نکالی گئی اور پورے ملک کا ماحول گرم کر کے ہندو مسلم منافرت اور جنگ و جدال کا ماحول پیدا کیا گیا، تو انھیں، سب کچھ، خود بخود سمجھ میں آ جائے گا۔

اور انہیں اس نتیجے تک پہنچنے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ:
انگریزوں کے پرانے فارمولہ **''لڑاؤ اور حکومت کرو''** پر، کس طرح عمل کیا جا رہا ہے

اور کس طرح پورے ہندوستان کو زوال وانحطاط اور رسوائی وبدنامی کی راہ پر لگایا جارہا ہے۔

الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور ضلع اعظم گڑھ (صوبہ اتر پردیش۔ انڈیا) کے
زمانۂ تدریس (از دسمبر ۱۹۷۳ء تا ۱۹۸۲ء) میں ایک موقع پر، انقلاب ۱۸۵۷ء کی تاریخ کا
جب، مَیں مطالعہ کر رہا تھا، تو قدم قدم پر مجھے اس کا احساس ہوا کہ:
کچھ مخصوص انداز اور محدود نقطۂ نظر سے بہت سے اردو مؤرخین نے
تاریخ نگاری کی ہے اور بعض عُلما کو، اِس طرح پیش کیا گیا ہے کہ:
اِفراط وتفریط اور کہیں کہیں، جانب داری کا پہلو، صاف طور پر نمایاں ہوجاتا ہے۔

اس احساس کا اظہار میں نے تین قسطوں میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون بعنوان
''**کچھ اپنی باتیں**'' میں کیا تھا، جو ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور ۱۹۷۷ء کے شماروں میں اور بعد میں
۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء میں المجمع الاسلامی مبارک پور کی جانب سے
''**پیغامِ عمل**'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔
۱۴۲۲ھ/۲۰۰۲ء میں بھی دارُالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی کی جانب سے اس کی اشاعت ہوئی۔

جس کا یہ حصہ آج بھی ایک مہمیز کا کام دے رہا ہے:
''سیاسی محاذ پر عُلمائے اہلِ سنّت ہی نے جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) کی روح پھونکی تھی۔
جس کی شہادت، تاریخ کے بھولے بِسرے اوراق دے رہے ہیں۔
مفتی صدرالدین، آزردہ، دہلوی، مفتی انعام اللہ، گوپامئوی، قاضیِ دہلی وسرکاری وکیل الٰہ آباد
قاضی فیض اللہ، کشمیری، دہلوی، وغیرھُم کے ہاتھوں میں مسلمانوں کی باگ ڈور تھی۔
مولانا امام بخش، صہبائی، مولانا غلام امام شہید، مفتی عبدالوہاب، گوپامئوی، مولانا فیض احمد
بدایونی، مفتی مظہر کریم، دریابادی، مولانا وہاج الدین، مرادآبادی، مولانا وزیر خاں، اکبرآبادی
مولانا سید کفایت علی، کافی مرادآبادی، مفتی عنایت احمد، کاکوروی، منشی رسول بخش، کاکوروی
مولانا رحمت اللہ، کیرانوی، وغیرھُم کی زرّیں خدمات، ہمارے لئے آج بھی سرمایۂ افتخار ہیں۔
سید احمدُ اللہ شاہ، مدراسی، جنرل بخت خاں، روہیلہ، جنرل عظیم اللہ خاں
شہزادہ فیروز شاہ، وغیرھُم کی حربی صلاحیتوں کا اعتراف، خود انگریزوں کو بھی تھا۔
جن کے تصور ہی سے ان کے ماتھے پر، پسینہ آجاتا تھا۔
مجاہدِ اعظم، مولانا سید کفایت علی، کافی مرادآبادی، آزادیِ وطن کی راہ میں ۱۸۵۸ء میں

گرفتار ہوئے اور مرادآباد جیل سے متصل، انہیں ۶ رمئی (۱۸۵۸ء) کو، برسرِ عام، پھانسی دی گئی۔
آپ کی زبان اُس وقت بھی عشقِ رسول (عَلَیْہِ السَّلام) میں، یوں، نغمہ سَرا تھی:

کوئی گل باقی رہے گا، نَے چمن رہ جائے گا
پر، رسول اللہ کا، دینِ حَسَن رہ جائے گا
ہم صفیرو! باغ میں ہے کوئی دَم کا چہچہا
بلبلیں اُڑجائیں گی، سونا چمن رہ جائے گا
اطلس و کمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو
اِس تنِ بے جان پر، خاکی کفن رہ جائے گا
جو پڑھے گا صاحبِ لولاک کے اوپر درود
آگ سے محفوظ اُس کا، تن بدن رہ جائے گا
سب فنا ہوجائیں گے کافیؔ ولیکن حشر تک
نعتِ حضرت کا، زبانوں پر سخن رہ جائے گا

ان تاریخی حقائق کو آخر کب تک جھٹلایا جاتا رہے گا؟ اِنْ شاءَ اللّٰہ ان مظلوموں کا لہو
خود پکار اُٹھے گا اور خونِ شہیداں کی سرخی، رنگ لاکر رہے گی:

آکے گِرا تھا ایک پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

(ص ۳۰ و ۳۱۔ **پیغامِ عمل**۔ طبعِ ثانی، دارُالقلم، دہلی ۲۰۰۲ء)

ذیل میں ان تین نمبروں کے اندر موجود اور درج شدہ معلومات ومعاملات کا گہری نظر سے
مطالعہ وتجزیہ کرلیں، تو آپ کو بہت کچھ، از خود سمجھ میں آجائے گا۔ یہ محض اشارے ہیں۔ تفصیلی
حقائق، راقِم سطور کی کتاب ''**۱۸۵۷ء! پس منظر وپیش منظر**'' مطبوعہ: دارُالقلم، دہلی میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) جناب، وقارُالحسن صدیقی، سابق ڈائرکٹر آرکیولوجیکل سَروے آف انڈیا
وموجودہ او ایس ڈی، رضا لائبریری، رام پور لکھتے ہیں:
''مولانا فضلِ حق خیرآبادی کے بارے میں یہ غلط، مشہور ہوگیا ہے کہ:
وہ کسی دوسرے فضلِ حق سے اِلتباسِ اِسمی کی بِنا پر گرفتار کرلیے گئے تھے۔

اُس وقت کی خفیہ رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۸۵۷ء کی شورش کا آغاز ہوا، تو مولانا فضلِ حق، ریاستِ اَلور (راج پوتانہ) میں
تھے۔ وہ اپنی ملازمت سے اِستعفا، دے کر ۱۸؍اگست ۱۸۵۷ء کو، دہلی آ گئے۔

اور یہاں، مجاہدین کی باقاعدہ رہنمائی کر رہے تھے۔

انگریزوں کے مُخبِر، تُراب علی کی رپورٹ، مؤرخہ ۲۴؍اگست (۱۸۵۷ء) سے
معلوم ہوتا ہے کہ وہ، قلعہ کی جنگی مشاورتی کونسل کے ممبر بھی بن گئے تھے۔

انگریزوں کے جاسوس، گوری شنکر نے ۲۸؍اگست ۱۸۵۷ء کی رپورٹ میں لکھا تھا:

''مولوی فضلِ حق، جب سے دہلی آیا ہے، شہریوں اور فوج کو
انگریزوں کے خلاف، اُکسانے میں مصروف ہے۔
وہ کہتا پھرتا ہے کہ:
اس نے آگرہ گزٹ میں برطانوی پارلیمنٹ کا ایک اعلان پڑھا ہے۔
جس میں انگریزی فوج کو، دہلی کے تمام باشندوں کو قتل کر دینے
اور پورے شہر کو مِسمار کر دینے کے لئے کہا گیا ہے۔
آنے والی نسلوں کو یہ بتانے کے لئے کہ یہاں، دہلی شہر، آباد تھا
شاہی مسجد کا صرف، ایک مینار، باقی چھوڑا جائے گا۔''

(Indian Office London Mutiny Collection No.17o, PP.442-443)

اِسی طرح، مفتی صدرالدین، آزردہ کے بارے میں عام طور پر مشہور ہو گیا کہ:

ان کی جاں بخشی، اِس سبب سے ہوئی کہ فتوائے جہاد پر انھوں نے ''کتبتُ بِالُحر'' لکھا تھا اور اس پر نقطے، نہیں لگائے تھے۔ جب، انگریزوں نے ان سے باز پرس کی تو اپنی صفائی میں کہا کہ میں نے فتویٰ پر کتبتُ بِالُجَبر (دباؤ میں لکھا) لکھ دیا تھا۔ **یہ بھی محض، مَن گھڑت کہانی ہے۔**

وہ فتویٰ، شائع بھی ہوا تھا اور ۱۹۴۶ء میں جامعہ مِلّیہ اسلامیہ (نئی دہلی) میں ہونے والی ایک نمائش میں بھی رکھا گیا تھا۔ اس پر کہیں، یہ الفاظ لکھے ہوئے، نہیں تھے۔

(ص ۱۴ و ۱۵۔ پیشِ لفظ ''**تاریخِ جنگِ آزادیِ ہند اٹھارہ سوستاون**'' مؤلّفہ: سید خورشید مصطفیٰ رضوی۔ مطبوعہ رضا لائبریری، رام پور، یوپی۔ طبعِ اول ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء)

(۲) صوبۂ سرحد، روپے بھیجنے کی پاداش میں قائم، مقدمۂ اَنبالہ میں غیر مقلّد عالم، مولوی محمد جعفر، تھانیسری (متوفی ۱۹۰۵ء) وغیرہ کو ۱۸۶۴ء میں کالا پانی کی سزا ہوئی۔

اور تقریباً، بیس (۲۰) سال، وہاں رہ کر، تھانیسری صاحب نے بعدِ رِہائی
بنام ''**تواریخِ عجیب**'' (کالا پانی) اپنے حالات لکھے تھے۔

اسی سلسلے میں ''**تاریخِ عجیب**'' کے عنوان سے رئیس احمد جعفری، ندوی (متوفی ۱۹۶۸) لکھتے ہیں:

''یہ ایک مجاہدِ جلیل کی خود نوشت سوانحِ حیات ہے۔
مولانا محمد جعفر تھانیسری، حضرت سید احمد شہید کی تحریکِ جہاد کے باقیاتُ الصّالحات میں سے تھے۔
...... کتاب، بڑی دل چسپ ہے اور بڑے لرزہ خیز اَحوال و حوادث پر مشتمل ہے۔
لیکن، اس میں ایک بڑی کمی بھی ہے۔ مولانا نے سب کچھ لکھا ہے
لیکن، رُفقائے زِندان کے ذکر سے بالکل گریز کیا ہے۔
حالاں کہ اس دَور میں چوٹی کے مسلمان، ان کے ساتھ ''**کالا پانی**'' میں
اِبتلا کی زندگی، بڑے استقلال اور وقار کے ساتھ، بسر کر رہے تھے۔
حق بات، یہ ہے کہ مولانا پر ''**اَنا**'' اور ''**تحریکِ وہابیت**'' کا جوش، اِس قدر، نمایاں اور غالب تھا کہ **وہ اپنے اور اپنی تحریک کے سوا، کسی اور چیز کا ذکر کرنا، پسند نہیں کرتے تھے۔**
اگر، انھوں نے ''**کالا پانی**'' کے دوسرے بلند مرتبت اور اعلیٰ مقام اسیروں کا
ذکر کیا ہوتا، تو اس کتاب کی اہمیت اور افادیت، بہت زیادہ ہوتی۔''

(ص ۱۳۶۰۔ ''**بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد**''۔ کتاب منزل، لاہور۔ ۱۹۵۶ء)

(۳) معروف مؤرخ، پی سی جوشی لکھتے ہیں:

''یہ کہنا، بجا ہوگا کہ فضلِ حق خیر آبادی، ۱۸۵۷ء کے مسلمانوں کی روح تھے۔
اگر چہ، اِصطلاحاً، وہ خود، وہابی نہ تھے، بلکہ ان کے عقائد اور مذہبی رسوم کے مخالف تھے۔''

(ص ۱۰۵۔ ''**انقلابِ ۱۸۵۷ء**''۔ مؤلّفہ: پی سی جوشی۔
قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی۔ طبعِ سوم ۱۹۹۸ء)

''علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی کے بیان کا حوالہ دینا مفید ہوگا۔
انھوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں رہنما کا پارٹ ادا کیا اور عمر قید کی سزا پائی۔''

(ص ۱۵۷۔ ''**انقلاب ۱۸۵۷ء**''۔ مؤلّفہ: پی سی جوشی)

تقریباً ۱۹۸۰ء میں دِلی سے دو کتابیں (**آثارِ رحمت**، مؤلّفہ: مولانا امداد صابری، اور ''**مفتی صدرالدین آزردہ، دہلوی**''، مؤلّفہ: عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی) منگا کر میں نے مطالعہ کیا۔

پھر ''**باغیِ ہندوستان**''، اردو ترجمہ از عبدالشاہد شیروانی، طبعِ دوم، لاہور ۱۹۷۴ء مطالعہ میں آئی۔
مدینہ پریس، بجنور نے ۱۹۴۷ء میں مع مقدمۂ مولانا ابوالکلام آزاد، پہلی بار، اسے شائع کیا تھا۔
''**باغی ہندوستان**'' میں مجھے جگہ جگہ، حذف واِضافہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔
جس کے بعد میں نے تقریباً ۱۹۸۰ء میں ہی اس کے مترجم ومرتّب
مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی (متوفی ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء) سے
خط وکتابت کی اور کئی چیزوں کی طرف، توجہ دلا کر، ان سے گذارش کی کہ:
اس کتاب پر نظرِ ثانی فرمائیں اور مزید تحقیقی مواد، شامل کر کے اسے مکمل اور جامع کتاب بنادیں تا کہ نئی کتابت وطباعت کے ساتھ، اسے منظرِ عام پر لایا جا سکے۔

چنانچہ، انھوں نے مثبت جواب دیتے ہوئے، بڑی محنت وعرق ریزی کے ساتھ، اپنی کتاب ''**باغی ہندوستان**'' پر نظرِ ثانی واضافہ کیا، جس کے بعد المجمع الاسلامی مبارک پور کی طرف سے ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء میں نئی کتابت کے ساتھ اس کی اشاعت ہوئی۔

مولانا شیروانی کے کئی خطوط اب بھی میرے پاس، محفوظ ہیں۔
جو انھوں نے اس سلسلے میں مجھے لکھے تھے۔

''**باغی ہندوستان**'' کے مقدمۂ طبعِ چہارم میں مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی (متوفی ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء) لکھتے ہیں:

''میں بہ صمیمِ قلب، محترم مولانا محمد یٰسٓ اختر، رکنِ المجمع الاسلامی، مبارکپور (اعظم گڑھ) کا شکر گزار ہوں کہ موصوف کے پیہم اِصرار اور مسلسل تقاضوں نے
نظرِ ثانی کا کام انجام دلایا اور چوتھے ایڈیشن کی اشاعت کا، سروسامان کیا۔''

(ص ۱۴۔ ''**باغی ہندوستان**'' اردو ترجمہ از عبدالشاہد، شیروانی۔ طبعِ چہارم ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء۔
المجمع الاسلامی، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ۔ یوپی)

۱۹۹۷ء میں اپنی آنکھوں کے علاج کے سلسلے میں جب بمبئی میں میرا قیام تھا، تو ملک بھر میں آزادی کا پچاسواں جشن (از ۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۷ء) منایا جارہا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں رضا اکیڈمی، بمبئی کو متوجہ کیا اور بِفَضْلِہٖ تعالیٰ، حج ہاؤس، بمبئی میں ایک شاندار جشن کا

رضا اکیڈمی نے اِنعقاد کیا، جس کی اردو اخبارات میں نمایاں رپورٹنگ بھی ہوئی۔

قیامِ بمبئی کے دَوران، ہی بعض شخصیات پر میں نے اِجمالاً، روشنی ڈالتے ہوئے کچھ اِملا کرادیا
جسے ''**قائدینِ تحریکِ آزادی**'' کے نام سے اردو اور ہندی میں دو دو ہزار چھپوا کر
اسی موقع پر رضا اکیڈمی بمبئی نے مفت تقسیم کیا تھا۔

اَڑتالیس (۴۸) صفحات پر مشتمل ''**قائدینِ تحریکِ آزادی**'' (مطبوعہ ربیع الآخر ۱۴۱۸ھ ماہِ اگست ۱۹۹۷ء۔ رضا اکیڈمی، بمبئی) میں مندرجہ ذیل حضرات کا اِجمالی تعارف تھا:

حافظ رحمت خاں روہیلہ، مفتی صدرالدین، آزردہ، دہلوی، علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی، مولانا فیض احمد، بدایونی، مولانا سید احمدُ اللہ شاہ، مدراسی، مفتی عنایت احمد، کاکوروی، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی، مولانا وہاج الدین، مرادآبادی، مولانا لیاقت علی، الٰہ آبادی، مولانا امام بخش، صہبائی دہلوی، مولانا سید کفایت علی، کافی مرادآبادی، مولانا رضا علی خاں، بریلوی۔

زیرِ نظر کتاب ''**ممتاز علمائے انقلاب** (۱۸۵۷ء)'' اسی رسالہ ''**قائدینِ تحریکِ آزادی**'' کی ایک توسیعی شکل ہے، جسے مزید تحقیق واضافہ کے ساتھ، قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

راقم سطور کی تحریک پر مفتیِ اعظم اکیڈمی، دہلی نے انقلابِ ۱۸۵۷ء کا ڈیڑھ سو سالہ (از ۱۸۵۷ء تا ۲۰۰۷ء) ''جشنِ آزادی کنونشن'' (منعقدہ بروز دوشنبہ ۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ/ ۲۱؍ مئی ۲۰۰۷ء۔ بمقام غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین اولیا، نئی دہلی ۱۳) کا اِنعقاد کیا جو بہت کامیابی سے ہمکنار ہوا اور دہلی کے اردو اخبارات نے نمایاں طور پر، اس کی خبر، شائع کی۔

دہلی وبمبئی ولکھنؤ میں اس سے اچھے پیمانے پر، اس طرح کی تقریبات منعقد کرنے کی تحریک وسرگرمی، جاری ہے۔ اور امید ہے کہ اِنْ شاءَاللہ، جلد ہی ان کا اِنعقاد ہوگا۔
جس کے نہایت مفید اور دوررَس نتائج وثمرات، برآمد ہوں گے۔

۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کی صحیح تاریخ سے بیشتر اہلِ ہندو پاک، ناواقف ہوتے جارہے ہیں۔
حتی کہ ان دونوں کے فرق اور ان کے اثرات وغیرہ کا بھی انھیں بلکہ اچھے اچھے عُلما اور دانشوروں کو بھی علم نہیں، یا۔ بہت سرسری اور سطحی علم ومطالعہ ہے۔

۱۸۵۷ء میں باضابطہ عملی جنگ ہوئی، اس لئے اسے ''**جنگِ آزادی**'' کہنا، زیادہ مناسب بلکہ ضروری ہے۔ جب کہ ۱۹۴۷ء سے قبل، بیان وقرارداد واِحتجاج ومظاہرہ کی سیاست ہوئی۔
اِس لئے اسے ''**تحریکِ آزادی**'' کہنا، زیادہ مناسب ہے۔

۵۷ء کی جنگ کو علماے کرام نے بشرائطِ معہودہ، جہاد کہا اور اس کے جہاد ہونے کا
علّامہ فضلِ حق، خیرآبادی و مفتی صدرالدین، آزردہ، دہلوی و مولانا سید کفایت علی، کافی مرادآبادی
و مولانا فیض احمد، بدایونی، وغیرہ نے فتویٰ، جاری کیا۔
یہ حضرات، ان انگریزوں کو ہندوستان کا، حاکم نہیں، بلکہ انھیں غاصب و قابض سمجھتے تھے۔
اور ان سے جنگ کی ضرورت کے ساتھ، اُس دَور کے مسلمانوں کے اندر، اُس وقت
مناسب قوت و طاقت بھی تھی اور انھوں نے بہادر شاہ ظفر و جنرل بخت خاں کو اپنا امیر بھی بنا لیا تھا۔
لیکن، بعض کمزوریوں اور بعض اہلِ وطن کی غدّاریوں کے نتیجے میں
جنگِ آزادی کو، ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔
سفّاک و درندہ صفت انگریزوں نے انقلاب کی پاداش میں تقریباً پندرہ ہزار علما
اور لگ بھگ پانچ لاکھ مسلمانوں کو، طرح طرح کی اذیتیں دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔
اور بے شمار اہلِ وطن کو بے گھر، بے دَر بنا کر، ان کی زندگی کو عذاب میں مبتلا کر دیا۔
اپنے علما، اپنے اسلاف، اپنے شہیدوں، اپنے محسنوں اور اپنے سرپرستوں کو یاد رکھنا
اور ان کی خدمات کو اُجاگر کر کے اپنی رگوں میں حرارت و توانائی کی لہر دوڑانا
ہر زندہ قوم کی خواہش ہوتی ہے، جس کا یہ ایک نہایت مناسب اور زرّیں موقع ہے
اور ۲۰۰۷ء میں اِس طرح کی ہمیں مزید سرگرمیاں، شروع کر کے
اپنی تاریخ کی بنیادوں کو مضبوط کر لینا چاہیے۔

ضبط کن تاریخ را پایندہ شو

اَللّٰہ تَبارَک وَ تَعالیٰ ہمیں اپنے مقاصدِ خیر میں کامیابی سے نوازے اور نئی نسل کو اپنے
اسلافِ کرام کی خدمات سے متعارف ہونے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق، عطا فرمائے۔
آمین بِجاہِ حَبِیبِہٖ سَیِّدِالْمُرْسَلِین عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالتَّسْلِیم۔

یٰسٓ اختر مصباحی
بانی و صدر دارالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵

یوم جمعۃ المبارکہ
۸ر جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ
۲۵ر مئی ۲۰۰۷ء

''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کی تجارت و حکومت

۱۶۰۰ء کے آخر میں ملکہ الزبتھ نے لندن کی ایک تجارتی کمپنی کو، بعہدِ بادشاہِ ہند
جلال الدین محمد اکبر (متوفی ۱۴ر جمادی الآخرہ ۱۰۱۴ھ/ ۱۷راکتوبر ۱۶۰۶ء۔ درآگرہ)
ہندوستان میں تجارت کرنے کی باضابطہ منظوری دی۔
پُرتگیزی اور ڈَچ، یہاں پہلے سے تجارت کیا کرتے تھے۔
جنھوں نے انگریزوں کی مزاحمت و مخالفت کی۔ مگر، انگریز، رفتہ رفتہ، ان پر غالب آ گئے۔
۱۶۰۸ء میں انگریزوں نے سورت (گجرات) میں سب سے پہلے ایک تجارتی کوٹھی بنا کر
وہاں سے اپنا کام شروع کیا۔ مغل بادشاہ، نورالدین جہانگیر نے ۱۶۱۳ء میں سورت، کھمبات، گوا
اور احمد آباد میں انگریزوں کو اپنی تجارتی کوٹھیاں بنانے کا، پَروانہ دیا۔
آزاد تجارت کی دولت، عہدِ جہانگیر ہی میں انگریزوں کو حاصل ہو گئی۔
۱۶۱۵ء میں جیمس اول، بادشاہِ انگلستان نے جہانگیر بادشاہِ دہلی کی طلب پر، سرٹامس رُو کو
اپنا سفیر بنا کر، ہندوستان بھیجا، جو چار سال تک، یہاں مقیم رہا۔ کپتان ولیم ہاکنز تاجرِ ایسٹ انڈیا کمپنی
سرٹامس سے پہلے، ہندوستان میں موجود تھا، جو بادشاہِ دِلی کا ہم نشین بن چکا تھا۔
جہانگیر، بائیس سال تک، ہندوستان پر حکومت کر کے ۸ر صفر ۱۰۳۷ھ/ ۲۸ر اکتوبر ۱۶۲۷ء کو
کشمیر سے لاہور جاتے ہوئے راستے میں انتقال کر گیا۔ شاہدرہ، لاہور میں اس کی تدفین ہوئی۔
جہانگیر کے عہد میں انگریزوں کو ہندوستان کے اندر، آزاد تجارت کے وسیع مواقع، حاصل ہوئے۔
شاہجہاں کے عہد میں انگریزوں کے تجارتی ادارہ **''ایسٹ انڈیا کمپنی''** نے
مشرقی ساحلِ مدراس پر ایک وسیع و عریض زمین خرید کر فورٹ سینٹ جارج کی تعمیر کی۔
اور کلکتہ کے قریب، دریائے گنگا کے دہانے پر واقع، مقام، ہُگلی میں بھی ایک تجارتی کوٹھی بنالی۔
شاہجہاں نے ۱۶۲۸ء سے ۱۶۵۸ء تک، ہندوستان پر حکومت کی۔ ۲۶ر رجب ۱۰۷۶ھ/ یکم فروری
۱۶۶۶ء کو، اکبرآباد (آگرہ) میں اس کا انتقال ہوا۔ وہیں، تاج محل کے اندر، اس کی تدفین ہوئی۔
اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے مُعتمد اور مُہم جُو جنرل، میر جُملہ کے انتقال (۱۶۶۳ء) کے بعد

نواب، شائستہ خاں کو، میر جُملہ کی جگہ، بنگال بھیجا، جس نے تیئیس (۲۳) برس تک، وہاں حکومت کی۔

مولوی بشیر الدین، دہلوی، اِس شائستہ خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ وہی شائستہ خاں ہے، جس نے ۱۶۸۶ء میں انگریز تاجروں کو اپنے علاقہ سے بدر کر دیا اور اس سے پہلے بھی ۱۶۶۰ء میں اسی نے پرتگیزوں اور دوسرے بحری قزّاقوں کو جو، چٹا گانگ کے اَطراف میں کثرت سے بھرے ہوئے تھے، صاف کر دیا تھا۔

(ص ۵۰۱۔ **واقعاتِ دارُالحکومت دہلی**، حصہ اول، ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۹ء۔ از مولوی بشیر الدین، دہلوی۔ طبعِ سوم، اردو اکادمی، دہلی۔ ۱۹۹۵ء)

ہندوستان کے شرقی کنارے پر، سب سے پہلے، انگریزوں کی تجارتی کوٹھی ۱۶۲۵ء میں امرگاؤں ضلع نلّور، مچھلی پٹن ضلع کرشنا میں بنی۔ اور چند سال کے بعد ۱۶۳۳ء میں بالاسور اور دوسرے غیر معروف مقامات، ہری ہر پور میں بنیں۔

۱۶۵۱ء میں ایک کوٹھی، ہگلی (بنگال) میں بصلۂ حُسنِ خدماتِ طبی، ڈاکٹر گیبریل ہیوٹن کی بنی، جس نے صوبہ دارِ بنگال کے گھر میں بڑے معرکے کا علاج کیا تھا۔

چارناک نے، جو، ہُگلی کی کوٹھی کا صدر تھا، ۱۶۸۶ء میں کلکتہ میں ایک اور شاخ کھولنی چاہی لیکن، نواب شائستہ خاں کی دشمنی کی وجہ سے، وہاں سے اسے بھاگنا پڑا اور مدراس میں جا کر پناہ لی۔ ۱۶۹۰ء میں اورنگ زیب سے فرمان، حاصل کر کے ایک چھوٹی سی کوٹھی، قائم کی گئی۔ جو بڑھتے بڑھتے، آج، کلکتہ جیسا مشہور مقام ہو گیا، جو برٹش انڈیا میں درجۂ دوم کا شہر ہے۔

شائستہ خاں ۱۶۶۳ء میں دَکن سے بنگال لایا گیا، جس نے ۱۶۹۴ء میں اِکیانوے (۹۱) سال کی عمر میں اور بہ حسابِ قمری، ترانوے (۹۳) سال کی عمر میں آگرہ میں انتقال کیا۔

(ص ۵۰۱۔ **حاشیۂ واقعاتِ دارالحکومت دہلی**، حصہ اول)

اورنگ زیب کے عہد میں ۱۶۶۱ء میں چارلس کو ایسٹ انڈیا کمپنی کا چارٹر ملا اور بمبئ پُرتگیزیوں کے حوالے کی گئی۔ ۱۶۶۴ء میں فرانسیسوں نے باضابطہ ہندوستانی کمپنی کی بنیاد رکھی۔

جارج چارناک نے ۱۶۹۰ء میں کلکتہ کی بنیاد ڈالی۔

۱۷۰۲ء میں ''**یونائیٹڈ ایسٹ انڈیا کمپنی**'' کی تشکیل ہوئی۔

اورنگ زیب عالمگیر نے مئی ۱۶۵۹ء سے ۱۷۰۷ء تک، ہندوستان پر حکومت کی۔

احمد نگر میں بروزِ جمعہ بتاریخ ۲۸/ ذوالقعدہ ۱۱۱۷ھ/۴/ مارچ ۱۷۰۷ء اورنگ زیب کا انتقال

ہوا۔ خُلد آباد متصل دولت آباد ضلع اورنگ آباد، دکن (موجودہ مہاراشٹر) میں تدفین ہوئی۔

محمد معظّم، معروف بہ شاہ عالَم بہادر شاہ، فرزندِ اورنگ زیب کے عہدِ حکومت، از ۱۷۰۷ء تا ۱۷۱۲ء۔ و جہاں دار شاہ، فرزندِ شاہ عالَم بہادر شاہ کے عہدِ حکومت، از ۱۷۱۲ء تا ۱۷۱۳ء کے بعد جہاں دار شاہ کے برادر زادہ، فرخ سیر کے عہد ۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء کا ایک اہم واقعہ اِس سلسلے میں قابلِ ذکر ہے کہ:

''۱۷۱۶ء میں بادشاہ، بیمار ہوا۔ علاج کے لئے اسکاٹ لینڈ کا ایک ڈاکٹر ہیملٹن گیبریل طلب کیا گیا، جس کے علاج سے اسے صحتِ کامل ہو گئی۔

بادشاہ نے اپنی صحت کی خوشی میں ڈاکٹر سے کہا کہ: **مانگو کیا مانگتے ہو؟**

ڈاکٹر، نرا ڈاکٹر ہی نہ تھا بلکہ اپنی قوم کا فدائی تھا۔

اس نے منفعتِ ذاتی پر قومی بہتری کو ترجیح دی۔ اور عرض کیا کہ:

''**ایسٹ انڈیا کمپنی** سے جو محصول دَر، لیا جاتا ہے، اُس کی معافی کا فرمانِ عطوفت نشان مرحمت فرمایا جائے اور اس کے معاوضے میں کوئی سالانہ رقم، یکمشت، مقرر ہو۔''

جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کمپنی کے حقوق، تسلیم کر لیے جائیں۔ اس مراعات نے کمپنی کے پاؤں جما دیے۔'' (ص ۶۲۷۔ **واقعاتِ دارُالحکومت دہلی**۔ حصہ اول۔ از مولوی بشیر الدین، دہلوی)

شاہِ عالَم بہادر شاہ کے پوتے، محمد شاہ رنگیلے کی مدتِ حکومت، اکتوبر ۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء مغلیہ حکومت کی کمزوری واَبتری و ذِلّت ورُسوائی سے بھرپور اور ایک عبرت ناک حکومت تھی۔ یہاں تک کہ ابوالمظفّر، جلال الدین سلطان عالی گوہر، معروف بہ شاہ عالَم ثانی (مدتِ حکومت، ۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء) تک، مغلیہ حکومت، اتنی کمزور و ناتواں ہو گئی کہ:

بادشاہ بننے کے باوجود، شاہ عالَم ثانی کو، دس سال، الہ آباد میں گذارنے پڑے۔

اور چھبیس لاکھ سالانہ، اسے ایسٹ انڈیا کمپنی سے ملنا شروع ہوا، جس پر اسے قناعت کرنا پڑا۔

دس سال بعد، شاہ عالَم ثانی کو دلی آنا، نصیب ہوا۔ ریاستوں نے جا بجا بغاوت کر کے مغل شہنشاہیت کے ٹکڑے کر ڈالے اور ہندوستان کے ہر حصے میں خود مختار ریاستیں، قائم ہو گئیں۔

ایک طرف، نادر شاہ دُرّانی نے ۱۷۳۸ء میں دلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور تختِ طاؤس کے ساتھ، کروڑوں روپے، ہندوستان سے لے گیا۔

ہزاروں انسانوں کا قتلِ عام کیا اور ہزاروں مکانات، تباہ کر دیے۔

دوسری طرف، احمد شاہ اَبدالی، ۱۷۴۸ء میں آدھمکا۔
پھر ۱۷۴۹ء میں بھی ہندوستان پر، چڑھ دوڑا۔
اِس طرح، دُرّانی اور اَبدالی نے مغل حکمرانوں کی قوت اور شوکت وحشمت کو خاک میں ملا دیا۔
تیسری مرتبہ، ۱۷۵۷ء میں پھر، احمد شاہ ابدالی نے دلی پر قبضہ کرلیا اور دو ماہ تک، یہاں رہا۔
چوتھی بار، ۱۷۵۹ء میں ابدالی نے دلی کو، تاراج کیا۔
دوسری طرف، جاٹ اور مرہٹے، کچھ دنوں بعد، دہلی میں گھس آئے
اور یہاں، لوٹ مار کی انتہا کردی۔ لیکن، جب پھر احمد شاہ اَبدالی نے ہندوستان پر چڑھائی کی
تو جنوری ۱۷۶۱ء میں پانی پت (پنجاب۔ موجودہ صوبہ ہریانہ۔ انڈیا) کے میدان میں
اس نے مرہٹوں کو ڈھیر کردیا اور ان کی طاقت وقوت کا، ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا۔
تیسری جانب، انگریز اپنا تجارتی لباس اتار کر فاتح اور حاکم بننے کے لئے کمر بستہ ہوگئے
اور جگہ جگہ اپنی عیّارانہ وشاطرانہ حکمتِ عملی کے تحت، مداخلت وجارحیت کے راستے ڈھونڈنے لگے۔
دہلی کی طرف، انگریزوں نے بعد میں رُخ کیا۔ وہ پہلے، ریاستی وصوبائی مورچوں کو
فتح کرنے اور انھیں مضبوط کرنے میں ایک مدت تک لگے رہے۔
۱۷۵۷ء میں جنگِ پلاسی، ۱۷۶۴ء میں جنگِ بکسر، ۱۷۷۴ء میں جنگِ روہیل کھنڈ
اس کے بعد، حیدرعلی سے کئی جنگیں کرنے کے بعد، آخر میں ۱۷۹۹ء میں اس کے شیر دل بیٹے
سلطان ٹیپو کو، زیر کرکے ہی انگریزوں نے دہلی کی طرف، قدم بڑھائے۔
۱۸۰۱ء میں اَودھ اور ۱۸۰۳ء میں دہلی پر انگریز، حاوی اور مسلّط ہوگئے۔
لیکن اپنی حکمتِ عملی کے تحت، اَودھ کی نوابی اور دہلی کی شاہی حکومت کو باقی و برقرار رکھا
جن کی حیثیت، وظیفہ خوار حکومت سے زیادہ، نہ تھی۔

بالآخر، ۱۸۵۶ء میں اَودھ، اور ۱۸۵۷ء میں دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد

ایسٹ انڈیا کمپنی کو تحلیل کرکے ۱۸۵۸ء میں پورا ہندوستان، شاہِ انگلستان کے حوالے کردیا گیا
اور ملکہ الزبتھ کی براہِ راست حکومت، سارے متحدہ ہندوستان پر ہوگئی۔
اَودھ کے آخری نواب، واجد علی شاہ کو گرفتار کرکے مع اہل وعیال، کلکتہ بھیج دیا گیا۔
اسی طرح، دہلی کے آخری مغل بادشاہ، بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کرکے باقی ماندہ اہل وعیال کے ساتھ
رَنگون بھیج دیا گیا۔ جہاں انھوں نے حسرت ویاس کے ساتھ، اپنی زندگی کے ایام، پورے کیے۔

انگریزوں کی شاطرانہ چالیں اور ان کی ریشہ دَوَانیاں، ہرگز، کامیاب، نہ ہوسکتی تھیں
اگر، انھیں، ہندوستانی حریصوں اور غداروں کی فوج، نہ مل جاتی۔
جنگِ پلاسی (بنگال) میں نواب، سراجُ الدّولہ کو، میر جعفر اور جنگِ سرنگا پٹم (میسور) میں
سلطان ٹیپو کو، میر صادق، اگر دھوکہ نہ دیتے، تو اتنی آسانی کے ساتھ
انگریز، میدان، نہ جیت لیتے اور اپنی فتح وکامرانی کے پرچم نہیں لہرا سکتے تھے۔
اِسی حقیقت کا، شاعرِ مشرق، ڈاکٹر اقبالؔ نے اپنے اِس شعر میں اظہار کیا ہے:

جعفر از بنگال و صادق از دَکن
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

دہلی میں مرزا الٰہی بخش و مرزا مغل ومنشی رجب علی، وحکیم احسنُ اللہ خاں
اگر، انگریزوں کے آلۂ کار اور ان کے حامی وطرف دار نہ بن جاتے
تو آغازِ انقلاب ۱۸۵۷ء کے چند ماہ کے اندر ہی انگریز، دہلی، فتح نہ کرپاتے۔
یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ:
بہادر شاہ ظفر کی ضعیفی وکبر سنی نے بھی دہلی کا مورچہ، مضبوط نہ ہونے دیا۔

۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۷ء تک، اس نے سالانہ ایک لاکھ روپے کے وظیفہ خوار بادشاہ کی حیثیت سے
اپنی زندگی گذاری اور جواں مردی واولعزمی کی کوئی تاریخ، رقم کرنے میں وہ تاحیات، ناکام رہا۔
دیگر شہزادگانِ آلِ تیمور بھی عیش وعشرت سے آگے، عموماً، کچھ نہیں جانتے تھے
اور طاؤس ورباب کے جھرمٹ میں ان کی زندگی، اِس طرح گذر رہی تھی کہ:
شمشیر وسنان کو انھوں نے گویا، کبھی ہاتھ، نہ لگایا، جو اُن کے آباواَجداد کا امتیاز بلکہ طُرّہ اِمتیاز تھا۔
نتیجہ، ظاہر ہے کہ وہی ہوا، جو ہونا چاہیے تھا اور دوسروں کی شکوہ سنجی سے بہتر یہی ہے کہ:
ضعف واضمحلال کے شکار اور دوں ہمتی کے خوگر لوگوں کے انجام سے
آنے والی نسل کو درسِ عبرت لینا چاہیے کہ حوادث ووَقائع سے عِبرت پذیری کے سِوا
ان کے حق میں کوئی بات، مفید اور مستقبل کے لئے محرّک ونتیجہ خیز نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ:

تقدیر کے قاضی کا، یہ فتویٰ ہے اَزل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا، مرگِ مفاجات

انگریزوں نے بادشاہوں، نوابوں، راجاؤں کی کمزوریوں اور ان کے اختلافات کا فائدہ

اٹھایا۔ پہلے، تاجر کی حیثیت سے انھوں نے کسانوں، زمینداروں، صنعت کاروں، پارچہ بافوں ہنرمندوں کا خون چوسا،اس کے بعد، تروتازہ ہوکر صوبائی حکومتوں اور ریاستوں کو، یکے بعد دیگرے نگلنا،شروع کیا۔انھیں ایک دوسرے سے لڑا کر اور پھر اپنے طاقتور ہاتھوں سے ان کا گلا گھونٹ کر اپنے اختیار واقتدار کی بنیادیں،مضبوط کرتے رہنے کا انھوں نے سلسلہ جاری رکھا۔

اور آخر میں بتاریخ ۲۰ر ستمبر ۱۸۵۷ء، دہلی کے لال قلعہ پر اپنا پرچم لہرانے، فاتحِ ہندوستان ہونے اور بلا شرکتِ غیرے، حاکمِ ہندوستان بننے میں بھی وہ، کامیاب ہوگئے۔

یہاں اس مرحلے میں بھی انگریزوں کو لعنت ملامت کرنے
اور انھیں کوسنے سے بہتر یہی ہے کہ برِصغیر ہندوپاک کے عوام کو یہی پیغام دیا جائے کہ:

گُل وگُل چیں کا گِلہ، بلبلِ خوش رنگ نہ کر
تو گرفتار ہوئی، اپنی صدا کے باعث

○○○

آغاز و انجامِ انقلاب کے اسباب

سر سید احمد خاں (متوفی ذُوالقعدہ ۱۳۱۵ھ / مارچ ۱۸۹۸ء)

جب اپریل ۱۸۵۸ء میں مراد آباد کے صدرُ الصُّدور ہوئے
اُس وقت انھوں نے ''**اَسبابِ بغاوتِ ہند**'' کے نام سے ایک کتاب لکھی
جس کی ۱۸۵۸ء ہی میں آگرہ سے طباعت بھی ہوئی۔

رسالہ ''**اسباب بغاوت ہند**'' کے کُل، پانچ سو نسخے، اردو میں چھپے تھے۔
جن میں سے چند نسخے، سرسید نے اپنے پاس رکھے۔ایک نسخہ،حکومتِ ہند کو بھیجا۔
باقی سارے نسخے، حکومتِ برطانیہ کے نام، لندن، اِرسال کردیا۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی (متوفی ۱۹۱۴ء) نے رسالہ ''**اسباب بغاوت ہند**'' کو
سرسید کی سوانح بنام ''**حیاتِ جاوید**'' میں بھی ضمیمہ کے طور پر شامل کردیا ہے۔

اس رسالہ (**اسبابِ بغاوتِ ہند**) کے کچھ اِقتباسات، درج ذیل ہیں:

''**۱۸۵۷ء کی سرکشی میں یہی ہوا کہ:**
بہت سی باتیں، ایک مدتِ دراز سے لوگوں کے دل میں جمع ہوتی جاتی تھیں
اور بہت بڑا میگزین، جمع ہوگیا تھا۔صرف اس کے شتابے میں آگ لگانی، باقی تھی کہ:
سالِ گذشتہ میں فوج کی بغاوت نے اس میں آگ لگادی۔''

(ص ۸۰۷۔**حیاتِ جاوید**۔طبع پنجم ۲۰۰۴ء۔قومی کونسل برائے فروغِ اردو۔نئی دہلی)

''روس اور ایران کی سازش سے ہندوستان میں سرکشی کا خیال کرنا
نہایت بے بنیاد بات ہے۔'' (ص ۸۰۷۔**حیاتِ جاوید**)

''**اَوَدھ** کی ضبطی کو بھی ہم، اس سرکشی کا سبب، نہیں سمجھتے۔'' (ص ۸۰۸۔**حیاتِ جاوید**)

''اِس فساد کو یہ بھی خیال، نہیں کرنا چاہیے کہ:
اس حسرت وافسوس کے باعث سے کہ ہندوستانیوں کے قدیم ملک پر غیرقوم، قابض ہوگئی تھی

تمام قوم نے اتفاق کرا کر، سرکشی کی۔'' (ص ۹۰۹۔حیاتِ جاوید)

''تو، اب، ہرگز، خیال میں بھی نہیں آتا کہ:

اب کا فساد، مسلمانوں نے حکومت اور اپنی سلطنت کے جاتے رہنے کے رنج سے کیا ہو۔'' **(ص۔۸۱۰۔حیاتِ جاوید)**

''دلی کے معزول بادشاہ کی سلطنت کا کوئی بھی آرزومند نہ تھا۔اس خاندان کی لغو اور بیہودہ حرکات نے سب کی آنکھوں سے، اس کی قدر و منزلت گرادی تھی۔'' **(ص۸۱۰۔حیاتِ جاوید)**

''مسلمانوں کا بہت روزوں سے آپس میں سازش اور مشورہ کرنا، اس ارادے سے کہ:

ہم، باہم متفق ہو کر، غیر مذہب کے لوگوں پر جہاد کریں اور ان کی حکومت سے آزاد ہو جائیں

نہایت بے بنیاد بات ہے۔ جب کہ مسلمان، ہماری گورنمنٹ کے مُستامن تھے

کسی طرح، حکومت کی عمل داری میں جہاد، نہیں کر سکتے تھے۔

بیس تیس برس پیشتر، ایک بہت بڑے نامی مولوی، محمد اسمٰعیل نے

ہندوستان میں جہاد کا وعظ کہا اور آدمیوں کو جہاد کی ترغیب دی۔

اُس وقت انھوں نے صاف، بیان کیا کہ:

ہندوستان کے رہنے والے، جو سرکار انگریزی کی امن میں رہتے ہیں، ہندوستان میں جہاد، نہیں کر سکتے۔اس لئے ہزاروں جہادی، ہر ایک ضلع ہندوستان میں جمع ہوئے۔

اور سرکاری عمل داری میں کسی طرح کا فساد نہیں کیا اور غربی سرحد پنجاب پر جا کر لڑائی کی۔

اور، جو، ہر ضلع میں، پاجی اور جاہلوں کی طرف سے جہاد کا نام ہوا، اگر، ہم، اس کو جہاد ہی فرض کریں، تو بھی اس کی سازش اور صلاح قبل دسویں مئی ۱۸۵۷ء، مطلق، نہ تھی۔

غور کرنا چاہیے کہ اس زمانے میں جن لوگوں نے جہاد کا جھنڈا بلند کیا، ایسے خراب اور بدرَوَیّہ اور بداَطوار آدمی تھے کہ بجز شراب خوری اور تماش بینی اور ناچ اور رنگ دیکھنے کے

کچھ وظیفہ ان کا، نہ تھا۔ بھلا، یہ کیوں کر پیشوا اور مقتدا، جہاد کے گنے جا سکتے تھے؟

اس ہنگامے میں کوئی بات بھی مذہب کے مطابق، نہیں ہوئی۔

سب جانتے ہیں کہ سرکاری خزانہ اور اسباب، جو امانت تھا

اس میں خیانت کرنا، ملازمین کو نمک حرامی کرنی، مذہب کی رُو سے، درست نہ تھی۔

صریح ظاہر ہے کہ بے گناہوں کا قتل، علی الخصوص عورتوں اور بچوں اور بڈھوں کا مذہب کے بموجب، گناہِ عظیم تھا۔ پھر کیوں کر، یہ ہنگامۂ غدر، جہاد ہو سکتا تھا؟

ہاں! البتّہ، چند بدذاتوں نے دنیا کی طمع اور اپنی منفعت اور اپنے خیالات پورا کرنے اور جاہلوں کو بہکانے کو اور اپنے ساتھ، جمع کرنے کو جہاد کا نام، دے لیا۔

پھر، یہ بات بھی مُفسِدوں کی حرمزدگیوں میں سے ایک حرمزدگی تھی، نہ واقع میں جہاد۔

دِلی میں جو جہاد کا فتویٰ چھپا، وہ ایک عمدہ دلیل، جہاد کی سمجھی جاتی ہے۔

مگر میں نے بتحقیق سنا ہے اور اس کے اِثبات پر بہت دلیلیں ہیں کہ وہ محض، بے اصل ہے۔

میں نے سنا ہے کہ جب فوج نمک حرام، میرٹھ سے دلی میں گئی

تو کسی نے جہاد کے باب میں فتویٰ چاہا۔سب نے فتویٰ دیا کہ جہاد نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ، اس پہلے فتویٰ کی نقل میں نے دیکھی ہے، مگر جب کہ وہ اصل فتویٰ، معدوم ہے

تو میں اس نقل کو، نہیں کہہ سکتا کہ کہاں تک،، لائقِ اعتماد ہے؟

مگر، جب، بریلی کی فوج، دلی پہنچی اور دوبارہ فتویٰ، جاری ہوا

جو مشہور ہے اور جس میں جہاد کرنا، واجب لکھا ہے، بلا شبہ، اصلی نہیں ہے۔

چھاپنے والے اس فتویٰ کے، جو ایک مُفسِد اور نہایت قدیمی بدذات آدمی تھا

جاہلوں کے بہکانے اور وَرغلانے کو، لوگوں کے نام لکھ کر اور چھاپ کر، اس کو رونق دیا تھا۔

بلکہ ایک آدھ مہر، ایسے شخص کی چھاپ دی تھی، جو قبلِ غدر، مر چکا تھا۔ مگر، مشہور ہے کہ چند آدمیوں نے فوجِ باغی، بریلی اور اس کے مُفسِد ہمراہیوں کے جبر اور ظلم سے مہریں بھی کی تھیں۔

دِلی میں بڑا گروہ، مولویوں اور ان کے تابعین کا، ایسا تھا کہ:

وہ مذہب کی رُو سے معزول بادشاہِ دلی کو بہت بُرا اور بدعتی سمجھتے تھے۔

ان کا یہ عقیدہ تھا کہ دِلی کی جن مسجدوں میں بادشاہ کا قبض و دخل اور اِہتمام ہے

ان مسجدوں میں نماز، درست نہیں۔ چنانچہ، وہ لوگ، جامع مسجد (دہلی) میں بھی نماز، نہیں پڑھتے تھے۔اور غدر سے بہت قبل کے چھپے ہوئے فتوے، اس معاملے میں موجود ہیں۔

پھر، کبھی، عقل، قبول کر سکتی ہے کہ ان لوگوں نے جہاد کے درست ہونے میں

اور بادشاہ کو، سردار بنانے میں فتویٰ دیا ہو؟''

(ص۸۱۰تا۸۱۲۔''**اسبابِ بغاوتِ ہند**''از سرسید احمد خاں، مشمولہ: **حیاتِ جاوید**۔ مؤلّفہ: خواجہ الطاف حسین حالیؔ)

''فوجِ باغی کا، پہلے سے، دلی کے معزول بادشاہ سے سازش کرنا، محض بے اصل ہے۔
دلی کے بادشاہ کو، کوئی شخص، ولی اور مقدس، نہیں سمجھتا۔
اس کے منہ پر لوگ، اس کی خوشامد کرتے تھے اور پیٹھ پیچھے، ہنستے تھے۔
(ص۸۱۳۔**حیاتِ جاوید**)

''بلا شبہ، پارلیمنٹ میں ہندوستان کی رعایا کی مداخلت، غیر ممکن اور بے فائدہ محض تھی۔
مگر، لجیس لیٹو کونسل میں مداخلت، نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔
بس، یہی ایک بات ہے، جو جڑ ہے، تمام ہندوستان کے فساد کی۔
اور جتنی اور باتیں جمع ہوتی گئیں، وہ سب، اس کی شاخیں ہیں۔'' (ص۸۱۴۔**حیاتِ جاوید**)

''یہ نقص، جو ہماری گورنمنٹ میں تھا، اس نے تمام ہندوستان کے حالات میں سرایت کیا۔
اور جس قدر اسباب، سرکشی کے، جمع ہو گئے، گو، وہ اسی ایک امر پر متفرّع ہیں
مگر، غور کر کے، سب کو اِحاطہ میں لایا جائے، تو پانچ اصول پر مبنی ہوتے ہیں:

اول: غلط فہمیِ رعایا۔ یعنی برعکس سمجھنا، تجاویز گورنمنٹ کا۔

دوم: بھاری ہونا، ایسے آئین اور اصول اور طریقۂ حکومت کا، جو ہندوستان کی حکومت اور ہندوستانیوں کی عادات کے مناسب، نہ تھے۔ یا۔ مضرّت رسانی کرتے تھے۔

سوم: ناواقف رہنا گورنمنٹ کا، رعایا کے اصلی حالات اور اَطوار و عادات اور اُن مصائب سے، جو اُن پر گذرتی تھیں۔ اور جن سے رعایا کا دل، گورنمنٹ سے پھٹا جاتا تھا۔

چہارم: ترک ہونا اُن اُمور کا، ہماری گورنمنٹ کی طرف سے جن کا بجالانا، ہماری گورنمنٹ پر، ہندوستان کی حکومت کے لئے واجب تھا۔

پنجم: بدانتظامی اور بے اِہتمامی، فوج کی۔''

(ص۸۱۶و۸۱۷۔**حیاتِ جاوید**۔ مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغِ اردو، نئی دہلی۔ طبع پنجم ۲۰۰۴ء)

مذکورہ اِقتباسات، ہم نے بلا تبصرہ، نقل کیے ہیں، جن سے ''**اسبابِ انقلابِ ہند**'' کے ساتھ، سرسید کے اپنے کچھ سیاسی خیالات بھی، دو دو چار کی طرح، واضح ہو جاتے ہیں۔

سرسید کا یہ بیان، ایک طرف، جہاں، بیانِ صفائی اور انگریز نوازی پر مشتمل ہے وہیں، دوسری طرف، انھوں نے انقلابِ ۱۸۵۷ء کے علَم بردار سبھی ہندوستانی عوام اور عُلما و قائدین کی حد درجہ توہین و تذلیل بھی کی ہے، جو اُن کی ایک ایک سطر، ایک ایک جملہ بلکہ ان کے دل کی ایک ایک دھڑکن سے صاف، عیاں ہے۔

بغاوت و غدر یعنی انقلابِ ۱۸۵۷ء کی پانچ بنیادوں میں سے پہلی بنیاد
ان کی نظر میں غلط فہمیِ رعایا ہے۔ جس کی تفصیل میں، سرسید لکھتے ہیں:

''اِس مقام پر جتنی باتیں، ہم، بیان کرتے ہیں، ان سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ:
درحقیقت، ہماری گورنمنٹ میں، یہ باتیں تھیں، بلکہ یہ مطلب ہے کہ:
لوگوں نے یوں غلط سمجھا اور سرکشی کا سبب ہو گیا۔ اگر، ہندوستانی آدمی بھی **لیجس لیٹو** کونسل میں مداخلت رکھتے، تو یہ غلط فہمی، واقع، نہ ہوتی۔'' (ص۸۱۷۔**حیاتِ جاوید**)

اس کے بعد لکھتے ہیں:

''**مداخلتِ مذہبی**، کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ، جاہل اور قابل اور اعلیٰ اور ادنیٰ، یقین جانتے تھے **کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے۔**
اور سب کو، کیا ہندو کیا مسلمان، عیسائی مذہب اور اپنے ملک کے رسم و رواج پر، لا ڈالے۔
اور سب سے بڑا سبب، اس سرکشی میں یہی ہے۔'' (ص۸۱۷۔**حیاتِ جاوید**)

''ہماری گورنمنٹ کی ابتدائی حکومتِ ہندوستان میں گفتگو، مذہب کی بہت کم تھی
روز بروز، زیادہ ہوتی گئی اور اس زمانہ میں بدرجۂ کمال پہنچ گئی۔
اس میں شک نہیں کہ ہماری گورنمنٹ کو، ان امور میں کچھ، دخل نہیں، مگر، ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ یہ سب معاملے، بموجب حکم اور بموجب اشارہ اور مرضیِ گورنمنٹ، ہوتے ہیں۔
سب جانتے تھے کہ گورنمنٹ نے پادری صاحبوں کو ہندوستان میں مقرّر کیا ہے۔
گورنمنٹ سے پادری، تنخواہ پاتے ہیں۔ گورنمنٹ اور حُکّامِ انگریزی ولایت جو اس ملک میں نوکر ہیں، وہ پادری صاحبوں کو بہت سا روپیہ، واسطے خرچ کے اور کتابیں بانٹنے کو دیتے ہیں۔ اور ہر طرح، ان کے مددگار اور معاون ہیں۔
اکثر حُکّامِ متعہد اور افسرانِ فوج نے اپنے تابعین سے مذہب کی گفتگو، شروع کی تھی۔

بعضے صاحب، اپنے ملازموں کو حکم دیتے تھے کہ:
ہماری کوٹھی پر آن کر پادری صاحب کا وعظ سنو۔ اور ایسا ہی ہوتا تھا۔
غرضے کہ اس بات نے ایسی ترقی کہ کوئی شخص نہیں جانتا تھا کہ:
گورنمنٹ کی عملداری میں ہمارا، یا ہماری اولاد کا مذہب، قائم رہے گا۔" (ص ۸۱۸۔ **حیاتِ جاوید**)

"پادری صاحب، وعظ میں صرف انجیلِ مقدس ہی کے بیان پر، اِکتفا نہیں کرتے تھے
بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں اور مقدس مقاموں کو بہت برائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے۔
جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچتی تھی۔
اور ہماری گورنمنٹ سے ناراضی کا بیج، لوگوں کے دلوں میں بویا جاتا تھا۔
مشنری اسکول، بہت جاری ہوئے اور ان میں مذہبی تعلیم، شروع ہوئی۔
سب لوگ کہتے تھے کہ سرکار کی طرف سے ہیں۔
بعض اضلاع میں بہت بڑے بڑے عالی قدر حُکام متعہد، اِن اسکولوں میں جاتے تھے
اور لوگوں کو، ان میں داخل اور شامل ہونے کی ترغیب، دیتے تھے۔
امتحان، مذہبی کتابوں میں لیا جاتا تھا اور طالب علموں سے، جو کم عمر لڑکے ہوتے تھے
پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون ہے؟ تمہارا نجات دینے والا کون؟
اور وہ، عیسائی مذہب کے مطابق، جواب، دیتے تھے، اس پر، ان کو انعام ملتا تھا۔
ان سب باتوں سے رعایا کا دل، ہماری گورنمنٹ سے پھر جاتا تھا۔"

(ص ۸۱۹۔ حیاتِ جاوید)

"دیہاتی مکتبوں کے مقرر ہونے سے، سب لوگ، یقین سے سمجھتے تھے کہ:
صرف عیسائی بنانے کو یہ مکتب، جاری ہوئے ہیں۔
پرگنہ وزیٹر اور ڈپٹی انسپکٹر، جو ہر گاؤں اور قصبہ میں لوگوں کو نصیحت کرتے پھرتے تھے کہ
لڑکوں کو مکتبوں میں داخل کرو۔ ہر ہر گانو میں کالا پادری، ان کا نام تھا۔ جس گانو میں پرگنہ وزیٹر
یا۔ ڈپٹی انسپکٹر پہنچا اور گنواروں نے آپس میں چرچا کیا کہ: **کالا پادری آیا۔"**

(ص ۸۱۹۔ حیاتِ جاوید)

"دفعۃً، پیش گاہ گورنمنٹ سے اِشتہار، جاری ہوا کہ:

جو شخص، مدرسے کا تعلیم یافتہ ہوگا اور فلاں فلاں علوم اور زبان انگریزی میں امتحان دے کر
سند یافتہ ہوگا، وہ، نوکری میں سب سے مقدم سمجھا جائے گا۔
چھوٹی چھوٹی نوکریاں بھی ڈپٹی انسپکٹروں کے سرٹیفکیٹ پر
جن کو ابھی تک، سب لوگ "کالا پادری" سمجھتے تھے، منحصر ہوگئیں۔
اور ان غلط خیالات کے سبب، لوگوں کے دلوں پر ایک غم کا بوجھ پڑ گیا۔"

(ص ۸۲۱۔ **حیاتِ جاوید**)

"یہ سب خرابیاں، لوگوں کے دلوں میں ہو رہی تھیں کہ:
دفعۃً ۱۸۵۵ء میں پادری اے ایڈمنڈ نے دارُ الامارت، کلکتہ سے
عموماً اور خصوصاً، سرکاری معزز لوگوں کے پاس، چھٹیات بھیجیں، جن کا مطلب، یہ تھا کہ:
"اب، تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی ہے۔ تار برقی سے، سب جگہ کی خبر
ایک ہوگئی ہے۔ ریلوے سڑک سے، سب جگہ، آمد و رفت ایک ہوگئی۔
مذہب بھی ایک چاہیے، اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی، ایک مذہب ہو جاؤ۔
سچ کہتا ہوں کہ ان چھٹیات کے آنے کے بعد، خوف کے مارے
سب کی آنکھوں میں اندھیرا آ گیا۔ پانو تلے کی مٹی، نکل گئی۔
سب کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانی، جس وقت کے منتظر تھے، وہ وقت، اب آ گیا۔
اب جتنے سرکاری نوکر ہیں، اول، ان کو، کرسٹان، ہونا پڑے گا اور پھر تمام رعیت کو۔
سب لوگ، بے شک سمجھتے تھے کہ یہ چھٹیاں، گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں۔"

(ص ۸۲۱ و ۸۲۲۔ حیاتِ جاوید)

"ان سب باتوں سے مسلمان، بہ نسبت ہنود کے، بہت زیادہ، ناراض تھے۔
اس کا سبب یہ ہے کہ ہندو، اپنے مذہب کے اَحکام، بطور رسم و رواج کے، ادا کرتے تھے
نہ بطور احکام مذہب کے۔ ان کو اپنے مذہب کے احکام اور عقائد اور وہ دلی اور اعتقادی باتیں
جن پر نجات، عاقبت کی، موافق ان کے مذہب کے، منحصر ہے
مطلق، معلوم نہیں ہیں اور نہ ان کے برتاؤ میں ہیں۔
اس سبب سے، وہ اپنے مذہب میں نہایت سست اور بجز، ان رسمی باتوں کے

اور کھانے پینے کے پرہیز کے، اور کسی مذہبی عقیدے میں پختہ اور متعصّب نہیں۔
ان کے سامنے، ان سے، اس عقیدے کے، جس کا دل میں اعتقاد چاہیے
برخلاف باتیں ہوا کریں، ان کو کچھ غصہ، یا۔ رنج نہیں آتا۔
برخلاف مسلمانوں کے کہ وہ اپنے مذہب کے عقائد کے بموجب، جو باتیں کہ:
ان کے مذہب میں نجات دینے والی اور عذاب میں ڈالنے والی ہیں، بخوبی جانتے ہیں۔
اور ان کے احکام کو مذہبی احکام اور خدا کی طرف کے احکام سمجھ کر کرتے ہیں۔
اس سبب سے اپنے مذہب میں پختہ اور متعصّب ہیں۔
ان وجوہات سے مسلمان، زیادہ تر، ناراض تھے۔
اور ہندوؤں کی بہ نسبت، زیادہ تر فساد میں ان کا شریک ہونا، قرینِ قیاس تھا۔ چنانچہ، یہی ہوا۔"

(ص۸۲۲ وص۸۲۳۔ "**اسبابِ بغاوتِ ہند**" از سرسید۔ مشمولہ "**حیاتِ جاوید**"۔ از خواجہ الطاف حسین حالی۔
مطبوعہ: قومی کونسل برائے فروغِ اردو۔ نئی دہلی۔ طبع پنجم ۲۰۰۴ء)

انقلابِ ۱۸۵۷ء کے چھوٹے بڑے بہت سے اسباب و وجوہ ہیں۔
جن میں سے کچھ، سرسید نے بیان کر دیے ہیں۔ یہ انقلاب اپنے مقصد میں ناکام کیوں ہوا؟
اور اس وقت کے انقلابیوں کی کوشش، کامیاب کیوں نہ ہو سکی؟
یہ ایک اہم سوال ہے، جس کا جواب، تلاش کرنے کی کوشش، مندرجہ ذیل تحریر میں کی گئی ہے:
مسٹر ایڈورڈ ٹامسن کی انقلابِ ۱۸۵۷ء کے موضوع پر لکھی گئی کتاب The other side of the Medal کے اردو ترجمہ
بنام "**تصویر کا دوسرا رُخ**" از شیخ حسام الدین۔ میونسپل کمشنر، امرت سر۔ پنجاب
مطبوعہ: اردو اکیڈمی، لاہور۔ طبعِ دوم فروری ۱۹۴۷ء کے دیباچہ میں
عبدالرحیم خاں پوپلزئی، پشاور لکھتے ہیں:
"اِس سلسلے میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ:
میں اُن چیزوں کو بھی واضح کر دوں، جن کو عام طور پر ناکامی کے اسباب میں شمار کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اُن کی روشنی میں غور و خوض کر لینے کے بعد، اصل بھید کا سُراغ، لگ سکے۔
کیوں کہ بعض دفعہ، آثار و قرائن کے ذیل میں قطعی دلائل کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔

بہر حال! تحقیقی ذِمّہ داری سے قطعِ نظر کر کے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ:
۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے اسباب، حسبِ ذیل ہیں:

(۱) ہندوستانی ریاستوں نے ہندوستانیوں کا ساتھ، نہیں دیا۔
(۲) جنگی رقبوں کی عام سِول آبادی نے، اس میں حصہ نہیں لیا۔
(۳) انگریزوں کے خلاف، عام طبقہ میں کوئی پروپگینڈا نہیں کیا گیا۔
اور نہ ہی عام سطح پر، جنگِ آزادی کی کوئی تحریک تھی۔
(۴) جدید اسلحہ اور سامانِ جنگ سے ہندوستانی، مسلّح نہیں تھے۔
(۵) "**ایسٹ انڈیا کمپنی**" نے ملک کی دولت پر قبضہ کر کے، اس کو، کنگال کر دیا تھا۔
(۶) جنگجو ہندوستانیوں کی جماعت میں ایسے بااثر لوگ بھی موجود تھے
جو اپنی اَغراض کے ماتحت، انگریزوں کے ساتھ، در پردہ، ساز باز کر چکے تھے۔
(۷) ہندوستان کی بری و بحری حُدود میں امن تھا اور انگریز، مکمل طور پر، وہاں، قابض تھے۔
صرف پشاور میں دوسو (۲۰۰) فوجیوں کو بغاوت کے الزام میں سخت سزائیں دی گئی تھیں، لیکن، اس سے عام سِول آدمی میں کوئی خاص اثر، پیدا نہیں ہوا تھا۔
(۸) عام لوگ، اُس وقت، شخصی حکومتوں سے تنگ آ چکے تھے۔ اور ان کے سامنے اِس قسم کا کوئی ایسا پروگرام نہیں رکھا گیا تھا، جس کی رُو سے، یہ اطمینان ہوتا کہ:
انگریزوں کی غلامی سے نجات، حاصل کر لینے کے بعد
کوئی ایسی حکومت، قائم کی جائے گی، جو ہندوستان کے مشترکہ مفاد کی محافظت
اور عام طبقہ کی صحیح نمائندگی کر سکے گی۔
(۹) ملک کے اندر، پھوٹ اور اختلاف پیدا کرنے کے لئے خطرناک ریشہ دوانیاں کام کر رہی تھیں۔ اِس وجہ سے ہندوستانیوں میں فرقہ وارانہ حقوق و مفادات
اور فوجی جھگڑوں نے افسوسناک صورتِ حال، پیدا کر دی تھی۔
(۱۰) ذرائعِ نقل و حرکت اور سلسلۂ خبر رسانی پر، انگریزوں کا، کامل قبضہ تھا۔
اور اس کے ساتھ، پریس پر بھی پورا اِقتدار تھا۔
(۱۱) اگرچہ، یہ کہا جاتا ہے کہ اکیس (۲۱) چھاؤنیاں، جنگ کی نذر ہو چکی تھیں

مگر، وہ، اِس قدر بکھری ہوئی تھیں کہ ان میں مطلقاً، کسی قسم کی باہم شیرازہ بندی نہیں تھی۔
دوسرے، سوا میرٹھ کے، کہیں بھی ہندوستانی، معقول تعداد میں شریک نہیں تھے۔
اور اگر، کہیں تھے بھی، تو ان کا، مرکزوں کے ساتھ کوئی اِتّصال نہیں تھا۔
برخلاف اس کے، انگریزوں کے مراکز، محفوظ اور مربوط تھے۔

(۱۲) ہندوستان میں تازہ دَم انگریزی فوج، انگلستان سے اُس وقت پہنچ چکی تھی
جب کہ ہندوستانی فوج کے سربرآوردہ اور محرّک قائدین، جنگ میں کام آ چکے تھے۔

(۱۳) دُوَلِ خارجہ کے سامنے، ہندوستان کی مظلومیت اور جنگ کے حقیقی اغراض کا
کوئی خاکہ، موجود نہیں تھا۔ بلکہ اس کے برخلاف، غلط پروپیگنڈے کے ذریعہ
بغاوت اور سرکشی کا الزام، ذہن نشین کرایا گیا تھا۔

(۱۴) نئے نظامِ حکومت، قائم کرنے اور ہندوستانیوں کے ملکی و مذہبی مفاد کی حفاظت کرنے
کے متعلق، حکومت نے خوشنما وعدوں سے عوام کو، لٹّو بنا دیا تھا۔

اِس تفصیل کو سامنے رکھ کر، ناظرین، حق رکھتے ہیں کہ:

وہ اس کی ہر ایک دفعہ کو تاریخی معیار سے پرکھیں۔ کیوں کہ میں نے ان کو مُدَّعیانہ حیثیت سے پیش نہیں کیا، بلکہ عام خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض چیزیں، تحقیق وتنقید کی کسوٹی پر پوری نہ اُتر سکیں، لیکن، واقعیت کے امکان سے خالی نہیں ہیں۔"

(ص ۲۲ تا ۲۴۔ "**تصویر کا دوسرا رُخ**"۔ مقدمہ بقلم عبدالرحیم خاں۔ اردو اکاڈمی۔ لاہور۔ طبعِ دوم ۱۹۴۷ء)

○○○

انگریزوں کے لرزہ خیز مظالم

گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ:
تقریباً ۱۹۲۵ء میں مسٹر ایڈورڈ ٹامسن کی ایک کتاب، شائع ہوئی جس کا نام ہے
The other side of the Medal یعنی "**تصویر کا دوسرا رُخ**"۔
اِس کتاب کا اردو ترجمہ، شیخ حُسام الدین، میونسپل کمشنر، امرت سر، پنجاب نے
تقریباً ۱۹۳۰ء میں کیا۔ اردو اکیڈمی، لاہور کا دوسرا ایڈیشن، فروری ۱۹۴۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔
جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء "تصویر کا دوسرا رُخ" لکھ کر
مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے، اُس وقت، یہ کوشش کی تھی کہ:
ہندوستانیوں اور انگریزوں کی باہمی منافرت، دور کی جائے، تا کہ ان کے درمیان
اعتماد کی ایک ایسی فضا اور ایسا ماحول بن جائے کہ متوقع خطرات کا، سدِّ باب کیا جا سکے۔
زیرِ نظر حصے میں مذکورہ کتاب کے کچھ اِقتباسات، بلا تبصرہ، نقل کیے جا رہے ہیں۔
یہ اقتباسات، انگریزی مظالم اور انقلابِ ۱۸۵۷ء میں ہونے والے مظالم کی داستان
اپنے آپ، بیان کرتے چلے جائیں گے۔

مسٹر نکلسن (Nicholson) اپنے ایک خط
بنام مسٹر ایڈورڈز (Edwards) میں لکھتا ہے:
"دہلی میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کے خلاف
ہمیں ایک ایسا قانون، پاس کرنا چاہیے، جس کی رُو سے ہم، ان کو، زندہ ہی جلا سکیں۔
یا زندہ، ان کی کھال اتار سکیں۔ یا گرم سلاخوں سے اذیت دے کر، ان کو فنا کے گھاٹ، اُتار سکیں۔
ایسے ظالموں کو محض پھانسی کی سزا سے ہلاک کر دینے کا خیال ہی مجھے دیوانہ کیے دیتا ہے۔
میری، یہ دلی خواہش ہے کہ کاش، میں دنیا کے کسی ایسے گمنام گوشے میں چلا جاؤں
جہاں، مجھے، یہ حق، حاصل ہو کہ میں حسبِ ضرورت، سنگین انتقام لے کر، دل کی بھڑاس، نکال سکوں۔"

(ص۶۱۔تصویر کا دوسرا رُخ)Kaye,Book VI. ch.1

ایک پادری کی بیوہ، ہندوستانیوں کو دی جانے والی وحشت ناک اذیت سے لطف اندوزی کی تصویر، اِس طرح، پیش کرتی ہے:

''لڑائی کے اِختتام پر، بہت سے قیدیوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔
اور یہ معلوم کرنے پر کہ اِس قسم کی موت کی وہ کوئی خاص پرواہ نہیں کرتے
ان میں سے چار آدمیوں کو فوجی عدالت کے حکم سے توپوں سے باندھ کر اُڑا دیا گیا۔
چنانچہ، ایک روز ایک توپ کے بہت بڑے دھماکے کی آواز سے ہم، چونک پڑے۔
جس کے ساتھ ہی ایک ناقابلِ بیان، دھیمی، مگر وحشت ناک چیخ بھی سنائی دی۔
دریافت کرنے پر ایک افسر نے ہمیں بتایا کہ:
یہ ایک نہایت ہی کرب انگیز نظارہ تھا۔ یعنی ایک توپ میں اتفاق سے بارود، زیادہ بھرا ہوا تھا جس کے چلائے جانے سے بدقسمت ملزم کا گوشت، ریزہ ریزہ ہوکر فضائے آسمانی میں اُڑا، اور تماشائیوں پر خون کے چھینٹے اور گوشت کے ٹکڑے گرے۔
اور اس کا سَر، ایک راہ رَو پر، اِس زور سے گرا کہ اس کو بھی چوٹ آئی۔''

(Mis Coop Land alady's ascape from
(ص۵۸۔تصویر کا دوسرا رُخ)gewaliar.P.233)

آئرلینڈ کا ایک جنرنلسٹ، مسٹر، ڈی لین (Delean) ایڈیٹر، ٹائمز آف انڈیا
اپنے ایک آرٹیکل میں لکھتا ہے:

''زندہ مسلمانوں کو، سُوّر کی کھال میں سینا، یا پھانسی سے پہلے، ان کے جسم پر سُوّر کی چربی مَلنا یا زندہ، آگ میں جلانا۔ یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ، بدفعلی کریں۔
ایسی مکروہ اور مُنتقمانہ حرکات کی، دنیا کی کوئی بھی تہذیب کبھی اجازت نہیں دیتی۔
ہماری گردنیں، شرم وندامت سے جھک جاتی ہیں اور یقیناً ایسی حرکات ''عیسائیت'' کے نام پر ایک بدنما دھبّہ ہیں۔ جن کا کفارہ، لازمی طور پر ہمیں بھی ایک دن، ادا کرنا پڑے گا۔
اِس قسم کی دردناک جسمانی اور دماغی سزائیں دینے کا، ہمیں، مطلقاً کوئی حق نہیں۔
اور نہ ہی ہم یورپ میں ایسی سزائیں دینے کی جرأت کر سکتے ہیں۔''

(ص۶۹۔تصویر کا دوسرا رُخ)**(Russel, Diary, II,P.43(May 1858)**

ایک پادری کی بیوی، نہایت فاتحانہ انداز میں لکھتی ہے:

''جب، بہت سے باغی، گرفتار کر کے لائے گئے، تو انھیں حکم دیا گیا کہ:
وہ گرجا کے فرش کو صاف کریں۔ مگر، باوجودیکہ یہ لوگ، اِس قسم کا کام اپنے مذہبی معتقدات کے خلاف سمجھتے تھے، پھر بھی سنگین کی نوک سے انھیں اِس حقیر کام کے کرنے پر مجبور کیا گیا۔
ان میں سے بعض آدمیوں نے نہایت پُھرتی سے اس کام کو، سَر انجام دیا۔
محض اِس خیال سے کہ شاید، پھانسی کی سزا سے بچ جائیں گے۔
لیکن، بے سود۔ کیوں کہ وہ سب کے سب پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔''

(ص۴۷۔تصویر کا دوسرا رُخ)**(Alady's Escape from gawaliar, P.243).**

جنرل، نیل (Neill) نے کان پور میں مامور
میجر، رینالڈ (Renaud) کو، یہ ہدایت دی:

''بعض دیہات کو، ان کی مُجرمانہ حرکات کی بنا پر عام تباہی کے لئے منتخب کر دیا گیا ہے
جہاں کی تمام، مرد آبادی کو قتل کر دینا ہوگا۔
باغی رجمنٹوں کے تمام ایسے سپاہی، فی الفور، پھانسی پر لٹکا دیے جائیں
جو اپنے چال چلن کے متعلق، اطمینان بخش ثبوت، بہم نہ پہنچا سکیں۔
قصبہ فتح پور کی تمام آبادی کو محاصرہ میں لے کر، تہِ تیغ کر دیا جائے۔
کیوں کہ اس قصبہ نے بغاوت میں حصہ لیا ہے۔
باغیوں کے تمام سرغنوں، بالخصوص، فتح پور کے تمام سرغنوں کو فی الفور، پھانسی دے دی جائے۔
اور ان کے سر، کاٹ کر، وہاں کی بڑی عمارت پر لٹکا دیے جائیں۔''

(ص۵۷۔تصویر کا دوسرا رُخ)۔**Kaye, Book V chepter.ii**

''جب، تقریباً، ڈیڑھ سو باغیوں کو، اِس طرح گولیوں سے اڑا دیا گیا
تو، قتل کرنے والوں میں سے ایک شخص، غش کھا کر گر پڑا، جو ہلاک کرنے والوں میں سے سب سے بوڑھا سپاہی تھا۔ اس لئے آرام کرنے کے لئے تھوڑا وقفہ دیا گیا۔
چنانچہ، اس کے بعد، قتل کی کارروائی کو، دوبارہ، شروع کیا گیا۔

اور جب تعداد، دوسوسینتیس (**۲۳۷**) تک پہنچ گئی، تو ایک افسر نے اطلاع دی کہ:
باقی باغی، بُرج سے باہر آنے سے انکار کرتے ہیں۔
جہاں کہ وہ چند گھنٹے، عارضی طور پر پہلے سے بند کردیے گئے تھے۔
اس پر، بُرج کے دروازے کھولے گئے، تو معاً ایک نہایت ہی دردناک منظر دیکھنے میں آیا۔ جس سے، ہولو کے بلیک ہول **Holwell's Black Hole** کی تلخ یاد، دوبارہ، تازہ ہوگئی۔
یعنی، پینتالیس (۴۵) انسانوں کی مُردہ لاشیں، باہر لائی گئیں۔
جوخوف، گرمی، سفر کی صعوبت اور دَم گھٹنے کی وجہ سے ایڑیاں، رگڑ رگڑ کر، ہلاک ہوگئے تھے۔"
(ص ۹۰ و ۹۱۔ **تصویر کا دوسرا رُخ**)

محاصرہ میں لیے گئے ہندوستانیوں کی نگرانی پر مامور
سِوِل کمشنر، مسٹر گریتھ **(Greathed)** لکھتا ہے:
"دو (۲) انگریزوں کے قتل کے عوض، پانچ سو (۵۰۰) باغیوں کی جان لینا
ایک ایسا خوفناک بدلہ ہے، جو کبھی، فراموش نہ ہوسکے گا۔" (ص ۹۷۔ **تصویر کا دوسرا رُخ**)

"ایک افسر، جو، ریناڈ **(Renaud)** کے دستے کے ساتھ، متعین تھا
بتاتا ہے کہ ہندوستانیوں کو، اِس کثرت کے ساتھ، پھانسی پر لٹکایا گیا، جو، بیان سے باہر ہے۔
دو (۲) دن کے اندر، بیالیس (42) آدمیوں کو سڑک کے کنارے پر پھانسی دی گئی۔
اور، بارہ (12) آدمیوں کو، تو صرف اِس جرم پر پھانسی کی سزا ملی کہ:
جب فوج، مارچ کرتی ہوئی، ان کے سامنے سے گذری
تو ان کے چہرے، دوسری طرف کیوں تھے؟
جہاں جہاں فوج نے پڑاؤ کیے، وہاں پر قُرب و جوار کے تمام دیہات، جلے ہوئے تھے۔
Russel, Dairy.P.221,222۔ (ص ۹۸۔ **تصویر کا دوسرا رُخ**)

"ایک طرف تو فوجی قانون کے نفاذ کا اعلان کردیا گیا۔
اور دوسری طرف، مجلسِ وضعِ آئین وقوانین نے مئی اور جون میں نہایت خوفناک قوانین پاس کیے، جن پر پوری سرگرمی سے عمل کیا گیا اور فوجیوں اور سِوِل افسران نے خونیں عدالتیں

قائم کرکے ہندوستانیوں کو بے دریغ، موت کے گھاٹ، اتارنا شروع کردیا۔
بلکہ بعض حالات میں تو بغیر نام نہاد عدالت کے حکم سے بھی
پھانسیاں دی گئیں، جن میں مرد و عورت کی کوئی تمیز، رَوا نہ رکھی گئی۔
بایں ہمہ، خوں ریزی کی آگ، دن بہ دن اور بھڑکتی گئی۔ چنانچہ، آج بھی پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں گورنمنٹ ہند کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں، جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ:
باغیوں کے علاوہ، عام آبادی میں سے عورتوں، مردوں، بچوں
اور بوڑھوں تک کو بھی پھانسی کے تختوں پر لٹکایا گیا۔
نہ صرف، سولی پر، اِکتفا کیا گیا، بلکہ دیہات میں ان کو اپنے مکانوں میں بند کرکے آگ میں جلا کر خاکستر کردیا گیا۔ اور شاذ و نادر ہی کسی ایک کو گولی سے مارنے کی تکلیف کی گئی ہو۔
انگریزوں نے، نہ صرف اِس قسم کی خوفناک سزاؤں کا فخریہ اظہار کیا
بلکہ خود اپنی یادداشتوں میں ان دردناک واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:
"ہم نے حتی الامکان، کسی ذی روح آبادی کو، زندہ نہیں رہنے دیا۔
یہاں تک کہ ان سیاہ فام انسانوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے نظاروں سے
اپنی خوں آشامی کی پیاس بجھا کر، لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔"
Kaye, Book v, Chepter.ii (ص ۱۰۳ و ۱۰۴۔ **تصویر کا دوسرا رُخ**)

"ایک موقع پر چند نوجوان لڑکوں کو، محض، اِس بِنا پر پھانسی کی سزا دی گئی کہ انھوں نے غالباً، تفنُّنِ طبع کے طور پر، باغیوں کی جھنڈیاں اٹھائے ہوئے بازاروں میں منادی کرادی تھی۔
سزائے موت دینے والی عدالت کے ایک افسر نے، پُرنم آنکھوں سے
کمانڈنگ افسر کے پاس جا کر درخواست کی کہ:
ان نابالغ مجرموں پر رحم کرکے پھانسی کی سزا کو تبدیل کردیا جائے۔ لیکن، بے سود۔
اِس تمام سلسلے میں بے شمار ایسے واقعات ملیں گے، جن میں اِس قسم کی نمائشی عدالتوں سے بھی گریز کیا گیا اور بے گناہ انسانوں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔
پھانسیاں دینے کے لئے رضا کارانہ ٹولیاں بنائی گئیں۔ جنھوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لئے دیہات میں دَورہ کیا۔ اِس حالت میں کہ ان کے ساتھ، پھانسی دینے کا سامان بھی

مکمل، نہ تھا اور نہ ہی کسی کو پھانسی دینے کے طریقہ سے پوری واقفیت تھی۔

چنانچہ، ان میں سے ایک ''شریف آدمی'' اپنی شاندار کامیابیوں کا
اس طرح، فخریہ اظہار کرتا تھا کہ:

ہم، پھانسی دیتے وقت، عام طور پر آم کے درخت اور ہاتھی کو استعمال کرتے تھے۔
یعنی، ملزم کو، ہاتھی پر بٹھا کر درخت کے نیچے لے جاتے تھے اور اوپر سے رَسّہ ڈال کر ہاتھی کو ہنکایا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ملزم، اس طرح تڑپتا کہ جاں کنی کی حالت میں اکثر اوقات، انگریزی کے آٹھ (8) ہندسے کی دل چسپ شکل، بن کر رہ جاتا تھا۔''

Kaye, Book v,) Chepter.ii (ص ۱۰۴ و ۱۰۵۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

''تمام جج صاحبان، رحم کے اظہار کی پالیسی کے خلاف ہیں۔ چنانچہ، تمام ایسے ملزمین جو پیش کیے گئے، تقریباً، سب کے خلاف، فردِ جرم لگادی گئی اور موت کی سزا کا حکم، دے دیا گیا۔
شہر کے ایک بلند مقام پر، جو ایک چوگوشہ سولی، نصب کی گئی ہے، جہاں پانچ اور چھ اشخاص کو روزانہ، پھانسی دی جاتی ہے، جس کے قریب ہی انگریز افسران، سگریٹوں کے کش پر کش اُڑاتے ہوئے، لاشوں کے تڑپنے کے نظاروں میں محو، دکھائی دیتے ہیں۔''

Holmes.P.386 (ص۔۱۰۸۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

''ہر، ایسے ہندوستانی کو، قطعِ نظر، اس کے کہ وہ سپاہی ہے، یا۔ اَوَدھ کا دیہاتی
بے دریغ، تہِ تیغ کیا گیا۔ یہاں تک کہ، نہ تو کوئی سوال ہی کیا جاتا تھا۔
اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی تکلّف، رَوا رکھا جاتا تھا۔
بلکہ محض، سیاہ رنگت ہی اس کے مجرم ہونے کے لئے کافی دلیل سمجھی جاتی تھی۔
اور ہلاکت کے لئے ایک رَسّہ اور درخت کی شاخ کا استعمال کیا جاتا تھا۔
اگر، یہ اشیا، مہیّا نہ ہوں، تو بندوق کی ایک گولی، بے گناہ انسان کے دماغ کو چیرتی ہوئی نکل جاتی تھی اور وہ وہیں ڈھیر ہو جاتا تھا۔''

Majerdia P.195,196 (ص۔۱۱۱۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

''ہماری فوج کے شہر میں داخل ہونے پر تمام ایسے لوگ، جو شہر کی چہار دیواری کے اندر چلتے پھرتے نظر آئے، سنگینوں سے وہیں پر ختم کر دیے گئے۔

ایسے بدقسمت انسانوں کی تعداد، بہت کافی تھی۔
آپ، اس ایک واقعہ سے بخوبی، اندازہ لگا سکتے ہیں کہ:
ایک گھر میں چالیس، یا پچاس، ایسے اشخاص، ہمارے خوف سے پناہ گزیں ہو گئے جو اگرچہ، باغی، نہ تھے، بلکہ غریب شہری تھے اور ہمارے عفو و کرم پر تکیہ لگائے ہوئے تھے۔
جن کے متعلق، میں خوشی سے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ:
وہ، سخت مایوس ہوئے۔ کیوں کہ ہم نے اسی جگہ ان کو اپنی سنگینوں سے ڈھیر کر دیا۔''

(ص ۱۱۲۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

ٹائمز آف انڈیا کا ایک رپورٹر لکھتا ہے:

''میں نے دہلی کے گمنام بازاروں میں سیر کرنا، مطلقاً، چھوڑ دیا ہے۔
کیوں کہ کل، ایک دردناک واقعہ دیکھنے میں آیا۔
جس سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔
جب ایک افسر، بیس (20) سپاہی کو لے کر شہر کی گشت کو جانے لگا تو میں بھی اس کے ہمراہ ہو لیا اور راستے میں ہم نے چودہ (14) عورتوں کو لاشوں میں لپٹے ہوئے بازار میں پڑا، پایا۔ جن کے سَر، دھڑوں سے ان کے خاوِندوں نے خود، جدا کر دیے تھے۔
چنانچہ، ایک عینی شاہد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ:
یہ دردناک حادثہ، اِس لئے ظہور پذیر ہوا کہ:
ان مَستورات کے خاوندوں کو، شبہ تھا کہ:
انگریز سپاہیوں کے قابو میں آ گئیں، تو وہ ان کی عصمت دری کریں گے۔
اسی لئے بحالتِ موجودہ، اپنے ناموس کے تحفظ کا یہی طریقہ مناسب سمجھا گیا۔ جس کے بعد انھوں نے خود بھی خودکشی کر لی۔
چنانچہ، ہم نے ان کے خاوندوں کی لاشوں کو بھی بعد میں دیکھا۔''

Times, Latters, Dated 19.11.57,
Mantgumary Martin (ص۔۱۱۴۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

''نادرشاہ کی تاریخی لوٹ اور قتلِ عام کے بعد، جب کہ اس نے چاندنی چوک
کی مسجد میں بیٹھ کر غارت گری کا حکم دیا تھا، ایسا دردناک نظارہ
آج سے پہلے، شاہجہاں کے دارالخلافہ نے کبھی، نہیں دیکھا تھا۔''

Times, 16.11.57(ص۱۱۴۔**تصویر کا دوسرا رُخ**)

''باغیوں کے جرائم کے مقابلہ میں ہزار گنا، زیادہ سنگین پاداش
باشندگانِ دہلی کو برداشت کرنی پڑی۔ ہزارہا مرد وعورت اور بچوں کو
بے گناہ خانماں برباد ہو کر جنگلوں اور ویرانوں کی خاک، چھاننی پڑی۔
اور جتنا مال واسباب، وہ پیچھے چھوڑ گئے، اُن سے ہمیشہ کے لئے ان کو
ہاتھ دھونے پڑے۔ کیوں کہ سپاہیوں نے گھروں کے کونے کھود کر
تمام قیمتی اشیا کو قبضہ میں کر لیا اور باقی سامان کو توڑ پھوڑ کر خراب کر دیا۔
جن کو، وہ اٹھا کر، نہیں لے جا سکتے تھے۔''

Holems, P.386(ص۱۱۶۔**تصویر کا دوسرا رُخ**)

''کئی دفعہ ایسی بے کس اور شریف عورتوں کے غول، ماتمی قافلوں کی شکل میں
دیکھنے میں آئے، جن میں سے اکثر بے چاری، بچوں کو اٹھا کر مشکل سے چل سکتی تھیں۔
اور بعض کے ساتھ، عمر رسیدہ مرد، نظر آتے تھے، جو چلتے ہوئے ٹھوکریں، کھا کھا کر گر پڑتے تھے۔''

Greathed, P.285. Letter Datted 18.9.57
(ص۱۱۶۔**تصویر کا دوسرا رُخ**)

''ایک انگریز کا خون، غصے اور انتقام سے کھولنے لگتا ہے
جب وہ کسی ہندوستانی کے ہاتھوں کسی انگریز عورت کے قتل کا واقعہ سنتا ہے۔
لیکن، ہندوستانی تاریخ یا افسانوں کو سن کر عام ہندوستانیوں کے جذبات کی کیا کیفیت ہوگی
جب وہ، اُن بے شمار معصوم اور گمنام عورتوں، بچوں، اور مردوں کے بے دریغ قتل کے حالات
پڑھتے، یا سنتے ہوں گے، جو انگریز کے بے پناہ انتقام کا نہایت سفّاکی سے شکار بنائے گئے تھے؟
یقیناً، جس طرح، ہم، اپنے ہم قوم افراد کے مقتول ہونے سے چراغ پا ہو جاتے ہیں
اُسی طرح، ہندوستانیوں کے دماغ بھی ایسے واقعات، سننے کے بعد، ضرور، متأثر ہوتے ہوں گے۔''

Kaye. Book V Chepter.ii(ص۱۱۹۔**تصویر کا دوسرا رُخ**)

**''بالخصوص، جنرل، نیل(Neill) کے حملہ کے وقت
جس بے دردی سے قتلِ عام کیا گیا، اُس کے درست، تسلیم کرنے میں کوئی عذر، نہیں ہو سکتا۔
علاوہ ازیں، مَیں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ:
الٰہ آباد میں تو بے انتہا انسانوں کو پھانسی کے تختہ پر لٹکایا گیا۔
چنانچہ، جب، جنرل نیل، ان مظالم سے فارغ ہو چکا
تو اس نے اپنے ایک میجر کو کان پور روانہ کیا تو اس نے بھی راستے میں نہایت
بے باکانہ طریقے سے لوگوں کو موت کے گھاٹ، اُتارا۔ حالاں کہ بظاہر، ان کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔
قتل و غارت کی آخری کمی، خود جنرل نیل، پوری کرتا ہے۔
جب، اُس کے حکم سے بے گناہ انسانوں کو ایسی شدید تکالیف دے کر جان سے ہلاک کیا گیا کہ
ان کے مقابلے میں ہم، ہندوستانی سنگ دلی اور بربریت کا ایک بھی واقعہ، پیش نہیں کر سکتے۔''**

Campbell, 1.P.280(ص۱۲۱۔**تصویر کا دوسرا رُخ**)

''دہلی سے باغیوں کے فرار ہو جانے کے بعد، انگریز فاتحین نے باشندوں کا قتلِ عام کیا
اور بے ضابطہ انگریزی عدالتوں کے حکم سے ہزاروں شہری، پھانسی کے تختے پر لٹکائے گئے۔
حالاں کہ ان کا بغاوت سے دور کا بھی تعلق، نہیں تھا۔'' (ص۱۲۴۔**تصویر کا دوسرا رُخ**)

مسٹر، ایڈورڈ ٹامسن، اپنی اِس کتاب ''**تصویر کا دوسرا رُخ**'' کے بابِ دوم میں
''**غدر کے اثرات**'' کے عنوان سے لکھتا ہے:

''یہاں پر میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ:
اگر چہ، میں نے مسٹر کوپر(**Cooper**) کی کتاب سے بعض سنگین واقعات نقل کیے ہیں
لیکن میں نے ان سے بھی زیادہ شدید اور رنج دِہ واقعات کو پھر بھی چھوڑ دیا ہے۔
غدر کے متعلق، تقریباً، تمام دستاویزیں، زبانِ حال سے ہماری زیادتیوں کا اعلان کرتی ہیں۔''

۱۹۲۳ء میں غدر کے حالات پر شائع شدہ، دو کتابوں میں سے ایک کا نام ہے:
''لارڈ رابرٹس کے خطوط'' **Latter of Lard Reberts**۔
اور دوسری کتاب کا نام ہے **Miss Sammerville's Wheel Treck**
ان، ہر دو کتب میں ہماری زیادتیاں، بالکل عریاں حیثیت سے ظاہر ہوئی ہیں۔

لیکن، دوسری کتاب میں، تو مِس موصوفہ کے چچا جان کے وہ خطوط بھی شامل کیے گئے ہیں
جو بے انتہا خوں ریزی کے مظہر ہیں۔'' (ص ۱۲۶۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

''حالاں کہ میں نے جنرل نیل (Neill) کے اُن کارناموں کو بالکل چھوڑ دیا ہے
جو کان پور کے خونیں حادثہ سے، بہ درجہا، زیادہ، سنگین تھے۔
نیز، ہوڈسن (Hadson) کی مشہورِ زمانہ سنگِ دلی کی کارروائی کو بھی میں نے نہیں چھیڑا۔
اگرچہ، میرے پاس، عینی شاہدوں کی دستاویزیں، موجود تھیں۔
جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بے شمار دیہات کو ایسے وقت میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا
جب کہ عورتیں، بچے اور بوڑھے، گھروں کے اندر، موجود تھے۔ لیکن، میں نے نہایت رحم دلی کی
وجہ سے ان خوفناک واقعات کو اپنی اِس کتاب سے علیحدہ، رکھا۔'' (ص ۱۲۸ و ۱۲۹۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

''یہاں پر، میں، یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ: میں نے جتنے واقعات، قلم بند کیے ہیں
اُن میں سے ایک بھی تو کسی ہندوستانی قلم، یا۔ زبان سے نکلا ہوا، نہیں ہے۔
مزید برآں، میں نے شاذ و نادر ہی کوئی ایک فقرہ ''**وحشت و بربریت کی آماج گاہ**''
یعنی اینگلو انڈین اخبارات۔ یا۔ اس سے کم درجہ پر، اپنے ملک کے اخبارات سے نقل کیا ہوگا۔
اِس لئے جو کچھ، اس وقت انھوں نے کہا، یا لکھا، وہ، ہمارے اسلاف کی طرح، اب
نابود ہو چکا ہے۔ اور موجودہ زمانہ کے لئے مناسب بھی یہی ہے کہ ان تحریرات کو بُھلا دیا جائے۔
لیکن، بدقسمتی سے، یہ تلخ اور رنج دِہ واقعات، خاموشی سے برداشت نہیں کیے جا سکتے۔
اِس لئے کہ، ایک پوری قوم کے دماغ، اِس وقت تک ان کی یاد سے آتش زیر پا ہیں۔''
(ص ۱۲۹، ۱۳۰۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

رونگٹے کھڑے کر دینے والی انگریزی درندگی کی یہ داستانیں بھی ملاحظہ فرمائیں:
میجر، تھامسن (Thamson) نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے:
''دہلی کے مسلمانوں کے قتلِ عام کی منادی کی گئی۔
حالاں کہ ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے، جن کے متعلق، ہمیں علم تھا کہ:
وہ ہماری حکومت کے خواہشمند تھے۔ مگر، ہمارے اکثر نوجوان تو محض، خون بہانے کی
خواہش پوری کرنے کے لئے اپنی ہی فوج کے ہندوستانی اَردلیوں اور پوربی گھسیاروں کو

گولی سے اُڑا دینے کی تمنا کا اعلانیہ طور پر اظہار کر چکے تھے۔''

ایک انگریز کمانڈر، لارڈ، رابرٹس (Lard Roberts)
دہلی کی ایک وحشتناک اور خوفناک منظر کشی کرتے ہوئے، بیان کرتا ہے:
''صبح کی ابتدائی روشنی میں دہلی سے کوچ کا وہ مرحلہ بڑا ہی دردناک تھا۔
لال قلعہ کے لاہوری دروازے سے نکل کر ہم، چاندنی چوک سے گذرے۔
دہلی، حقیقتہً، شہرِ خموشاں، معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے، اپنے گھوڑوں کی سُموں کی آواز کے سِوا
کوئی آواز کسی سمت سے، نہ آتی تھی۔ ایک بھی زندہ مخلوق، ہماری نظر سے نہیں گذری۔
ہر طرف، نعشیں بکھری پڑی تھیں۔ ہر نعش پر، وہ حالت، طاری تھی
جو موت کی کشمکش نے طاری کر دی تھی۔ ہر نعش، تجزیہ و تحلیل کے مختلف مراحل میں تھی۔
ہم، چپ چاپ چلے جا رہے تھے۔ یا سمجھ لیجیے کہ بے ارادہ، زیرِ لب باتیں کر رہے تھے۔
تا کہ انسانیت کی ان دردناک باقیات کی اِستراحت میں خلل، نہ پڑے۔
جن مناظر سے ہماری آنکھیں، دوچار ہوئیں، وہ بڑے ہی رنج افزا تھے۔
کہیں کوئی کتّا، کسی نعش کا، بَرہنہ عضو، بھنبھوڑ رہا ہے۔
کہیں کوئی گدھ، ہمارے قریب پہنچنے پر اپنی گھناؤنی غذا، چھوڑ کر
پھڑ پھڑاتے پروں سے ذرا، دور چلا جاتا۔ لیکن، اس کا پیٹ اتنا بھر چکا تھا کہ اُڑ نہ سکتا تھا۔
اکثر حالتوں میں مَرے ہوئے، زندہ، معلوم ہوتے تھے۔
کسی کے ہاتھ، اوپر اُٹھے ہوئے تھے، جیسے کسی کو اشارہ کر رہا ہو۔
دراصل، یہ پورا منظر، اس درجہ بھیانک تھا کہ بیان میں نہیں آ سکتا۔
معلوم ہوتا تھا کہ ہماری طرح، گھوڑوں پر بھی خوف، طاری تھا۔
اِس لئے وہ بھی، بِدک رہے تھے اور نتھنے، پُھلا رہے تھے۔
پوری فضا، ناقابلِ بیان حد تک بھیانک تھی، جو بڑی مُضر بیماری اور بدبو سے لبریز تھی۔''
(متعدد کتبِ تاریخ۔ و ص ۲۰۲، ۲۰۳۔ ۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی! واقعات و حقائق۔
مؤلّفہ: میاں محمد شفیع۔ اَریب پبلکیشنز، پٹودی ہاؤس، نئی دہلی۔)

ایک انگریز فوجی افسر، ہنری کوٹن (Henry Cotton) بیان کرتا ہے کہ:

’’دہلی دروازہ سے پشاور تک، گرینڈ ٹرنک روڈ کے دونوں ہی جانب
شاید ہی کوئی خوش قسمت درخت ہوگا، جس پر انقلابِ ۱۸۵۷ء کے رَدِّ عمل
اور اسے کچلنے کے لئے ہم نے، ایک، یا۔ دو عالمِ دین کو پھانسی پر، نہ لٹکایا ہو۔
ایک اندازہ کے مطابق، تقریباً، بائیس ہزار علما کو پھانسی دی گئی۔‘‘
’’مسلمان مجاہدین‘ کے نام سے لکھی گئی اپنی کتاب میں
ایک غیر مسلم مؤرخ لکھتا ہے:
’’ایک اندازہ کے مطابق، ۱۸۵۷ء میں
پانچ لاکھ مسلمانوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ جو بھی معزّز مسلمان، انگریزوں
کے ہاتھ لگ گیا، اُس کو ہاتھی پر بٹھایا گیا اور درخت کے نیچے لے گئے۔
اُس کی گردن میں پھندا ڈال کر ہاتھی کو آگے بڑھایا گیا۔
لاشیں، پھندے میں جھول گئیں۔ آنکھیں، اُبل پڑیں۔
زبان، منہ سے باہر نکل آئی۔‘‘

○○○

انقلابِ ۱۸۵۷ء کے اوّلین سرپرست

مفتی صدرُ الدین، آزردہ، دہلوی

مفتی صدرُ الدین، آزردہ، دہلوی، صدرُ الصُّد ورِ دہلی

(متولد ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء۔ متوفی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) فرزندِ مولوی لطف اللہ، کشمیری
ایک طرف، علومِ اسلامیہ میں حضرت شاہ رفیع الدین، دہلوی (متوفی ۶/شوال ۱۲۳۳ھ/
۹/اگست ۱۸۱۸ء) وحضرت شاہ عبدالقادر، دہلوی (متوفی ۱۹/رجب ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء)
وحضرت شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی (متوفی ۷/شوال ۱۲۳۹ھ/جون ۱۸۲۴ء) کے۔
اور دوسری جانب، علومِ عقلیہ میں حضرت علاّمہ فضل امام، خیر آبادی
صدرُ الصُّد ورِ دہلی (متوفی ۱۲۴۴ھ/۲۹۔۱۸۲۸ء) کے شاگردِ رشید تھے۔
درس وتدریس، شعروشاعری کے علاوہ، اِفتا وفصلِ مقدمات وشرکتِ مجالسِ اَحباب ومتعلقین
وسَیرِ باغات وزیارتِ قبورِ صالحین وبزرگانِ دین، مفتی آزردہ کے خاص مشاغل تھے۔
طلبہ وغُربا ومساکین کی غم گساری ودستگیری، فرمایا کرتے تھے۔
۱۸۲۷ء سے ۱۸۵۷ء تک، دہلی کے صدر امین اور صدرُ الصُّد ور، رہے۔
آپ کا دولت کدہ، اُس وقت کے اکابر علُما وفُضَلا وَ اُدَبا وشُعَرا کا مرکز تھا۔
انیسویں صدی عیسوی کے نصفِ اول میں دلی کے اندر، علم وحکمت کے
دو، ایسے دریا، رَواں تھے اور منقولات ومعقولات کی، دو، ایسی درسگاہیں، آراستہ تھیں
جن سے اِکتسابِ فیض کرنے والے طلبہ، اپنے عہد وعصر کے ممتاز ومتبحر علُمائے دین، بن گئے۔
اور سارے ہندوستان میں ان کے فضل وکمال کا طوطی بولنے لگا۔ دلی کی ان دو بڑی درسگاہوں
کے مسند نشیں، حضرت شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) اور علاّمہ فضلِ امام
خیر آبادی (متوفی ۱۲۴۴ھ/۲۹۔۱۸۲۸ء) تھے۔ جن کے دینی وعلمی فیض کا دریا
عہد بہ عہد وسلسلہ بہ سلسلہ، آج بھی پورے برصغیر ہندوپاک میں جاری ہے۔

علم وفضل وکمال کے انھیں دوسرچشموں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی
(متوفی ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء) سابق لائبریرین مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ لکھتے ہیں:

’’علمی قابلیت کا اندازہ تو اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ:
ایک جانب، شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کا ڈنکا منقولات میں بج رہا تھا۔
اور دوسری طرف، اسی دہلی میں مولانا فضلِ امام کے معقولات کا سکّہ، چل رہا تھا۔
طلبہ، دونوں دریاؤں سے سیراب ہوتے تھے۔
مفتی صدرُالدین، آزردہ اور علاّمہ فضلِ حق وغیرہُما بھی دوسرے طلبہ کی طرح
حدیث ایک جگہ پڑھتے تھے اور منطق وفلسفہ، دوسری جگہ......

(ص۱۳۸۔ ’’**باغی ہندوستان**‘‘ مرتَّبہ: عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی۔
مطبوعہ: المجمع الاسلامی مبارک پور۔ ضلع اعظم گڈھ، یوپی، انڈیا۔ ۱۹۸۵ء)

اور دہلی کی مجالسِ شعروادب کے سخنورانِ باکمال کا ذکر کرتے ہوئے
حکیم عبدالحیٔ، رائے بریلوی (متوفی ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء) لکھتے ہیں:

’’بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر، مولوی امام بخش صہبائی، علاّمہ عبداللہ خاں علوی، حکیم مومن خاں مومن، مفتی صدرالدین خاں آزردہ، مرزا اسداللہ خاں غالب، نواب ضیاءالدین خاں نیر، شاہ نصیرالدین نصیر، شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم آغاجان عیش، حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان، میر حسن تسکین۔
اور خدا جانے کتنے سخنورانِ باکمال کا جمگھٹا تھا۔
جب، یہ لوگ ایک جگہ، جمع ہوتے ہوں گے، تو آسمان کو بھی زمین پر، رَشک آتا ہوگا۔‘‘

(ص۳۱۲۔ **گلِ رعنا**۔ از حکیم عبدالحیٔ، رائے بریلوی۔ مطبوعہ: دارُالمصنّفین، اعظم گڑھ)

سرسید احمد خاں (متوفی ذوالقعدہ ۱۳۱۵ھ/ مارچ ۱۸۹۸ء) نے بڑے والہانہ انداز میں
حضرت مفتی صدرالدین، آزردہ کا ذکر اور تعارف، اس طرح، تحریر کیا ہے کہ:

’’اَکملِ کُملاے روزگار، افضلِ فُضَلائے ہر دیار، حاکم محاکمِ جاہ وجلال، مُتّکیِ ارایکِ اقبال کلیدِ درِ دائرۂ علم، لوحِ طلسمِ حلم، عالمِ محقق تجرید، مدقق سرجملہ عُلماے متاٴهلین، رافعِ مناقشاتِ حکما ومتکلمین، مجبول الفضل خصومات العدل بفصلِ مقدمات، مجلّیِ آئینہ ناظر صورتقدیر، نخلبندِ حدائقِ فضل وافضال، مظہرِ صفاتِ جلال وجمال، جامعِ محاسنِ صوری ومعنوی، مستجمع کمالاتِ ظاہری وباطنی کاشفِ دَقائقِ معقول ومنقول، واقفِ حقائقِ فروع واصول، تونگر صورت درویش سیرت، انسان پیکر ملک سریرت، مَرجِعِ مآربِ جہاں وجہانیاں، **مولانا ومخدومنا مفتی محمد صدرُالدین، خان بہادر۔**
قلم کو کیا طاقت کہ ان کے اوصافِ حمیدہ سے ایک حرف لکھے۔

اور زبان کو کیا یارا کہ ان کے محامدِ پسندیدہ سے ایک لفظ کہے۔
قطعِ نظر اس سے کہ اس زُبدۂ جہاں وجہانیاں کی صفات کا اِحصا، محالات سے اور کمالات کا حَصر، مرتبۂ متعسّرات سے ہے، جس وقت، قلم چاہتا ہے کہ کوئی صفت، صفات میں سے لکھے۔
یا۔ زبان، ارادہ کرتی ہے کہ کوئی مدح، مدائح میں سے کہے۔
جو کہ ہر صفت، قابلیت اوّل لکھنے کی اور مدح، لیاقت پہلے بیان کرنے کی رکھتی ہے
مدت تک یہی عقدہ بندِ زبانِ تحریر اور گرہ لسان رکھتا ہے کہ
کون سی صفت سے آغاز اور کون سی مدح سے ابتدا کرے؟

مجلس تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہمچناں در اولِ وصفِ تو ماندہ ایم

بے شائبۂ تکلّف وبے آمیزشِ مبالغہ، ایسا فاضل اور ایسا کامل کہ جامعِ فنونِ شتیٰ اور مستجمعِ علومِ بےمُنتہا ہو، اب سِوا، اس سرگروہِ عُلماے روزگار کے، بساطِ عالَم پر جلوہ گر نہیں۔‘‘

(ص۵۲۴۔ **آثارُالصّنادید**۔ از سرسید۔ مطبوعہ: اردو اکاڈمی، دہلی۔ ۲۰۰۰ء)

مزید لکھا ہے کہ:

’’راہِ حق میں تیزرَو اور مسلکِ دنیا میں کاہل کوش
لیکن، تونگریِ ظاہری، درویشیِ معنوی کی پردہ پوش ہے۔

کسانے کہ راہِ خدا داشتند   چنیں خرقہ زیرِ قبا داشتند

اگر مولوی جامی، زندہ ہوتے، تو یہ بیت:

چو فقر اندر لباسِ شاہی آمد   بہ تدبیرِ عُبیدُ اللّٰہی آمد

سِوا، اس برگزیدۂ انفس وآفاق کے، اور کسی کی شان میں نہ کہتے۔
جو کہ اربابِ معنی پر، یہ بات ظاہر ہے کہ:
لباسِ فقر میں مصروفِ اطاعت ہونا اور گوشۂ خلوت کو واسطے، فراغتِ عبادت کے، اختیار کرنا موجبِ شہرت اور صیتِ بلند، بہ سبب کثرتِ اہلِ دنیا کے، اس شغل سے باز رکھتی ہے
لباسِ ظاہر کو اختیار کیا اور از بَس کہ اِحقاقِ حق اور فریادرسیِ عِباد اور عدل وانصاف افضلِ عبادات ہے، منصبِ صدارت کو، اپنے ذِمّہ لیا۔....
....شوکتِ ظاہری سے ان کے دربار میں دارا کو گذر نہیں اور جلالتِ باطنی سے ان کی خلوت میں فرشتے کو بار نہیں۔ باوجود، اِن مراتبِ بلند اور اس منصبِ ارجمند کے، خُلقِ محمدی اختیار کیا ہے کہ

اِفادۂ علوم اور اِفاضۂ مسائلِ دین کے وقت، ہر ادنیٰ کو اجازتِ سخن ہے۔'' الخ۔

(ص ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ **آثارُ الصَّنادید**۔ از سر سید احمد خاں)

نواب مصطفیٰ خاں، شیفتہؔ، دہلوی لکھتے ہیں:

''راقم کے ساتھ، نہایت الفت رکھتے ہیں۔
کوئی دن، ایسا نہیں جاتا کہ ان کی صحبت سے باریاب نہیں ہوتا ہوں۔
اور اس قندِ مکرّر کے باوجود بھی، روح کا تالو، حلاوت اندوز نہیں ہوتا۔
میرے نزدیک ان کی مجالست کے بغیر، جو دن گذر جائے
وہ داخلِ ایامِ عمر، نہیں۔ خُلقِ مجسّم ہیں۔''

(ص ۱۲۔ ''**گلشنِ بےخار**''۔ از نواب مصطفیٰ خاں، شیفتہؔ)

''جھگڑوں کے فیصلے کرنے پر مامور ہیں، جو منصبِ اعلیٰ ہے۔
جس کو، اہلِ فرنگ کی اصطلاح میں ''**صدرُ الصُّدور**'' کہتے ہیں۔
فی زمانہ، ان کی سلطنت میں اہلِ ہند کے لائق، اِس سے بڑا، کوئی عہدہ، نہیں ہے۔
مولانا نے، اس دنیوی کسبِ معاش کے ذریعہ کو، دینی ثواب، حاصل کرنے کا ذریعہ، بنا رکھا ہے۔ کیوں کہ ان کی تمام تر کوشش، مخلوق کی حاجت رَوائی میں صَرف ہوتی ہے۔ ان کے انصاف کی برکت، ہر خاص و عام پر مُحیط ہے۔''

(ص ۱۲۔ **گلشنِ بےخار**۔ از نواب مصطفیٰ، شیفتہؔ)

مفتی صدر الدین آزردہؔ کے آخری دَور کے ایک شاگرد
مولانا فقیر محمد، جہلمی (متوفی ذوالحجہ ۱۳۳۴ھ / اکتوبر ۱۹۱۶ء) مؤلِّفِ ''**حدائقُ الحنفیہ**'' لکھتے ہیں:

''مفتی صدر الدین خاں، صدرُ الصُّدور دہلی، تمام علوم نَحو، صَرف، منطق، حکمت، ریاضی، معانی بیان، ادب، اِنشا، فقہ، حدیث، تفسیر، وغیرہ میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اور درس دیتے تھے۔
آبا و اَجداد آپ کے، کشمیر کے اہلِ بیتِ علم وصلاح تھے، مگر، ولادت آپ کی، دہلی میں ہوئی۔
علومِ نقلیہ، فقہ، حدیث وغیرہ، شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی اور ان کے بھائیوں سے حاصل کیے اور ان کی سندیں لیں۔ اور فنونِ عقلیہ کو مولوی فضلِ امام خیرآبادی، والدِ مولوی فضلِ حق، خیرآبادی سے اَخذ کیا۔ اور شیخ محمد اسحٰق، دہلوی نے بھی آپ کو حدیث کی اجازت لکھ کر دی۔
آپ، بڑے صاحبِ وجاہت و ریاست اور اپنے زمانہ میں یگانۂ روزگار اور نادرۂ عصر تھے۔
ریاستِ درس و تدریس، خصوصاً، اِفتائے ممالکِ محروسہ مغربیہ
بلکہ شرقیہ و شمالیہ و دہلی اور امتحانِ مدارس و صدارتِ حکومتِ دیوانی، آپ پر منتہی ہوئی۔

بجز شاہِ دہلی کے، تمام اَعیان و اَکابر، عُلَما و فُضَلا، خاص دہلی اور اس کے نواح کے آپ کے مکان پر آتے تھے۔ طلبہ، واسطے تحصیلِ علم کے اور اہلِ دنیا، واسطے مشورۂ معاملات اور منشی لوگ (اِنشا پرداز) بغرضِ اصلاحِ اِنشا اور شُعَرا، واسطے، مشاعرہ کے، آتے تھے۔
اِس آخر وقت میں ایسا فاضل، بایں جامعیت اور قوتِ حافظہ و حُسنِ تحریر و متانتِ تقریر و فصاحتِ بیان اور بلاغتِ معانی کے، صاحبِ مروَّت و اخلاق اور احسان، دیکھا نہیں گیا۔''

(ص ۴۹۹۔ **حدائقُ الحنفیہ**۔ از فقیر محمد، جہلمی۔ مطبوعہ: ادبی دنیا، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی)

مزید لکھتے ہیں:

''عربی، فارسی، اردو میں نہایت عمدہ شعر کہتے تھے۔ آزردہؔ، تخلص تھا اور بمقتضا، اس کے ہمیشہ، فرطِ عشق اور وَلولۂ محبت سے آزردہ خاطر، افسردہ طبع، دیدہ گریاں، سینہ بریاں رکھتے تھے۔
اور اشعار کے پڑھنے میں، نہایت دل شگاف آواز اور لحن حزیں اور صوت درد انگیز رکھتے تھے۔ جس نے آپ کی زبان سے سخنِ موزوں سنا ہے، وہی اس کیفیت کو جانتا ہے کہ:

کیا، اِنشادِ شعر تھا، یا۔ ایجادِ سحر۔

غالبؔ و حسرتیؔ و مومنؔ وغیرہ، شُعَراے دہلی نے آپ کی مدح و تعریف میں بڑے بڑے قصائد و اشعار، تصنیف کیے ہیں۔ اور فُضَلاے زمانہ نے آپ کے تلمذ و شاگردی کو، باعثِ تفاخُر، تصور کیا ہے۔
بہت لوگ، دور دراز سے علومِ متداولہ اور فنونِ مروَّجہ، حاصل کر کے آپ کی خدمت میں آتے اور ایک دو سبق، یا کوئی مختصر کتاب پڑھ کر فراغت، حاصل کرتے اور محصِّلین و اہلِ فضیلت میں شمار کیے جاتے تھے۔''

(ص: ۵۰۰۔ **حدائق الحنفیہ**، از فقیر محمد، جہلمی۔ مطبوعہ دہلی۔ ۲۰۰۶ء)

مولانا محمد عبدالشکور (فرزندِ حکیم شیر علی صدیقی) معروف بہ مولانا **رحمٰن علی** (ولادت ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء۔ قصبہ نارہ، عُرف احمد آباد ضلع الہ آباد۔ وفات ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء)
تلمیذِ مولانا شاہ سلامتُ اللہ، کشفیؔ، بدایونی ثم کان پوری (وصال ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء) و قاری عبدالرحمٰن، پانی پتی (وصال ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء) و مولانا محمد عبدالشکور، مچھلی شہری (وصال ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۳ء) و مرید و خلیفۂ شاہ صوفی محمد حسین، الہ آبادی (وصال ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۵ء) اپنی مشہور تاریخی کتاب ''**تذکرۂ علماے ہند**'' (آغازِ تصنیف ۱۳۰۵ھ / ۸۸۔ ۱۸۸۷ء۔ واِختتام، تقریباً ۸۔ ۱۳۰۷ھ / ۹۱۔ ۱۸۹۰ء۔ طبع اول، نول کشور، لکھنؤ ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء) میں
مفتی صدر الدین آزردہؔ، دہلوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''علومِ نقلیہ کی تحصیل، شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، شاہ محمد اسحٰق سے کی۔
اور علومِ عقلیہ، مولوی فضلِ امام خیرآبادی سے حاصل کیے۔ اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے۔

مدرسہ، دارُ البقا کے اکثر طلبہ کو، جو جامع مسجد کے نیچے تھا، کھانا اور لباس دیتے تھے۔.........
موزوں طبع تھے۔ عربی فارسی اور اردو اشعار کہتے تھے۔ ان کا تخلّص، آزردہ تھا۔
دور دور کے لوگ آتے تھے اور ان سے استفادہ کرتے تھے۔
کثرتِ درس کی وجہ سے تصنیف کی طرف، کم توجہ تھی۔ رسالہ **مُنتَهىٰ المَقَال فِي شرحِ حديثِ لاتُشَدُّ الرِّحال** ۔و۔ **اَلدُّرُّ المَنضُود فِي حُكمِ امرأَةِ المَفقود**
اور بہت سے فتووں کے جوابات، ان سے یادگار ہیں۔
دو سال، فالج کے مرض میں مبتلا رہے۔ اِکیاسی (۸۱) سال کی عمر میں
بروز پنجشنبہ، ۲۴ / ربیع الاول ۱۲۸۵ھ / (۱۸۶۸ء) میں فوت ہوئے۔'' الخ۔
(ص ۲۴۷ ۔ **تذکرۂ علمائے ہند** ۔ مؤلّفہ: رحمٰن علی۔ ترجمہ اردو از پروفیسر محمد ایوب قادری (کراچی)
پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی، کراچی۔ طبعِ اول ۱۹۶۱ء)
اپنے اضافی نوٹ میں مترجِم، پروفیسر محمد ایوب قادری (متوفی نومبر ۱۹۸۳ء کراچی) لکھتے ہیں:
''دہلی میں مفتی صدرُ الدین، آزردہ کی امتیازی حیثیت تھی۔
جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں فتویٰ جہاد پر دستخط کیے۔ اس کی وجہ سے گرفتاری، عَزلِ منصب اور ضبطیِ جائداد کی نوبت پہنچی۔ چند ماہ کے بعد، رہائی ہوئی۔ نصف جائداد، وَاگذاشت ہوئی۔
عربی فارسی اور اردو، تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔
سر سید احمد، خان بہادر نے '' **آثارُ الصَّنادید** '' میں ہر زبان کا نمونۂ کلام، درج کیا ہے۔'' الخ۔
(حاشیہ ص ۲۴۸ ۔ **تذکرۂ علمائے ہند**، مترجَم ۔ مطبوعہ: کراچی ۱۹۶۱ء)
حکیم عبدالحئی، رائے بریلوی (متوفی ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۳ء) لکھتے ہیں:
مفتی صدرُ الدین، خان بہادر، عالی خاندان، والا دودمان، سرمایۂ نازشِ ہندوستان فضل وکمال اور فنونِ ادبیہ میں آپ اپنا جواب تھے۔
سرزمینِ ہند میں اس جامعیت کے دو چار ہی ایسے اشخاص ہوئے ہوں گے۔
اس کے ساتھ، مزاج دیکھو، تو خلقِ مجسّم اور لطفِ مصوّر، علم وکمال میں بقول شیفتہ:
''در فنونِ ادبیہ، ثانیِ اعشیٰ وجریرست ودر مَراتبِ حکمیہ، ثالثِ باقر ونصیر۔''
(ص ۲۲۷ ۔ **گلِ رعنا** ۔ مؤلّفہ: حکیم عبدالحئی، رائے بریلوی۔ مطبوعہ: دارالمصنّفین، اعظم گڑھ)
حضرت آزردہ، اُن چند منتخبِ روزگار ہستیوں میں سے تھے
جنھوں نے اعلیٰ درجہ کی جامع قابلیت وفضیلت سے ملک میں اپنی علمی استعداد کا سِکّہ بٹھا دیا۔
آپ اپنے زمانے کے مشاہیر علُما میں سے تھے اور نہایت قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

حکیم عبدالحئی، رائے بریلوی (متوفی ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۳ء) لکھتے ہیں:
''علُما کی مجلس ہو، تو صدر نشیں، مشاعرہ ہو، تو میرِ مجلس۔
حُکّام کے جلسوں میں مؤقّر وممتاز، بیکسوں اور محتاجوں کے ملجا و ماویٰ۔
منصبِ اعلیٰ پر فائز و حُکّام رَس ہونے کے باوجود، آپ کی طبیعت ظاہری نمائش سے کوسوں، دور تھی۔ دنیاوی آسائش کے تمام سامان بہم ہوتے ہوئے بھی سیدھی سادھی وضع سے زندگی بسر کرتے تھے۔''
(**گلِ رعنا** ۔ از حکیم عبدالحئی، رائے بریلوی۔ مطبوعہ: دارُ المصنّفین، اعظم گڑھ)
شاہجہانی جامع مسجد، دہلی سے متصل، دارُ الشفا اور دارُ البقا کی تعمیر
شاہ جہاں نے کرائی تھی، جو گردشِ ایام کا شکار ہو کر، اب معدوم ہو چکے ہیں۔
ان کے بارے میں سر سید احمد خاں (متوفی مارچ ۱۸۹۸ء) لکھتے ہیں:
''اِس مسجد کے گرد، بہت چوڑا بازار چھوڑ کر مشرقی دونوں کونوں کی طرف دو حوض، بڑے بڑے بنائے تھے۔ اب، وہ حوض، بند ہو گئے ہیں اور ان پر مکانات بن گئے ہیں۔ اور غربی، دونوں کونوں میں شمال کی طرف
دارُ الشفا تھا اور بادشاہ کی طرف سے حکیم، مقرر تھے اور بیماروں کو دوا ملتی تھی۔
اب وہ کارخانہ نہیں رہا۔ بادشاہ زادوں نے اس پر مکان بنا لیے ہیں اور رہتے ہیں۔ اور جنوب کی طرف، دارُ البقا یعنی مدرسہ ہے۔
یہ مدرسہ بھی بالکل ویران ہو گیا تھا۔ اور اکثر مکان، گر پڑے تھے۔
مولوی صدرُ الدین، خان بہادر، صدرُ الصُّدور شاہجہان آباد نے
اس مدرسے کو، بادشاہ سے لے کر آباد کیا ہے اور اکثر مکاناتِ شکستہ کی مرمّت کی ہے۔ اور بہت مستعد طالب علم، بسائے ہیں۔
یہ دونوں مکان بھی شاہجہانی ہیں۔ اور جامع مسجد کے ساتھ، تخمیناً ۱۰۶۰ ہجری، مطابق ۱۶۵۰ء میں بننے، شروع ہوئے۔'' (۲۸۳ ۔ **آثارُ الصَّنادید** ۔ از سر سید۔ مطبوعہ: اردو اکاڈمی، دہلی)
منشی ذکاءُ اللہ دہلوی (متوفی ۱۹۱۰ء) کے بیان کے مطابق، جامع مسجد دہلی کا یہ حال ہو گیا تھا کہ:
جامع مسجد، جو شہر کی کُل مسجدوں کی ناک تھی، انگریزوں نے ایسے نِکَٹا بنا دیا کہ:
سپاہ کی بیَرک، اس کو بنایا۔ اس میں پیشاب پاخانہ کرنے سے پرہیز، نہ کیا۔
سکھوں نے سُوَّر، ذبح کر کے پکائے۔ کتّے جو انگریزوں کے ساتھ تھے، وہ درگاہ شریف میں پڑے پھرتے تھے۔'' (ص ۱۶۷ ۔ **تاریخِ عروجِ عہدِ انگلشیۂ ہند** ۔ مؤلّفہ: ذکاءُ اللہ، دہلوی۔ مطبوعہ دہلی ۔ ۱۹۰۳ء)

جامع مسجد، دہلی کو مولانا مفتی آزردہ نے انگریزوں کے دوسالہ قبضہ سے نومبر ۱۸۶۳ء میں وَاگذار کرایا۔

’’مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبر آبادی (متوفی ۱۹۶۸ء) لکھتے ہیں:

’’یہ مقدس عمارت، فوجی استعمال کے کام میں آتی۔ قریباً، دوسال یہی صورت، قائم رہی۔
مسلمانانِ دہلی، فریضۂ نماز کی ادائیگی سے محروم تھے۔ جب، دہلی میں اَمّی جمی ہوگئی
تو مفتی صاحب نے عمایدِ شہر کی ہم نَوائی میں مسجد کی وَاگذاشت کی سَعی کی۔ آپ کے شُرکا میں
شاہی خاندان کے مرزا الٰہی بخش بھی تھے۔ چنانچہ، گورنمنٹ نے یہ مسجد، مسلمانوں کے حوالہ کی۔
اور مسلمان اکابرِ شہر کی ایک مختصر جماعت کی انتظامیہ کمیٹی بنا کر مسجد، اس کو تفویض کی۔
اس منتظمہ جماعت میں مفتی صاحب و مولوی اِکرام اللہ خاں وغیرہ تھے۔

(ص ۴۷ و ۴۸۔ ’’**غدر کے چند عُلما**‘‘۔ از مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی۔ مطبوعہ: دینی بکڈپو، اردو بازار، دہلی)

مفتی صدرُ الدین، آزردہ، اگر ایک طرف، جلیلُ القدر عالمِ دین اور آبروئے شہرِ دہلی تھے
تو دوسری طرف، ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔
ان کی ذات، علم و ادب کا سنگم تھی اور ان کا دولت کدہ، مرکزِ عُلما و فُضلا و اُدَبا و شُعَرا تھا۔

چنانچہ، مولانا ابو الکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء) اپنے والد ماجد، حضرت مولانا خیر الدین دہلوی (متوفی ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء) کے بیان کردہ واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

’’مفتی (صدر الدین، آزردہ) صاحب کا دیوان خانہ، دہلی کے منتخب افراد کا مرکز تھا۔
جاڑا، گرمی، برسات، کوئی موسم ہو، لیکن، شب کی مجلس، کوئی، قضا نہیں کرتا تھا۔
ہر فن کے اکابر کو وہاں ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جا سکتا تھا۔
اگر، کوئی نَو وارِد، دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے فضل و کمال کو بیک وقت دیکھ لے
تو وہ سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانہ کا رُخ کرتا۔‘‘

(ص: ۱۳۰۔ ’’**غدر کے چند علما**‘‘۔ مؤلّفہ: مفتی انتظام اللہ شہابی، مطبوعہ دہلی)

عبد الرحمٰن، پرواز اصلاحی نے اپنی کتاب میں حضرت آزردہ کی شاعرانہ عظمت و حیثیت اُجاگر کرتے ہوئے ان کے فارسی و اردو کلام کا ایک بہترین انتخاب بھی پیش کیا ہے۔
جس کی ایک جھلک، ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

’’مفتی صدرُ الدین، آزردہ، نہ صرف علومِ اسلامیہ میں دستگاہِ کامل رکھتے تھے
بلکہ شعر و سخن کے میدان میں بھی اپنے معاصرین میں ممتاز تھے۔
وہ، فقہ و حدیث و تفسیر ہی میں درجۂ اِجتہاد نہیں رکھتے تھے بلکہ اردو ریختہ میں بھی

طرزِ خاص کے مالک تھے۔
عام طور سے اگرچہ، ان کی عالمانہ اور فقیہانہ حیثیت، نمایاں رہی
لیکن، احباب اور دوستوں کی مجلسوں میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے بھی جوہر چمکے۔
عربی، فارسی اور اردو، تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔
اور اپنی قادرُ الکلامی کا لوہا، بڑے بڑے شاعرانِ گفتار سے منوالیا۔
یہی وجہ ہے کہ ان کے فضل و کمال کا جہاں، تذکرہ کیا جاتا ہے، وہاں، اردو کے بلند پایہ شاعروں میں بھی ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ جیّد عالمِ دین ہوتے ہوئے بھی ایک حسّاس اور خوش مذاق انسان تھے۔‘‘

(ص ۱۸۵۔ **مفتی صدر الدین آزردہ**۔ مؤلّفہ: پرواز اصلاحی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی۔ طبعِ اول ۱۹۷۷ء)

’’آزردہ کا مجموعۂ کلام، مرتّب صورت میں نہیں ملتا، لیکن، تذکروں میں جتنے اشعار بھی پائے جاتے ہیں، وہ ان کی شاعرانہ حیثیت، متعین کرنے کے لئے کافی ہیں۔
ان کا سرمایۂ کلام، اگرچہ، بہت مختصر اور تھوڑا ہے، لیکن، بہت وقیع اور وزن دار ہے۔
اور سب کا سب، انتخاب ہی ہے۔ وہ ان کی نسبت، اگر، یہ کہتے ہیں کہ:

جوں سرا پائے یار، آزردہ! — تیرے دیواں کا انتخاب نہیں

تو بڑی حد تک صحیح اور درست ہے۔ ان کے کلام میں شگفتگی و شادابی بھی ہے اور رَوانی و برجستگی بھی، شوخی و بانکپن بھی ہے اور نرمی و گداز بھی، شیرینی و حلاوت بھی ہے اور سادگی و پُرکاری بھی ان میں طرزِ دل بری بھی ہے اور اندازِ دل رُبائی بھی۔
ان کے اشعار، عوام و خواص، سب کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتے۔
اور ہر صاحبِ ذوق کو اپنی طرف، متوجہ کر لیتے ہیں۔
آزردہ کے یہاں، خیال کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، طرزِ ادا، عام فہم اور بے حد سادہ ہے۔
وہ بے جا اور بے روح مبالغہ کو شعر کے حق میں سَمِّ قاتل سمجھتے ہیں۔ وہ شعر میں ایسی گنجلک یا اُلٹ پھیر کو بھی مذموم سمجھتے ہیں، جو اس کی رَوانی اور موسیقی میں فرق، پیدا کردے۔
وہ، بڑے بڑے خیال کو بغیر عربی و فارسی کی اَدق تراکیب اور مشکل الفاظ کا سہارا لیے
نہایت پُر لطف اور مزے دار طریقے سے بیان کر دیتے ہیں۔ اور ان کی یہ خصوصیت اپنے تمام معاصرین میں امتیازی درجہ رکھتی ہے۔ چنانچہ، وہ خود فرماتے ہیں:

ریختہ، یہ ہے کہ جوں آیتِ محکم ہے صاف
معنیِ دور نہیں، لفظ بھی مہجور نہیں

غزل کے علاوہ، کسی دوسری صنف میں ہمیں ان کا کلام، دست یاب نہیں ہوتا۔

لیکن، ان کی غزلوں کے اشعار، سراسر، درد واثر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔
ان کے خیال میں بلندی بھی ہے اور زبان کی صفائی بھی ہے اور طہارتِ فکر بھی۔
لطافت اور پاکیزگی کا وصف، ہر غزل میں ملے گا۔ اسی لئے فرماتے ہیں:

آزردہ نے پڑھی غزل، اِک میکدے میں کل
وہ صاف ترکہ سینۂ پیرِ مُغاں نہیں

(ص ۱۸۵ و ص ۱۸۶۔ **مفتی صدرالدین آزردہؔ**۔ مؤلفہ: پرواز اصلاحی۔ مطبوعہ: نئی دہلی)

''مُغلیہ سلطنت کے آخری دَور میں ہندوستان کے اندر، فارسی کے چمنستانِ شعر میں
ویسی ہی بہار آ گئی تھی جیسی کہ عہدِ شاہجہانی اور عہدِ جہانگیری میں تھی۔
مرزا اَسد اللہ خاں غالبؔ، حکیم مومن خاں مومنؔ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ و حسرتیؔ
عبداللہ خاں علویؔ، امام بخش صہبائیؔ اور مفتی صدرُالدین، آزردہ
اِس عہد میں، نہ صرف فارسی ادب کا نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے بلکہ اعلیٰ درجہ کے سخنور بھی تھے۔
آزردہ، فارسی زبان میں کس درجہ کے شاعر تھے؟
اِس کے متعلق، صہبائیؔ جیسے نکتہ سنج اور نکتہ شناس، کہتے ہیں:

چو دیدم غالبؔ و آزردہ را، از ہند، صہبائیؔ!
بخاطر ہیچ یاد از خاکِ ایرانم نمی آید

اس دَور کے لوگوں میں شیفتہؔ کا مذاقِ شعر وسخن، بڑا مستند اور معیاری سمجھا جاتا تھا۔
وہ بھی جہاں، آزردہؔ کے فضل وکمال کا ''**گلشنِ بےخار**'' میں تذکرہ کرتے ہیں، تو کہتے ہیں:
'''خیّاطِ ازل نے قابلیت کی قبا، اِس خوبی سے ان کی زیبِ تن کی ہے اور روشن گرِ قضا وقدر نے
اِس روشن دلی اور آگاہی سے ان کا ضمیر، منوّر کیا ہے کہ ایسی فضیلت والا کوئی شاعر، ایران سے نہیں ہوا۔''
ممکن ہے شیفتہؔ کی رائے میں مبالغہ ہو اور اس میں کچھ دوستی کا پاس ولحاظ ہو۔
لیکن، جہاں تک، آزردہؔ کی فارسی شاعری کا تعلق ہے
وہ، ضرور شُعَراے ایران کے مقابل میں رکھی جاسکتی ہے۔'' (ص ۱۹۸۔ حوالۂ مذکورہ)

نمونۂ کلامِ فارسی:

آزردہؔ! زِمَن حالِ شبِ وصل چہ پُرسی؟
نَے دل، خبرم داشت، نہ از دل، خبرم بود

ooo

بایں تقویٰ، درونِ میکدہ، آزردہؔ را دیدم   صراحی در بغل، ساغر بکف، پیمانہ در پہلو

ooo

عالَم کُشتہ شد و چشمِ تو در ناز، ہُماں
صد قیامت شد و حُسنِ تو در آغاز، ہُماں

ooo

زاہد بیا و موتِ شہیدانِ عشق بیں   کیں موت را، نہ زندگیِ جاوداں، رسد

ooo

درباغ، جورِ تازہ کہ از باغباں رسد
اوَّل بہ بلبلانِ کہن آشیاں رسد

نمونۂ کلامِ اردو:

مختصر حالِ چشم و دل یہ ہے   اس کو آرام، اس کو خواب نہیں

اے دل! تمام نفع ہے، سَودَاے عشق میں   اک جان کا زیاں ہے، سو، ایسا زیاں نہیں

نہ اُٹھی بیٹھ کے خاک اپنی ترے کوچے میں   ہم، نہ یاں، دوشِ ہَوا کے بھی کبھی بار ہوئے

اُس شوخ سے مربوط، بہت سہل سے ہوتے   گر، ہم بھی سُبک حرکت و نااہل سے ہوتے

دل نے ملا دیں خاک میں سب وضع داریاں   جوں جوں رُکے وہ ملنے سے، ہم بیشتر ملے

کٹتی کسی طرح سے نہیں یہ شبِ فراق   شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

آزردہؔ، مَر کے کوچۂ جاناں میں رہ گئے   دی تھی دعا یہ کس نے کہ جنت میں گھر ملے

فلک نے بھی سیکھے ہیں تیرے سے طَور   کہ اپنے کیے پر پشیماں نہیں

یہ عمر اور عشق؟ ہے آزردہؔ! جاے شرم   حضرت! یہ باتیں پھبتی ہیں عہدِ شباب میں

کامل، اِس فرقۂ زُہّاد سے اُٹّھا نہ کوئی　　کچھ ہوئے تو یہی رِندانِ قدح خوار ہوئے

کچھ تعجب نہیں گر، اَب کے فلک ٹوٹ پڑے　　آج، نالے جو کوئی اور بھی دو چار ہوئے

جو کچھ نہ دیکھا تھا، سو وہ دیکھنا پڑا　　اس بے وفا سے، پہلے تھے، کیا دیکھ کر ملے؟

عالَم، خراب ہے، نہ نکلنے سے آپ کے　　نکلو تو دیکھو خاک میں، کیا گھر کے گھر ملے

ذکرِ وفا وہ سنتے ہی محفل سے اٹھ گئے　　کچھ گفتگو ہی ٹھیک نہ تھی ایسے باب میں

کاش! مقبول ہو دُعاے عدُو　　کیا کروں، وہ بھی مُستجاب نہیں

مَر کر بھی ہمارا دلِ بے تاب نہ ٹھہرا　　کُشتہ بھی ہوا تو بھی یہ سیماب نہ ٹھہرا

نہ دیکھا ہو جو کسی نے حُباب میں دریا　　وہ دیکھ لے مری چشمِ پُر آب میں دریا

محتسب آئے تو نقشہ، تری آنکھوں کا دکھائے　　منہ میں ٹپکاؤں، دَمِ غش، مئے گلنار کی بوند

اس در دِجُدائی سے کہیں جاں نہ نکل جائے　　آزردہ! مِرے حق میں ذرا تو بھی دعا کر

ہو نہ دامن گیر کوئی، جان کر قاتل تجھے　　تو بھی روتا چل، جنازے کو ہمارے دیکھ کر

آمد آمد ہوئی پھر موسمِ گل کی شاید　　ان دنوں چاک کو پاتے ہیں، گریبان سے اُنس

عکس، دنداں کا پڑے، تیرے اگر پانی میں　　آب ہو جائے خجالت سے گہر پانی میں

ناصح! یہاں یہ فکر ہے، سینہ بھی چاک ہو　　ہے فکرِ بخیہ تجھ کو، گریباں کے چاک میں

گیا کون ہے صَید اَفگن اِدھر سے　　کہ خالی پڑے آشیانے بہت ہیں

وہ اور وعدہ وصل کا؟ قاصد! نہیں نہیں　　سچ سچ بتا، یہ لفظ انہیں کی زباں کے ہیں؟

کیا عقل، محتسب کی کہ لایا ہے کھینچ کر　　سَودَازَدوں کو محکمۂ اِحتساب میں

چند غزل ہاے آزردہ:

حُسن کی شان سے ہے، یہ، رہے مستور نہیں　　ورنہ ہوتا کبھو، یہ جلوہ، سَرِ طُور نہیں
لاکھ ہنگامۂ منصور دکھاویں دَم میں　　پَر ہم اِفشائے سَرائرِ میں ہیں مامور نہیں
چارہ اب کیا ہو، جو ہو نشتر و مرہم یکساں　　کون سا داغ ہے سینے میں، جو، نا سور نہیں
ریختہ یہ ہے کہ جوں آیتِ محکم ہے صاف　　معنیِ دور نہیں، لفظ بھی مُہجور نہیں
آستاں ہے ترے در کا وہ تجلّی پرتو　　پہنچے پاسنگ کو بھی جس کے جبلِ طور نہیں
خانۂ غیر، تجلّی کدہ ہو اور نصیب　　ہم کو جُز روزِ سیاہِ شبِ دیجور نہیں
میں ہوں اور گوشۂ طیبہ، یہ تمنا ہے اب　　خواہشِ سلطنتِ قیصر و فَغفور نہیں
کون سا دن ہے کہ خورشیدِ جہاں تابِ سحر　　خاکِ در سے ترے دریوزہ گرِ نور نہیں
محتسب کو کیا بیکار، تری آنکھوں نے　　ایک میخانہ بھی اِس دَور میں مَعمور نہیں
دامن اوس کا تو بھلا دور ہے، اے دستِ جنوں!　　کیوں ہے بیکار؟ گریباں تو مِرا دور نہیں
مدد اے پَرتوِ لُطفِ نبوی! کوئی عمل　　شمعِ تنہائیِ ظلمت کدۂ گور نہیں
پایۂ عرش بڑھانا تھا، وگر نہ یہ نام　　لوح پر عرش کی، ہوتا کبھی مَسطور نہیں
ہوں ادا نظم میں کس طرح مناقب تیرے　　سلسلہ یہ مُتَناہی ہے، وہ مَحصور نہیں

ترکِ رُوے خوش، آزردہ! محالات سے ہے
یوں خدا کی تو خدائی سے ہے، کچھ دور نہیں

....

مجھ سا بھی عشق میں ہے کوئی بدگماں نہیں　　کیا رَشک دیکھ کر مجھے رنگِ خزاں نہیں

آنکھوں سے دیکھ کر تجھے سب ماننا پڑا — کہتے تھے جو ہمیشہ، چنیں ہے چناں نہیں
اٹھ کر سحر کو سجدۂ مستانہ کے سِوا — طاعت، قبولِ خاطرِ پیرِ مغاں نہیں
افسردہ دل نہ ہو، درِ رحمت نہیں ہے بند — کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مُغاں نہیں
اے جذبِ شوق! رحم کہ مَدِّ نظر ہے یار — جاسکتی وَاں تلک، نگہِ ناتواں نہیں
کٹتی کسی طرح سے نہیں یہ شبِ فراق — شاید کہ گردشِ آج تجھے آسماں نہیں
اچھا ہُوا نکل گئی آہِ حزیں کے ساتھ — اک قہر تھی، بلا تھی، قیامت تھی، جاں نہیں
کہتا ہوں اس سے کچھ مَیں، نکلتا ہے منہ سے کچھ — کہنے کو یوں تو ہیگی زباں، اور زباں نہیں
مَہکا ہوا ہے بیتِ حَزَن دیکھنا کوئی — آیا نسیمِ مصر کا ہو، کارواں نہیں
لب ،بند ہوں، تو آتشِ سینہ کو کیا کروں؟ — تھمتا تو مجھ سے، نالۂ آتش عناں نہیں
کیا کچھ نہ کر دکھاؤں؟ پر اک دن کے واسطے — ملتا بھی ہم کو منصبِ ہفت آسماں نہیں
وہ نخلِ شاخِ خشک ہوں، میں کنجِ باغ میں — دیکھے ہے بھول کر بھی جسے باغباں نہیں
بے وقت آئے دَیر میں، کیا شورشیں کریں؟ — ہم پیر و پیرِ میکدہ بھی نوجواں نہیں

آزردہ نے پڑھی غزل، اِک میکدے میں کل
وہ صاف تر، کہ سینۂ پیرِ مغاں نہیں

نالوں سے میرے کب، تہ و بالا، جہاں نہیں — کب آسماں، زمین و زمیں، آسماں نہیں
قاتل کی چشم تر نہ ہو، یہ ضبطِ آہ دیکھ — جوں شمع سر کٹے، پہ اٹھا، یاں، دھواں نہیں
اے بلبلانِ شعلہ دَم! اک نالہ اور بھی — گم کردہ راہِ باغ ہوں، یاد آشیاں نہیں
اس بزم میں نہیں کوئی آگاہ، ورنہ کب — وَاں خندہ زیرِ لب، اِدھر اشکِ نہاں نہیں
اے دل! تمام نفع ہے سَودائے عشق میں — اِک جان کا زیاں ہے، سو، ایسا زیاں نہیں
ناز و نگہ، رَوِش، سبھی لاگو ہیں جان کے — ہے کون ادا وہ تیری کہ جو جاں ستاں نہیں
ملنا ترا یہ غیر سے، ہو بہرِ مصلحت — ہم کو تو سادگی سے تری، یہ گماں نہیں

آزردہ تک بھی کچھ نہ چلے ،اس کے رو برو
مانا کہ آپ سا کوئی، جَادو بیاں نہیں

اگر، ہم نہ تھے، غم اٹھانے کے قابل — تو کیوں ہوتے دنیا میں آنے کے قابل

کروں چاک سینہ کو، سوبار لیکن — نہیں داغِ دل یہ دکھانے کے قابل
ملیں تم سے کیوں کر؟ رہے ہی نہیں ہم — بُلانے کے قابل، نہ آنے کے قابل
چُھٹے بھی قفس سے تو کس کام کے ہیں؟ — نہیں جب چمن تک بھی جانے کے قابل
بجز اس کے تھے خاک، پہلے بھی اے چرخ! — نہ تھے خاک میں پھر مِلانے کے قابل
کیا تَرک دنیا میں جب تو یہ سمجھے — کہ دنیا نہیں، دل لگانے کے قابل
وہ آئے دَمِ نزع، کیا کہہ سکیں گے؟ — نہیں ہونٹ تک بھی، ہلانے کے قابل
خدایا! یہ رنج اور یہ ناصبوری؟ — نہ تھے ہم تو اِس آزمانے کے قابل
رہے ہم نہ کچھ ''مصطفٰی خاں'' کے غم میں — نہ فکرِ سخن، نَے پڑھانے کے قابل
نہ چھوڑیں گے ''**محبوب الٰہی**'' کے دَر کو — نہیں گو، ہم اِس آستانے کے قابل
ہمیں قید کرنے سے کیا نفع، صیّاد؟ — نہ تھے دام میں ہم تولانے کے قابل
نہ بالِ منقّش نہ پَرہائے رنگیں — نہ آوازِ خوش کے سنانے کے قابل
ہوئے ہیں وہ ناقابلوں میں شمار اَب — جنھیں مانتے تھے، زمانے کے قابل

وہ آزردہ جو خوش بیاں تھے نہیں اب
اشارے سے بھی کچھ بتانے کے قابل

اپنی کتاب کے بابِ ششم میں بعنوان ''**۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ**''
عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی لکھتے ہیں:

''انگریزوں کا تسلّط، ہندوستانیوں کی مرضی سے نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس میں بڑی حد تک مغلوں کی نااہلی اور انگریزوں کی شاطرانہ چالوں کا دخل تھا۔ جوں جوں، انگریزی اقتدار، ہندوستان پر مستحکم ہوتا گیا، ہندوستانیوں کی توہین، دل آزاری، اور ان پر، ان کے مظالم کا سلسلہ بھی بڑھتا گیا۔

حساس اور باشعور طبقے میں نفرت اور بغاوت کے جذبات ابھرنے لگے۔

حتیٰ کہ جو لوگ ''**ایسٹ انڈیا کمپنی**'' کی حکومت کی طرف سے بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز تھے وہ بھی محسوس کرنے لگے کہ مذہبی شعائر، تمدن و معاشرت اور سماجی زندگی، بری طرح، متاثر ہوتی جارہی ہے۔

نہ تو اس ملک میں ہندوستانیوں کی عزت و آبرو محفوظ ہے اور نہ ان کی جان و مال۔
نہ ان کے حقوق کا کوئی لحاظ ہے اور نہ ان کی عزتِ نفس کا۔ چنانچہ، یہی وجہ ہے کہ:

وہ، انگریزوں کے عزائم اور ان کے ناپاک منصوبوں کے خلاف، تدبیریں سوچنے لگے۔

مفتی صدرُالدین، آزردہ اور ان کے رفیقانِ خاص، مولانا فضلِ حق خیرآبادی، مولانا امام بخش

صہبائی، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، نواب ضیاء الدین نیر رخشاں

سب کے دل میں انگریزوں کے خلاف، جذبات بھڑکنے لگے۔''

(ص۲۷۔ **مفتی صدرالدین، آزردہ**۔ مؤلفہ: عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵)

''یہ صحیح ہے کہ خاص اس ہنگامہ کے دَوران، مفتی صاحب کسی محاذ پر پیش پیش، نظر نہیں آتے لیکن، جب دہلی میں مجاہدین کی آمد کی اطلاع ہوئی، تو وہ اجلاس، برخاست کر کے چلے گئے۔''

(ص۳۰۷۔ **کنز التاریخ**۔ از رضی الدین صدیقی بدایونی۔ نظامی پریس، بدایوں۔ ۱۹۰۷ء)

''مسٹر لیاس مجسٹریٹ کو بھی اجلاس، برخاست کرنا پڑا۔
یہ صاحب بہادر، اِجلاس ختم کر کے مجاہدین کی بیخ کنی میں لگ گئے۔
لیکن، مفتی صاحب، انگریزی صدرُ الصُّدور ہوتے ہوئے بھی
انگریزوں کے حامیوں کی صف میں شامل ہونے کے بجائے ۱۹؍رمضان ۱۲۷۳ھ
مطابق ۱۲؍مئی ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر کے دربار میں شامل ہوئے۔

چنانچہ، عبداللطیف خاں کا روزنامچہ، اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کی عبارت، یہ ہے:

''صبح کے وقت، جب بادشاہ کو، اصلاحِ ملکی کا خیال پیدا ہوا
میاں نظام الدین، نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر، نواب علی حسن خاں، نواب احمد علی خاں اعتمادالدّولہ، میر حامد علی خاں، نجم الدّولہ، مرزا اسداللہ خاں غالبؔ، نواب بدھن صاحب، خان جہاں خان اِرادت خاں، مفتی صدرُالدین خاں، اور کرم علی خاں، ایوانِ شاہی میں آداب، بجالانے کے لئے حاضر ہوئے۔ اور زمیں بوسی سے سرخ روئی، حاصل کی۔ اور ہر ایک نے ایک ایک، خرمہرہ، پیش کیا۔''

(ص۱۲۳۔ **۱۸۵۷ء کا روزنامچہ**۔ مرتّبہ: عبداللطیف خاں۔ مطبوعہ دہلی)

''۱۷؍جون کے دربار میں مفتی صدرُالدین خاں، بہادر، شاہ ظفر کو دیوانِ حافظؔ، دینے کے لئے آئے۔ بادشاہ نے ان سے فوجداری مقدمات، فیصلہ کرنے کا شغل، قبول کرنے کی بابت دریافت کیا۔ اگرچہ انہیں اس کی بہت آرزو تھی، لیکن، نامساعد حالات کی بنا پر معذرت کر دی۔''

(ص۱۳۸۔ **۱۸۵۷ء کا روزنامچہ**۔ مرتّبہ: عبداللطیف خاں۔ مطبوعہ دہلی)

''وہی باغی، جن کی سرتابی و سرکشی سے، ہر ایک ابنُ الوقت لرز رہا تھا۔
یہاں تک کہ خود بادشاہ کو ان کی شورہ پشتی کی شکایت تھی۔ وہ شورہ پشت، مفتی صاحب سے اِس درجہ، متاثر تھے کہ جو کام، دوسرے نہیں کرا سکتے تھے، بادشاہ کو یقین تھا کہ مفتی صاحب کرا سکتے ہیں۔
چنانچہ، حکیم احسنُ اللہ خاں کا سامان لوٹ لیا گیا
تو ۱۲؍اگست (۱۸۵۷ء) کو، بر سرِ دربار، بادشاہ نے مولوی صدرُالدین خاں سے کہا کہ:

جب تک، حکیم احسنُ اللہ خاں کا مال، جسے سپاہیوں نے لوٹ لیا ہے، واپس نہ کیا جائے گا اُس وقت تک، آپ کو، دربار میں شریک ہونے کی اجازت، نہیں دی جائے گی۔''

(ص۲۱۲۔ **روزنامچہ منشی جیون لال**۔ مطبوعہ دہلی)

مفتی صاحب میں معاملات سلجھانے کی خداداد صلاحیت تھی۔ اس درمیان میں بعض مواقع بڑے نازک آئے، لیکن، مفتی صاحب کی دانش مندی نے ان موقعوں پر معاملہ بگڑنے نہ دیا۔
عین، جنگِ آزادی کے دوران، ایک خطرناک قضیہ کھڑا ہو گیا۔
جس کو نمٹانے کے لئے ۸؍ذوالحجہ ۱۲۷۳ھ/۳۱؍جولائی ۱۸۵۷ کو بہادر شاہ ظفر نے مفتی صدرالدین صاحب کو بھیجا، جس میں وہ نہایت خوش اسلوبی سے کامیاب ہوئے۔
چنانچہ، عبداللّطیف خاں اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں:

''ایک گروہ نے قربانی کے متعلق، یہ منادِی کی ہے کہ گائے کی قربانی، ہرگز، نہ ہونے پائے۔
جب ان کی سرکشی، حد سے گذر گئی، تو تمام مسلمانوں نے ان کی تادیب کی کوشش کی۔
شاہ غلام علی، دہلوی، رَحمۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِ کے جانشین، مولانا شاہ احمد سعید (نقش بندی، مجدّدی دہلوی) جو قابلِ تعریف اور برگزیدہ ہستی ہیں، سب سے پہلے، ان مُفسِدوں سے جہاد کے لئے اٹھے اور جہاد کا جھنڈا، جامع مسجد کے سامنے، نَصب کر دیا۔ اور جہاد کی تلقین کی اور عام، دعوت دی۔
جوں ہی لوگوں نے سنا، ان کے گرد، جمع ہونے لگے۔ جامع مسجد، دہلی میں عقیدت مندوں کا جمگھٹا لگ گیا۔ اکثر نے اسی جگہ کو اپنا مسکن بنا لیا۔
اکثر دکانداروں نے انھیں خورد و نوش دینے کی ہمت کی۔ جب بادشاہ کو اس کا علم ہوا تو مفتی صدرُالدین کی زبانی، جو سنجیدہ، شگفتہ مزاج، ذی علم، بالحاظ آدمی تھے مولانا احمد سعید کے پاس، کہلا بھیجا، اور یہ شعر بھی اپنے قلم سے لکھ دیا:

رُخ مَتاب، اے یار! گر پیشِ نیاز آرَد کسے
نازنیں آں بہ کزو ہرگز، نیاز ارَد کسے

پس، مولانا نے بادشاہ کی ایما پر اپنا ارادۂ جہاد، ترک کر دیا۔''

(ص۱۵۴ و ص۱۵۵۔ **روزنامچہ عبداللّطیف خاں**۔ مطبوعہ دہلی)

روزنامچہ منشی جیون لال میں بھی مفتی صاحب کے مذکورہ واقعہ اور مذکورہ تاریخوں میں بہادر شاہ ظفر کے درباروں میں مفتی صاحب کے شریک ہونے کی تصدیق ہے۔

(ص۷۶۔ **مفتی صدرُالدین آزردہ**۔ مؤلّفہ: پرواز اصلاحی۔ مطبوعہ نئی دہلی)

''۲؍اگست (۱۸۵۷ء) آج بادشاہ، دربارِ عام میں نہایت شان و شوکت کے ساتھ، جلوہ فرما

تھے۔ مولانا امین الدین، سعادت علی خاں وکیل، فضلِ حسن خاں، ابراہیم علی خاں وکیل، اکبر علی خاں
بھی حاضرِ دربار تھے۔ جنرل سمند خاں رسالدار، غلام نبی خاں وکیل، حسن علی خاں اور مولوی صدرُالدین خاں
بھی شریکِ دربار ہوئے۔ ۱۲۶ روپے اور نَو اشرفیاں، بطور نذر، پیش ہوئیں۔
بالعموم، جنگی حالت پر بھی گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد، بادشاہ نے چند اشعار سنائے۔
جنھیں انھوں نے موزوں کیے تھے۔
یہ اشعار، جنرل بخت خاں کے پاس بھیج دیے گئے۔ ان کا مفہوم، یہ تھا:
خدا کرے کہ دین کے دشمن، تباہ ہوجائیں۔ خدا کرے، فرنگی، نیست و نابود ہوجائیں۔
قربانیاں کر کے عیدِ قرباں کا تہوار مناؤ۔ اور دشمنوں کو، تہِ تیغ کردو۔ کوئی بچنے نہ پائے۔''
(ص ٦٧ و ٧٧۔ **مفتی صدرُالدین آزردہ**۔ مؤلّفہ: پرواز اصلاحی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۲۵)
انگریزوں کے خلاف، جہاد کا فتویٰ، جس پر مفتی صدرُالدین، آزردہ، دہلوی کے دستخط ہیں
اس دستخط کے ساتھ، شَهِدتُ بِالْجَبر یا کتبتُ بِالْجَبر جیسی کوئی عبارت، نہیں تھی۔
معلوم نہیں کیسے یہ افواہ پھیل گئی کہ مفتی صاحب نے اس طرح کی کوئی عبارت لکھی تھی۔
میاں جی، سید نذیر حسین، دہلوی (متوفی دوشنبہ ۱۰/ رجب ۱۳۲۰ھ/ ۱۳/ اکتوبر ۱۹۰۲ء) کے
شاگرد اور سوانح نگار، مولانا فضلِ حسین، بہاری (متوفی ۱۹۲۰ء) لکھتے ہیں:
''زمانۂ غدر ۱۸۵۷ء میں، جب، دہلی کے بعض مقتدر اور بیش تر معمولی مولویوں نے
انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ دیا، تو میاں صاحب نے، نہ اس پر دستخط کیا نہ مہر۔ وہ خود فرماتے تھے کہ:
میاں! وہ ہُلّڑ تھا، بہادر شاہی نہ تھی۔ وہ بے چارا بوڑھا بادشاہ کیا کرتا؟
حشرات الارض خانہ براندازوں نے تمام دہلی کو خراب، ویران، تباہ اور برباد کر دیا۔
شرائطِ امارت و جہاد، بالکل مفقود تھے۔ ہم نے تو اس فتویٰ پر، دستخط نہیں کیا۔
مہر کیا کرتے؟ اور کیا لکھتے؟ مفتی صدرُالدین خاں صاحب، چکّر میں آگئے۔''
(ص ۹۳۔ **اَلْحَیَاۃُ بَعْدَ الْمَمَاۃ**۔ مؤلّفہ: فضلِ حسین، بہاری۔
الکتاب انٹرنیشنل، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵)
''یہ فتویٰ، اخبارُ الظَّفر، دہلی میں، شائع ہوا تھا۔ وہاں سے اس کی نقل
انھیں دِنوں، صادقُ الاخبار، دہلی میں مورخہ ۲۶/ جولائی ۱۸۵۷ء میں چھپی تھی۔
یہ اخبار، نیشنل آرکائیوز (دہلی) میں محفوظ ہے۔
اور اس فتویٰ کا عکس ''سوتنتر دہلی''، ہندی اور ''نوائے آزادی'' میں بھی شائع ہوچکا ہے۔
فتویٰ پر دستخط کرنے والوں میں مفتی صدرُالدین کا نام، تو ملتا ہے

لیکن، آگے پیچھے ''کتبتُ بِالْجَبر'' وغیرہ، کوئی عبارت ہی، سرے سے، نہیں ہے۔
یہ روایت، بالکل اختراعی اور مَن گھڑت ہے۔ حقیقت اور واقعیت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔
مشہور محقق، جناب امتیاز علی عرشی نے اپنے ایک مضمون (در ماہنامہ تحریک، دہلی، ماہِ اگست
۱۹۵۷ء) میں اس فتویٰ کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کا اِزالہ کر دیا ہے۔''
(ص ۸۰۔ **مفتی صدرُالدین آزردہ**۔ از پرواز اصلاحی۔ مطبوعہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی)
نواب صدیق حسن خاں، بھوپالی (متوفی ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۸۹ء) لکھتے ہیں:
مفتی صاحب کو ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) میں انگریزی فوج کے ہنگامۂ فساد میں سخت صدمہ اٹھانا
پڑا۔ تعلقِ روزگار بھی ہاتھ سے گیا۔ اور تمام جائداد و املاک بھی جو آپ نے، تیس (۳۰) سالہ ملازمت
کے دَوران، جمع کی تھی، بحقِ سرکار، ضبط ہوگئی۔ بلکہ جہاد کے فتویٰ کے الزام میں چند ماہ تک
جیل خانہ میں بھی بند، رہے۔ چوں کہ ان کا قصور، ثابت، نہ ہوسکا، اِس لئے رہا کر دیے گئے۔''
(فارسی سے ترجمہ۔ ص ۲۶۱۔ اِتْحافُ النُّبَلاء۔ مؤلّفہ: نواب صدیق حسن، بھوپالی۔ مطبع نظامی ۱۲۸۰ھ)
اس سلسلے میں مولوی ذکاءُ اللہ دہلوی (متوفی ۱۹۱۰ء) نے
ایک بات اور لکھی ہے، جو بڑی حد تک، قرینِ قیاس ہے۔ لکھتے ہیں:
''ایک طریقہ اور امیروں کے لوٹنے کا تھا۔ بعض ذی اختیار انگریز، مجرموں کو
سب طرح سے جرم سے بری ہونے کی اسناد دیتے اور ان سے خاطر خواہ روپیہ لے لیتے۔
مشہور ہے کہ نواب حامد علی خاں، مفتی صدرُالدین خاں اور مکند لال مشرا نے
اس طرح، زرِ کثیر دے کر اپنی جانیں بچائی تھیں۔''
(ص ۱۷۔ **تاریخ عروجِ عہدِ انگلشیہ**۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۰۳ء)
ممکن ہے کہ مفتی صاحب کے کسی عزیز، قریبی رشتہ دار، یا دوست نے یہ معاملہ طے کرلیا ہو۔''
(ص ۸۱۔ **مفتی صدرُالدین، آزردہ**۔ از پرواز اصلاحی۔ مکتبہ جامعہ۔ نئی دہلی۔ ۲۵)
۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے کی بات ہے، جس سے بہادر شاہ ظفر اور مغل حکومت کے ساتھ
مفتی صدرُالدین، آزردہ کی ہمدردانہ وابستگی، اچھی طرح، ظاہر ہوتی ہے۔
اور یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ مغل حکومت اور کمپنی کی حکومت کو، وہ کس نظر سے دیکھتے تھے۔
بادشاہ سلامت کے خزانہ سے مفتی صاحب کے منصب کے، دو (۲) روپے آٹھ آنے
ملتے تھے۔ محبوب علی خاں خواجہ، جب وزیر ہوا، تو اس نے بند کرا دیے۔
مفتی صاحب نے بادشاہ کے یہاں، ڈھائی روپے کا مقدمہ لڑ کر پھر جاری کرائے۔
''صاحب کمشنر بہادر، دہلی نے مفتی صاحب سے کہا کہ:

آپ کو ہماری سرکار، ہزار روپے سے اوپر دیتی ہے۔
آپ نے ڈھائی روپے کے لئے اتنی کھکھیڑ کیوں اٹھائی؟''
مفتی صاحب نے کہا:
آپ کے ہزار، بارہ سو پر، ڈھائی روپے، بھاری ہیں۔ یہ تبرک ہے۔ اس پر ہمیں فخر ہے۔''
(ص ۵۰۔ **لال قلعہ کی ایک جھلک**۔ مؤلّفہ: ناصر نذیر فراق، دہلوی۔ مطبوعہ: اردو اکاڈمی، دہلی۔ ۲۰۰۶ء)
انقلابِ ۱۸۵۷ء کے دوران، جنرل بخت خاں روہیلہ، جب چودہ ہزار انقلابیوں کی فوج لے کر
بریلی سے جون کے آخر، یا آغازِ جولائی کو دہلی پہنچا، تو علمائے دہلی کی طرف سے
انگریزوں کے خلاف ایک فتویٰ، جاری ہوا
جس پر حضرت مفتی صدرُالدین، آزردہ، دہلوی کے دستخط، موجود ہیں۔
مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبر آبادی (متوفی ۱۹۶۸ء) لکھتے ہیں:
''ہنگامۂ ۱۸۵۷ء رونما ہوا۔ مولانا فضلِ حق، الور سے دہلی آئے۔
جنرل بخت خاں نے اقتدار کا نقشہ، جما رکھا تھا۔ استفتا، مولانا (فضلِ حق) نے لکھا۔
مفتی صاحب و دیگر علما نے فتویٰ دیا۔ مگر، یہ سب تدبیریں، بے سود تھیں۔
عصبیتِ قومی، مردہ ہو چکی تھی۔ بہادر شاہ، رنگون، روانہ کیے گئے۔ ان علما پر بھی
مصائب کا پہاڑ ٹوٹا۔ مولانا فضلِ حق کو اقرارِ جرم کرنے پر، انڈمان، جانا پڑا۔''
(ص ۴۶۔ **''غدر کے چند علما''**۔ مطبوعہ: دہلی)
ایک بار، تقریباً، پچاس (۵۰) سپاہی، ۹ر اگست ۱۸۵۷ء کو
مفتی صدرُالدین، آزردہ کے مکان پر آدھمکے۔ اس کے بعد جو ہُوا، اس کے بارے میں
انگریزوں کے ایک وفادار مُخبِر، منشی جیون لال نے لکھا ہے کہ:
شدید مزاحمت کی تیاری، دیکھ کر سپاہیوں کا دَستہ،، واپس ہو گیا۔
یہ دیکھ کر کہ وہاں ستر (۷۰) جہادی، مقابلہ کے لئے تیار ہیں وہ واپس چلا گیا۔''
(**روزنامچہ منشی جیون لال**۔ مطبوعہ دہلی)
مفتی صدرُالدین، آزردہ، ۱۸۲۷ء میں دہلی کے صدر امین اور جون ۱۸۴۴ء میں
صدرُ الصُّدورِ دہلی بنائے گئے۔ اور ستمبر ۱۸۵۷ء تک، مفتی آزردہ ہی، صدرُ الصُّدورِ دہلی رہے۔
آپ کا ایک بڑا سیاسی کارنامہ، یہ ہے کہ:
انقلابِ ۱۸۵۷ء کے مجاہدِ اعظم، سالارِ جنگ، مولانا سید احمدُ اللہ شاہ، مدراسی کو
یہ مشورہ دیا کہ آپ، دہلی کی بجائے آگرہ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں۔

چنانچہ، وہ آگرہ گئے اور اپنی مہم میں انھوں نے بے پناہ کامیابی، حاصل کی۔
یہ بات تقریباً ۱۸۴۶ء کی ہے۔
مفتی آزردہ دہلوی کے تعارفی مکتوب، بنام مولانا انعام اللہ، گوپامئوی، سرکاری وکیلِ آگرہ
(متوفی ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۹ء۔ **مدفون**: درگاہِ ابوالعلا، آگرہ) نے
آگرہ میں مولانا احمدُ اللہ شاہ، مدراسی کی ساری مشکلات، آسان کر دیں۔
اور آگرہ کے اندر، کچھ دنوں بعد ہی مولانا فیض احمد، بدایونی، مولانا غلام امام شہید، مولانا مفتی
عبدالوہاب، گوپامئوی، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں، اکبر آبادی، سید محمد قاسم، داناپوری
مولانا کریم اللہ خاں، صدرُ الصُّدور، سید باقر علی، ناظمِ محکمۂ دیوانی، وغیرہ
مولانا احمدُ اللہ، مدراسی کے انقلابی خیالات کے ہم نوا بن گئے۔
مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبر آبادی (متوفی ۱۹۶۸ء) لکھتے ہیں:
مفتی انعام اللہ، خان بہادر، جو محکمۂ شریعت کے مفتی رہ چکے تھے، اب، سرکاری وکیل تھے۔
حضرت آزردہ کے خط کے ذریعہ، شاہ صاحب (مدراسی) ان کے یہاں آکر مقیم ہوئے۔
ان کا گھر، علما کا مرکز بنا ہوا تھا۔
مفتی صاحب کے صاحبزادے، مولوی اکرام اللہ خاں
صاحبِ ''تصویرُ الشُّعَرا'' مُرید ہوئے۔''
(**مولوی احمدُ اللہ شاہ اور جنگِ آزادی**۔ از مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبر آبادی)
دہلی پر، انگریزوں کے قبضہ و تسلُّط کے بعد، مفتی صدرالدین آزردہ کے خلاف، مقدمہ چلا۔
گرفتاری ہوئی اور جائداد بھی ضبط ہو گئی۔ بدِقّت تمام آپ، بری ہوئے۔
مرزا غالب، حکیم سید احمد حسن، مودودی کے نام، اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:
''مولوی صدرُالدین صاحب، بہت دن، حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ، پیش ہوا۔
روبکاریاں ہوئیں۔ آخر، صاحبانِ کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری، موقوف۔ جائداد، ضبط۔
ناچار، خستہ و تباہ حال، لاہور گئے۔ فنانشیل کمشنر اور لفٹننٹ گورنر نے
ازراہِ ترحُّم، نصف جائداد، وَاگذاشت کی۔
اب، نصف جائداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ کرایہ پر معاش کا مدار ہے۔''
(ص ۲۴۱۔ **اردوئے معلیٰ**۔ نیشنل پریس، الہ آباد۔ ۱۹۲۸ء)
مفتی صدرُالدین، آزردہ کے سیکڑوں نامی گرامی تلامذہ ہیں۔
مگر، ان کے نام و مقام اور دیگر تفصیلات کا کوئی ریکارڈ نہیں۔ جیسا کہ اس زمانے کا عام دستور تھا۔

تاہم مختلف تذکروں میں کہیں کہیں، جو نام مل جاتے ہیں، اُن میں سے چند حضرات، یہ ہیں۔

(۱) مفتی سعدُ اللہ، مراد آبادی (متولد ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء۔ متوفی ۲۴ رمضان ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء بمقام، رام پور) ابتدائی تعلیم، رام پور اور نجیب آباد میں ہوئی۔ پھر، دہلی پہنچ کر، اَخوند شیر محمد، ولایتی مولوی محمد حیات، پنجابی اور مفتی صدرُ الدین، آزردہ سے اکثر درسی کتابیں پڑھیں۔

۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء میں لکھنؤ پہنچے اور مولوی محمد اسمٰعیل، مراد آبادی و مرزا حسن علی، محدّث اور مفتی ظہور اللہ، فرنگی محلی لکھنوی سے تحصیلِ علم کیا۔ مدرسہ شاہی لکھنؤ میں مدرس ہوئے۔

پھر، انتیس (۲۹) سال تک، کچہری کوتوالی لکھنؤ میں مفتی رہے۔

حج و زیارتِ حرمین کے لئے گئے، تو شیخ جمال مکّی سے علمِ حدیث کی سند، حاصل کی۔

لکھنؤ، واپس آئے اور عہدۂ اِفتا پر، مامور ہوئے۔

پھر، نوابِ رام پور، یوسف علی خاں (متولد ۵ ربیع الآخر ۱۲۳۱ھ/ ۵ مارچ ۱۸۱۶ء۔ متوفی ۲۴ ذوالقعدہ ۱۲۸۱ھ/۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء) کی طلب پر، رام پور آئے۔

اور عہدۂ قضا و اِفتا و مرافعہ سے سرفراز ہوئے۔ نواب نے شاگردی، اختیار کی۔

رام پور ہی میں انتقال ہوا اور وہیں، تدفین ہوئی۔ تقریباً، دو درجن کتابیں آپ نے تالیف کیں۔"

(**تذکرۂ علمائے ہند**۔ مؤلّفہ: مولوی رحمٰن علی۔ مطبوعہ: لکھنؤ و کراچی)

(۲) مولانا فیض الحسن، سہارن پوری (متولد ۱۲۳۲ھ/ ۱۸۱۶ء۔ متوفی ۶ فروری ۱۸۸۷ء)

ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر اپنے والد، حافظ خلیفہ علی بخش سے حاصل کی۔

دلی آئے تو مفتی صدرُ الدین، آزردہ سے اِکتسابِ فیض کیا۔ شاہ احمد سعید، مجدّدی اور اَخوند محمد، ولایتی سے درسِ حدیث لیا۔ معقولات و ادبیات کی تعلیم، علاّمہ فضل حق خیر آبادی سے حاصل کی۔ امام بخش، صہبائی سے فنِ شاعری سیکھا۔ مومن و غالب و ذوق کی محفلوں سے استفادہ کیا۔

دہلی، سہارن پور، علی گڑھ میں دینی و علمی خدمات انجام دیں۔ اورینٹل کالج لاہور میں ۱۸۷۰ء میں صدر شعبۂ عربی و ناظم شعبۂ تحقیق و تصنیف، مقرر ہوئے۔ یہاں، کئی کتابیں آپ نے لکھیں۔

حاجی امداد اللہ، مہاجر مکی، چشتی صابری (متوفی ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء) سے بیعت و ارادت تھی۔

سید سلیمان ندوی (متوفی ۱۹۵۳ء) لکھتے ہیں کہ:

"مولانا فیض الحسن، سہارن پوری، اس پایہ کے ادیب تھے کہ:

خاکِ ہند نے صدیوں میں شاید کوئی اتنا بڑا امامُ الادب پیدا کیا ہو۔"

(**حیاتِ شبلی**۔ دارُالمصنّفین، اعظم گڑھ)

شرحِ سبعہ معلّقہ و شرحِ حماسہ، آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔

(اورینٹل کالج میگزین، لاہور۔ مئی ۱۹۶۴ء)

(۳) مولانا خیر الدین، دہلوی (متولد ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء دہلی۔ متوفی ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء کلکتہ)

مولانا ابوالکلام آزاد کے والد ماجد، مولانا خیر الدین دہلوی کی تربیت و پرورش ان کے نانا، مولانا منور الدین دہلوی (متوفی ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء) شاگردِ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی (وصال ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) نے فرمائی اور زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔

تحصیلِ علوم کی تکمیل، مفتی صدرُ الدین، آزردہ سے کی۔

مولانا خیر الدین، دہلوی کا فاتحۂ فراغ، جامع مسجد، دہلی میں جمعہ کے دن ہوا۔

مفتی صدرُ الدین، آزردہ نے سر پر پگڑی باندھی اور حضرت شاہ عبدالغنی، مجدّدی، دہلوی (متولد ۲۵ شعبان ۱۲۳۴ھ/ ۱۹ جون ۱۸۱۹ء دہلی۔ متوفی ۷ محرم ۱۲۹۶ھ/ ۳۱ دسمبر ۱۸۷۸ء۔ مدینہ منورہ۔ فرزندِ حضرت شاہ ابوسعید، مجدّدی۔ متوفی شوال ۱۲۵۰ھ/جنوری ۱۸۳۵ء) نے انھیں، مسندِ درس پر بٹھایا۔

حرمین شریفین میں شیخ محمد طاہر کُردی اور شیخ محمد مغربی سے استفادہ کیا۔ مصر و عراق کے دَورے کیے۔ مولانا خیر الدین، دہلوی نے شاہ اسمٰعیل، دہلوی کی کتاب، تقویۃُ الایمان و جلاءُ العینین کا رَد کیا۔

مولانا خیر الدین نے وہابیت کے خلاف، دس جلدوں پر مشتمل ایک کتاب "**النَّجمُ المُبین لِرَجمِ الشَّیطٰین**" کے نام سے لکھی، جس کی دو جلدیں چھپ چکی ہیں۔

مولانا منور الدین، دہلوی، تلمیذ شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی نے ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں جامع مسجد دہلی میں شاہ اسمٰعیل دہلوی سے ان کے جدید مذہبی رجحانات و خیالات کے خلاف، مباحثہ کیا۔

جس میں سارے عُلَما و مشائخِ دہلی، مولانا منور الدین، دہلوی کے حامی و ہم نوا تھے۔

مولانا خیر الدین، دہلوی نے حجازِ مقدس کی نہرِ زبیدہ کی مرمت کے لئے لاکھوں روپے کا چندہ، جمع کیا، جس کے صلے میں سلطانِ تُرکی کی طرف سے آپ کو تمغۂ مجیدی اول ملا۔

آپ ہی کی تحریک پر، ناخدا مسجد، کلکتہ کی تعمیر ہوئی۔ مسجد سلطان ٹیپو، کلکتہ کی توسیع میں بھی آپ نے حصہ لیا۔ پریل، بمبئی میں ایک مسجد تعمیر کرائی، جو **مسجد خیر الدین** کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔

کلکتہ اور ملک کے دیگر حصوں میں آپ کے ہزاروں مُریدین تھے۔

رسولِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّم کی محبت و الفت اور آپ سے والہانہ تعلق آپ کی ساری علمی و عملی کاوشوں و سرگرمیوں کا مرکز و محور تھا۔

(ملخص از **آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی**۔ مرتّبہ: عبدالرزاق، ملیح آبادی۔ مطبوعہ: دہلی)

عبدالرحمٰن پرواؔز اصلاحی نے مفتی صدرُ الدین آزردؔہ کے ممتاز تلامذہ کے عنوان سے مذکورہ تین حضرات کے علاوہ، جو نام، درج کیے ہیں، وہ، بِالتّرتیب، اِس طرح ہیں:

شیخ محمد ہادی، دہلوی (ابوالکلام آزاؔد، فرزندِ مولانا خیرالدین دہلوی کے دادا)۔ مولانا ظہورعلی خَلفِ مولوی فتح علی خان بہادر، دہلوی (متوفی ۱۲۸۶ھ)۔ مولانا نورُالحسن کاندھلوی (متولد ربیع الآخر ۱۲۲۷ھ۔ متوفی محرم ۱۲۸۵ھ) بن مولانا ابوالحسن بن مفتی الٰہی بخش، کاندھلوی۔ نواب محمد یوسف خاں والیِ رام پور (متولد ربیع الآخر ۱۲۳۱ھ/ مارچ ۱۸۱۶ء۔ متوفی ذوالقعدہ ۱۲۸۱ھ/ اپریل ۱۸۶۵ء) بن نواب محمد سعید خان بہادر۔ مولانا کریم الدین، پانی پتی (مؤلِّفِ کریمُ اللُّغات) بنِ شیخ سراج الدین پانی پتی (متولد ۱۲۳۷ھ/ ۱۸۲۱ء۔ متوفی ۱۸۶۹ء) نواب ضیاء الدین احمد نیّؔر رخشاں دہلوی (متولد ۱۸۲۱ء۔ متوفی رمضان ۱۳۰۲ھ/ جون ۱۸۸۵ء) بنِ نواب احمد بخش خاں۔ مولانا محمد مظہر، نانوتوی (متولد ۱۸۲۳ء۔ متوفی ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۴ء) بن حافظ لطف علی۔ مولانا امیر حَسَن، سَہسوانی (متولد ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۷ء۔ متوفی ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء) بنِ لیاقت علی۔ سید نذیر احمد سَہسوانی، (متولد ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۷ء۔ متوفی ۱۳۰۹ھ) خَلفِ سید آل احمد شاہ۔ قاضی محمد جمیل، بُرہان پوری، عُرف بسم اللہ بن مولوی محمد عبدالغفار، برہان پوری (متوفی ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۷ء)۔ مولانا رشید احمد، گنگوہی (متولد ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۹ء۔ متوفی ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۵ء)۔ مولانا محمد منیر، نانوتوی بنِ حافظ لطف علی۔ مولانا محمد قاسم، نانوتوی (متولد ۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۲ء۔ متوفی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) بنِ شیخ اسد علی، نانوتوی۔ نواب صدیق حسن قنوجی، بھوپالی (متولد ۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۲ء۔ متوفی ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۸۹ء) بنِ سید آلِ حسن قنوجی، بخاری۔ مولوی سمیع اللہ دہلوی (متولد ۱۸۳۴ء۔ متوفی ربیع الاول ۱۳۲۶ھ/ اپریل ۱۹۰۸ء) بن منشی عزیز اللہ، دہلوی۔ مولانا حاجی ضیاء الدین، حنفی، قادری، دہلوی بنِ داروغہ محمد بخش دہلوی۔ نواب محمد علی خاں بہادر جہانگیر آبادی دہلوی (متولد ۱۸۴۴ء۔ متوفی محرم ۱۳۱۷ھ/ مئی ۱۸۹۹ء) بنِ نواب مصطفیٰ خاں شیفتؔہ دہلوی۔ حکیم عبدالمجید، رام پوری بن مُعِزُّ الدین ولایتی (متوفی ۱۲۸۹ھ)۔ مولانا سید قطب الدین دلاور علی، جعفری، بلند شہری (متوفی شوال ۱۳۲۹ھ/ ستمبر ۱۹۱۱ء)۔ مولانا حکیم سید محمد حَسن، امروہوی (متولد ۱۲۴۹ھ۔ متوفی ۱۳۲۳ھ)۔ مولانا ذوالفقار علی، دیوبندی (متوفی ۱۳۲۲ھ)۔ مولانا عبدالسَّمیع بیدؔل، رام پوری، سہارن پوری (متوفی ۱۳۱۸ھ)۔ مولانا انوارُ الحق دہلوی (متوفی رمضان ۱۳۲۰ھ)۔ مولانا فقیر محمد، جہلمی، مؤلِّفِ "**حدائقُ الحنفیہ**"۔ (متوفی ذوالحجہ ۱۳۳۴ھ/ اکتوبر ۱۹۱۶ء)

مفتی صدرُ الدین، آزردؔہ، دہلوی کی کئی ایک تصانیف ہیں، مگر، افسوس کہ وہ گردشِ زمانہ کی نذر ہوگئیں۔ حاشیۂ قاضی مبارک، حاشیۂ میر زاہد، شرحِ دیوان متنبّی کا ذکر، بعض تذکروں میں ملتا ہے۔

"**اَلـدُّرُّ الـمَنضُود فِی حُکمِ اِمرأۃِ الْمَفقود**" کے نام سے ایک رسالہ آپ نے لکھا تھا۔ اسی طرح "**اِمْتِناعُ النَّظیر**" کے نام سے بھی آپ کی ایک معرکۃ الآرا کتاب ہے۔

ایک کتاب "تذکرۂ شُعَرائے ریختہ" ہے، جس کا خطی نسخہ، ڈاکٹر مختارالدین احمد (علی گڑھی) نے کورپس کرسٹی کالج کیمبرج (انگلینڈ) سے ڈھونڈھ نکالا۔

اور اس کے تعارف وحاشیہ کے ساتھ، رسالہ تحریر کیا اور علمی مجلس، دلی سے اسے شائع کیا گیا۔

آپ کی مشہور کتاب "**مُنتَھیٰ الْمَقال فِی شَرحِ حَدِیثِ لَاتُشَدُّ الرِّحَال**" مطبع علویہ دہلی ۱۲۶۴ھ۔ مخزونہ: کتب خانہ جامع مسجد، بمبئی، جس پر عربی زبان میں علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی ومفتی سعدُ اللہ، مرادآبادی، تلامذۂ شاہ عبدالعزیز، محدِّث دہلوی کی تصدیقات وتقریظات ہیں۔

اِس کی وجہِ تالیف، بیان کرتے ہوئے عبدالرحمٰن پرواؔز اصلاحی لکھتے ہیں:

> **"حضرت شاہ عبدالعزیز، محدِّث دہلوی کے تلامذہ اور ان سے اِنتساب رکھنے والوں میں ایک گروہ، تو شاہ صاحب کے مسلک پر گامزن تھا۔**
> **اور مسائلِ دینی میں ان سے سرِمو، اِنحراف، پسند نہیں کرتا تھا۔**
> **مگر، دوسرا گروہ، اجتہاد اور عدمِ تقلید کا رُجحان رکھتا تھا۔**
> **چنانچہ، رفتہ رفتہ، ان دونوں گروہوں میں مختلف مسائل میں اختلاف، رونما ہوا۔**
> **اور نوبت، بحث ومناظرہ تک پہنچی۔**
> **دونوں کی جانب سے متعدد کتابیں اور رسائل لکھے گئے۔**
> **انھیں میں سے ایک مسئلہ "زیارتِ قبور" کا بھی تھا۔**
> چوں کہ اس زمانہ میں علاّمہ ابنِ تیمیہ اور علاّمہ ابنِ حزم کی تصنیفات ہندوستان پہنچ چکی تھیں اور اہلِ علم کا اچھا خاصا گروہ، ان کے خیالات سے متأثر ہوا، اور مسائل میں ان کی پیروی کرنے لگا۔
> اِس لئے مفتی صاحب نے ابنِ تیمیہ کی کتاب "اِقْتِضَاءُ الصِّراطِ الْمُستقیم" اور ابنِ حزم کی کتاب "اَلْمُحَلّیٰ" کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے۔
> ان کتابوں میں انبیائے کرام اور اولیائے عِظام کی قبروں کی زیارت کو حرام، قرار دیا گیا ہے۔

ابنِ تیمیہ کے معاصرین میں تقی الدین سُبکی کی کتاب

’’شفاءُ السّقام فِی زیارۃِ خیرِ الْاَنام‘‘ اِس موضوع پر، بڑی اہم کتاب ہے۔
لیکن، مفتی صاحب نے بھی اس موضوع پر بعض نادر تحقیقات، پیش کی ہیں۔
خصوصاً، انھوں نے عربی زبان دانی کے قواعد اور اصولِ فقہ کی روشنی میں
جو نکتے پیدا کیے ہیں، اُن سے ان کی ذہانت، فقیہانہ بصیرت اور محدِّثانہ تبحرِ علمی کا اظہار ہوتا ہے۔‘‘
(ص ۱۳۸ و ۱۳۹۔ **مفتی صدرُالدین، آزردہ**۔ مؤلِّفہ: پرواز اصلاحی۔ مکتبہ جامعہ۔ نئی دہلی ۲۵)

مفتی صدرُ الدین، آزردہ، دہلوی وعلاَّمہ فضلِ حق خیرآبادی کی معاصر بلند پایہ شخصیات میں ایک نمایاں نام، سَیفُ اللہِ المسلول، علاَّمہ فضلِ رسول، عثمانی، بدایونی (وصال ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) کا ہے۔
ان تینوں جلیل القدر عُلَماے اسلام کے درمیان، بڑے گہرے روابط اور خصوصی تعلقات تھے۔
مفتی آزردہ، دہلوی کے بارے میں ڈاکٹر سلمہ فردوس سیہول لکھتی ہیں:

.......شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، اور مولانا فضلِ امام خیرآبادی کے شاگرد تھے۔
عربی، فارسی، اردو، تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ تخلص، آزردہ اور مہجور کرتے تھے۔
شاعری میں شاہ نصیر اور میر ممنون دہلوی سے تلمذ تھا۔
نواب یوسف علی خاں، والیِ رام پور و نواب صدیق حسن خاں، قنوجی، بھوپالی
اور سر سید احمد خاں، مخصوص تلامذہ سے ہیں۔
..........انھوں نے جامع مسجد دہلی کے پاس ’’دارُالبقا‘‘ کے نام سے
مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔‘‘ (قدیم مدرسہ کو آباد کیا تھا)

آزردہ اور علاَّمہ فضلِ حق، ہم سبق ساتھی تھے۔ آزردہ، علاَّمہ فضلِ حق سے عمر میں آٹھ سال بڑے تھے۔ ان کے اساتذہ،، مشترک تھے۔ دہلی کے تمام دوست احباب بھی مشترک تھے۔
۱۲۴۰ھ میں جب مسئلۂ امتناعُ النظیر چھڑا، تو آزردہ نے علاَّمہ کی طرف داری کی اور ان کی مشہور تصنیف ’’تحقیقُ الْفَتویٰ فِی اِبْطالِ الطَّغْویٰ‘‘ پر، دستخط و مہر کی۔
اور جب مولوی حیدر علی، رام پوری (ثم ٹونکی) کی کتاب کے جواب میں
جناب عبدالستار نے ایک استفتا، مرتَّب کر کے عُلَماے وقت سے دستخط کرائے
تو مفتی آزردہ صاحب نے بھی اس پر دستخط و مہر کی اور تصدیق عبارت بھی لکھی۔
مولانا فضلِ رسول بدایونی کی رَدِّ تقویت الایمان میں کتاب ’’اَلْـمُـعْـتَـقَـدُ الْـمُـنْـتَـقَـد‘‘
(۱۲۷۰ھ) پر، تقریظ لکھی۔ ۱۲۶۹ھ میں مسئلۂ امکانِ کذب و اِمتناعِ کذب پر
علاَّمہ خیرآبادی کو خط لکھا۔
رضا لائبریری، رام پور (یوپی) میں مفتی صدرُالدین آزردہ، مولانا فضلِ رسول، بدایونی

و مولانا محمد حَسن خاں بدایونی، ثُمَّ بریلوی اور علاَّمہ فضلِ حق خیرآبادی کا ایک مجموعۂ تحریرات
’’شِبہِ لُزومِ لزوماتِ اِعتباریہ فِی الْعُقولِ الْمُجَرَّدہ‘‘ نمبر ۱۵۲ا پر، محفوظ ہے۔‘‘
(ص ۱۵۰ و ۱۵۱۔ ’’**علاَّمہ فضلِ حق خیرآبادی**‘‘۔ تحقیق و تالیف: سلمہ سیہول۔ مطبوعہ: مکتبہ قادریہ، لاہور۔ ۲۰۰۱ء)

شہیدِ بغداد، مولانا اُسید الحق محمد عاصم قادری، بدایونی (شہادت ۲/جمادیٰ الاولیٰ ۱۴۳۵ھ/ ۴/مارچ ۲۰۱۴ء۔ مدفون: بغداد، عراق) نے اِن حضرات کے سلسلے میں خانقاہِ قادریہ بدایوں کے ذخیرۂ کتب و نَوادِر و مخطوطات کی روشنی میں ایک علمی و تحقیقی کتاب بنام ’’**خیرآبادیات**‘‘ تحریر کی ہے۔
جس میں ان تینوں مشاہیر عُلماے اہلِ سُنَّت کے باہمی روابط و تعلقات کی مختلف جہتوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ بعض اہم حصے، یہاں، مختصراً، نذرِ قارئین ہیں:

اِن تینوں شخصیات کے درمیان، ایک سے زیادہ اُمور ایسے قدرِ مشترک تھے
جو، باہم، یگانگت اور رشتۂ خلوص و محبت کی بنیاد، بن سکتے تھے۔
مثال کے طور پر، ہم یہاں، چند باتوں کی طرف، اشارہ کریں گے۔
(۱) معقولات سے خاص شغف، دلچسپی اور علومِ حکمیہ میں گہری نظر، اِن تینوں حضرات میں قدرِ مشترک ہے۔ مفتی صدرُ الدین، آزردہ، دہلوی، علاَّمہ فضلِ امام خیرآبادی کے شاگرد تھے۔ جب کہ علاَّمہ فضلِ رسول، بدایونی، عُلماے فرنگی محل، لکھنؤ کے شاگرد تھے۔
رہے استاذِ مطلق، علاَّمہ فضلِ حق، تو وہ معقولات میں درجۂ اِجتہاد پر، فائز تھے۔
(۲) شعر گوئی، سخن فہمی، سخن سنجی اور اعلیٰ ادبی ذوق، اِن تینوں حضرات کی مشترک صفت ہے۔
(۳) علاَّمہ فضلِ حق اور مفتی صدرُالدین، آزردہ میں ایک رشتہ، استاذ بھائی کا ہے۔
اوَّلاً: دونوں حضرات، علاَّمہ فضلِ امام خیرآبادی کے تلمیذ تھے۔
پھر، خاندانِ ولی اللّٰھی سے تلمذ کی نسبت میں بھی دونوں حضرات، شریک ہیں۔
(۴) شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی نے جب تقویۃ الایمان لکھ کر
ہندوستان میں شیخ محمد بن عبدالوہَّاب نجدی کے افکار و عقائد، عام کرنے کی کوشش کی
تو، ان تینوں حضرات نے مذہبِ سَوادِ اعظم اہلِ سُنَّت و جماعت کے تحفظ و صیانت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے جدید افکار و خیالات کے خلاف، قلم اٹھایا۔
(۵) انقلابِ ۱۸۵۷ء میں قائدانہ کردار ادا کرنے میں، یہ تینوں حضرات، پیش پیش تھے۔
مفتی صدرالدین آزردہ اور علاَّمہ فضلِ حق و علاَّمہ فضلِ رسول
یہ تینوں حضرات، انگریزی حکومت کے خلاف، اپنے اپنے طور پر صف آرا تھے۔
اِنقلابِ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف، علاَّمہ فضلِ حق خیرآبادی کے شانہ بہ شانہ

جہادِ حُرِّیَّت کے لئے علاّمہ فضلِ رسول بدایونی نے اپنے بیٹے کی طرح، پالے ہوئے عزیزترین بھانجے اور شاگرد، مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی کو آپ کے ساتھ، مستقلاً، وابستہ کردیا تھا۔

چنانچہ، علاّمہ خیرآبادی کے مشہور فتوائے جہاد پر

مولانا فیض احمد، بدایونی نے بھی دستخط کیے اور جنگِ آزادی میں عملاً، حصہ لیا۔

مذکورہ مشترک اُمور نے، اِن تینوں حضرات کو ایک نقطۂ اتحاد پر جمع کردیا تھا۔

جس کی کچھ جھلکیاں، زیرِ نظر تحریر کی زینت ہیں۔

علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی، ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء کے ابتدائی مہینوں میں ریاستِ اَلْوَر (میوات، راج پوتانہ) تشریف فرما ہوئے۔ مفتی صدرُ الدین آزردہ نے مسرت و بہجت کے ساتھ ایک نظم لکھ کر علاّمہ خیرآبادی کے پاس بھیجی۔ نظم کا ایک شعر ہے:

رَشکِ تہران وصفاہاں، شدہ دہلی اَز مَنِ   اَلْوَر، اَز ذاتِ ہمایونِ تو، یوناں باشد

(ترجمہ: میری بدولت، دہلی، رَشکِ تہران واَصفہان ہے۔

جب کہ آپ کے اَلْوَر پہنچ جانے سے، وہ یونان بن گیا ہے)

حکیم سید محمود احمد، برکاتی، ٹونکی (شہادت ۱۴۳۴ھ/۲۰۱۳ء۔ کراچی۔ مصباحی)

فرزند حکیم سید محمد احمد، ٹونکی (متوفی ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۲ء)

فرزندِ حکیم سید برکات احمد، ٹونکی (متوفی ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء) اس پر، یہ دل چسپ تبصرہ کرتے ہیں:

شَرَافَۃُ الْمَکَانِ بِالْمَکِین کی صداقت دیکھیے کہ:

برِعظیم کے مراکزِ علمیہ میں اَلْوَر نامی کسی مقام کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

مولانا فضلِ حق، خیرآبادی، وہاں پہنچ گئے، تو ان کی ذاتِ ہمایوں نے اَلْوَر کو یونان بنادیا۔

سچ ہے۔ ع

ہم جہاں بیٹھ کے پی لیں، وہی مے خانہ بنے

○○○

میں چمن میں کیا گیا، گویا، دبستاں کھل گیا

آج، وہاں اَلْاُفُقُ الْمُبِین، شرحِ اِشارات، محاکمات

قاضی مبارک جیسی کتابیں، معرضِ تدریس میں ہیں۔''

(مضمون ''**عُلمائے خیرآباد و بدایوں کے روابط**''۔ مشمولہ ''**تاج الفحول نمبر**''۔

ماہنامہ مظہرِ حق، بدایوں۔ ج ۱، شمارہ ۸۔ ص ۲۳۱۔ مطبوعہ ۱۹۹۹ء)

ریاستِ اَلْوَر (میوات، راج پوتانہ) کے زمانۂ قیام میں علاّمہ فضلِ رسول بدایونی نے

اپنے فرزند، تاج الفحول، مولانا عبدالقادر، بدایونی کو، علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کی خدمت میں منطق و فلسفہ کی بعض مُنْتَہی کتابوں کی تحصیل کے لئے بھیجا۔

علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی، ایک بار، بدایوں تشریف لائے اور مدرسہ قادریہ میں فروکش ہوئے۔

مولانا ضیاءُ القادری، بدایونی، **اَکمل التاریخ** میں لکھتے ہیں:

''حضرت سیفُ اللہ المسلول (علاّمہ فضلِ رسول) سے آپ (علاّمہ فضلِ حق) کو نہایت خلوص وعقیدت تھی۔ ایک زمانے میں بدایوں بھی تشریف لائے تھے۔

اکثر اَوراد واَشغال کی اجازتیں بھی حاصل کی تھیں۔ مدرسہ قادریہ میں مقیم رہے تھے۔''

(ص ۸۹۔ جلد اول، **اکمل التاریخ**۔ مطبع قادری، بدایوں۔ ۱۳۴۳ھ)

علاّمہ فضلِ رسول، بدایونی نے اپنی تصانیف میں متعدد مقامات پر علاّمہ فضلِ حق کے علم وفضل اور دینی و علمی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ (دیکھیے ص: ۴۸۔ **سیفُ الجبار**۔ مطبع صبح صادق، سیتا پور ۱۲۹۲ھ۔ وص ۳۰۔ **فَوْزُ الْمُؤمِنِین بِشفَاعَۃِ الشَّافِعِین**۔

مطبع: مفیدُ الخلائق، دہلی۔ ۱۲۶۸ھ۔ وص: ۱۱۲۔ **اَلْمُعْتَقَدُ الْمُنْتَقَد**۔ مطبع اہلِ سنّت، پٹنہ۔ ۱۳۲۱ھ)

نواب صدیق حسن خاں، بھوپالی (غیر مقلّد عالم ومؤرخ) جنہوں نے کچھ دنوں مفتی صدرُ الدین، آزردہ، دہلوی سے تعلیم، حاصل کی تھی، وہ، اپنی ایک مشہور تاریخی کتاب **اَبجدُ العلوم** میں ایک حیرت انگیز اور بے بنیاد بات، لکھتے ہیں:

(ترجمہ از عربی) علاّمہ فضلِ حق اور میرے استاذ، علاّمہ محمد صدرالدین خاں آزردہ، صدر الصُّدور کے درمیان، بڑی دوستی اور محبت تھی۔ کیوں کہ وہ دونوں ایک ہی استاذ کی درس گاہ کے فیض یافتہ تھے۔

اور پھر، علاّمہ فضلِ حق کے والد، علاّمہ فضلِ امام، خیرآبادی کے بھی، دونوں، شاگرد تھے۔

لیکن، اس (استاذ بھائی ہونے) کے باوجود

میرے استاذ، بعض معاملات میں ان سے ناراض رہتے تھے۔

ان میں ایک معاملہ یہ تھا کہ:

انہوں (علاّمہ فضلِ حق) نے شیخ حافظ محدّث اصولی حاجی غازی شہید، محمد اسمٰعیل دہلوی کا رَد کیا تھا۔

(مفتی آزردہ، علاّمہ خیرآبادی سے) کہا کرتے تھے کہ:

مَیں اس معاملہ میں تم سے خوش نہیں ہوں اور یہ تمھیں زیب نہیں دیتا۔

(**اَبجدُ العلوم**۔ بحوالہ ص: ۴۱۳، ج ۷۔ **نزہۃُ الخواطر**۔ مؤلّفہ: حکیم عبدالحئی، رائے بریلوی۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۹۲ء)

حکیم، سید محمود احمد، برکاتی، ٹونکی (شہادت: ۱۴۳۴ھ/۲۰۱۳ء۔ کراچی)

اِس خیال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک دوست کا، دوسرے دوست کو، ٹوکنا، تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔
لیکن، یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ مولانا آزردہ، مولانا فضلِ حق کو
اس بات پر، برا بھلا کہیں کہ انہوں نے شاہ اسمٰعیل کا رَد کیا تھا۔ جب کہ:
(۱) خود، مولانا آزردہ، شاہ اسمٰعیل کے خیالات سے متفق نہیں تھے۔
(۲) مولانا آزردہ، تعینِ یوم میلاد کے قائل تھے۔
(۳) مولانا آزردہ، قیام فی المیلاد کو بھی مستحسن جانتے تھے۔
(۴) **مُنْتَھیٰ الْمَقال فِی شَرحِ حدیثِ لاتُشَدُّ الرِّحال** میں بھی
وہ، وہابی نقطۂ نظر کے خلاف گئے ہیں۔ اور جوش وخروش کے ساتھ، وہابیہ کا رَد کیا ہے۔
(۵) اِمتناعُ النظیر کے باب میں بھی مولانا آزردہ کا ایک قلمی رسالہ، میرے کتب خانہ
(کراچی) میں محفوظ وموجود ہے۔ مولانا آزردہ، اس میں بھی، شاہ اسمٰعیل سے کلیّۃً متفق نہیں تھے۔
اِن حقائق کی موجودگی میں، مَیں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ:
"یہ نواب (صدیق حسن، بھوپالی) کا، اپنے استاذ (مولانا آزردہ) پر، اِفترا ہے کہ:
وہ، مولانا فضلِ حق سے اس لئے ناراض تھے کہ انہوں نے شاہ (اسمٰعیل) صاحب کا رَد کیا تھا۔
اور مولانا فضلِ حق کے سلسلہ میں لوگوں کو، بدگمان کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔"
(ص۱۰۸، وص۱۰۹ "**فضلِ حق اور ۱۸۵۷ء**" ۔ مؤلّفہ: حکیم محمود احمد برکاتی، ٹونکی۔ مطبوعہ: برکات اکیڈمی، کراچی ۱۹۷۵ء)
نواب صدیق حسن، بھوپالی کی مذکورہ بات، قطعی، درست نہیں، جس کے دلائل گذر چکے۔
مزید برآں، یہ حقائق، نواب بھوپالی کے اِتہام والزام کی تکذیب وتردید کرتے ہیں کہ:
پہلی بات تو یہ ہے کہ
جب، ۱۲۴۰ھ میں علاّمہ خیرآبادی نے شاہ اسمٰعیل دہلوی کے خلاف، فتویٰ دیا
تو اس پر، مفتی آزردہ نے تائیدی دستخط فرمائے۔
دوسرے یہ کہ اِس فتویٰ کے اُنتیس (۲۹) سال بعد، ۱۲۶۹ھ میں
جب علاّمہ خیرآبادی نے شاہ اسمٰعیل دہلوی کے حامی ومؤیّد، مولانا حیدرعلی، رام پوری ثم ٹونکی
کے خلاف، فتویٰ دیا، جس میں شاہ اسمٰعیل کے امکانِ نظیر اور اِمکانِ کذب کے
موقف کا زبردست رَد تھا، تو، اس کی بھی مفتی آزردہ نے تحریری تصدیق فرمائی۔
یہاں، یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ:
۱۲۶۹ھ و ۱۲۷۰ھ ہی، وہ زمانہ ہے، جب، نواب صدیق حسن صاحب
دہلی میں مفتی صدرالدین، آزردہ سے تحصیلِ علم کررہے تھے۔

تیسرے یہ کہ ۱۲۷۰ھ (علاّمہ خیرآبادی کے وصال سے آٹھ سال قبل) میں
علاّمہ فضلِ رسول، بدایونی نے، اَلْمُعْتَقَدُ الْمُنْتَقَد لکھی۔
جس میں جگہ جگہ، شاہ اسمٰعیل، دہلوی کے افکار وخیالات کا رَدّ، نامزد اور متعین طور پر ہے۔
اِس اَلْمُعْتَقَدُ الْمُنْتَقَد (۱۲۷۰ھ بزبانِ عربی) کی بھی مفتی صدرُالدین، آزردہ نے
تصدیق کرتے ہوئے زوردار تقریظ لکھی ہے۔ اور اس کی تعریف میں یہاں تک، تحریر فرمایا دیا کہ:
علمِ کلام میں لکھی جانی والی کوئی کتاب، اِس کتاب کے برابر نہیں ہے۔
(ص۴۔ اَلْمُعْتَقَدُ الْمُنْتَقَد۔ مطبع اہلِ سنّت، پٹنہ۔ ۱۳۲۱ھ)
اَلْمُعْتَقَدُ الْمُنْتَقَد (۱۲۷۰ھ، بزبانِ عربی) میں درج عقائد ومسائلِ اہلِ سنّت کی تصدیق
کرتے ہوئے علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی ومفتی صدرالدین آزردہ دہلوی نے زوردار تقریظ لکھی۔
مفتی آزردہ، تحریر فرماتے ہیں:
وَبَعدُ فَاِنِّی نَظَرْتُ فی الرِّسَالَةِ الْبَالِغَةِ وَالْعُجَالَةِ النَّافِعَةِ الَّتِی
اَلَّفَهَا الْحِبْرُ الْمُدَقِّقُ ، اَلنّحْرِيْرُ الْمُحَقِّقُ ، اَلْفاضِلُ الْكَامِلُ، الْعالِمُ الْفَائِقُ
اَلْبَحرُ الْخِضَمُّ، اَلَا لَمَعِیُّ اللَّوْذَعِی، اَلَاحْوَذِی اَلَاصْمَعِی
مَوْلَانَا الْمولوی فَضْلُ الرَّسُول اَلْبَدَايُونی اَلْقَرَشِی الْقادری ۔"
(ص۴: **اَلْمُعْتَقَدُ الْمُنْتَقَد**، مطبع اہلِ سنّت، پٹنہ۔ ۱۳۲۱ھ)
مزید تحریر فرماتے ہیں:
وَجَدْتُهَا اَجْوَدَ لَفْظاً وَاَحْسَنَ مَعْناً وَاَغَرَّ نَظْماً وَاَزهَرَ حكماً وَاَرْفعَ شاناً
وَ اَمْنَعَ مَكاناً۔ **لا يُدَانِيُهَا كتابٌ قَد صُنِّفَ فِی عِلمِ الْكَلام**
وَلَايُساوِيُه رِسَالَةٌ قَدْ اُلِّفَتْ فِی هٰذا الْمَرَام۔"
(ص: ۵۔ **اَلْمُعْتَقَدُ الْمُنْتَقَد. لِلْعَلَّامَة فَضلِ رَسول، اَلْاُمَوِی، اَلْبَدايونی۔**
مطبوعہ مطبع اہلِ سنّت۔ پٹنہ، بہار ۱۳۲۱ھ)
ترجمہ: میں نے اس رسالہ کو لفظ ومعنی کے اعتبار سے عمدہ اور بہترین
نظم وترتیب کے اعتبار سے چمکتا دمکتا اور رفیعُ الشّان پایا۔
علمِ کلام میں تصنیف کی جانے والی کوئی کتاب، اِس کے قریب، نظر نہیں آتی۔
اور اِس موضوع پر تالیف کیا جانے والا کوئی بھی رسالہ، اس کے برابر نہیں ہے۔"
روضۂ رسول کی زیارت وسفرِ زیارت کے اِستحباب پر ۱۲۶۴ھ میں مفتی آزردہ کا تحریر کردہ رسالہ
" **مُنْتَهٰی الْمَقال فِی شَرحِ حدیثِ لَا تُشَدُّ الرِّحال** " ۱۲۶۴ء میں دہلی سے شائع ہوا۔

پھر، ۱۲۶۸ھ میں شرف المطابع، دہلی سے ہی اس کی دوسری طباعت واشاعت ہوئی۔

علاّ مہ فضلِ حق خیرآبادی و مفتی سعدُ اللہ مرادآبادی نے اس پر تقریظیں، تحریر فرمائیں۔

۱۴۱۰ھ/۱۹۹۰ء میں اس کا اردو ترجمہ بقلم: مولانا شاہ حسین، گردیزی
مصلح الدین پبلی کیشنز۔کراچی سے شائع ہو چکا ہے۔

مفتی آزردہ کے جامع و مانع رسالہ مُنتہیٰ المَقال پر کسی مُنکِر ومعترض نے
کچھ اعتراضات کیے تو علاّ مہ فضلِ رسول بدایونی نے ایک تحقیقی رسالہ
بنام ''اِکمَال فِی بَحثِ شَدِّ الرِّحال'' لکھ کر حمایتِ حق کا فریضہ، انجام دیا۔

فارسی زبان میں لکھے گئے اِس جوابی رسالہ ''اِکمال'' کی پہلی اشاعت، ۱۲۶۶ھ میں ہوئی۔

اب، یہ رسالہ اِکمَال فِی بَحثِ شَدِّ الرِّحال، اردو ترجمہ و تحقیق و تخریج کے ساتھ
''**مجموعۂ رسائلِ فضلِ رسول**'' مطبوعہ بمبئی وکراچی میں شامل ہے۔

واضح رہے کہ تقویۃ الایمان از شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی کے منظرِ عام پر آنے کے ساتھ ہی
۱۲۴۰ھ میں علاّ مہ فضلِ حق خیرآبادی نے ''**تقریرِ اعتراضات بر تقویۃُ الایمان۔**'' تحریر فرمایا۔

اپنی اس مختصر تحریر کے بعد **تحقیقُ الفَتوىٰ فِی اِبطالِ الطَّغوىٰ** کے نام سے اس کا مفصّل
و مدلّل اور ایمان افروز جواب دیا تھا۔جس میں مولانا شاہ مخصوص اللہ دہلوی و مولانا شاہ محمد موسیٰ، دہلوی
فرزندانِ مولانا شاہ رفیع الدین، دہلوی، فرزندِ شاہ ولی اللہ، محدّث دہلوی کے ساتھ
مولانا احمد سعید، نقش بندی، مجدّدی، دہلوی و مفتی صدرالدین، آزردہ، دہلوی کی
تحریری تصدیقات وتقریظات بھی شامل ہیں۔

عُلما و مشائخِ دہلی نے **تحقیقُ الفَتوىٰ** کی پُر زور تائید فرمائی ہے۔

ہندوستان کے آخری مغل بادشاہ، بہادر شاہ ظفر نے محفلِ میلاد و فاتحۂ طعام وغیرہ کے
سلسلے میں علاّ مہ فضلِ رسول، بدایونی سے ۱۲۶۸ھ میں ایک اِستفتا کیا جس کا آپ نے جواب
تحریر کیا
اور مطبع مفیدُ الخلائق، دہلی سے ۱۲۶۸ھ میں اس کی پہلی طباعت واشاعت ہوئی۔

اَکملُ التاریخ، مطبوعہ بدایوں ۱۳۳۴ھ میں بھی یہ فتویٰ، منقول و محفوظ ہے۔

اِس فتویٰ پر، سترہ (۱۷) عُلما و مشائخِ دہلی کے تائیدی دستخط ہیں۔

جن میں پہلا نام، مفتی صدرُ الدین، آزردہ، صدرالصُّدور دہلی کا ہے۔

اب، یہ فتویٰ ''**مجموعۂ رسائلِ فضلِ رسول**'' مطبوعہ بمبئی وکراچی میں بھی شامل ہے۔

مفتی صدرُ الدین آزردہ و علاّ مہ فضلِ حق خیرآبادی و علاّ مہ فضلِ رسول بدایونی کے درمیان

بڑے مخلصانہ اور گہرے دینی و علمی روابط وتعلقات تھے۔اور باہمی مُراسلت تھی۔

چنانچہ، ان حضرات کے مکتوبات پر مشتمل ایک مجموعہ، شعبۂ مخطوطات رضا لائبریری، رام پور
یوپی، انڈیا میں اور دوسرا مجموعۂ مکاتیب، کتب خانہ، قادری، بدایوں میں موجود و محفوظ ہے۔

علاّ مہ فضلِ حق خیرآبادی کی کتاب **تَحقیقُ الفَتوىٰ** (جوابِ تقویۃ الایمان، از شاہ محمد اسمٰعیل
دہلوی) کا ایک جواب، پچیس سال بعد، مولانا حیدر علی، رام پوری ثمّ ٹونکی نے دیا۔

جس میں مسئلۂ امکانِ کذبِ باری تعالیٰ میں، شاہ اسمٰعیل، دہلوی کے موقف کی حمایت کی۔

اور اسی کی بنیاد پر کسی صاحب نے علامہ فضل حق سے پندرہ سوالات کر ڈالے۔

علاّ مہ نے اس کا تحقیقی جواب دیا۔

علاّ مہ کا جواب، مطبع ہدایہ، دہلی سے ۱۲۶۹ھ میں شائع ہوا۔

جس کی مفتی صدرالدین، آزردہ، وغیرھُم نے تصدیق وتائید کی۔اس پر مفتی آزردہ سمیت
تیس (۳۰) عُلما و مشائخ دہلی و مرادآباد و رام پور کے تائیدی دستخط ہیں۔

دوسرا مجموعۂ مکاتیب، مخزونہ کتب خانہ قادری، بدایوں اسی سے متعلق ایک علمی و تحقیقی بحث پر
مشتمل ہے، جس میں علاّ مہ فضلِ رسول و علاّ مہ فضلِ حق و مفتی آزردہ کے
ایک دوسرے کے نام، لکھے گئے سات (۷) خطوط ہیں۔

کتب خانہ قادریہ، بدایوں میں مولانا قلندر علی، زبیری (تلمیذ علاّ مہ فضلِ حق خیرآبادی)
کا رسالہ **نُورُ العَین فِی ذِکرِ مَولِدِ النَّبِیِّ وَشَھادۃِ الحُسین** (مطبع ناصری، دہلی ۱۲۸۱ھ)
موجود ہے۔جس میں محفلِ میلاد و مجلسِ ذکر امام حسین کے جواز واِستحباب کی تائید
اور انھیں، بدعت قرار دینے والوں کی تردید کی گئی ہے۔

متعدد عُلما کے ساتھ، مفتی آزردہ نے بھی اس رسالہ کی تحریری تصدیق کی ہے۔

(مولانا اُسید الحق قادری، بدایونی کی تحریر کا خلاصہ ختم ہوا۔تفصیل و تحقیق کے لئے ملاحظہ ہو:
''**خیرآبادیات**'' مؤلّفہ: مولانا اُسیدالحق، بدایونی۔مطبوعہ: تاج الفحول اکیڈمی، بدایوں)

شوقِ زیارت و آستاں بوسیِ رسولِ کونین صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسلَّم کا جذبہ، حضرت آزردہ کے
دل میں اتنا بیدار و بیقرار تھا کہ اپنی جبینِ شوق کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

مہر جہاں فروز دکھاؤں، جبیں کو مَیں
گر، سنگِ آستانۂ خَیرُ البشر ملے

اس وقت کے اختلافِ مسلک کو مزید واضح کرتے ہوئے
مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی، رقم طراز ہیں:

’’قرآن و حدیث کے فہم اور فقہی مسائل کی تحقیق و تنقید میں اختلاف
کوئی نئی بات، نہیں ہے۔ صدرِ اول سے مختلف مکاتیبِ فکر اور فقہی مسالک
رہے ہیں۔ دہلی کے عوام و خواص بھی اس زمانے میں دو گروہوں میں
بٹے ہوئے تھے۔ ان میں کبھی بحث و مناظرہ بھی ہو جاتے تھے۔

ایک گروہ، کٹّر حنفی مسلک کا پَیرو تھا۔ دوسرا، عاملین بِالحدیث کا۔
حضرت شاہ عبدالعزیز اور ان کے بھائیوں کا مسلک تو حنفی تھا
مگر، اسی خاندان میں حضرت شاہ اسمٰعیل شہید و مولانا عبدالحیٔ (بڑھانوی)
اور حضرت سید احمد شہید کے بعض خُلفا اور ان کے ماننے والوں کا مسلک، اہلِ حدیث تھا۔
مفتی صدرالدین خاں، آزردہ اور مولانا فضل حق، خیرآبادی، ان سے اختلاف رکھتے تھے۔‘‘

(ص ۴۹۔ ’’**مفتی صدرُالدین، آزردہ**‘‘۔ مؤلّفہ: پرواز اصلاحی۔ مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵)

مفتی صدرُالدین آزردہ کی روحانی و معنوی اولاد کی کمی نہ تھی، مگر صلبی اولاد کوئی، نہیں تھی۔
ایک شخص، عنایت اللہ کی آپ نے پرورش کی تھی، جنھوں نے سعادت مندی کا ثبوت دیا
اور آخر تک، خدمت گذاری کرتے رہے۔

عمر کے آخری حصے میں، جب کہ آزردہ، اَسّی (۸۰) سال کے ہو گئے تھے
نواب، کلب علی خاں، والیِ ریاستِ رام پور کی طرف سے، دو سو روپے کا ماہانہ وظیفہ، جاری ہو گیا تھا
اور انتقال کے بعد، تجہیز و تکفین کے لئے ریاست کی طرف سے پانچ سو روپے کی اِعانت ہوئی تھی۔
نواب کلب علی کے والد، نواب یوسف علی خاں، حضرت آزردہ کے شاگرد تھے۔‘‘

(ہفت روزہ۔ اَکملُ الاخبار۔ دہلی۔ جلد ۳۔ نمبر ۳۹۔ ۳۰/ستمبر ۱۸۶۸ء۔
بحوالہ: **کلاسیکی ادب**، از خواجہ احمد، فاروقی۔ آزاد کتاب گھر، دہلی)

اِکیاسی (۸۱) سال کی عمر میں بمرضِ فالج، بروز پنجشنبہ ۲۴/ربیع الاول ۱۲۸۵ھ/ ۱۶/جولائی ۱۸۶۸ء مفتی صدرُالدین، آزردہ، دہلوی کا انتقال ہوا۔

ہفت روزہ، **اَکملُ الاخبار**، دہلی نے آپ کے انتقال کی خبر، اِس طرح، شائع کی:

’’اگرچہ، اہلِ کمال کے مرنے کا، ہر حال میں صدمہ جاں گداز ہوتا ہے
مگر، اس صورت میں جاں گداز سے بھی سِوا ہے کہ:
ان دنوں میں جناب فضیلت مآب، زُبدۃُ العلُما، عمدۃُ الفُضلا
دانش آموزِ مَشّائیاں، دانش اندوز اِشراقیاں، مولانا مفتی محمد صدرالدین
خان بہادر، متخلص بہ آزردہ، سابق صدرُ الصُّد ور دہلی نے وفات پائی۔

تمام اہلِ شہر کو، اس قدر رنج و الم ہوا ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔
اور یہ واقعہ ۱۶/جولائی ۱۸۶۸ء، یوم پنجشنبہ، چار بجے دن کو
جاں گزائے مردمِ شہر ہوا۔ مغرب کے وقت، جنازہ، جامع مسجد (دہلی) میں آیا۔
نماز پڑھائی گئی، خلقت کا بہت ہجوم تھا۔
بعد اِنفراغِ نماز، درگاہ چراغِ دہلی میں حسبِ وصیتِ مغفور، دفن کیا۔
یک شنبہ کو فاتحہ ہوئی، تمام عَمایدین و رُؤسائے شہر جمع ہوئے۔
مگر جس کو دیکھا، افسردگی و غم سے خالی، نہ تھا۔
تاریخِ وفات جو مرزا قربان علی بیگ سالک نے لکھی ہے، وہ یہ ہے:

صدر آرائے دیں و مفتیِ شہر　　کہ جسے لاکھ نے یگانہ کہا
سب نے اس کی وفات کو سن کر　　رنج و اندوہ کا فسانہ کہا
سال اِس واقعہ کا سالک نے　　مرگیا ’’فاضلِ زمانہ‘‘ کہا

(مورخہ ۲۲/جولائی ۱۸۶۸ء۔ جلد ۳۔ نمبر ۳۰)

شمس الشُّعَراء، مولانا ظہور علی، دہلوی، شاگردِ آزردہ نے یہ تاریخِ وفات کہی:

چہ مولانائے صدرُ الدیں کہ در عصر　　امامِ اعظمِ آخر زماں بود
بروزِ پنجشنبہ کرد رِحلت　　کہ ایں عالم، نہ جائے جاوِداں بود
ربیعُ الاول و بست و چہارم　　وَداعِ اُو، سُوے دارِ جناں بود
ظہورؔ! افسوس آں استادِ ذی قدر　　پدر دارم ہمیشہ مہرباں بود
چراغش ہست تاریخِ ولادت　　کنوں گفتم چراغِ دو جہاں بود

حضرت آزردہ کے آخری دَورِ حیات کے ایک شاگرد، مولانا فقیر محمد جہلمی لکھتے ہیں:
آخر عمر میں ایک دو سال، مرضِ فالج میں مبتلا رہ کر، اِکّاسی (۸۱) سال کی عمر میں، یومِ پنج شنبہ ۲۴/ربیع الاول ۱۲۸۵ھ میں فوت ہوئے۔　(**حدائق الحنفیہ**۔ از فقیر محمد جہلمی۔ مطبوعہ: لکھنؤ و کراچی)

قبرِ نبوی عَلیٰ صاحِبِہِ الصَّلوٰۃُ وَ السَّلام کے سفر کے جواز و اِستحباب پر مشتمل
آپ کے مشہور رسالہ ’’مُنتَہَی الْمَقال فِی شَرحِ حدیثِ لا تشَدُّ الرِّحال‘‘ پر
علّامہ فضل حق خیرآبادی اور حضرت مفتی سعدُ اللہ مرادآبادی، تلامذۂ حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کی تحریری تصدیق، خاصی اہمیت کی حامل ہے اور اس رسالہ کا اردو ترجمہ، از مولانا شاہ حسین گردیزی، پہلی مرتبہ، مصلح الدین پبلی کیشنز، کراچی سے شعبان ۱۴۱۰ھ/۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔

جس کے فارسی متن کی پہلی طباعت ۱۲۶۸ھ میں شرف المطابع، دہلی سے ہوئی تھی۔

حضرت مفتی صدرُ الدین آزردہ دہلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء)

چراغ دہلی میں اِحاطۂ حضرت نصیرالدین محمود چراغ دہلوی میں مدفون ہوئے۔

مفتی آزردہ دہلوی کے بارے میں مولانا سید محمد میاں، دیوبندی لکھتے ہیں:

''ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے تقریباً، دس سال پہلے، جب رئیس المجاہدین، مولانا احمدُ اللہ شاہ صاحب دہلی، تشریف لائے تھے، تو یہی دانش مند فرزانۂ روزگار، حضرت مولانا مفتی صدرُ الدین صاحب تھے جنھوں نے شاہ صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ: **وہ اپنی جدوجہد کا مرکز، دہلی کے بجائے آگرہ بنائیں۔**

پھر، آپ ہی نے اپنے خط کے ذریعہ، شاہ صاحب کا تعارف
آگرہ کے اُن زُعَما وعلَما سے کرایا، جو ایک طرف، سرکاری حلقوں میں باوقار تھے
تو دوسری جانب، قومی وملّی کارکنوں کا اِعتماد، اُن کو حاصل تھا۔
جنوبی ہند کا ایک غیر معروف نوجوان، جو دہلی میں ناکام ہو چکا تھا
اُس نے اس دورِ بے آئین میں جو سیاسی لحاظ سے بے حد نازک تھا
پولیس اور سی آئی ڈی کی ریشہ دَوانیوں سے محفوظ رہتے ہوئے، چند ہی مہینوں میں
وہ غیر معمولی مقبولیت، حاصل کر لی، جس کی نظیر، بہت مشکل ہی سے کہیں کہیں ملتی ہے۔
یہ بے شک، حضرت شاہ صاحب کی غیر معمولی صلاحیت وقابلیت کی برکت ہے۔
لیکن، ایک منصف مزاج حقیقت پسند کو اس پر بھی تأمل نہیں ہونا چاہیے کہ:
حضرت مفتی (آزردہ) صاحب کے تعارفی خط نے بھی اَساس اور بنیاد کا، کام کیا ہے۔
دارُالحکومت آگرہ کے اعلیٰ سیاسی طبقہ میں ایک غیر معروف شخص کے لئے
رُسوخ اور اعتماد حاصل کرنے کی کٹھن منزل، جو سالہا سال میں طے ہوتی
حضرت مفتی صاحب کا مکتوبِ گرامی اور سیاسی حلقوں میں حضرت مفتی صاحب کا گہرا تعلق ہی تھا
جس نے اس کو نہایت آسانی سے چند لمحوں میں طے کرا دیا۔
خاص، اس ہنگامہ کے دَوران، مفتی صاحب کسی محاذ پر پیش پیش، نظر نہیں آتے۔
مگر، تحریکِ انقلاب سے آپ کی دل چسپی کا اندازہ، اس سے ہوتا ہے کہ:
آپ کا درِ دولت، جس طرح، عام حالات میں مرجع رہا کرتا تھا
اس وقت بھی انقلابی عناصر کی پناہ گاہ بنا رہا۔
انگریزوں کے سب سے خطرناک دشمن، جن کو مجاہدین کہا جاتا تھا
جن کی انگریز دشمنی کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری کی بنا پر نہیں تھی

بلکہ ان کی حُرِّیَّت پسند فطرت نے اس کو عقیدہ کی حیثیت دے رکھی تھی
ان، سربکف مجاہدین کا ہجوم جس کے درِ دولت پر رہتا تھا، وہ مفتی صدرُ الدین صدرُ الصُّدور ہی تھے۔
چنانچہ، ۹/ اگست ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے کہ:
کسی غلط فہمی کی بنا پر، پچاس (۵۰) سپاہیوں کا ایک دَستہ
حضرت مفتی صاحب کے مکان پر چڑھ دوڑا۔ اس پر منشی جیون لال کا تحریری بیان ہے:
''یہ دیکھ کر کہ، وہاں، ستر (۷۰) جہادی، مقابلہ کے لئے تیار ہیں، وہ واپس چلا آیا۔''

ص ۲۱۲۔ **روزنامچہ منشی جیون لال۔** (ص ۲۲۵ وص ۲۲۶۔ **علمائے ہند کا شاندار ماضی**۔ جلدِ چہارم از سید محمد میاں، دیوبندی۔ کتابستان، گلی قاسم جان، دہلی ۶)

مولانا نورُالحسن راشد کاندھلوی لکھتے ہیں:

''مفتی (صدرُ الدین آزردہ) صاحب، شاہ محمد اسحٰق کی دہلی سے ہجرت (۱۲۵۸ھ) کے بعد، نہ صرف دہلی، بلکہ شمالی ہند کے غالباً، سب سے ممتاز عالم، ادیب، محقق اور غیر متنازعہ شخص تھے۔
ہر قسم کی علمی، دینی، ادبی، فقہی موضوعات پر
ان کی رائے، ہر مکتبۂ فکر کے علُما اور ہر مجلسِ کمال میں اہم اور لائقِ اِعتنا سمجھی جاتی تھی۔
مفتی صاحب کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے جس میں اُن کا کوئی معاصر، اُن کا ہم سَر نہیں کہ:
ان کے اِبتداے درس وافادہ سے عصرِ حاضر تک، تمام تذکرہ نگار، اُن کی مدح وثنا راست گوئی، حقانیت اور پاکیزگیِ کردار پر، یک زبان اور متفق ہیں۔'' اِلیٰ آخِرِہٖ۔

(ص ۳۵۔ سہ ماہی مجلّہ **''احوال وآثار''**، کاندھلہ ضلع مظفرنگر، یوپی۔ شمارہ نمبر ۲۱۔۲۰۔ جلد نمبر ۲۔ شوال ۱۴۲۹ھ تا ربیع الاول ۱۴۳۰ھ۔ اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۸ء تا جنوری، مارچ ۲۰۰۹ء)

○○○

قائدِ جنگِ آزادی
علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی

اپنے وقت کے دومعروف عُلمائے کرام

(۱) حضرت مولانا بہاءالدین فاروقی، مفتیِ رُہتک (پنجاب۔موجودہ صوبہ ہریانہ)

(۲) حضرت مولانا شمس الدین فاروقی، مفتیِ بدایوں (روہیل کھنڈ)

(۳) فرزندانِ شیرالملک بن شاہ عطاءالملک فاروقی کی نسل میں کئی جلیل القدر عُلما پیدا ہوئے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز بنِ شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم دہلوی، مفتی بہاء الدین کی اور حضرت علاَّمہ فضلِ حق خیرآبادی بن علاَّمہ فضلِ امام خیرآبادی بن قاضی ارشد، ہرگامی مفتی شمس الدین کی اولاد میں ہیں۔

علاَّمہ فضلِ امام، فاروقی، خیرآبادی، صدرُ الصُّدور دہلی (متوفی ۱۲۴۴ھ/ ۲۹۔۱۸۲۸ء) علاَّمہ فضلِ حق خیرآبادی (متولد ۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۷ء۔متوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) کے والدِ ماجد ہیں۔

جن کے بارے میں سرسیداحمد خاں (متوفی ذوالقعدہ ۱۳۱۵ھ/ مارچ ۱۸۹۸ء) لکھتے ہیں:

’’اَکملِ اَفرادِ نوعِ اِنسی، مَہبطِ اَنوارِ فُیوضِ قُدسی، سَرابِ سرچشمۂ عین الیقین، مؤسّسِ اَساسِ مِلَّت ودین، ماحیِ آثارِ جَہل، ہادمِ بِنِۂ اِعتساف، مُحیِ مراسمِ علم، بانی مبانی انصاف، قدوۂ عُلمائے فُحول، حاویِ معقول ومنقول، سنداَ کابرِ روزگار، مَرجعِ اَعالی وَ اَدانیِ ہر دیار، مزاج دانِ شخصِ کمال، جامعِ صفاتِ جلال وجمال، مَوردِ فیضِ اَزل وَاَبد، مَطرحِ اَنظارِ سعادت سرمد، مِصداقِ مفہومِ اَجزائے واسطۃ العِقد، سلسلۂ حکمتِ اِشراقی وَمَشّائی، زُبدۂ کرام، اُسوۂ عِظام، مقتدائے اَنام

مولانا ومخدومنا مولوی فضلِ امام، اَدْخَلَہُ اللّٰہُ الْمِنْعَامُ فِی جَنَّۃِ النَّعِیم بِلُطْفِہٖ الْعَمِیم۔

... علومِ عقلیہ اور فنونِ حکمیہ کو، ان کی طبعِ وقّاد سے اعتبار تھا اور علومِ ادبیہ کو ان کی زبان دانی سے افتخار۔ اگر، ان کا ذہنِ رَسا، دلائلِ قاطعہ، بیان نہ کرتا، فلسفہ کو معقول، نہ کہتے۔

اور ان کا فکرِ صائب، براہینِ ساطعہ، قایم نہ کرتا

اَشکالِ ہندسہ، تارِ عنکبوت سے سُست تر، نظر آتیں۔

اِس نَواح میں ترویج، علمِ حکمت ومعقول کی، اِسی خاندان سے ہوئی۔

گویا: اِس دودۂ والا تبار سے اِس علم نے یک جہتی پائی۔

باوجود، اِن کمالات کے، خُلق اور حِلم کا کچھ حساب نہ تھا۔

ہمیشہ، سرکارِ حُکَّام میں مناصبِ بلند سے سرفراز اور اَبنائے عہد سے ممتاز رہے۔

پایۂ ہمت آپ کا بہت بلند تھا اور سلوک آپ کا حق پسند۔

بہ سبب کثرتِ ایثار کے، تنگ دستیِ خلائق، دیکھ نہ سکتے تھے

اور، بہ سبب خُلقِ وسیع کے، ہر عاجز وزبوں حال کو، عرض ونیاز سے منع نہ کرتے۔‘‘

(ص ۵۶۰ وص ۵۶۱۔ **آثارُ الصَّنادید**۔ از سرسید احمد خاں۔ مطبوعہ: اردو اکاڈمی، دہلی۔ ۲۰۰۰ء)

اسی طرح کے القاب وآداب اور مدح وستائش کے ساتھ

سرسید نے علاَّمہ فضلِ حق خیرآبادی کا بھی تعارف لکھا ہے۔ چنانچہ، وہ لکھتے ہیں:

مستجمعِ کمالاتِ صوری ومعنوی، جامعِ فضائلِ ظاہری وباطنی، بنّاءِ بِنائے فضل وافضال، بہار آرائے چمنستانِ کمال، متکیِ اَرایکِ اِصابتِ رائے مسند نشینِ اَفکارِ رَسا، صاحبِ خُلقِ محمدی، مَوردِ سعاداتِ ازلی وابدی، حاکمِ محاکمِ مناظرات، فرماں رَوائے کشورِ محاکمات، عکسِ آئینۂ صافی ضمیری

ثالثِ اِثنین بدیعی وحریری، اَلمعیِ وقت وَلوذعیِ زمان

فرزدقِ عہد ولبیدِ دوران، مُبطلِ باطل ومحققِ حق، مولانا محمد فضلِ حق۔

یہ حضرت، خَلفُ الرشید ہیں، جنابِ مُستطاب، **مولانا فضلِ امام**، غَفَرَلہُ اللّٰہُ الْمِنعام کے۔ اور تحصیل، علومِ عقلیہ ونقلیہ کی اپنے والد ماجد کی خدمتِ بابرکت سے کی ہے۔

زبانِ قلم نے ان کے کمالات پر نظر کر کے، فخرِ خاندان لکھا ہے۔

اور فکرِ دقیق نے جب سِرّ کار کو دریافت کیا، فخرِ جہاں پایا۔
جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی
تو گویا، انھیں کی فکرِ عالی نے بِنا ڈالی ہے۔
عُلمائے عصر، بَل فُضَلائے دَہر کو کیا طاقت ہے کہ:
اِس سرگروہِ اہلِ کمال کے حضور میں بساطِ مناظرہ، آراستہ کرسکیں۔
بارہا، دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ (اپنے) آپ کو یگانۂ فن سمجھتے تھے، جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا، دعوائے کمال کو فراموش کرکے، نسبتِ شاگردی کو اپنا فخر سمجھے۔''

(ص ۵۶۲۔ آثار الصَّنادید، از سرسید۔ مطبوعہ: اردو اکاڈمی، دہلی۔ ۲۰۰۰ء)

علاّمہ فضلِ حق نے اپنے والد ماجد، علاّمہ فضلِ امام خیرآبادی، صدرُ الصُّدور دہلی اور حضرت شاہ عبدالقادر، محدّث دہلوی و حضرت شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی سے تعلیم و تربیت، حاصل کی۔
۱۲۲۵ھ/ ۱۸۰۹ء میں بعمر تیرہ سال، تمام علوم نقلیہ و عقلیہ کی تکمیل کرلی۔
ایک مدت تک، درس و تدریس میں مصروف رہے، اور پھر، اَواخرِ ۱۸۱۵ء میں سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوگئے۔ جس کا سلسلہ، آپ کے والد ماجد کے وصال (۱۸۲۹ء) تک، جاری رہا۔
اس کے بعد، ۱۸۳۰ء میں نواب فیض محمد خاں، والیِ جھجر (صوبہ پنجاب۔ موجودہ صوبہ ہریانہ) نے قدردانی کے ساتھ، آپ کو اپنے یہاں بلایا۔
اور، پانچ سو روپے (۵۰۰) ماہانہ، نذرانہ، پیش کرتے رہے۔
دہلی سے جھجر، روانگی کے وقت، بہادر شاہ ظفر نے اپنا ملبوس دوشالہ
علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کو اُڑھایا اور آب دیدہ ہوکر کہا:
''چوں کہ آپ جانے کو تیار ہیں۔ میرے لئے بجز اِس کے، کوئی چارۂ کار نہیں کہ:
میں بھی اس کو منظور کروں۔ مگر، خدا، علیم ہے کہ لفظِ ''وَداع'' زبان پر لانا، دشوار ہے۔''
مرزا غالبؔ نے اپنے ایک خط میں اِس واقعہ کا مؤثر انداز میں ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:
بالجُملہ، بعد ازیں اِستعفا، نواب فیض محمد خاں (رئیسِ جھجر)
پانصد روپیہ برائے مصارفِ ماہانہ خُدّامِ مخدومی، معیَّن کرد، و نزدِ خود، خواند۔
روزے کہ مولوی فضلِ حق ازیں دیار رفت

ولی عہد خسرو دہلی، صاحبِ عالم مرزا ابوظفر بہادر.........
دوشالۂ ملبوسِ خاص، بہ دوشِ وَے نہاد۔
و آب در دیدہ گردانید وفرمود کہ:
ہر گاہ، شما می گوئید کہ مَن رخصت می شوم، مرا جُز ایں کہ بہ پذیرم، گریز نیست۔
امّا ایزد دانا، داند کہ لفظِ وَداع، از دل، بہ زباں نمی رسد، اِلّا بصد جَرِّ ثقیل۔''

(یادگارِ غالبؔ۔ مطبوعہ: دہلی)

جھجر (پنجاب۔ موجودہ صوبہ ہریانہ) کے بعد، علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی نے مہاراجہ اَلْوَر (راج پوتانہ) کی دعوت پر، ریاستِ اَلور، پھر، نواب ٹونک (راج پوتانہ) و نوابِ رام پور (روہیل کھنڈ) کی دعوت پر، ٹونک و رام پور میں ملازمت کی۔
ریاستِ رام پور کے بعد لکھنؤ کے صدرُ الصُّدور اور ''حضور تحصیل'' کے مہتمم بنائے گئے۔
محمد حسین آزادؔ، کلامِ غالبؔ کے انتخاب اور دیوانِ غالبؔ کے تعلق سے
اپنی معلومات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
''سِن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ:
حقیقت میں ان (غالبؔ) کا دیوان، بڑا تھا۔ یہ منتخب ہے۔
مولوی فضلِ حق صاحب خیرآبادی، فاضلِ بے عدیل تھے۔
جو ایک زمانے میں دہلی کی عدالتِ ضلع میں، سررشتہ دار تھے.......
انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا، تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ:
یہ اشعار، عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔
مرزا نے کہا: جو کچھ کرچکا، اب کیا تدارک ہوسکتا ہے؟
انھوں نے کہا:
خیر، جو ہوا، سو ہوا۔ انتخاب کرو اور مشکل شعر، نکال ڈالو۔
مرزا صاحب نے دیوان، حوالے کردیا۔
دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔
وہ یہی دیوان ہے، جو آج، عینک کی طرح

لوگ، آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔"

(ص:۵۱۲۔ آبِ حیات۔ از محمد حسین آزاد۔ مطبوعہ دہلی)

خواجہ الطاف حسین، حالؔی (متوفی ۱۹۱۴ء) لکھتے ہیں:

"مولوی فضلِ حق سے مرزا کی رسم وراہ، جب بہت بڑھ گئی
اور مرزا، اُن کو اپنا خالص و مخلص دوست اور خیر خواہ سمجھنے لگے
تو انہوں نے اس قسم کے اشعار پر، روک ٹوک کرنی، شروع کر دی۔
یہاں تک کہ انہیں کی تحریک سے
انہوں نے اپنے اردو کلام میں سے، جو اُس وقت، موجود تھا، دو ثلث کے قریب نکال دیا۔
اور اس کے بعد، اس رَوِش پر چلنا، بالکل چھوڑ دیا۔" (یادگارِ غالبؔ۔ از خواجہ حالؔی۔ مطبوعہ دہلی)

ڈاکٹر، سید محی الدین قادری، زورؔ لکھتے ہیں:

............مولوی فضلِ حق خیرآبادی جیسی سخن فہم اور پاکیزہ ذوق ہستی سے
غالبؔ نے اس زمانے میں بہت کچھ، حاصل کیا۔ اور ان لفظی و معنوی تعقیدوں سے پرہیز کرنے لگے
جو اُن کے ابتدائی کلام میں بیدلؔ کی تقلید کا نتیجہ تھا۔
اگر، مولوی فضلِ حق سے ملاقات نہ ہو جاتی
تو شاید، میر تقی میرؔ کی پیشین گوئی کی دوسری شق پوری ہو جاتی جس میں انھوں نے کہا تھا کہ:
یہ لڑکا، بھٹک جائے گا۔" (ص ۲۰۔ **سرگذشتِ غالبؔ**۔ از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ۔
افضل برقی پریس۔ حیدرآباد۔ طبع دوم۔ ۱۹۵۰ء)

شیخ محمد اِکرام (متولد ۱۹۰۸ء۔ متوفی ۱۹۷۳ء) لکھتے ہیں:

"مولانا فضلِ حق خیرآبادی، جو علاوہ، اپنی دینی و علمی خدمات کے
اِس لئے بھی یاد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے غالبؔ کو بیدلؔ کی تقلید سے روکا۔
اور ان کی ادبی تربیت کے لئے ایسے استادِ کامل، ثابت ہوئے
جو بقول میر تقی میرؔ: مرزا کی شاعری کی نشو و نما کے لئے ضروری تھا۔"

(ص: ۸۲۔ **غالبؔ نامہ**، مطبوعہ لاہور۔ ۱۹۳۶ء)

"مولوی فضلِ حق، غالبؔ کے سب سے بڑے مُحبّ اور مُحسن تھے۔

انھوں نے، جو اُن کا اصل دائرۂ عمل تھا، رِندمنش غالبؔ کو متانت و اِستقامت کا
راستہ دکھایا اور علم و فضل کی محبت میں اُستوار کیا۔
بلکہ آگے چل کر، اُن کی مادّی مشکلات، دور کرنے کی بھی کوشش کی۔
اور مرزا (غالبؔ) کے تعلقات، دربارِ رام پور سے وابستہ کرائے۔
جو غدر کے بعد مرزا کی زندگی کا، سب سے بڑا اسہارا تھے۔"

(ص ۵۲۔ **حیاتِ غالبؔ**۔ از شیخ محمد اِکرام۔ مطبوعہ فیروزسنز، لاہور)

ڈاکٹر، سید محی الدین قادری، زورؔ لکھتے ہیں:

"مولانا فضلِ حق خیرآبادی، وہ بزرگ ہستی ہے
جس نے غالبؔ کے اخلاق و عادات و شاعری کی اِصلاح میں بہت بڑا حصہ لیا۔
ان کی بزرگی و عظمت کا، اس واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ:
مرزا جیسے خود رائے و آزادرَو شاعر و ادیب
جن کی نظر میں بڑے بڑے عُلما و شُعرا انہیں جچتے تھے
مولانا خیرآبادی کی بڑی تعظیم و عزت کرتے تھے۔" (ص ۶۲۔ **سرگذشتِ غالبؔ**۔ مطبوعہ: حیدرآباد)

خود، غالبؔ نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ:

**مولانا فضلِ حق، خیرآبادی، مجھ جیسے سیکڑوں
اور عرفؔی شیرازی جیسے ہزاروں کی تربیت کر سکتے ہیں۔ مرزا غالبؔ، رقم طراز ہیں:
چوں مَن صد، و عرفؔی صد ہزارارا، بہ سخن پرورش تواند کرد۔"**

(ص ۱۰۳۔ **پنج آہنگ**، از مرزا غالبؔ۔ مجلس یادگارِ غالبؔ، پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور)

مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی، سابق لائبریرین مولانا آزاد لائبریری
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (متوفی ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء) علاّمہ خیرآبادی کی ملازمت کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"والد ماجد کے انتقال کے وقت، علاّمہ کی عمر، بتّیس (۳۲) سال تھی۔
اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا۔ دہلی میں ریزیڈنٹ رہا کرتا تھا۔ اس کے محکمہ کے
سررشتہ دار ہو گئے۔" (ص ۱۴۸۔ **"باغی ہندوستان"**۔ از عبدالشاہد، شیروانی۔
مطبوعہ: المجمع الاسلامی مبارک پور ۱۹۸۵ء)

مفتی صدرالدین، آزردہؔ، دہلوی وعلاّمہ فضلِ حق خیرآبادی اور مرزا اسدُ اللہ غالبؔ کے باہمی ربط وتعلق کے بارے میں مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی لکھتے ہیں:

''مرزا غالبؔ سے علاّمہ کے پُرخلوص اور گہرے تعلقات تھے۔
اس کی وجہ، شاید یہ بھی تھی کہ دونوں، بالکل، ہم سِن تھے۔
دونوں ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہؔ **''ثالثِ ثلثہ''** تھے۔
یہ تینوں، ایک جسم کے لئے **''اَبعادِ ثلثہ''** (طول، عَرض، عُمق) کا حکم رکھتے تھے۔
جس طرح، جسم اپنے اَبعاد کے بغیر، نہیں سمجھا جا سکتا
اسی طرح، ان تینوں کو جسمِ خلوص ومحبت سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔
مفتی صاحب، دونوں سے آٹھ سال، بڑے تھے۔''

(ص ۱۵۷۔ **باغی ہندوستان**۔ مطبوعہ مبارک پور)

''دہلی میں علما کی، دوجگہ، نشست تھی۔ ایک علاّمہ (فضلِ حق) کے یہاں۔
دوسرے مفتی صدرالدین آزردہؔ کے دولت کدہ پر۔
علاّمہ کے علمی دربار میں آٹھویں روز، شُعَرائے دہلی کا اِجتماع ہوتا تھا۔
غالبؔ، صہبائیؔ، مومنؔ، آزردہ، احسانؔ، نیرؔ، نثارؔ، شیفتہؔ، ضمیرؔ، ممنونؔ، نصیرؔ، وغیرھُم۔
عُلما میں مولوی عبداللہ خاں علوی، مولوی عبدالخالق، مولوی محبوب علی، مولوی نصیرالدین شافعی، مولوی کریم اللہ، مولوی نورُالحسن، مولوی کرامت علی، مولوی مملوک علی، مفتی سید رحمت علی مولوی امان علی، مولوی محمد جان، مولوی محمد رستم علی خاں، وغیرھُم۔
......اندازہ لگایئے کہ اکبر بادشاہ کے شاہی دربار سے، یہ دربار کسی طرح کم تھے؟
بادشاہ نے لاکھوں روپے، صَرف کرکے، نورتن، جمع کیے تھے۔
اور، اِن شاہانِ علم نے اپنے حُسنِ اخلاق سے سینکڑوں باکمال حضرات کو، درباری بنالیا تھا۔''

(ص ۱۶۲ و ۱۶۳۔ **باغی ہندوستان**۔ ازعبدالشاہد شیروانی، مطبوعہ مبارک پور)

''علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی، ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ چھوڑ کر، ریاستِ اَلوَر چلے گئے تھے۔
اِس دَوران آپ کے دل ودماغ میں انقلاب کی آہٹ، صاف محسوس ہورہی تھی۔
مہاراجہ اَلوَر کو آپ نے اپنا ہم نَوا بنانے کی کوشش کی۔ مگر، اس میں کامیابی نہیں مل سکی۔

حادثۂ مسجد، ہنومان گڑھی (اجودھیا) جس کی کشمکش اور جہاد میں
مولانا امیر علی، امیٹھوی کی ۱۸۵۵ء میں شہادت ہوئی تھی
اُس وقت، لکھنؤ کے کوتوال، نواب احمد یار خاں تھے، ان کے پوتے، عشرت رحمانی لکھتے ہیں:

''حضرت امیرُ المجاہدین، مولانا امیر علی شاہ کی شہادت نے علاّمہ فضلِ حق کو بےحد متأثر کیا اور ان کا دل، انگریزی ڈپلومیسی اور جَبر وظلم سے سخت متنفر ہوگیا۔''

(ص ۱۲۳۔ **جنگِ آزادی کے نامور مجاہدین**۔ ازعشرت رحمانی۔ مقبول اکیڈمی، شاہراہ قائدِ اعظم، لاہور)

مولانا شیروانی، علی گڑھی لکھتے ہیں:

''علاّمہ، اَلور سے نشر واشاعت کرتے ہوئے، مئی ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے۔
میرٹھ اور دوسری چھاؤنیوں میں کارتوسوں کا قضیہ، زور پکڑ چکا تھا۔
گائے اور سُوَّر کی چربی کی آمیزش کی خبر سے ہندو اور مسلمان فوجی بگڑ بیٹھے۔
روٹی کی ٹکیا کی تقسیم، کسی خاص اسکیم کے ماتحت، گاؤں گاؤں، پہلے سے ہو ہی چکی تھی۔
میرٹھ سے، دہلی پر ''باغی فوج'' نے ۱۱؍مئی ۱۸۵۷ء کو حملہ کردیا۔ قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوا۔ **بادشاہِ دہلی، سرگرمیوں کا مرکز بنے۔ علاّمہ بھی شریکِ مشورہ، رہے۔**

منشی جیون لال، اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں:

۱۶؍اگست ۱۸۵۷ء: مولوی فضلِ حق، شریکِ دربار ہوئے۔ انھوں نے اشرفی، نذر، پیش کی اور صورتِ حال سے متعلق، بادشاہ سے گفتگو کی۔
۲؍ستمبر ۱۸۵۷ء: بادشاہ، دربارِ عام میں تشریف فرما ہوئے۔ مرزا الٰہی بخش مولوی فضلِ حق، میر سعید علی خاں، اور حکیم عبدالحق، آداب، بجالائے۔
۶؍ستمبر ۱۸۵۷ء: مولوی فضلِ حق نے اطلاع دی کہ:
متھرا کی فوج، آگرہ چلی گئی ہے اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملے کررہی ہے۔
۷؍ستمبر ۱۸۵۷ء: بادشاہ، دربارِ خاص میں رہے۔ حکیم عبدالحق، میر سعید علی خاں، مولوی فضلِ حق، بدرالدین خاں اور دیگر تمام اُمَرا و رؤسا شریکِ دربار رہے۔ (ص ۲۱۷، ۲۴۰، ۲۴۶، ۲۴۷۔ **روزنامچہ منشی جیون لال**)

اس روزنامچہ سے علاّمہ کی باخبری اور انقلابی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔“

(ص ۲۱۴۔ **”باغی ہندوستان“**۔ از عبدالشاہد شیروانی، علی گڑھی، مطبوعہ: مبارک پور)

بہادر شاہ ظفر سے **مسلسل** رابطہ اور انقلابی سرگرمیوں پر **مسلسل** نظر رکھنے کے
کچھ اَحوال، اِس طرح، بیان کیے جاتے ہیں:

۲۶/ جولائی ۱۸۵۷ء۔ مولانا فضلِ حق خیرآبادی نے ۲۶/ جولائی کو
کمانڈر اِنْ چیف، شہزادہ، مرزا مغل کو فارسی زبان میں خط لکھا اور کہا کہ:
جنرل بخت خاں سے، ان کی جو گفتگو ہوئی ہے
اُس کی تفصیل سے مجھے آگاہ کیا جائے۔ ۲۶/ جولائی، میوٹنی پیپرز بکس نمبر ۱۰۰۔ نمبر ۹۶۔

بحوالہ ص ۳۹۱۔ **بہادر شاہ دوم اور انقلابِ ۱۸۵۷ء**۔ دردِ دہلی۔ از مَہدی حسین۔ مطبوعہ: دہلی ۱۹۵۸ء)

۱۶/ اگست ۱۸۵۷ء۔ مولوی فضلِ حق، شریکِ دربار ہوئے۔ انھوں نے اشرفی، نذر میں
پیش کی اور صورتِ حال کے متعلق، بادشاہ سے گفتگو کی۔ (ص ۱۷۱۔ **”غداروں کے خطوط“**۔ مطبوعہ: لاہور)

۱۸/ اگست۔ مولوی فضلِ حق نے اطلاع دی کہ انگریزی اخبارات لکھ رہے ہیں کہ:
شہر پر قبضہ ہو جانے کے بعد، باشندوں کا قتلِ عام کیا جائے گا۔
اور بادشاہ کے گھرانے میں ایک آدمی بھی ایسا نہ چھوڑا جائے گا
جو بادشاہ کا نام لے، یا اسے پانی کا ایک قطرہ بھی دے سکے۔“

(ص ۲۲۰۔ **”غدر کی صبح و شام“**۔ روزنامچہ منشی جیون لال۔ مطبوعہ: دہلی)

۱۸/ اگست۔ (کرنل بیچر کے مُخبِر کی رپورٹ) مولوی فضلِ حق، اَلْوَر کے راجہ کی
ملازمت، چھوڑ کر، دہلی آ گیا ہے۔ (ص ۱۷۶۔ **”غداروں کے خطوط“**۔ مطبوعہ: لاہور)

۱۸/ اگست۔ بہادر شاہ ظفر کے ایک منشی، مکند لال کی
انگریزوں کو بھیجی گئی رپورٹ، علاّمہ خیرآبادی سے متعلق، کچھ یوں ہے:
جب، بادشاہ، دریا پار کرنے کے بعد اپنے خاص کمرے میں تشریف لے گئے
تو مولوی فضلِ حق، نواب احمد علی خان بہادر، بُڈھا صاحب
اور مرزا خیر سلطان بہادر نے تحریری احکام دیے، جو، مُفصَّلۃً درج ذیل ہیں:
حکم نمبر ۱۶۔ بنامِ حَسَن بخش عرض بیگی، ضلع علی گڑھ کی آمدنی، وصول کرنے کے لئے

مولوی فضلِ حق کی موجودگی میں لکھا گیا اور شمشیر الدّولہ بہادر، و مرزا خیر سلطان بھی موجود تھے۔
حکم نمبر ۱۷۔ بنامِ فیض محمد، اسے ضلع بلند شہر و علی گڈھ کی آمدنی، وصول کرنے پر
مقرر کیا گیا ہے۔ **حسبِ ہدایتِ مولوی فضلِ حق، تحریر کیا گیا۔**
حکم نمبر ۱۸۔ بنامِ ولی داد خاں۔ مذکورہ دونوں آدمیوں کی آمدنی، وصول کرنے میں
مدد دینے کے لئے تحریر کیا گیا۔ مولوی فضلِ حق۔
حکم نمبر ۲۶۔ بنام مولوی عبد الحق۔
ضلع گوڑ گانوہ کی مالگذاری، آمدنی، وصول کرنے کا انتظام کیا جائے۔
حسبِ ہدایتِ مولوی فضلِ حق لکھا گیا، جن کا بھتیجا، گوڑ گانوہ (میوات) جائے گا۔“

(ص ۱۲۷ تا ۱۲۹۔ **”غدر کے فرمان“**۔ مؤلّفہ: خواجہ حسن نظامی۔ مطبوعہ دہلی)

۱۹/ اگست۔ عبدالحق اور مولوی فیض محمد، لگان وصول کرنے کی غرض سے گوڑ گانوہ گئے۔

(ص ۲۲۲۔ **”غدر کی صبح و شام“**۔ روزنامچہ جیون لال۔ مطبوعہ: دہلی ۱۹۲۶ء)

۱۹/ اگست۔ جب ہنگامہ، برپا ہوا، تو مولوی فضلِ حق آئے۔
دربار میں حاضر ہوئے، نذر، پیش کی، انھیں انتظام سنبھالنے کی خواہش تھی۔

(ص ۹۶۔ **۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ**۔ برطانوی جاسوس، عبداللّطیف کی رپورٹ)

۲۸/ اگست۔ **مولوی فضلِ حق، جب سے دہلی آیا ہے، شہریوں اور فوج کو**
انگریزوں کے خلاف، اُکسانے میں مصروف ہے۔ وہ کہتا پھرتا ہے کہ:
اس نے آگرہ گزٹ میں برطانوی پارلیمنٹ کا ایک اعلان پڑھا ہے
جس میں انگریزی فوج کو، دہلی کے تمام باشندوں کو قتل کر دینے
اور پورے شہر کو، مسمار کر دینے کے لئے کہا گیا ہے۔
آنے والی نسلوں کو یہ بتانے کے لئے کہ یہاں، دہلی شہر، آباد تھا
شاہی مسجد کا صرف ایک مینار، باقی چھوڑا جائے گا۔
.........ممکن ہے، باغی فوج، آج، انگریزی مورچوں پر حملہ کرے،..........
مولوی فضلِ حق کے کہنے پر شہزادے، اب حملہ کرنے والی فوج کے ساتھ
محاذ پر جاتے ہیں اور عموماً، سبزی منڈی (دہلی) کے پُل پر لڑتے ہیں۔

(ص ٢٠٣ و ص ٢٠٤۔ ''**غداروں کے خطوط**''۔ رپورٹ از برطانوی مُخبر، تُراب علی۔ مطبوعہ: لاہور)

٣٠ / اگست۔ اگر، آپ، مرزا الٰہی بخش کو اس خط کا جواب دیں تو اس مقصد کے لئے اپنا اثر و رسوخ، استعمال کرے گا۔ **اور مولوی فضلِ حق اور دوسرے باغیوں کو شہر سے باہر نکال دے گا۔**

(ص ٢١٣۔ ''**غداروں کے خطوط**''۔ رپورٹ از برطانوی مُخبر، تُراب علی۔ مطبوعہ لاہور)

کیم، تا گیارہ ستمبر۔ کورٹ، یعنی ''**جنگی مشاورتی کونسل**'' کے ممبروں کے نام، یہ ہیں:

........ان کے علاوہ، کونسل میں دہلی کی، ہر رجمنٹ کے پانچ پانچ سپاہی

اور مولوی فضل حق بھی شامل ہیں۔

(ص ٢١٨ و ص ٢١٩۔ رپورٹ از برطانوی جاسوس، تُراب علی۔ ''**غدّاروں کے خطوط**''۔ مطبوعہ لاہور)

٦ / ستمبر۔ بادشاہ، دربار میں تشریف فرما ہوئے۔

...........**مولوی فضلِ حق نے اطلاع دی کہ:**

متھرا کی فوج، آگرہ چلی گئی ہے اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد، شہر پر حملہ کر رہی ہے۔''

(ص ٢٤٦۔ ''**غدر کی صبح و شام**''۔ روزنامچہ، منشی جیون لال۔ مطبوعہ دہلی)

٧ / ستمبر۔ **مولوی فضلِ حق اپنے مواعظ سے عوام کو مسلسل بھڑکا رہے ہیں۔**

(ص ٢٧٣۔ **اخبار دہلی**۔ رپورٹ از چُنّی لال۔ اخبار دہلی۔ فائل نمبر ١٢٧)

''علاّمہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے۔ مشورہ کے بعد

علاّمہ خیر آبادی نے آخری تیر، تَرکش سے نکالا۔

بعد نمازِ جمعہ، جامع مسجد (دہلی) میں علما کے سامنے تقریر کی۔ اِستفتا، پیش کیا۔

مفتی صدرُ الدین خاں، آزردہ، صدرُ الصّدور دہلی، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ، دہلوی

مولانا فیض احمد، بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں، اکبر آبادی، سید مبارک شاہ، رام پوری نے دستخط کیے۔

اِس فتویٰ کے شایع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔

دہلی میں نوے ہزار سپاہ، جمع ہو گئی تھی۔

(''**تاریخ عروجِ عہدِ انگلشیہ**''۔ از ذکاءاللہ، دہلوی۔ بحوالہ ص ٢١٥۔ **باغی ہندوستان**، مطبوعہ مبارک پور)

پروفیسر خلیق احمد نظامی، شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ لکھتے ہیں:

پھر، اِقتصادی اعتبار سے بھی، یہ حقیقت، فراموش نہیں کی جا سکتی کہ:

ہندوستانی سپاہی، جو بہادر شاہ کے گرد، جمع ہو گئے تھے، انھیں سخت ترین مالی دشواریاں، پیش آ رہی تھیں۔ آئے دن، فوج کے ضروری اخراجات کے لئے روپیہ، قرض لینے کی ضرورت پڑتی تھی۔

ایسی صورت میں کوئی فوج، بے فکری کے ساتھ، کام نہیں کر سکتی تھی۔

منشی جیون لال نے اپنے روزنامچہ میں بہادر شاہ

اور مولوی فضلِ حق کی گفتگو، نقل کی ہے۔

بہادر شاہ نے جب، مولوی (فضلِ حق) صاحب کو حکم دیا کہ:

''اپنی اَفواج کو لڑانے کے لئے لے جاؤ اور انگریزوں کے خلاف، لڑاؤ''

تو انھوں نے کہا۔ ''افسوس تو اِسی بات کا ہے کہ:

سپاہی، اُن کا کہا، نہیں مانتے، جو، اُن کی تنخواہ دینے کے ذمہ دار نہیں۔''

(ص ٢٢٠۔ ''**غدر کی صبح و شام**''۔ بحوالہ ص ٣٥۔ ''**مقدمہ ١٨٥٧ء کا تاریخی روزنامچہ**''۔
مؤلّفہ: پروفیسر خلیق احمد نظامی، مکتبہ ندوۃ المصنّفین، اردو بازار، دہلی ١٩٧١ء)

ایک اہم دستاویز کی تازہ بازیافت، کچھ اِس طرح ہے:

''راقم، اِس سلسلے میں نیشنل آرکائیوز آف انڈیا (نئی دہلی) میں

١٨٥٧ء سے متعلق دستاویزات کی چھان پھٹک کر رہا تھا کہ:

اس میں علاّمہ فضلِ حق کے فتوائے جہاد کے تعلق سے ایک دستاویز ملا، جو ٹونک کے نواب وزیرالدّولہ (متوفی ١٢٨١ھ/١٨٦٤ء۔ فرزندِ نواب امیر خان بانیِ ریاست ٹونک، راج پوتانہ) کی جانب سے جاری کیا گیا ہے۔

اور اس میں انگریزوں کے خلاف، جہاد کو، ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ اس تحریر کی عبارت، یوں ہے:

''نواب نے (یہاں، عبارت پڑھی نہیں گئی) کہا کہ:

جہاد، انگریزوں پر، درست نہیں۔ بعد، اس کے، سب فوجی سے کہا کہ:

میں، نمک خوار، انگریزوں کا ہوں۔ میں، نمک حرام نہیں ہوتا۔

اور تم میرے نمک خوار ہو۔ تم کو اختیار ہے کہ چاہو، تو نمک حرام ہو جاؤ۔

چنانچہ، اس بات پر، پانچ سو آدمیوں نے نوکری چھوڑ دی۔''

اس تحریر کے بعد، درمیان میں دیگر کچھ باتوں کے بعد، لکھا ہے:

مولوی فضلِ حق، شریکِ جلسہ (میٹنگ) ہوتے ہیں اور مشتمل بر بخت خاں کے محمد شفیع رسالدار، مولوی سرفراز علی خاں، مولوی امداد علی، ساکن، بلب گڑھ، رسالدار ہیں۔

اور جو کچھ، بخت خاں کرتا ہے، ابتدا میں ان (مولوی فضلِ حق) کے مشورے سے ہوتا ہے۔

اور مولوی کی اطاعت، ظِلِّ شاہ دربارِ خاص میں ضروری سمجھی جاتی ہے۔

میوٹنی پیپرز، کلکشن: ۱۶ نمبر: ۱۲، یکم ستمبر ۱۸۵۷ء۔ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی۔

(ص ۱۱۔ اداریہ، ماہنامہ جامِ نور، دہلی۔ شمارہ رجب/شعبان ۱۴۳۲ھ/جولائی ۲۰۱۱ء۔ بقلم: خوشتر نورانی)

۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان
شروع ہونے والی جنگ، مختلف مراحل سے گذرتی رہی۔
جنگ کا نقشہ اُلٹتا پلٹتا رہا، لیکن ۱۴ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے
دہلی پر، پوری طاقت وقوت کے ساتھ، حملہ کیا اور ۱۹ر ستمبر کو
دہلی پر اور بالفاظِ دگر، پورے متحدہ ہندوستان پر، اس کا مکمل قبضہ ہو گیا۔
بہادر شاہ ظفر، قلعۂ ہمایوں سے ۲۱ر ستمبر (۱۸۵۷ء) کو گرفتار کر لیے گئے۔

جنرل بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں، اکبر آبادی، مولانا فیض احمد، بدایونی، وغیرھُم لکھنؤ چلے گئے۔ اور مولانا احمدُ اللہ شاہ، مدراسی کے پرچم کے نیچے، جمع ہو کر، انگریزوں سے لڑتے رہے۔

آخر میں شاہجہاں پور پہنچے اور اپنی حکومت، قائم کر لی۔ پھر، آخری شکست، بماہِ جون ۱۸۵۸ء کے بعد، روپوش ہوتے ہوئے نیپال گئے۔ اس کے بعد کسی کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔

بلدیو سنگھ، راجہ پوائیں، شاہجہاں پور کی غداری سے مولانا احمدُ اللہ شاہ، مدراسی، ۲ر ذوالقعدہ ۱۲۷۴ھ/ ۱۵ر جون ۱۸۵۸ء کو شہید ہو گئے اور جہان آباد (شاہجہان پور) میں آپ کا سر، مدفون ہوا۔

علاّمہ فضلِ حق، ۲۴ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو، دہلی سے نکل کر کسی طرح، اَوَدھ پہنچے۔
جہاں، لکھنؤ میں ۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۹ء میں آپ پر مقدمہ چلا اور کالا پانی کی سزا ہوئی۔
وہیں ۱۲ر صفر ۱۲۷۸ھ/ ۲۰ر اگست ۱۸۶۱ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔
آپ کے دوست، مرزا غالبؔ نے انتقال کی خبر سنی
تو شیخ لطیف احمد، بلگرامی کے نام اپنے ایک خط میں لکھا:

**''کیا لکھوں اور کہوں؟ نور، آنکھوں سے جاتا رہا اور دل سے سرور۔
ہاتھ میں رَعشہ، طاری ہے۔ کان، سماعت سے عاری ہے۔**

عِتابِ عُروساں در آمد بجوش
صُراحی تہی گشت و ساقی خموش

**فخرِ ایجاد و تکوین، مولانا فضلِ حق، ایسا دوست مر جائے۔
غالبِ نیم مردہ، نیم جاں رہ جائے۔**

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے، پَر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب، کسی بات پر نہیں آتی

(ص ۳۲۔ اردوئے معلّٰی، علی گڑھ۔ دسمبر ۱۹۰۷ء)

علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی کے خلاف، جرمِ بغاوت کی دفعات
اِس طرح، عاید کی گئی تھیں:
بہ عدالتِ لکھنؤ۔ مؤرخہ ۱/۲/۴/ مارچ ۱۸۵۹ء۔
بہ اجلاسِ لیفٹیننٹ، جی کیمبل، جوڈیشیل کمشنر آف اَوَدھ۔
ومیجر، بیرو، سی، ایم، اوفشٹنگ کمشنر، خیر آباد ڈویژن۔
مولوی فضلِ حق پر، مندرجہ ذیل الزامات، عاید کیے گئے۔

بغاوت اور قتل کی سازش

نکتہ (۱): ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں باغیِ سرکار کی حیثیت میں
دہلی، اَوَدھ اور دوسری جگہوں پر بغاوت اور قتل میں مدد دی۔

نکتہ (۲): بوندی میں ماہِ مئی ۱۸۵۸ء میں باغی سردار، مَمّو خاں (اَوَدھ) کے مُشیرِ خاص کی حیثیت سے نمایاں کام، انجام دیا۔

نکتہ (۳): بوندی میں ماہِ مئی ۱۸۵۸ء میں ملازم عبدالحکیم سرکار انگلشیہ کے خلاف، سازشِ قتل کی۔

عدالت نے قیدی کو مندرجہ ذیل وجوہ پر مُجرم قرار دیا:
(۱) ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں باغیوں کی کونسل میں، خاص کام، انجام دیے۔
خاص طور پر، باغی سردار، مَمّو خاں کے مشیرِ خاص کی حیثیت سے

اس نے ایسے اصولوں کی اشاعت کی، جس سے قتل کے امکانات پیدا ہوئے۔
۴/ مارچ کو مجرم کو عمر قید بعبور دریائے شور بحیثیت قیدی سرکارِ انگلشیہ
اور ضبطیِ جائداد کی سزا دی گئی—— لکھنؤ۔ ۴/ مارچ ۱۸۵۹ء۔

.........اِس مقدمہ کی مزید تحقیق و تفصیل کے لئے **''باغی ہندوستان''**
مرتّبہ: عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی (مطبوعہ مبارک پور ۱۹۸۵ء) کا مطالعہ کیا جائے۔
جس میں اس سلسلے میں کافی مستند مواد، پیش کر دیا گیا ہے۔
مذکورہ فیصلے میں جس 'بوندی' کا نام، درج ہے
وہ موجودہ خطۂ بہرائچ (اتر پردیش) میں واقع ہے۔

مولانا انتظام اللہ، شہابی، اکبر آبادی (متوفی ۱۹۶۸ء)
اس فیصلے کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:
''۱۸۵۹ء میں سلطنتِ مغلیہ کی وفاداری، یا۔ فتوائے جہاد، یا۔ جُرمِ بغاوت میں
مولانا فضلِ حق، خیر آبادی، ماخوذ ہو کر، سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے۔
مقدمہ چلا۔ مولانا موصوف کے فیصلے کے لئے جیوری بیٹھی۔
ایک اسیسر نے واقعات سن کر، بالکل چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔
سرکاری وکیل کے مقابل، خود مولانا، بحث کرتے تھے۔ بلکہ لطف، یہ تھا کہ:
چند الزامات، خود اپنے اوپر، قائم کیے اور پھر، خود، مثلِ تارِ عنکبوت، عقلی و قانونی اَدِلّہ سے توڑ دیے۔
جج، یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا اور ان سے ہمدردی بھی تھی۔ کرے تو کیا کرے؟
ظاہر، یہ ہو رہا تھا کہ مولانا، بری ہو جائیں گے۔ سرکاری وکیل، لاجواب تھے۔
.........دوسرا دن، آخری دن تھا۔ آپ نے اپنے اوپر
جس قدر الزامات، عاید کیے تھے، ان کو ایک ایک کر کے، رَد کیا۔
اور جس مُخبر نے فتویٰ کی خبر دی، اس کے بیان کی توثیق و تصدیق کی اور فرمایا:
''اس گواہ نے سچ کہا تھا۔ وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے۔
اور آج، اِس وقت بھی، میری، وہی رائے ہے۔''
چنانچہ، اس کے بعد، بے حد رنج کے ساتھ، عدالت نے حبسِ دوام کا حکم سنایا۔

آپ نے مسرت سے منظور کیا۔ یہ جج، آپ سے کام سیکھ چکا تھا'' الخ۔
(ص ۳۷، ۳۸۔ **''غدر کے چند علما''**۔ مطبوعہ: دہلی)

مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی (متوفی ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء) لکھتے ہیں:
''بغاوت، وسطِ مئی ۱۸۵۷ء میں شروع ہوئی۔ جوں ہی اس کی اطلاع ملی
علاّمہ (فضلِ حق، خیر آبادی) اہلِ خانہ کو، اَلور چھوڑ کر دہلی آ گئے۔
اور سرگرمی سے بغاوت کی رہنمائی اور حکومت کے دستورُ العمل کی ترتیب، شروع کر دی۔
جولائی میں جنرل بخت خاں کے دہلی آنے پر فتوائے جہاد، مرتّب کر کے عُلما کے دستخط کرائے۔
اسی دَوران، راجہ اَلور، بنّے سنگھ کی خبرِ اِرتحال پر، اَلور چلے گئے۔
تقریباً ایک ماہ میں واپس، دہلی آ گئے۔ پھر، پندرہ (۱۵) یوم، دہلی میں قیام کر کے
اَلور آ گئے اور اپنے اہل و عیال کو لے کر، اَوائلِ ستمبر میں دہلی آ گئے۔
وسطِ ستمبر ۱۸۵۷ء میں دہلی پر، انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔''
(ص ۲۶۔ **''باغی ہندوستان''**۔ از عبدالشاہد شیروانی، مطبوعہ مبارک پور)

انقلابِ ۱۸۵۷ء میں علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی کی شرکت
اور فکری قیادت کی معاصر اور داخلی شہادتیں، کافی اہمیت کی حامل ہیں۔
''مولوی فضلِ حق کی اشتعال انگیزیوں سے متاثر ہو کر شہزادے بھی میدان میں نکل آئے
اور سبزی منڈی (دہلی) کے پھل والے محاذ پر صف آرا ہیں۔'' (اخبار دہلی۔ رپورٹ تُراب علی)
''مولوی فضلِ حق اپنے مواعظ سے عوام کو مسلسل بھڑکا رہے ہیں۔''
(اخبار دہلی۔ ۳-۲۷۔ فائل ۱۲۷۔ رپورٹ از چنی لال)
''بادشاہ نے جنرل بخت خاں، مولوی سرفراز علی اور مولوی فضلِ حق پر مشتمل
''کِنگ کونسل'، بنائی۔'' (**دی گریٹ ریوولیشن آف ۱۸۵۷ء**۔ ص ۱۸۲۔ ۱۸۳)

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، اپنی مشہور کتاب **''ہمارے ہندوستانی مسلمان''** میں علاّمہ فضلِ حق، خیر آبادی
کے صاحبزادے، مولانا عبدالحق، خیر آبادی (متوفی ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء)
جو ایک زمانہ میں صدرُ المدرسین، مدرسہ عالیہ، کلکتہ تھے، اُن کے بارے میں لکھتا ہے:
''موجودہ ہیڈ مولوی، اُس عالمِ دین کے صاحبزادے ہیں، جن کو ۱۸۵۷ء کے

غدر نے نمایاں کر دیا تھا اور جنھوں نے اپنے جُرموں کا خمیازہ، اِس طرح
بھگتا تھا کہ بحرِ ہند کے ایک جزیرہ میں تمام عمر کے لئے جلا وطن کر دیے جائیں۔
اس غدّ ار عالمِ دین کا کتب خانہ، جس کو حکومت نے ضبط کر لیا تھا
اب، کلکتہ کالج میں موجود ہے۔''

(ص ۲۰۲ و ۲۰۳۔ ''ہمارے ہندوستانی مسلمان''۔ از ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر۔
مطبوعہ: اَلکتاب انٹرنیشنل، بٹلہ ہاؤس۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵)

مولانا امداد صابری، دہلوی لکھتے ہیں:

''دہلی میں آزادی کی تحریک، ۱۸۵۷ء میں شروع ہو چکی تھی۔ مولانا فضلِ حق کے ساتھیوں نے جہاد کا فتویٰ، مرتّب کیا۔ اس کی تائید و تصدیق، مفتی صدر الدین آزردہ نے فرمائی۔
عمل، مولانا امام بخش صہبائی نے کیا۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بھی پروگرام کے مطابق ولی داد خاں کے ساتھ، بغاوت کی آگ لگانے میں مصروف ہو گئے۔
معرکے ہوئے۔ جنگی صلاحیت، قوم میں نہیں تھی، اِس لئے شکست ہوئی۔''

(ص ۹۔ ''داستانِ شرف''۔ از امداد صابری، مطبوعہ: دہلی)

مولانا سعید احمد، اکبر آبادی، فاضلِ دار العلوم دیو بند
سابق صدر شعبۂ سنّی دینیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ لکھتے ہیں:

''اِس وقت، ہمارے سامنے، فتویٰ کی، جو نقل ہے، اُس پر دلی کے ۳۸ عُلما و مشائخ کے دستخط ہیں۔ مولانا فضلِ حق خیر آبادی کے اس پر دستخط، نہیں ہیں۔
لیکن، ان کا ایک الگ، مستقل فتوائے جہاد تھا، جس کا ذِکر
۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی اسلامی تاریخوں میں تفصیل کے ساتھ، کیا گیا ہے۔
مولانا، بلند پایہ عالمِ دین ہونے کے ساتھ، رئیسانہ طور طریق زندگی رکھتے تھے۔
لیکن، اس کے باوجود، ان کی ایمانی جرأت و جسارت اور دینی حمیّت و غیرت کا یہ عالم تھا کہ:
انھوں نے، ہر چیز سے بے نیاز ہو کر، دلی کی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ کے بعد
جہاد کے واجب ہونے پر، ایک نہایت ولولہ انگیز تقریر کی اور اس کے بعد، جہاد کے ایک
اور فتویٰ کا اعلان ہوا، جس پر صدرُ الصُّدور مفتی صدرُ الدین خاں، آزردہ، مولانا فیض احمد، بدایونی

ڈاکٹر مولوی وزیر خاں، اکبر آبادی اور دوسرے عُلما کے دستخط تھے۔''

(ص ۴۲۔ ''ہندوستان کی شرعی حیثیت''۔ از سعید احمد، اکبر آبادی۔ مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۶۸ء)

رئیس احمد جعفری، ندوی (متوفی ۱۹۶۸ء) لکھتے ہیں:

''مولانا فضلِ حق، خیر آبادی، ایک یگانۂ روزگار عالم تھے۔ عربی زبان کے مانے ہوئے ادیب اور شاعر تھے۔ علومِ عقلی کے امام اور مجتہد تھے۔ اور ان سب سے بالا ان کی یہ خصوصیت تھی کہ، وہ بہت بڑے سیاست داں، مفکر اور مدبّر بھی تھے۔
مسندِ درس پر بیٹھ کر، وہ علوم و فنون کی تعلیم دیتے تھے۔
اور ایوانِ حکومت میں پہنچ کر، وہ دور رَس فیصلے کرتے تھے۔ وہ بہادر اور شجاع بھی تھے۔
غدر کے بعد، نہ جانے کتنے سورما اور رَزم آرا، ایسے تھے
جو گوشۂ عافیت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔
لیکن، مولانا فضلِ حق، اُن لوگوں میں تھے جو اپنے کیے پر نادم اور پشیماں، نہیں تھے۔
انھوں نے سوچ سمجھ کر میدان میں قدم رکھا تھا اور اپنے اقدام و عمل کے نتائج بھگتنے کے لئے
وہ حوصلہ مندی اور دلیری کے ساتھ، تیار تھے۔
سراسیمگی، دہشت، اور خوف، یہ ایسی چیزیں تھیں، جن سے مولانا، بالکل، ناواقف تھے۔
مولانا کی شخصیت، سیرت، کردار اور علم و فضل پر ضرورت تھی کہ:
ایک مفصّل کتاب لکھی جاتی لیکن، وہ ایک زُود فراموش قوم کے فرد تھے، فراموش کر دیے گئے۔
اور کچھ دنوں کے بعد، لوگ، حیرت سے دریافت کریں گے کہ: یہ کون بزرگ تھے؟''

(ص ۸۵۴۔ ''بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد''۔ مؤلّفہ: رئیس احمد جعفری، ندوی۔
طبع اول: کتاب منزل، لاہور ۱۹۵۶ء)

علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی، امامُ الحکمۃ والکلام و قائدِ جنگ آزادی ہونے کے ساتھ بلند پایہ مدرس و مصنف بھی ہیں۔ آپ کی تصانیف کی تعداد، تقریباً، دو درجن ہے۔
منطق و فلسفہ کے دقیق فنّی مباحث پر آپ کی کئی ایسی تصانیف و حواشی ہیں، جنھیں، آج کے ہند و پاک میں بدِقّت تمام، چند عُلما ہی سمجھ پائیں گے۔ اکثر تصانیف، غیر مطبوعہ ہیں۔
تقویۃُ الایمان از شاہ محمد اسمٰعیل، دہلوی (متوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کے

بطن سے پیدا ہونے والے سنگین مسائل، مثلاً:
امکانِ کذب باری تعالیٰ و امکانِ نظیرِ محمدی و تخفیفِ شانِ رسالت کے جواب میں
"اِمتناعُ النَّظیر" اور "تَحقیقُ الفَتویٰ فِی اِبطالِ الطَّغویٰ" کے نام سے
آپ کی دو کتابیں، چھپ چکی ہیں۔

حکیم سید محمود احمد، برکاتی، ٹونکی (شہادت: ۱۴۳۴ھ/۲۰۱۳ء۔ کراچی) فرزندِ حکیم سید محمد احمد، ٹونکی
(متوفی ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۲ء) فرزندِ حکیم سید برکات احمد، ٹونکی (متوفی ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء) لکھتے ہیں:

"شاہ عبدالعزیز اور ان کے بھائیوں کے اَخلاف و تلامذہ میں
فکر و نظر کے اختلاف اور مذہب و مسلک کے تعدُّد نے، دو گروہ پیدا کر دیے تھے۔
ایک گروہ، جس کے سربراہ، شاہ محمد اسمٰعیل شہید تھے، شخصِ معیَّن کی تقلید کے وجوب کا منکر
اور کسی حد تک، محمد بن عبدالوہّاب نجدی کا ہم نَوا تھا۔
اور دوسرا گروہ، شاہ عبدالعزیز کے مسلک کا متبع، حنفیت پر مطمئن و مُصِر "حُکم بالکُفرِ وَ الشِّرْك"
کے باب میں محتاط تھا۔ مختصر، یہ کہ جادۂ اعتدال سے مُنحرف، نہیں ہوا تھا۔
شاہ محمد موسیٰ، دہلوی (فرزندِ شاہ رفیع الدین، فرزندِ شاہ ولی اللہ، محدّث دہلوی)
اِس دوسرے گروہ کے حامی و ناصر تھے۔
علّامہ فضلِ حق خیر آبادی نے، جو، حزبِ عزیزی کے گویا، قائد و نقیب تھے، شاہ محمد اسمٰعیل کے
متشدّدانہ افکار و نظریات کے رَد میں سبقت کی اور "تَحقیقُ الفَتویٰ فِی اِبطالِ الطَّغویٰ"
کے نام سے، ایک مفصَّل رسالہ میں دلائلِ عقلی و نقلی کے ساتھ، شاہ شہید کا، رَد کیا۔
تو، اس کے آخر میں جن ولی اللّٰہی عزیزی عُلما و فُضَلا کے دستخط تھے
اُن میں شاہ محمد موسیٰ، دہلوی بھی تھے۔
پھر، یہ اختلاف، اِن دونوں گروہوں کو، شاہ جہاں کی مسجدِ جامع میں منعقد، ایک مجلسِ مناظرہ
(۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء) میں لے گیا، تو اس میں بھی شاہ محمد موسیٰ، سرگرم نظر آتے ہیں۔"

(ص ۱۸۵ و ص ۱۸۶۔ "شاہ ولی اللہ اور ان کے اصحاب"۔ مولّفہ: حکیم سید محمود احمد، برکاتی، ٹونکی۔
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۵)

"اَلثَّورَۃُ الهِندِیة" (باغی ہندوستان) انقلابِ آزادی کا ایک مستند ترین ماخذ ہے۔

اس کے کئی ایک مخطوطے، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں آج بھی موجود ہیں۔
اسے اور قَصائِدِ فِتنة الھند (منظوم) کو، علّامہ فضلِ حق نے جزیرۂ انڈمان (کالا پانی) سے
۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء میں بذریعہ حضرت مفتی عنایت احمد، کاکوروی (متوفی ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء)
اپنے فرزندِ سعید و شاگردِ رشید، مولانا عبدالحق، خیر آبادی (متوفی ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء) کے پاس
کوئلہ و پنسل سے کپڑا وغیرہ پر لکھ کر، بحفاظت تمام بھیجا تھا۔

اِس سلسلے میں، سینہ بسینہ منتقل ہوتی ہوئی، یہ روایت بھی ملاحظہ فرمائیں
جسے ڈاکٹر مسعود انور، علوی، کاکوروی، استاذِ شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
بیان کر رہے ہیں:

"راقم الحروف (مسعود انور، علوی، کاکوروی) نے، اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ:
"جب، مفتی (عنایت احمد، کاکوروی) صاحب، اِنڈمان سے واپس تشریف لائے
تو اپنے ساتھ، بکسوں میں کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پُرزے
اور مٹی کے ٹکڑے بھر کر لائے تھے، جن پر کوئلہ اور پنسل سے کتابیں لکھی ہوئی تھیں۔
کاکوری پہنچ کر، ان منتشر پُرزوں اور ٹھیکروں سے کتابوں کو دوسرے کاغذوں پر نقل فرمایا۔"

(ص ۱۴۰۔ "۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور روہیل کھنڈ"۔ ماہنامہ ضیاءِ وجیہ، رام پور۔ یوپی۔
شمارہ جنوری و فروری ۲۰۱۱ء)

مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء) کے والد ماجد
حضرت مولانا خیر الدین، دہلوی (متوفی ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء) علّامہ فضلِ حق کے
اور خود، مولانا آزاد، مولانا نظیر الحسن، امیٹھوی، تلمیذِ مولانا عبدالحق، خیر آبادی کے شاگرد تھے۔

مولانا ابوالکلام "باغی ہندوستان" مرتّبہ: عبدالشاہد، شیروانی کے پہلے ایڈیشن
از مدینہ پریس، بجنور، ۱۹۴۷ء کے تعارف (محرَّرہ ۲۱ر اگست ۱۹۴۶ء) میں لکھتے ہیں:

"والدِ مرحوم نے معقولات کی تکمیل، مولانا (فضلِ حق، خیر آبادی) مرحوم سے کی تھی۔
اِس لئے ان کی مصنَّفات اور حالات سے خاص علاقہ رکھتے تھے۔
مولانا کے فرزند، مولانا عبدالحق، مرحوم نے، یہ رسالہ (اَلثَّورَۃُ الهِندِیَّة)، خود اپنے قلم سے نقل کر کے
والدِ مرحوم کو مکہ معظّمہ بھیجا تھا۔ چنانچہ، وہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔

مولوی عبدالشاہد صاحب شیروانی نے
جب مجھ سے، اس رسالہ کی تصحیح و اِشاعت کے ارادہ کا ذکر کیا، تو مجھے نہایت خوشی ہوئی۔''
(ص ۲۳۔ ''**باغی ہندوستان**''۔ مطبوعہ: بجنور و لاہور و المجمع الاسلامی مبارک پور)
علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کے چند مشہور شاگردوں کے نام، یہ ہیں:

مولانا عبدالقادر، عثمانی، بدایونی (متوفی ۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء) مولانا ہدایت اللہ، رام پوری ثم جون پوری (متوفی ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء) مولانا فیض الحسن، سہارن پوری (متوفی ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء) مولانا سید عبداللہ، بلگرامی (متوفی ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۸ء) مولانا ہدایت علی، بریلوی (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) مولانا عبدالعلی، رام پوری (متوفی ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۶ء) مولانا نور احمد بدایونی (متوفی ۱۳۰۱ھ/ ۱۸۸۴ء) مولانا نورُالحسن، کاندھلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) مولانا غلام قادر، گوپاموی، مولانا قلندر علی، زبیری۔ وغیرھُم۔

مولانا عبدالعلی خاں، ریاضی داں، رام پوری (متوفی ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء) تلمیذِ علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی سے فقیہِ اسلام، مولانا احمد رضا قادری، برکاتی، بریلوی (متوفی ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) نے رام پور جا کر علمِ ہیئت و توقیت کی تعلیم، حاصل کی تھی۔

مولانا عبدالحق، خیرآبادی، فرزندِ علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کے ایک معروف شاگرد مولانا حکیم سید برکات احمد، ٹونکی (متوفی ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء) تھے۔

مولانا ہدایت اللہ، جون پوری، تلمیذِ علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کے شاگردِ رشید، مولانا محمد امجد علی، اعظمی (متوفی ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء) و مولانا یار محمد، بندیالوی (متوفی ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۷ء) و مولانا سید سلیمان اشرف، بہاری ثم علی گڑھی (متوفی ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء) تھے۔

مؤخر الذکر دونوں حضرات (مولانا ٹونکی و مولانا جون پوری) کے ذریعہ
خیرآبادی سلسلۂ تعلیم کو کافی فروغ، حاصل ہوا۔

علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کے صاحبزادے، مولانا عبدالحق خیرآبادی کے بارے میں رئیس احمد جعفری، ندوی (متوفی ۱۹۶۸ء) لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالحق، خیرآبادی، اپنے علم و فضل اور منطق و فلسفہ میں بے نظیر قابلیت اور مہارت کے باعث، سارے ہندوستان میں بلند ترین منصب پر فائز تھے۔

انھوں نے اپنی زندگی سے یہ ثابت کر دیا کہ دولتِ علم کے مقابلے میں دولتِ دنیا، ہیچ ہے۔
مولانا عبدالحق، مولانا فضلِ حق کے فرزندِ اکبر تھے۔
۱۸۲۸ء/۱۲۴۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد سے تحصیلِ علم کی۔
سولہ (۱۶) سال کی عمر میں سندِ فضیلت، حاصل کر کے درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔
کچھ دنوں، ٹونک میں رہے۔ پھر، نواب کلب علی خاں نے رام پور بلا لیا۔
اور اپنے پوتے، حامد علی خاں کا اَتالیق، مقرر کیا۔ ۱۸۶۵ء/۱۲۸۱ھ سے ۱۸۸۶ء/۱۳۰۴ھ تک
یعنی نواب کلب علی خاں کی تمام مدتِ حکومت تک، رام پور میں رہے۔
نواب صاحب کے انتقال کے بعد، کلکتہ گئے۔
وہاں، حاکمِ مرافعہ اور مدرسہ عالیہ، کلکتہ کے افسر رہے۔ شمسُ العُلما کا خطاب پایا۔
وہاں سے ۱۸۹۶ء/۱۳۱۴ھ میں نواب حامد علی خاں نے رام پور بلا لیا۔
اور خود، تلمذ، اختیار کیا۔ یہاں سے بیمار ہو کر، وطن، خیرآباد گئے۔ اور ۱۸۹۸ء میں انتقال ہوا۔
مولانا عبدالحق، خیرآبادی، اپنے زمانہ کے امامِ فلسفہ تھے۔ آپ کے شاگردوں میں متعدد نامور عُلما نکلے۔ مولانا نے چالیس (۴۰) کے قریب کتابیں، تصنیف کیں۔''
(ص ۵۵۳۔ ''**بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد**''۔ از رئیس احمد جعفری، ندوی۔ مطبوعہ: لاہور ۱۹۵۶ء)

''**سلسلۂ خیرآباد**'' کے فیضانِ درس و تدریس کا ذکر کرتے ہوئے
سید سلیمان ندوی (متوفی ۱۹۵۳ء۔ کراچی) لکھتے ہیں:

''مولانا فضلِ حق خیرآبادی کے تلامذہ اور تلامذہ در تلامذہ نے سارے ملک میں پھیل کر علومِ معقول کو بڑی رونق دی۔ اور وہ بڑے با کمال مدرس، ثابت ہوئے۔
ان بزرگوں میں سے تین اَربابِ کمال کی درسگاہوں کو بڑی شہرت، حاصل ہوئی۔
مولانا عبدالحق، خیرآبادی، خَلَفُ الصِّدق، مولانا فضلِ حق، خیرآبادی۔
مولانا برکات احمد، بہاری، ٹونکی، مولانا ہدایت اللہ خاں، رام پوری، جون پوری۔

مولانا عبدالحق خیرآبادی نے رؤسائے رام پور کی قدردانی سے رام پور کو اپنے فضل و کمال سے منور کیا۔ مولانا برکات احمد، صوبہ بہار میں ضلع مونگیر کے ایک گاؤں کے تھے۔
ان کے والد، حکیم، دائم علی صاحب، ٹونک جا کر، رہ گئے تھے۔

مولانا برکات احمد صاحب نے رئیسِ ٹونک کی قدر شناسی سے ٹونک کو علم وفن کا مرجع بنادیا۔
مولانا ہدایت اللہ خاں، رام پور سے جون پور آئے۔
اور مدرسہ شیخ امام بخش میں علم وفضل کی مجلس، آراستہ کی۔
ان میں سے، ہر ایک کی درس گاہ سے سیکڑوں عُلَما، تعلیم پا کر نکلے۔''

(ص ۲۳۔حیاتِ شبلی۔مؤلّفہ: سید سلیمان ندوی۔مطبوعہ: دارُالمصنّفین، اعظم گڑھ۔یوپی۔انڈیا)

مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبرآبادی (متوفی ۱۹۶۸ء)

جزیرۂ انڈمان میں علاّمہ خیرآبادی کے اَحوال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
(مولانا فضلِ حق، خیرآبادی) انڈمان پہنچے۔استاذنا، محمد عمر، انصاری، بخاری، اکبرآبادی
اپنے استاذ کی زبانی کہتے تھے کہ مولانا کو خدمت، ذلیل درجہ کی دی گئی تھی۔
جیل سپرنٹنڈ ینٹ، ایک شریف انگریز تھا۔مشرقی علوم سے واقف اور فنِ ہیئت کا ماہر تھا۔
اس کی پیشی میں ایک سزایافتہ مولوی بھی تھے۔
اپنی تصنیف کردہ کتابِ ہیئت جو فارسی میں تھی، وہ ان کو دی کہ عبارت، صحیح ودرست کردیں۔
مولوی صاحب سے تو کام نہیں چلا۔ علاّمہ (فضلِ حق) نئے نئے گئے تھے۔
ایک ہی سال گذرا تھا۔ان کو، وہ کتاب دی اور کہا کہ: مولانا! آپ، اس کو درست کردیں۔
چنانچہ، علاّمہ نے اس کی عبارت، درست کی اور معلومات میں بہت کچھ اضافہ کردیا۔
اور حاشیہ میں کثیر التّعداد کتب کے حوالے لکھے۔
جب، یہ کتاب، مولوی صاحب، سپرنٹینڈ ینٹ کے پاس لے گئے
تو وہ اسے دیکھ کر حیران وششدر رہ گیا۔اور اس نے کہا:
مولوی صاحب! تم، بڑا، لائق آدمی ہے۔
مگر، جن کتابوں کے حوالے دیے ہیں اور ان کی عبارتیں نقل کی ہیں، یہ کہاں ہیں؟
مولوی صاحب مسکرائے اور اصل واقعہ، علاّمہ کا کہہ سنایا۔
وہ اسی وقت، مولوی صاحب کو لے کر، بیرک میں آیا۔
علاّمہ تھے نہیں۔کچھ انتظار کے بعد دیکھا کہ:
ٹوکرا، بغل میں دبائے چلے آرہے ہیں۔

وہ، یہ دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور معذرت کی اور کلرکی میں لے لیا۔
اور گورنمنٹ میں ان کی سفارش کی۔
ادھر، علاّمہ کے صاحبزادے، مولوی شمس الحق، دہلوی اور علاّمہ کے قریبی عزیز
خان بہادر، مفتی انعام اللہ، گوپامئوی کے داماد، منشی خواجہ غلام غوث بےخبر
وخان بہادر، ذوالقدر، میر منشی لیفٹیننٹ مغربی وشمالی صوبہ اودھ، سرگرمِ سعی تھے۔
پروانۂ آزادی، حاصل کیا اور مولوی شمس الحق، انڈمان، روانہ ہوگئے۔
وہاں (بحری) جہاز سے اُترے۔شہر میں گئے تو ایک جنازہ پر نظر پڑی۔
اس کے ساتھ بڑا اِزدِحام تھا۔انھوں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ:
کل ۱۲؍صفر المظفر ۱۲۷۸ھ کو علاّمہ کا انتقال ہوگیا۔اب سپردِ خاک کرنے جارہے ہیں۔
یہ بھی ہمراہ ہوگئے اور بعدِ دفن وفاتحہ، بصد حسرت ویاس لوٹے۔''

(ص ۳۹و۴۰۔''غدر کے چند علما''۔از مفتی انتظام اللہ شہابی، اکبرآبادی۔مطبوعہ: دہلی)

مولانا عبدالحق خیرآبادی، فرزندِ علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی کے بارے میں
مولانا عبدالشاہد شیروانی، علی گڑھی لکھتے ہیں:
''مولانا (عبدالحق، خیرآبادی) نے آخر میں وصیت بھی فرمائی کہ:
جب، انگریز، ہندوستان سے چلے جائیں، تو میری قبر پر خبر کردی جائے۔
چنانچہ، ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو رفیقِ محترم، مولوی سید نجم الحسن صاحب، رضوی
خیرآبادی نے مولانا (عبدالحق) کے مدفن (درگاہ مخدومیہ، خیرآباد۔اَوَدھ) پر
ایک جمِ غفیر کے ساتھ، حاضر ہوکر، میلادشریف کے بعد، قبر پر فاتحہ خوانی کی۔
اور اِس طرح پورے پچاس سال (از ۱۸۹۸ء تا ۱۹۴۷ء) کے بعد
انگریزی سلطنت کے خاتمہ کی خبر سنا کر، وصیت پوری کی۔
جَزَاہُ اللّٰہُ خَیْرَ الْجَزَاء۔''

(ص ۱۲۔مقدمۂ زُبدۃ الحکمۃ۔از عبدالشاہد، شیروانی۔مطبوعہ: علی گڑھ۔۱۹۴۹ء)

○○○

مولانا فیض احمد، بدایونی

حضرت **مولانا فیض احمد** بن حکیم غلام احمد، عثمانی، بدایونی کی ولادت ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء میں مولوی محلّہ، بدایوں میں ہوئی۔ آپ، تین سال کی عمر میں یتیم ہوگئے اِس لئے والدہ ماجدہ نے آپ کی تعلیم وتربیت کا فریضہ، ایسی شفقت وخوبی وذمّہ داری سے انجام دیا کہ:

آپ، بڑے ہوکر ایک نامی گرامی عالم وفاضل ہوئے۔

مولانا فیض احمد، بدایونی، بے حد محنتی، ذہین اور بلند حوصلہ تھے۔

آپ کے حقیقی ماموں، اور شفیق اُستاد ومُربی، حضرت علاّمہ فضلِ رسول، عثمانی، بدایونی (متوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) نے آپ کی مکمل سرپرستی ونگہداشت کی۔

چودہ (۱۴) سال کی عمر میں علومِ نقلیہ وعقلیہ سے فارغُ التحصیل ہونے کے بعد
آپ نے درس وتدریس کا سلسلہ، شروع کردیا۔

تمام علومِ متداولہ میں آپ کو عبور تھا۔ اپنے اَقران ومعاصرین میں آپ، امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ عربی فارسی اردو، تینوں زبانوں میں شاعری کا بھی اعلیٰ ذوق تھا۔
رسوا، آپ کا تخلص تھا۔

اپنے نانا، حضرت مولانا شاہ عینُ الحق عبدالمجید، عثمانی، بدایونی (متوفی ۱۷؍محرمُ الحرام ۱۲۶۳ھ/جنوری ۱۸۴۷ء) خلیفۂ شمس العارفین، حضرت سید شاہ آلِ احمد، اچھے میاں، قادری برکاتی، مارہروی (متوفی ربیعُ الاوّل ۱۲۳۵ھ/ جنوری ۱۸۲۰ء) سے آپ کو بیعت وارادت کے ساتھ، خصوصی فیضان، حاصل ہوا۔ علومِ ظاہری کے ساتھ، علومِ باطنی میں بھی آپ کا پایہ، بلند تھا۔

بدایوں میں ایک مدت تک، سلسلۂ درس وتدریس، جاری رکھنے کے بعد صدر نظامت، آگرہ میں پیش کار اور پھر بورڈ آف ریونیو میں آپ، سررشتہ دار ہوئے۔

۱۸۵۷ء سے سالہا سال پہلے کی بات ہے کہ:
سر، ولیم میور، جو آگرہ میں فوج کے مجسٹریٹ
اور بعد میں لیفٹیننٹ گورنر صوبہ متحدہ اَوَدھ وآگرہ (۱۸۶۸ء تا ۱۸۷۲ء) ہوا۔
اُس نے آپ سے عربی زبان سیکھی تھی۔

دَورانِ ملازمت بھی آپ کا تدریسی مشغلہ جاری رہا۔

آپ کے حقیقی ماموں، سیفُ اللہِ المسلول، علاّمہ فضلِ رسول، عثمانی، بدایونی فرماتے ہیں:
(فارسی سے ترجمہ) **بِفَضْلِهٖ تَعالیٰ**، فیض احمد، جن کا ذکر ہوا
وہ اِس خاکسار کے بھانجے، نورِ نظر، لختِ جگر اور قوتِ بازو ہیں۔
کمالاتِ اِنسانی کے جامع ہیں۔ علومِ مروّجہ میں اپنے معاصرین پر فوقیت رکھتے ہیں۔
مُحبّان ومحبوبانِ خدا سے محبتِ صحیحہ رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ، اس میں اضافہ فرمائے۔ اِلیٰ آخِرِہٖ۔
(ص ۳۷۔ **اَکملُ التاریخ**، حصہ اول۔ موٗلفہ: مولانا ضیاءُ القادری، بدایونی۔
طبع جدید، رمضان ۱۴۳۴ھ/جولائی ۲۰۱۳ء۔ تاجُ الفحول اکیڈمی، بدایوں۔ طبعِ اول ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء)

مولانا محمد یعقوب، ضیاءُ القادری، بدایونی (متوفی ۱۲؍جمادیٰ الاخریٰ ۱۳۹۰ھ/۱۵؍اگست ۱۹۷۰ء۔ کراچی) اپنی تاریخی کتاب ''**اَکملُ التاریخ**'' (محرّرہ ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء) میں
مولانا فیض احمد، بدایونی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''خزانۂ قدرت سے آپ کو، وہ دماغ، عطا ہوا تھا، جس کی مثال آج کل، ناپید ہے۔
ذرا سی عمر میں تمام علومِ معقول ومنقول، نہایت تحقیق وتدقیق کے ساتھ، حاصل فرمائے۔
آپ کی ذہانت وذکاوتِ خداداد پر، ہم سبق طلبہ، رَشک کرتے تھے۔
پندرہویں سالگرہ، نہ ہونے پائی تھی کہ اجازتِ درس، حاصل ہوگئی۔
تقریر وتحریر میں وہ زور تھا کہ مخاطب، شانِ اِستدلال وہیبتِ کلام سے ساکت ہوجاتا۔
جب، تکمیل سے فراغِ کامل، حاصل ہوا، دولتِ بیعت، اپنے مقدس نانا
حضرت سید شاہ عینُ الحق عبدالمجید قُدِّسَ سِرُّہٗ سے پائی۔
اس کے بعد سلسلۂ ملازمت میں داخل ہوکر، اُس عُہدۂ جلیلہ پر، مامور ہوئے کہ:
تمام سیاہ وسپید آپ کے اختیار میں تھا۔

اُس وقت، آگرہ، صوبے کا صدر مقام تھا۔ آپ، لیفٹیننٹ کے سر رشتہ دار تھے۔
ثروت وامارتِ خاندانی کے سِوَا، عہدہ کی وجاہت، اُس پر طُرَّہ، یہ کہ:
سر، ولیم میور، لیفٹیننٹ گورنر، صوبہ آگرہ اور اَوَدھ، آپ کے شاگردِ خاص اور احترام کنندہ۔
ہزاروں اہلِ حاجت کی دستگیری فرمائی۔
وطن کے اہلِ غرض، مطلب برآری کے لئے روزانہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔
ہر وقت، مطبخ، گرم رہتا۔ فُقَرا ومساکین، ہمیشہ، دامنِ دولت سے وابستہ رہتے۔
کبھی، پیسہ آپ کے ہاتھ میں، نہ رہتا اور مقروض رہتے۔
اہلِ بدایوں پر جو کچھ احسانات آپ کے ہیں، وہ، کبھی فراموش نہیں ہو سکتے۔
.... باوجود، ثروت ووَقار کے، دل فقیرانہ، مزاج شاہانہ۔
فُقَرا سے محبت، غُربا سے اُلفت، طلبہ کے شیدائی، شائقینِ علم کے فدائی تھے۔
شاگردوں کی تمام ضروریات کے خود، متکفّل ہوتے تھے۔
سلسلۂ درس وتدریس، اِقامتِ آگرہ میں بھی برابر، جاری رہا۔ شاعری کا مذاقِ سلیم
خاص طور پر، جُزوِ طبیعت تھا۔ کلام میں حُسنِ فصاحت اور رنگِ بلاغت، دونوں، موجود ہیں۔
مضامین آفرینی کے ساتھ، زبان کی صفائی، سونے پر سہاگا ہے۔ رسؔوا، تخلص فرماتے تھے۔
عربی، فارسی، اردو، ہر ایک زبان میں آپ کے اشعار، انمول جواہر ہیں۔''
(ص ۶۳ وص ۶۴۔ اَکمل التاریخ، حصہ اول۔ مرتّبہ: مولانا ضیاءُ القادری، بدایونی۔
طبعِ جدید، رمضان ۱۴۳۴ھ/جولائی ۲۰۱۳ء۔ تاجُ الفحول اکیڈمی، بدایوں)
مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی کی تصانیف میں ''تحفۂ قادری''
اَلتَّعلیقات عَلیٰ فُصُوْصِ الْحِکَمْ اور'' تعلیمُ الْجَاھِل ''معروف ہیں۔
تین مختلف مواقع پر، سید خورشید مصطفیٰ رضوی نے آپ کا ذکر
اپنی تاریخی کتاب میں اِس طرح کیا ہے کہ::
محراب شاہ قلندر نے (سید احمدُ اللہ شاہ، مدراسی کو) تلقینِ جہاد کی۔ مثنوی میں ہے کہ:

لیا ان سے پھر امتحانِ جہاد
کہ پہنچے نصاریٰ پہ تیغِ عِناد

مُرشد کی ہدایت پر، دہلی آئے۔ عُلما وصوفیاے کرام سے تبادلۂ خیال کیا۔ مگر، مایوسی ہوئی۔
صرف، مفتی صدرالدین، آزردؔہ نے کچھ آمادگی کا اظہار کیا اور آگرہ جانے کا مشورہ دیا۔
لِھٰذا، آگرہ پہنچے۔ مفتی انعام اللہ خاں، وکیل سرکار کے یہاں قیام کیا۔
مفتی صاحب کا مکان، اہلِ علم کا مرکز تھا اور تمام عُلما کی ان کے یہاں، نشست تھی۔
ہر ایک نے انھیں عزت واحترام سے جگہ دی۔
مولوی فیض احمد، بدایونی اور ڈاکٹر وزیر خاں، آپ کے گرویدہ ہوگئے۔''
(ص ۶۶۸۔ ''**تاریخِ جنگِ آزادی ہند، اٹھارہ سوستاون**''۔ مولّفہ: سید خورشید مصطفیٰ رضوی۔
مطبوعہ: رضا لائبریری، رام پور۔ ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء)
''انھیں حالات نے مسلمان عُلما کو آگرے کی طرف کھینچا۔ جنھوں نے پادریوں سے
معرکۃُ الآرا مناظرے کیے۔ کتابیں لکھیں اور تقریریں کر کے عیسائیت کا رَد کیا۔
ان عُلما کے ساتھ، یہاں کے اسسٹنٹ سرجن، ڈاکٹر وزیر خاں
ومولانا رحمت اللہ، کیرانوی اور مولانا فیض احمد، بدایونی بھی تھے۔
(ص ۳۷۶۔ ''تاریخِ جنگِ آزادی ہند ۱۸۵۷ء''۔ مؤلّفہ: سید خورشید مصطفیٰ رضوی)
''دہلی کی شکست کے بعد، جنرل بخت خاں نے (بدایوں) آکر جہاد کا فتویٰ، تقسیم کرایا۔
جس سے جوش وخروش میں اضافہ ہوا۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا فیض احمد
اور شہزادہ، فیروز، وغیرہ پہنچے۔ ککرالہ (بدایوں) میں تصادم (بتاریخ ۲۷/اپریل) ہوا۔
جہاں، جنرل پینی کی فوجیں، حملہ آور ہوئی تھیں۔ جنرل پینی، جان، گنوا بیٹھا۔
اور انقلابیوں کی فتح کے آثار، نظر آئے۔ مگر، جنرل جانس کی تازہ دَم فوجیں آجانے کے بعد
انھیں پسپا ہونا پڑا اور ان کے رہنما، بریلی چلے گئے، جہاں، خان بہادر خاں کا اِقتدار تھا۔''
(ص ۵۷۳۔ ''تاریخِ جنگِ آزادی ہند، ۱۸۵۷ء''۔ از سید خورشید مصطفیٰ رضوی)
پروفیسر محمد ایوب، قادری (کراچی) کے ایک تاریخی مضمون (جسے عُلماے ہند کا شاندار ماضی۔
جلدِ چہارم۔ مولّفہ: سید محمد میاں، مطبوعہ: دہلی میں بھی نقل کیا گیا ہے) کا
ایک طویل اِقتباس، یہاں، نقل کیا جا رہا ہے۔
حضرت مولانا فیض احمد، بدایونی کی مذہبی وسیاسی سرگرمیاں اور انقلابِ ۱۸۵۷ء میں

آپ کی نمایاں خدمات، اِس تعارفی تحریر سے مزید، واضح ہوجاتی ہیں:

’’مولانا فیض احمد نے اخلاق، بڑے وسیع پائے تھے۔ اہلِ وطن کی آپ، بڑی مدد کرتے تھے۔ بدایوں کا جو شخص پہنچا اور جس کام میں مدد کا خواستگار رہا، اُس کی حتّی الوسع اِمداد کی۔

قیام وطعام کی کفالت کرتے۔ بعض اوقات، ان مصارف کے لئے قرض کی ضرورت پڑتی۔

ہندوستان میں ’’**ایسٹ انڈیا کمپنی**‘‘ کے اِقتدار کے ہمدوش، مذہبِ عیسوی نے بھی فروغ، حاصل کیا اور ہر ممکن صورت سے اس مغلوب ملک کو مذہبی حیثیت سے بھی فتح کرنے کی کوشش کی گئی۔ **کمپنی کی تائید واِعانت سے مذہبِ مسیحی کی تنظیم اور ترقی عمل میں آئی۔**

ملک کے طول وعرض میں ہر جگہ، اس تنظیم کے آثار، قائم کیے گئے۔ چرچ مشن سوسائٹی بائیبل سوسائٹی، مشن فنڈ، مشن ہسپتال، مشن کالج اور مدارس، جا بجا، قائم ہوئے۔

مذہبی کتابوں اور رسائل کی اشاعت کے ذریعہ

ہندوستانیوں کے رُجحانات وعقائد، سَلب کرنے کی کوشش کی گئی۔

غرض، یہ وہ زمانہ تھا کہ عیسائیوں نے ہندوستان میں اسلام کے خلاف، زبردست مُہم جاری کر رکھی تھی۔ ۱۸۵۴ء میں پادری فنڈر (Revd C.C.D. Fonder) یوروپ سے ہندوستان آیا۔ یہاں، اُس نے اور اس کی جماعت نے دل شکن تقریروں کا سلسلہ، شروع کردیا اور اس کی کتاب ’’**میزانُ الحق**‘‘ نے خوف وہراس، پیدا کردیا تھا۔

پادری فنڈر نے آگرہ کو، مناظرہ کا گڑھ ٹھہرایا۔

کیوں کہ آگرہ ہی اُس وقت، عُلما کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس کا خیال تھا کہ:

اگر، یہاں کسی طرح، فتح ہوگئی، تو عیسائیت کی تبلیغ میں بڑی مدد ملے گی۔

اُس نے مشاہیر عُلما کو چیلنج دیا۔

آگرہ مجلسِ عُلما میں مشورہ ہوا۔ مولانا فیض احمد کے دوست، ڈاکٹر وزیر خاں، اکبرآبادی نے چیلنج، قبول کرلیا اور مذہبِ عیسوی کے مشہور ماہر ومناظر، مولوی رحمت اللہ کیرانوی جو کہ عرصہ سے پادری مذکور سے خط وکتابت کررہے تھے، بلائے گئے۔ انھوں نے چھِل اینٹ، آگرہ میں قیام کیا۔

ضروری انتظامات کے بعد ۱۱؍رجب ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۰؍اپریل ۱۸۵۴ء بروز پیر کٹرہ عبدالمسیح، آگرہ میں مناظرہ کا پہلا اجلاس ہوا۔

اہلِ اسلام کی جانب سے مناظرِ اوّل، مولوی رحمت اللہ، عثمانی، کیرانوی اور مناظرِ دوم، ڈاکٹر وزیر خاں، اکبرآبادی تھے۔ جن کے معین ومددگار، مولانا فیض احمد، بدایونی تھے۔

عیسائیوں کی طرف سے مناظرِ اوّل، پادری فنڈر اور مناظرِ دوم، پادری فرنچ تھے۔

مجلسِ مناظرہ میں، مسٹر اِسمتھ، حاکمِ صدر دیوانی، مسٹر کرسچین، سیکنڈ صوبہ بورڈ، مسٹر ولیم میور مجسٹریت علاقہ فوج، مسٹر لیڈل، ترجمانِ حکومت، پادری، ولیم گبن

مفتی ریاض الدین، مولوی حضور احمد، سَہسوانی، مولوی امیر اللہ مختار راجہ بنارس، مولوی ضمیر الاسلام، امامِ جامع مسجد آگرہ، مفتی خادم علی، مہتمِم مطلع الاخبار، مفتی سراج الحق مولوی کریم اللہ خان، بچھرایونی، پنڈت جگل کشور، راجہ، بلوان سنگھ (بنارس) قاضی حکیم فرزند علی گوپاموی، مولوی سراج الاسلام نیز اور بہت سے عُلما وعمائدین اور رؤسائے شہر، موجود تھے۔

تین روز تک، مناظرہ ہوا۔ پادری فنڈر کو انجیل کی تحریف کا اقرار کرنا پڑا۔

اور اُس نے شکستِ فاش کھائی اور آگرہ سے راہِ فرار، اختیار کرکے، سیدھا یورپ پہنچا۔

اس مناظرہ کی پوری کیفیت ’’**اَلْبَحْثُ الشَّرِیف فِی اِثْبَاتِ النَّسْخِ وَ التَّحرِیف**‘‘ کے نام سے، وزیر الدین نے مرتّب کرکے، حافظ عبداللہ کے اِہتمام سے

۱۲۷۰ھ میں فخر المطابع، شاہ جہان آباد میں ولی عہد، مرزا فخرو کے صَرفہ وحکم سے چھپوا کر اَکناف واَطرافِ ہند میں تقسیم کرادی تھی۔

اور اسی مناظرہ اکبرآباد کو چھوٹی تقطیع پر حصہ اول ’’**مباحثہ مذہبی**‘‘ اور دوسرا ’’**مراسلاتِ مذہبی**‘‘ کے نام سے سید عبداللہ، اکبرآبادی نے باہتمام منشی محمد امیر، مطبع منعمیہ، اکبرآباد سے ۱۲۷۰ھ میں چھپوایا۔ پہلا حصہ، فارسی میں تقریری مناظرہ کی روداد ہے۔

اور دوسرے حصہ میں ڈاکٹر وزیر خاں اور پادری فنڈر کا تحریری مناظرہ، اردو میں ہے۔

اس کتاب کا عربی ترجمہ، مولوی رحمت اللہ کی کتاب ’’**اظہار الحق**‘‘ کے حاشیہ پر مطبوعہ ہے جو کہ مطبع محمودیہ، قاہرہ، مصر سے ۱۳۱۷ھ میں طبع ہوا ہے۔

غرض، اِس تاریخی مناظرہ میں مولانا فیض احمد، بدایونی نے ڈاکٹر وزیر خاں کو ہر طرح مدد دی اور ان کی کامیابی کے لئے مُمِد ہوئے اور، یہ دَورانِ ملازمت میں بڑا کام تھا۔

ہندوستان کی قابلِ فخر تاریخی جامع مسجد، آگرہ، اُس زمانہ میں عجیب حالت میں تھی۔

صِرف، بیچ کا حصہ، خالی تھا، جس میں ستّر اَسّی نمازی، نماز پڑھ سکتے تھے۔
باقی حصہ پر کبوتر بازوں کا قبضہ تھا۔ یا۔ رسیاں بٹنے والے، رسّیاں بٹتے تھے۔
مسجد کی دکانیں، بنیوں کے پاس، رہن تھیں۔
مولانا (فیض احمد، بدایونی) نے یہ صورت دیکھی، تو بے چین ہوگئے اور طویل جد و جہد کا سلسلہ، شروع کردیا۔ جس کا اندازہ، مقدمات کی مِسلوں کے معائنہ سے ہوسکتا ہے۔
بالآخر، مولانا کو کامیابی ہوئی۔ دوکانیں، خالی کرائی گئیں۔ مسجد کا انتظام، درست کیا گیا۔
کبوتر بازوں کو نکالا گیا۔ رَسّی بٹنے کی لعنت، ختم کرکے مسجد کی درستی کرائی گئی۔
اور مسجد کے انتظام کے لئے **لوکل ایجنسی آگرہ** کا قیام، عمل میں آیا۔
جس کے تحت، آج تک جامع مسجد آگرہ کا انتظام ہے۔
مولانا سید احمدُ اللہ شاہ، مدراسی، ۱۸۵۷ء سے پہلے، جذبۂ انقلاب لے کر دہلی پہنچے۔
حضرت مولانا صدرُالدین صاحب، آزُردہ نے شاہ صاحب کو
آگرہ جانے کا مشورہ دیا اور وہاں کے بزرگوں کے نام، تعارفی خط بھی لکھ دیا۔
حضرت شاہ صاحب، وہ تعارفی خط لے کر، مفتی انعام اللہ خان بہادر وکیل سرکار کے پاس پہنچے۔ انھوں نے بڑی قدر و منزلت کی۔
یہاں، عُلما و فُضَلا کا اجتماع تھا۔ اس پورے حلقہ میں شاہ صاحب کی بڑی عزت ہوئی۔
محفلِ سماع اور وعظ کا دَور، شروع ہوا۔ یہاں تک کہ شاہ صاحب کو
یہاں اپنے خواب کی تعبیر، نظر آنے لگی۔
بہت لوگ، معتقد ہوگئے۔ عام گرویدگی دیکھ کر حکومت کو بھی فکر ہوئی۔ چنانچہ، حضرت شاہ صاحب سے تعلق رکھنے والے عُلما پر، جو صدرِ نظامت میں عہدہ دار بھی تھے، مقدمہ چلایا۔
مقصد، یہ تھا کہ جماعت، منتشر ہوجائے۔
مگر، حکومت کو اس میں ناکامی ہوئی۔ کیوں کہ تمام ملزمین، بے داغ، بری کردیئے گئے۔
میرٹھ اور دہلی میں علمِ انقلاب (۱۸۵۷ء) بلند ہوا
تو اُس کا فوری اثر، آگرہ پر پڑا، جو صوبائی حکومت کا مرکز تھا۔
کالن صاحب، لیفٹیننٹ گورنر نے سب فوج ہندوستانی اور انگریزی کو جمع کرکے فہمائش کی۔

جس کا اثر، چند روز رہا، مگر، ماہِ جون میں یہاں بھی واقعات، شروع ہوئے۔ جولائی میں تیزی آئی۔
مجاہدین فوج کی سرپرستی، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد، بدایونی نے کی۔
مگر، جب، حالات کا جائزہ لیا اور دہلی سے پیام وسلام کے ذریعہ، طلبی ہوئی
تو کچھ مسلّح سپاہ کے ساتھ، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد، بدایونی، دہلی، روانہ ہوگئے۔
دہلی میں ایسے ذی علم، سنجیدہ اور بااخلاص اصحابِ فکر کی ضرورت تھی۔
ان دونوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ڈاکٹر وزیر خاں، جنرل بخت خاں کے مشیرِ خاص کی حیثیت سے کام کرنے لگے اور مولانا فیض احمد صاحب، مرزا مغل کے پیش کار، مقرر ہوئے۔
مختلف معرکوں میں آپ نے شرکت فرمائی۔
۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو، جب، جنرل بخت خاں نے دہلی سے کوچ کیا
تو مولانا فیض احمد صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں، جنرل بخت خاں کے ساتھ تھے۔
اُس وقت، لکھنؤ میں معرکۂ کارزار گرم تھا۔ مولانا شاہ احمدُ اللہ صاحب
دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ **یہ مولانا فیض احمد صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں، لکھنؤ پہنچے۔**
اور تمام اہم معرکوں میں شاہ احمد اللہ صاحب کے ساتھ رہے۔
سقوطِ لکھنؤ کے بعد، سب کا اجتماع، شاہجہان پور میں ہوا۔
اور یہاں، چند ماہ تک، انگریزوں سے سخت معرکے ہوتے رہے۔
اسی اثنا میں مولانا فیض احمد صاحب، بدایوں پہنچے۔
ڈاکٹر وزیر خاں آپ کے ساتھ تھے اور شاہزادہ، فیروز شاہ بھی بدایوں پہنچ چکے تھے۔
بدایوں کے معرکوں میں ان مجاہدین نے حصہ لیا۔ ککرالہ (ضلع بدایوں) کے معرکہ میں قیادت کا فرض، انجام دیا۔ پھر جب، یہاں بھی ناکامی ہوئی، تو قصبہ محمدی (شاہجہاں پور) پہنچے۔
جہاں، مولانا احمدُ اللہ شاہ صاحب نے حکومت، قائم کی تھی۔
یہ دونوں بزرگ، مولانا (مدراسی) کی وزارت میں داخل ہوئے۔
مولانا شاہ احمدُ اللہ کی شہادت کے بعد، مولانا فیض احمد، ایسے روپوش ہوئے کہ:
آپ کے ماموں، مولانا فضلِ رسول، بدایونی نے آپ کی تلاش میں
قسطنطنیہ تک سفر کیا، مگر، کہیں، سراغ نہ لگ سکا۔ **رَحِمَهُ اللہ۔**

پروفیسر، انیس زیدی لکھتے ہیں:

عید کے ہفتہ بھر بعد ہی یعنی ۲؍جون کو بریلی سے باغی فوج کا ایک دستہ آیا۔
اوراس نے عملی طور پر انگریزی حکومت کا خاتمہ کردیا۔.....خزانہ پر قبضہ کرلیا۔
قیدیوں کو آزاد کردیا۔ پولیس اور انگریزی اہل کار، بھاگ گئے۔......
ضلع کا حاکم، ولیم ایڈورڈس (William Edwards)
اور دوسرے انگریز افسران، فرار، یاروپوش ہوگئے۔
انگریزی حکومت کے ختم ہوجانے کی وجہ سے ہر طرف افراتفری پھیل گئی اور لوٹ مار شروع ہوگئی۔
اِس موقع پر مولانا فضلِ رسول بدایونی نے فہم وفراست کا ثبوت دیا۔
نظم وضبط، قایم کیا اور جان و مال بچانے کی کوشش کی، جس میں وہ، کامیاب بھی ہوئے۔

حبیبُ الاخبار، بدایوں، اپنی ۲۵؍جون کی اشاعت میں لکھتا ہے:

افراتفری اور انتشار کے دَور میں گورنر روہیل کھنڈ، نواب خان بہادر نے
۱۷؍جون کو عبدالرحمٰن خاں کو بدایوں کا حاکم، مقرر کردیا۔ عبدالرحمٰن خاں نے سابقہ افراد کو
ان کے عہدوں پر برقرار رکھا۔ اور جہاں، ضروری سمجھا، اپنے اعتماد کے افراد کو مقرر کیا۔
....اسی دَوران، ڈاکٹر وزیر خاں، جنرل بخت خاں، مولانا فیض احمد، بدایونی
اپنے ساتھیوں کے ساتھ، بدایوں آئے اور فتوائے جہاد کی تشہیر کی۔
اس فتویٰ پر مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرُالدین آزردہ
مفتی فضلِ کریم اور مولوی عبدالقادر، وغیرہ کے دستخط تھے۔
ان حضرات کی آمد اور فتویٰ کی تشہیر کی وجہ سے، بدایوں اور اس کے مضافات کے
ہزاروں افراد، مجاہدین میں شامل ہوگئے۔ مجلّہ بدایوں، کراچی، شمارہ مئی جون ۱۹۹۱ء۔

(ص۱۳و۱۴۔ **انسائیکلوپیڈیا آف بدایوں**۔ جلد۲۔ ادارہ مجلّہ بدایوں۔ مطبوعہ کراچی۔ ۲۰۰۴ء)

پروفیسر محمد ایوب، قادری (متوفی نومبر ۱۹۸۳ء۔ کراچی) لکھتے ہیں:

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں عُلماے بدایوں نے نمایاں حصہ لیا۔
ان میں سرِ فہرست مولانا فیض احمد، بدایونی کا نام ہے، جو اپنے دَور کے نامور عالم تھے۔
سینٹرل بورڈ آف ریونیو میں ملازم تھے۔ عربی کے بلند پایہ ادیب وشاعر تھے۔

انھوں نے آگرہ کے قیام میں مولانا رحمتُ اللہ، کیرانوی اور پادری فنڈر کے
مناظرہ میں حصہ لیا اور مولوی رحمت اللہ کے مددگار رہے۔
پھر، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مردانہ وَار حصہ لیا۔ وہ، دہلی بھی گئے۔
آخری معرکہ، ککرالہ (بدایوں) میں ہوا۔ اس میں ڈاکٹر وزیر خاں، شہزادہ فیروز شاہ
جیسے بطلِ حریت بھی موجود تھے۔ انگریزوں کا مشہور جرنیل پینی مارا گیا۔

مجلّہ بدایوں، کراچی، شمارہ جنوری ۱۹۹۴ء۔

(ص۲۶۔ **انسائیکلوپیڈیا آف بدایوں**۔ جلد۲۔ مطبوعہ کراچی ۲۰۰۴ء)

○○○

مرادآباد کے صدرِ شریعت وقائد وشہیدِ انقلاب
مولانا سید کفایت علی، کافیؔ، مرادآبادی

حضرت مولانا سید کفایت علی، کافیؔ، مرادآبادی (شہادت ۲۲ رمضان ۱۲۷۴ھ/ ۶ مئی ۱۸۵۸ء) علم وفضل اور طِب و شاعری میں یگانۂ روزگار تھے۔ حضرت مفتی ظہورُ اللہ، فرنگی محلی لکھنوی (متوفی ۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء) سے بعض علوم وفنون کی، مولانا کافیؔ نے تحصیل کی تھی۔

مولانا محمد عبدالشکور، معروف بہ مولوی رحمٰن علی، مؤلّفِ **''تذکرۂ علمائے ہند''** (متوفی ۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء۔ تلمیذِ مولانا شاہ سلامت اللہ، کشفیؔ، بدایونی ثم کان پوری وصال ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۱ء وقاری عبدالرحمٰن، پانی پتی وصال ۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۶ء ومُرید وخلیفۂ صوفی محمد حسین، چشتی الہٰ آبادی وصال ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۵ء) کے والد

حکیم شیر علی، صدیقی، الہٰ آبادی (متوفی ۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء) سے علمِ طِب

اور شیخ مہدی علی خاں، ذکیؔ مرادآبادی (متوفی ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء) شاگردِ امام بخش، ناسخؔ (متوفی ۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸ء) سے فنِ شاعری سیکھ کر، طب وشاعری میں کمال، حاصل کیا۔

ذکیؔ، مرادآبادی کے چار تلامذہ مشہور ہوئے:

حضرت مولانا نعیم الدین، مرادآبادی کے والد ماجد، مولانا معین الدین، نزہتؔ ومولانا سید کفایت علی، کافیؔ مرادآبادی ومولوی محمد حسین، تمنّاؔ ومولوی شبیر علی تنہاؔ۔

حضرت شاہ ذکیُّ القدر، ابوسعید، مجدّدی، رام پوری (متولد ذوالقعدہ ۱۱۹۶ھ/ اکتوبر ۱۷۸۲ء متوفی شوال ۱۲۵۰ھ/ جنوری ۱۸۳۵ء)

خلیفۂ حضرت شاہ غلام علی، نقشبندی، مجدّدی، دہلوی (متوفی ۲۲ صفر ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۴ء)

وتلمیذِ حضرت شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) سے

حضرت مولانا کافیؔ نے علمِ حدیث کا درس لیا اور خدمتِ علمِ حدیث میں مصروف ہوئے۔

مولانا کافیؔ پر، اپنے استاد ومُربی، حضرت شاہ ابوسعید، مجدّدی (متوفی ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۵ء) کا گہرا اثر تھا۔ اِتباعِ سنّت اور عشقِ رسول میں آپ، ان کے پرتو تھے۔

اِس لئے اجمالاً، یہاں حضرت شاہ ابوسعید، مجدّدی کے اَحوال بھی درج کیے جارہے ہیں۔

حضرت شاہ، ابوسعید، مجدّدی، رام پوری کے بارے میں

سرسید احمد خاں (متوفی ذوالقعدہ ۱۳۱۵ھ/ مارچ ۱۸۹۸ء) لکھتے ہیں:

''آپ، شاہ غلام علی صاحب کے خلیفۂ اعظم ہیں اور آپ کے انتقال کے بعد آپ ہی سجادہ نشین ہوئے......آپ، حضرت مجدّد کی اولاد ہیں......

صفاتِ ذاتی اور کمالاتِ ظاہری اور باطنی ایسے تھے کہ جن کا کچھ حد وحساب نہیں۔

حافظِ کلام اللہ اور عاشقِ رسول اللہ۔ اور علومِ دینی آپ کو بہت مستحضر تھے۔

کلامُ اللہ، ایسی خوش آواز اور کمالِ قرأت سے پڑھتے کہ لوگ، دور دور سے سننے آتے۔

پہلے پہل تو آپ نے مولانا شاہ، درگاہی (رام پوری) صاحب عَلَیْہِ الرَّحْمۃ سے کہ بڑے اولیاے وقت سے تھے، سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی تھی۔

اور نسبتِ باطن، بخوبی، حاصل کرکے پیری مریدی کی اجازت لی تھی۔

لیکن اپنے خاندان کی نسبت نے زور کیا اور اس طریقۂ نقشبندیہ کی طرف کھینچا کہ:

آپ نے دوبارہ، حضرت شاہ غلام علی صاحب سے سلسلۂ نقشبندیہ مجدّدیہ میں بیعت کی اور از سرِ نو، تمام مقامات کو حاصل کیا۔

آپ کی شکل وشمائل، بہت نورانی تھی۔ بے اختیار، آپ کی صحبت میں حاضر رہنے کو دل چاہتا اور جب تک بیٹھتے، وسوسۂ شیطانی، ایک نہ آتا۔

.....اِتباعِ سنّتِ نبوی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم، بدرجۂ کمال تھا۔

کوئی بات، خلافِ سنّت نہ کرتے اور ہر دَم، پیرویِ سنّت کا خیال رکھتے۔

اخلاقِ محمدی، اِس وسعت سے تھا کہ ہر شخص ملنے والا بھی جانتا تھا کہ:

جیسی عنایت اور شفقت، آپ کو میرے حال پر ہے، اس سے سِوا، دوسرے پر نہیں۔

حقیقت میں تواضع کو بدرجۂ کمال پہنچایا تھا اور سخاوت کو، حد سے زیادہ، اختیار کیا تھا۔

........بعدِ انتقالِ شاہ صاحب کے، آپ ان کی جگہ، مسندِ ارشاد پر بیٹھے
اور سالہا سال، لوگوں کو آپ کے فیضِ صحبت سے علوِ مرتبت اور کمالِ مدارِج، حاصل ہوا کہ:
اسی اثنا میں محبتِ رسولِ مقبول صَلَّی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَ آلِهٖ وَسَلَّم نے
بہت غلبہ کیا اور آپ نے زیارتِ حرمین شریفین کا ارادہ کیا۔
اللہ نے وہ ارادہ بھی پورا کیا اور حج اور زیارتِ مدینہ منورہ، نصیب کی۔
بروقتِ مراجعت کے، بہ مقام ٹونک (راج پوتانہ) آپ کا انتقال ہوا۔''
(ص ۴۶۹ تا ۴۷۱۔ **آثارُالصّنادید**۔ از سر سید احمد خاں۔ مطبوعہ: اردو اکاڈمی، دہلی)

مولانا شاہ ابوالحسن زید، فاروقی، مجدّدی، دہلوی (متوفی دسمبر ۱۹۹۳ء) لکھتے ہیں:
''آپ (شاہ ابوسعید، مجدّدی) نے مفتی شرف الدین، شاہ رفیع الدین اور اپنے ماموں
شاہ سراج احمد سے کتبِ متداولہ پڑھیں، اور اپنے ماموں اور پیر و مرشد
حضرت شاہ غلام علی اور شاہ عبدالعزیز سے حدیث کی سند، حاصل کی۔
آپ پہلے اپنے حضرت والد سے بیعت ہوئے۔ انھوں نے آپ سے کہا کہ:
تمہارا مُرغِ ہمت، بلند پرواز ہے، لِہٰذا، اِس خاندان کے خُلفا سے تکمیلِ نسبت کرو۔
چنانچہ، آپ، حضرت شاہ درگاہی، خلیفۂ حضرت شاہ جمال اللہ، خلیفۂ حضرت قطب الدین
خلیفۂ حضرت محمد زبیر، مجدّدی قَدَّسَ اللّٰهُ اَسۡرَارَهُم سے بیعت ہوئے۔
بارہ (۱۲) سال تک فیوض و برکات، حاصل کرتے رہے۔
شاہ درگاہی نے آپ کو خلافت، عطا کی اور اپنا جانشین بنایا۔ وہ، آپ پر نہایت مہربان تھے۔
آپ کی طرف لوگوں کا رُجوع ہوا۔ جذب و شوق کے آثار، آپ کے مریدوں میں
ظاہر تھے۔ مع ھٰذا، جب، آپ، مکتوبات شریف کا مطالعہ فرماتے تھے، کمی کا احساس ہوتا تھا۔
کیوں کہ نسبتِ مجدّدیہ میں، یہ باتیں، باقی نہیں رہتیں، بلکہ حضراتِ صحابہ کی طرح
افسردگی میں عمر گذرتی ہے۔ ان کا سماع، قرآن مجید اور ان کا حضور، نماز
اور ان کا طریقہ اَمۡر بِالۡمَعۡرُوف وَ نَهی عَنِ الۡمُنکر ہوتا ہے۔
اتفاق سے، اس دَوران میں آپ کا دلی آنا ہوا۔ آپ نے دلی سے حضرت قاضی ثناء اللہ کو
پانی پت، خط لکھا کہ مَیں آپ سے باطنی استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔
قاضی صاحب نے محبت بھرا خط آپ کو لکھا۔

اور آپ کو حضرت شاہ غلام علی کی طرف، رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔
چنانچہ، ۱۲۲۵ھ میں آپ نے مشیخت چھوڑ کر، حضرت شاہ غلام علی کی غلامی، اختیار کی۔
یہ شعر، آپ کے حسبِ اَحوال ہے:

از برائے سجدۂ عشق، آستانے یافتم   سر زمینے بود منظور آسمانے یافتم

(ص ۱۷۱ و ۱۷۲۔ ''**مقاماتِ خیر**''۔ مؤلّفہ: شاہ ابوالحسن زید، فاروقی۔ درگاہِ حضرت شاہ ابوالخیر
چتلی قبر، دہلی ۶۔ طبعِ دوم۔ ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء)

مولانا کافیؔ، مراد آبادی کی متعدد تصانیف ہیں۔ جن میں سے چند کے نام یہ ہیں:
ترجمۂ شمائلِ ترمذی (منظوم) مجموعۂ چہل حدیث (منظوم) مع تشریح
خیابانِ فردوس، بہارِ خلد، نسیمِ جنت، مولودِ بہار، جذبۂ عشق، تجملِ دربارِ رحمت بار۔ دیوانِ کافیؔ۔
مولانا کافیؔ نے ۱۸۴۱ء میں حج و زیارت کی سعادت بھی حاصل کی۔
اسی کی یادگار ''**تجملِ دربارِ رحمت**'' ہے۔ جذب و کیف کے عالَم میں آپ نے والہانہ انداز
سے یہ مثنوی لکھی ہے، جس میں دربارِ رسالت و حاضریِ دربارِ رسالت کی بڑی ایمان افروز و روح پرور
اور دل آویز منظر کشی کی ہے: **مثنوی تجملِ دربارِ رحمت بارِ نبیِ کریم، عَلَیۡهِ الصَّلوٰةُ وَ التَّسۡلِیم۔**

ہے سزاوارِ تمامی حمد، وہ ربِّ مُجیب   صاحبِ لَوۡلَاک ہے جس ربِّ اکبر کا حبیب
نور سے اپنے وہ نورِ اوّلیں پیدا کیا   اور اُس محبوب کو لَوۡلَاک کا رُتبہ دِیا
اور اُس اپنے نبی پر کی جو نازل اِک کتاب   رحمةٌ لِلعالمیں کا اُس کو فرمایا خطاب
رحمتِ عالَم کا وہ دربارِ عالی شان ہے   جلوۂ دِیدار پر جس کے تصدُّق، جان ہے
ہو نہیں سکتے بیاں، اوصاف اُس درگاہ کے   کیا ادب آداب ہیں، درگاہِ شاہنشاہ کے
وہ تجمل، شوکت وہیبت کا عالَم ہے کہ یاں   ایک ذرّہ سے بھی کم ہے، قدرِ شاہانِ جہاں
ہر در و دیوار پر اِک عالَمِ تنویر ہے   سرِنگوں جس کے رَقم سے، خامۂ تحریر ہے
آستانِ اَنور و اَقدس پہ خلقت کا ہجوم   ہر طرف، صلوٰت خوانوں اور زوّاروں کی دھوم
پڑھ رہا ہے دست بستہ، باادب، کوئی سلام   ہے کوئی سرگرمِ تسلیمات، باحُبِّ تمام
کوئی اِس دربار میں ہے، سرِنگوں بیٹھا ہوا   ہے کسی کا بہرِ مطلب اُٹھ رہا دستِ دُعا
جا بہ جا، قرآن خواں، گرمِ تلاوت ہیں یہاں   عابد و زُہّاد مشغولِ عبادت ہیں یہاں
صوفیانِ باطریقت عارفانِ باکمال   ہیں بہ قدرِ رُتبہ، سرگرمِ بُکا وَ وَجد و حال

ہے ہجومِ درس جس جا، اور ہی وَاں دھوم ہے　　جو یہاں حاضر ہے اُس کا کیا بڑا مَقسوم ہے
ہے زیارت میں درِ دولت کی اَنبوہِ کثیر　　اہلِ روم واہلِ ہند، اہلِ عرب بَر ناو پیر
دست بستہ ہو کے پڑھتے ہیں وہ صلوٰت وسلام　　کرتے ہیں پھر عرضِ مطلب، زَائرانِ نیک نام
ہے کسی کے ہاتھ میں جالی کا شبکہ آگیا　　مَل رہا ہے اُس سے آنکھیں اور کرتا ہے دُعا
آستانے پر کوئی رکھتا ہے چشمِ اَشک بار　　لے کے خاکِ آستاں، مَلتا ہے منھ پر، بار بار
اور اُسی حجرے کے اندر، بِالیقیں　　ہے جہاں وہ خواب گاہِ رحمۃٌ لِلعالَمیں
اور محرابِ تہجد کی طرف، صَلِّ عَلٰی　　ہے مزارِ بنتِ ختم المرسلیں خَیر النِّسا
داخلِ روضہ ہے اور بیرونِ حجرہ وہ مقام　　ہے جہاں وہ مَرقدِ بختِ دِلِ خیرالانام
اُس مزارِ پاک پر ہے قُبۂ چوبیں بنا　　اس کے اوپر ہے فروہشتہ غلافِ پُر ضیا
مُنجَلی اُس کے سبب سے ہیں سب اَطرافِ مزار　　ہے نصیبِ زائراں، وہ پردۂ زَرّیں شِعار
اور وُکلائے سلاطین واَمیرانِ جہاں　　رہتے ہیں حاضر، بہ دربارِ شفیعِ عاصیاں
ہر وکیل اپنے مؤکّل کی طرف سے صبح وشام　　عرض کرتا ہے درِ دولت پہ تسلیم وسلام
ایک جا، بالَحنِ خوش، بیٹھے ہوئے میلادخواں　　مولدِ خَیر الوَرا کا حال کرتے ہیں بیاں
اور یہ میلادخوانوں نے رکھا ہے اِلتزام　　پڑھتے ہیں آیاتِ قرآں، پیشِ صلوٰت وسلام
بعداَزاں، حالِ ولادت، سیدِ اَبرار کا　　پھر سراپاے مبارک، احمدِ مختار کا
اور آجاتا ہے جب، ذکرِ ولادت، آپ کا　　واسطے تعظیم کے، ہر شخص ہوتا ہے کھڑا
دیر تک رہتے ہیں قائم اور پڑھتے ہیں سلام　　بیٹھ کر پھر حالِ مولد کو وہ کرتے ہیں تمام
ہاتھ اُٹھا روضے کی جانب، حُرمتِ ھٰذَا النَّبِی　　کہتے ہیں وقتِ دعا، سن کر تڑپ جاتا ہے جی
عُود اور صَندل سے جو محفل میں اٹھتا ہے بُخُور　　اس کی خوش بو ہے نصیبِ مجمعِ نزدیک ودُور
بیش تر، ہر روز ہے، یہ شغلِ میلادِ شریف　　ہے غرض، ہر طرح سے، اُس بزم میں یادِ شریف
ہے یہ آدابِ مؤذّن، یاں کہ ہنگامِ نماز　　آستانِ روضۂ حضرت پہ باعجز ونیاز
اِذن کرتا ہے طلب، پڑھ پڑھ کے صلوٰت وسلام　　پھر وہ جاتا ہے اذاں دینے، مَنارے پر مدام
وہ مَنارہ جس پہ کہتے تھے اذاں، حضرت بلال　　اب تلک ہے اُس مَنارے پر نہیں جاتا کوئی
اور پڑھتے تھے تہجد، آن کر حضرت، جہاں　　اب تلک باقی ہے، محرابِ تہجد کا نشاں
اور ہے اس کے مقابل، وہ بھی صُفَّہ برقرار　　رہتے تھے اَصحابِ صُفَّہ، جس جگہ لیل ونہار

شرق کی جانب کو ہے، روضے سے بابِ جبرئیل　　آتے رہتے تھے اُدھر ہی سے جنابِ جبرئیل
دوسرا اُس کے برابر، اور ہے بابُ النِّسا　　وہ بھی اک مشہور ہے بابِ حریمِ مصطفیٰ
اور، وَاں سے شرق کی جانب کو ہے بابُ السَّلام　　بابِ رحمٰں نے بھی پایا ہے اُسی جانب، نظام
نَوعمارت اور وہ جو ایک ہے بابِ مجید　　ہے شمالی سَمت کو، بازینت وزیبِ مزید
ایک غُرفہ اور بھی، مشرق کی جانب ہے وہیں　　اُس طرف سے بھی کبھی آتے تھے جبرئیلِ امیں
ہے مُزیَّن اب تلک، وہ غُرفۂ والا مقام　　آتا تھا اُودھر سے بھی ختمِ رسالت پر پیام
نور اَفشاں ہیں سبھی اَبوابِ شاہِ مُرسلاں　　ہے وہ درگاہِ مقدس، مَرجعِ قدُّوسیاں
اور وہ جو کچھ حرم میں ہیں درختِ تازہ تر　　نخلِ فردوسی سے ایک ایک برگ دیتا ہے خبر
نَوبہارِ نور ہے ہر نخلِ بُن سے آشکار　　جلوۂ دیدار پر، اُس کے تصدُّق نَوبہار
اور وہ معراج کی شب، مطلعِ نور وضیا　　جس کے تھے نظّارگی حور وملک اہلِ سما
آئے تھے لینے کو حضرت مصطفیٰ کے جبرئیل　　اور لائے آپ کو جس رات میں روحُ الامیں
آتی ہے ہر سال میں جب، وہ شبِ فرخندہ پَے　　یاں کے رہنے والوں کا، اِس طرح کا معمول ہے
آتے ہیں چاروں طرف سے وہ، مدینے کی طرف　　تاشبِ معراج کے اِحضار کا پاویں شرف
کیا خوشی کرتے ہیں سب اہلِ عرب اُس رات کی　　ہے بجا اُس کو کہوں، گر ''**عیدِ معراجِ نبیؐ**''
جمع ہوتے ہیں بہ پیشِ روضۂ خیرالانام　　اُس حریمِ محترم میں ہوتی ہے اِک دھوم دھام
کرتے ہیں اُس دن، لباسِ فاخرہ، ملبوسِ تن　　ہوتی ہے وہ انجمن، رشکِ بہارِ ہر چمن
ہوتے ہیں حاضر وہاں، حضرت نبی کے مدح خواں　　حالِ معراجِ رسول اللہ، پڑھتے ہیں وہاں
اور وہ جو ہیں مَنارے، اس حریمِ پاک کے　　اس حریمِ اَطہر واَقدس، شہِ لَولاک کے
ہوتی ہے اُن پر شبِ معراج میں کیا روشنی　　دوسری ایسی کہیں دیکھی نہ زیبا روشنی
اور اُس شب باعثِ معراجِ ختم المرسلیں　　ہوتے ہیں گرمِ مبارک باد، باہم اہلِ دیں
آگیا جو سامنے سے، وہ پکارا: شاد ہو۔　　آج یہ معراج کی شب ہے، مبارک باد ہو!
حَبَّذَا! اے طالعِ کافؔی! یہ تیری رہ بری　　مجھ کو دِکھلائی بہارِ ''**عیدِ معراجِ نبی**''
کافؔیِ عاصی جو حاضر تھا، شبِ اَسریٰ میں وَاں　　اُس کو بھی اَحباب، دیتے تھے مبارک بادیاں
عیدِ معراجِ رسول اللہ کی جلوہ گری　　وہ تجمل اور اُس درگاہ کی جلوہ گری
بس رہی ہے دیدۂ مشتاق میں اَب کیا کروں　　یاد کر کر، روز وشب، اُس رات کو تڑپا کروں

اور ہے وہ صاحبِ کوثر کی یاں جاری سبیل   یاد آوے دیکھنے سے، جس کے کوثر سلسبیل
وہ خنک پانی کہ ہو پینے سے جس کے شاد، دل   پھر کبھی برف آب کو ہرگز نہ لاوے یاد، دِل
جابہ جا، نہریں، رواں پانی کی باصد آب تاب   جوش زَنْ اُن میں عجب انداز سے ہے آب ناب
اور وہ وُسعت، حریمِ محترم کی حَبَّـــــــــذا   دیکھنے سے جس کے پاتی ہے بَصر، نور وضیا
مسجدِ عالی کا عالَم، عالَمِ بالا پہ ہے   مسجدِ ختمِ رسالت، رتبۂ اعلیٰ پہ ہے
عرض میں درجے ہیں اُس مسجد کے دس تا اِنتہا   اور چودہ طُول میں محر ابہاے باصفا
اُستنِ مسجد کو مَیں گنتی میں لایا جس گھڑی   ایک سو تینتیس پائے، وہ ستونِ مسجدی
وہ ستون وقُبَّہ ومحراب، محسودِ جناں   اُن میں نَقّاشی کا عالَم، رشکِ باغ وگلستاں
خاص محرابوں کی نقّاشی وگل کاری کا حال   ہوسکے کس سے بیاں؟ ہے یاں، زبانِ نُطق، لال
وہ جو ایک محراب ہے، حضرت کے منبر کے قریب   دید کے قابل ہے اس محراب کا حالِ عجیب
ایک جانب اُس کے، منبر ہے شہِ لَــوْلَاک کا   دوسری جانب کو ہے، روضہ حبیبِ پاک کا
ہے جو وہ مابین منبر اور روضے کے مقام   روضۂ جنت رکھا، حضرت نبی نے اُس کا نام
نور کا عالَم ہے وَاں، چشمِ ظواہر سے عیاں   وہ جگہ بے شبہ ہے، اِک سطحۂ باغِ جناں
اور وہ منبر کا عالَم، عالَمِ تصویر ہے   اُس کی وہ صَلِّ علیٰ، کیا مشتعل، تنویر ہے
ہے وہ منبر اُس جگہ، جس جا، وہ شاہِ کائنات   پڑھتے رہتے تھے وہیں، خطبے کو ثابت ہے یہ بات
کیوں نہ نورانی ہو، وہ منبر، شہِ لَــــوْلَاک کا   سیدِ کون ومکاں نے، اُس جگہ، خطبہ پڑھا
اور روزِ جمعہ، دو زَرّیں لوائے سرفراز   گردِ منبر کرتے ہیں، لا کر نَصب، وقتِ نماز
احمدی دونوں عَلَم سے صاف ہوتا ہے عیاں   ہیں لِوائے حمد کے، گویا کہ نائب یہ نشاں
اور محرابِ رسول اللہ سے سیدھی طرف   دفن ہے وہ اُستنِ حَنَّانہ، کیا پایا شرف
پُشتۂ دیوار کی صورت، لَحد اُس چوب کی   بن رہی ہے اب تلک، وہ زیرِ محرابِ نبی
وہ سُتوں تھا عاشقِ صادق، رسول اللہ کا   واہ! چوبِ خشک کو، کیا عشق میں رتبہ ملا
وہ جو تڑپا تھا فراقِ صاحبِ لَـــــوْلَاک میں   حشر تک محراب کے، نیچے رہے گا خاک میں
اور محرابوں میں آویزاں ہیں قندیلیں تمام   اور وہ جھاڑوں میں ہر شب، روشنی کی دھوم دھام
دیکھنے سے ہے تعلق، قابلِ اِنشا نہیں   مثل جس کے عالَمِ اِمکان میں پیدا نہیں
اور وہ جو ہے شباکِ روضۂ خیرالوَرا   اُس کا عالَم کیا کہوں، صَلِّ علیٰ، صَلِّ علیٰ

جلوۂ قُدسی ہے باہر سے وہ جالی کی بہار   نور کے شعلے ہیں ہر شبکے سے اُس کے آشکار
سبز گنبد کا، وہ جلوہ، مایۂ نور وضیا   جس نے دیکھا دور سے، تسلیم کرکے جُھک گیا
وہ نبی کا سبز گنبد، مطلعِ انوار ہے   چرخِ اَخضر ایک جس کا، سائباں بردار ہے
چار جانب سَقف کے اندر شباکِ پاک کے   گرد ہے وہ جو مکانِ صاحبِ لَولَاک کے
شمع داں ہیں فرش پر، اُوپر ہیں قندیلیں تمام   اور وَاں کے عُود سوزوں سے مہکتا ہے مشام

علمِ حدیث سے مولانا کافؔی کو بے پناہ شغف و اِنہماک تھا۔ عشقِ رسول کے جذبات سے ہمہ وقت آپ کا دل، لبریز رہتا تھا اور اشعار کی صورت میں وہ دل سے زبان پر آ جایا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؒ نے نعتیہ اشعار، بہت کہے ہیں۔

مولانا کافؔی، عرض کرتے ہیں:

بس آرزو یہی دلِ حسرت زدہ کی ہے   سنتا رہے شمائل و اَحوالِ مصطفیٰ

☆☆☆

ہے سعیدِ دوجہاں وہ جو کوئی لیل و نہار
نعتِ اوصافِ رسول اللہ کا شاغِل ہوا

اسی جذبۂ مسعود اور وصفِ محمود سے متأثر ہوکر، عاشقِ رسول، امام احمد رضا، قادری، برکاتی بریلوی (متوفی ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) نے آپ کو

''**سلطانِ نعت گویاں**'' قرار دیتے ہوئے عرض کیا ہے کہ:

مَہکا ہے مری بوئے دِہن سے عالَم   یاں، نغمۂ شیریں نہیں تلخی سے بہم
کافؔی ''سلطانِ نعت گویاں'' ہیں رضؔا   اِنْ شَــــاءَ اللہ، مَیں، وزیرِ اعظم

نیز، اپنے قلبِ پُرسوز کا کرب واضطراب، ظاہر کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں:

پرواز میں جب مدحتِ شہ میں آؤں   تا عرش، پَرِ فکرِ رَسا سے جاؤں
مضمون کی بندش تو میسَّر ہے رضؔا   کافؔی کا دردِ دل کہاں سے لاؤں؟

مولانا سید کفایت علی، کافؔی، مرادآبادی، انقلابِ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف سینہ سپر تھے اور مرادآباد میں چلنے والی تحریکِ حریت کے قائدین میں آپ، پیش پیش تھے۔

نواب مجدُ الدین خاں، عُرف مَجُّو خاں (شہادت ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء) کی سرکردگی میں جب مرادآباد کے اندر، آزاد حکومت، قائم ہوئی، تو آپ کو مرادآباد کا صدرِ شریعت بنایا گیا۔

اور آپ، شرعی احکام کے مطابق، مقدمات کے فیصلے کیا کرتے تھے۔
جب، مرادآباد میں انگریز حامی نوابِ رام پور کی بالادستی، قائم ہوئی
تو مولانا کافیؔ نے انگریزوں کے خلاف، فتواے جہاد، جاری کیا
اور اس کی نقلیں، دوسرے مقامات پر بھجوائیں اور بعض جگہوں پر آپ خود، تشریف لے گئے۔
آنولہ (روہیل کھنڈ) بریلی میں خاص اسی مقصد سے ایک ہفتہ سے زیادہ، قیام فرمایا۔
حکیم سعدُ اللہ ولد حکیم عظیم اللہ آپ کے ہم سبق ساتھی تھے۔ ان کے یہاں، آپ نے قیام کیا۔
حکیم سعد اللہ صاحب، آنولہ میں تحریکِ آزادی کے اہم رکن تھے۔

مرادآباد و مضافاتِ شہر کی مساجد میں آپ اور مولانا وہاج الدین، عُرف مولوی منو مرادآبادی، **وعظ و تلقین کے ساتھ، ہر جمعہ کو جہاد کی ترغیب دیا کرتے تھے۔**

آنولہ سے مولانا کافیؔ، بریلی پہنچے اور نواب خان بہادر خاں، روہیلہ، نبیرۂ حافظ رحمت خاں و مولوی سرفراز علی سے مشورہ و تبادلۂ خیال کیا۔

پھر، بریلی سے دہلی کے لئے جانے والی وہ فوج جو جنرل بخت خاں روہیلہ کی ماتحتی میں برسرِ پیکار تھی، اس کے ساتھ آپ، مرادآباد واپس آئے۔

مرادآباد میں آزاد حکومت کے قیام کے بعد، انگریز، مرادآباد سے بھاگ کر، نینی تال اور میرٹھ چلے گئے تھے۔ اُس وقت مجو خاں، حاکمِ شہر اور نواب شیر علی خاں، فوج کے جرنیل اور اسد علی خاں، افسرِ توپ خانہ، مقرر ہوئے تھے۔ جب کہ مولانا کافیؔ، صدرِ شریعت بنائے گئے تھے۔

ڈسٹرکٹ گزیٹر، مرادآباد میں ہے کہ:

مسلمانوں نے مِنْ حیثُ القوم، ضلع بھر میں برٹش حکومت سے اپنی مخالفت کو نہایت صاف و صریح طور پر ظاہر کیا۔ روہیل کھنڈ کے دوسرے اضلاع کی طرح ضلع مرادآباد میں بھی غیرتِ مذہبی اور انگریزوں کی ہر بات سے نفرت کے جذبات نے مسلمانوں کو عام بغاوت پر آمادہ کر دیا تھا۔ (ڈسٹرکٹ گزیٹر، مرادآباد)

انگریزوں کی طرف سے نوابِ رام پور، یوسف علی خاں کو مرادآباد، فتح کرنے کی اجازت مل چکی تھی اور اسی بنیاد پر نواب یوسف علی خاں نے مرادآباد کی طرف، پیش قدمی کی تھی۔
خان بہادر خاں، حاکمِ روہیل کھنڈ کے لئے نواب رام پور کی مداخلت، ناقابلِ برداشت تھی۔
مولانا کافیؔ کے ذریعہ، خان بہادر خاں، روہیلہ کو حالات کا پورا علم ہو گیا۔

تو، نواب مجو خاں، حاکمِ مرادآباد کی امداد کے لئے خان بہادر خاں نے جنرل بخت خاں کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ دہلی جاتے ہوئے، مرادآباد کا معرکہ، سَر کر لیں۔
نوابِ رام پور کے اندر اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ جنرل بخت خاں کی فوج سے مقابلہ کرے۔
اِس لئے اس نے انتظام اٹھا لیا اور اپنے افسر، واپس بلا کر میدان، خالی کر دیا۔
مگر، جنرل بخت خاں، جب ۱۷ رجون کو، مرادآباد سے دہلی چلے گئے۔
تو پھر، نوابِ رام پور نے مداخلت کی اور ۲۴ رجون ۱۸۵۷ء کو دوبارہ، اپنی فوج، مرادآباد بھیج دی۔
اس مرتبہ، نواب مجو خاں کے ساتھ، مصالحت کی راہ، اختیار کی۔
جس کے نتیجے میں، وہ رام پور کی طرف سے حاکمِ سنبھل، مقرر ہو گئے۔
بعد کے حالات ایسے رونما ہوئے کہ انگریزوں نے بے دردی کے ساتھ نواب مجو خاں کو بے حد اذیت ناک طریقے پر موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو بریلی چھاؤنی میں بغاوت کے نتیجے میں خان بہادر روہیلہ نبیرۂ حافظ رحمت خاں روہیلہ کو، روہیل کھنڈ کا نواب بنائے جانے کے بعد کے حالات، بیان کرتے ہوئے سید محبوب حسین، سبزواری، مرادآبادی لکھتے ہیں:

’’اسی دوران، نواب خان بہادر خاں کو ایک خط مولوی سید کفایت علی، کافیؔ کا، مرادآباد کے متعلق ملا۔
جس میں نوابِ رام پور کی قوم دشمن سرگرمیوں کا تفصیل سے تذکرہ تھا۔
نواب صاحب نے یہ خط، جنرل بخت خاں کو دکھایا اور نواب رام پور کی غدّارانہ حرکتوں سے آگاہ کیا۔ اور مرادآباد میں رام پور کی فوجی مداخلت سے جو حالات پیدا ہو چکے تھے، ان کے سدِّ باب کی گفتگو کی۔
نواب صاحب (خان بہادر خاں، روہیلہ) نے جنرل بخت خاں کے مشورہ سے محمد شفیع رسالدار کو مع رسالہ کے، مرادآباد جا کر قیام کرنے کا مشورہ دیا۔‘‘
(اخبارُ الصّنادید۔ از حکیم نجم الغنی، رام پوری)

رسالدار محمد شفیع، آنولہ ہوتے ہوئے مرادآباد پہنچے اور خود اپنے مکان میں قیام کیا اور اپنے رسالہ کو جہاں، اِس وقت انٹر کالج محلّہ مغل پورہ میں واقع ہے، پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔

دورانِ قیام، مرادآباد کے کچھ جوشیلے جوانوں کو اپنے ساتھ، شامل کر کے
اپنے رسالہ سے تربیت دلائی اور نمبر ۲۹ پلٹن، مقیم مرادآباد
جو باغی ہوگئی تھی، اُس کو بھی اپنے ساتھ، شامل کرلیا۔'' الخ۔
(ص ۲۰۳۔ **مرادآباد! تاریخِ جدو جہدِ آزادی۔** مرتّبہ: سید محبوب حسین، سبزواری۔
مطبوعہ: اسلامی بک ہاؤس، مرادآباد۔ مارچ ۲۰۰۰ء)
۲۵/اپریل ۱۸۵۸ء کو مرادآباد پر، جب، انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوا
تو مولانا کافیؔ ۱۶/رمضان ۱۲۷۴ھ/۳۰/اپریل ۱۸۵۸ء کو گرفتار کر لیے گئے۔
اور مختلف دفعات لگا کر، آپ کے خلاف، مقدمہ چلایا گیا۔
سرسری اور نمائشی کارروائی، ضابطہ کی خانہ پُری کے لئے ہوئی اور پھر پھانسی کا حکم سنا دیا گیا۔
مولانا سید کفایت علی، کافیؔ مرادآبادی نے مسرت وطمانیت کے ساتھ، حکم سنا۔
اور مرادآباد جیل کے سامنے، آپ کو پھانسی دی گئی اور بعدِ شہادت، وہیں آپ کی تدفین بھی ہوئی۔
پھانسی کے پھندے تک، جب، قدم بہ قدم، مولانا کافیؔ آگے بڑھ رہے تھے
تو اپنی ایک ایمان افروز اور تازہ نعت شریف کے اشعار
بڑے ترنم اور وجد وشوق کے ساتھ، گنگنا رہے تھے۔
سید محبوب حسین، سبزواری، مرادآبادی لکھتے ہیں:
''جس وقت، مرادآباد میں یہ خبر، مشہور ہوئی کہ:
بریلی چھاؤنی کی ہندوستانی سپاہ نے بغاوت کر دی ہے۔
تو، اس خبر کے ملنے پر، ۲۹ پلٹن، مقیم مرادآباد نے بغاوت کر کے
سرکاری خزانہ اور ہتھیار لوٹ لیے۔ (ڈسٹرکٹ گزیٹر، مراآباد)
اس کے بعد شہر میں ہنگامہ برپا ہو گیا اور شہر کے عوام جو انگریز کی غلامی سے ناراض تھے
تلواریں کھینچ کر فخر سے نعرہ لگاتے ہوئے سڑکوں پر نکل پڑے۔
اور انگریزوں پر حملہ کرنا اور جگہ جگہ، تلاش کرنا، شروع کر دیا۔
علما حضرات بھی اپنی درسگاہوں سے نکل کر عوام کے ساتھ، جہاد میں شریک ہو گئے۔
انگریز، اس ہنگامہ سے ڈر کر میرٹھ اور نینی تال، فرار ہو گئے۔
حالات کے پیشِ نظر، عُلما حضرات نے فوری انتظام کے لئے ایک ''**جنگی مشاورتی کمیٹی**''

قائم کی، جو شہر کا انتظام بھی کرے گی اور جنگ کے لئے ذرائع ووسائل بھی فراہم کرے گی۔
اس کمیٹی کے ایک رکن، مولوی سید کفایت علی، کافیؔ بھی تھے۔
اس کمیٹی نے ضلع مرادآباد کے اندر وباہر، جہاد کے فتویٰ، تقسیم کرائے۔
جس میں انگریز کے خلاف، مسلمانوں کو جہاد کا شرعی حکم دیا گیا تھا۔
اس غیر منظّم جہاد کو ناکام کرنے کے لئے نوابِ رام پور اور کچھ مقامی غدّاروں کا
بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس ناکامی کے نتیجہ میں مسلمانانِ مرادآباد کو بقول سرسید احمد خاں:
جس تباہی وبربادی کا سامنا کرنا پڑا، وہ ناقابلِ بیان ہے۔''
اسی دوران ۲۹ پلٹن اور جوش میں بھرے نوجوان عوام نے، باہم مشورہ سے
نواب مجدُالدین خاں، عُرف مجو خاں کو حاکمِ مرادآباد مقرر کیا۔ (**اخبارُالصّنادِید**، از نجم الغنی، رام پوری)
اور عباس علی خاں کو افسرِ توپ خانہ، مقرر کیا، مگر، توپیں، موجود نہیں تھیں۔
اور مولوی سید کفایت علی، کافیؔ کو صدرِ شریعت، مقرر کیا۔
عُلما کے فتوی نے عوام میں ہر طرف آگ بھڑکا دی تھی۔
روہیل کھنڈ میں مسلمانوں کی برہمی کا ایک خاص سبب، یہ بھی تھا کہ:
مذہب میں مداخلت ہونے لگی تھی۔
اس جنگِ آزادی کی ناکامی کے، دو بہت پرانے اسباب تھے:
اوّل یہ کہ کوئی مرکزی تنظیم نہیں تھی، جو جنگ پر قابو پاتی۔
دوسرے، جنگ کو ناکام بنانے کے لئے مقامی غدّار، بہت ہی کوشاں تھے۔
ان ہی وجوہات کی بنا پر مجاہدین کو، زبردست جانی ومالی نقصان اٹھانا پڑا۔
ان غدّاروں کی مدد سے انگریز، دوبارہ ۲۴/اپریل ۱۸۵۸ء کو شہر مرادآباد
اور اس کے مضافات پر قابض ہو گیا اور پھر عیسائی تہذیب کا، وہ ننگا ناچ، شروع ہوا
جس کو تاریخِ عالَم، کبھی، فراموش، نہیں کر سکتی۔
جسے دیکھا حاکمِ وقت نے، کہا یہ بھی قابلِ دار ہے
اس وقت، انگریزوں نے غدّاروں کو ایک اور لالچ یہ دے رکھا تھا کہ:
جو شخص، کسی بھی مجاہد کو گرفتار کرائے گا اور پھانسی، دِلوائے گا
اس کی جائیداد کا بڑا حصہ، اس غدّار کو دے دیا جائے گا۔

اس لالچ کا یہ نتیجہ نکلا کہ:

کوئی مجاہد ایسا نہیں بچا، جس کو غداروں نے گرفتار کروا کے پھانسی نہ دِلوادی ہو۔

جتنے بھی ساہو صاحبان ہیں، یہ اسی غدّاری کی پیداوار ہیں۔

لِہٰذا، مولوی سید کفایت علی، کافیؔ کو بھی ایک کمینہ صفت انسان نے قتل کرایا۔

پہلے، مولانا وہاج الدین، عرف منو کو قتل کرایا۔ پھر، مولوی سید کفایت علی کو۔

اس غدار کا نام، فخر الدین کلال تھا۔'' (اخبارُ الصّنادید۔ از نجم الغنی، رام پوری)

مولانا کافیؔ، جنگ کے بعد، اپنے مکان میں روپوش تھے کہ:

اس ظالم نے مُخبری کر کے گرفتار کرایا۔ اس نمک حرام نے انگریز کلکٹر سے جا کر مُخبری کی اور گرفتاری کا اِس شرط پر وعدہ کیا کہ گرفتاری کے بعد انعام میں، مولانا کی تمام جائیداد، اس کو دے دی جائے گی۔

یہ وعدہ لے کر فوج کے دَستہ کے ہمراہ، مولانا صاحب کے مکان پر پہنچ کر آواز دی۔

ملازم نے مولوی صاحب سے اجازت لے کر دروازہ کھول دیا۔

فوج کے جوان، اندر، داخل ہوئے۔ مولوی صاحب، تخت پر بیٹھے ہوئے گرفتار کر لیے گئے۔

گرفتاری کے بعد، اس غدار کو، جائیداد میں سے ایک بڑا حصہ دے دیا گیا۔

اس نمک حرام کا نام، انگریز کے وفاداروں کی کتاب میں درج کیا گیا۔

مولانا صاحب کی گرفتاری کے بعد، فوری کارروائیِ مقدمہ کی شروعات ہوئی۔

اُس وقت، انگریز کی عدالت کا یہ عالم تھا کہ:

کوئی ملزم کے بیان کو جس طرح چاہے، تحریر کر دے۔

ملزم کو بیان دیکھنے، یا وکیل کرنے کا حق نہیں تھا اور نہ کوئی صفائی پیش کرنے کی اجازت تھی۔

اس وقت، انگریزوں نے ایک کمیشن قائم کیا تھا، جو مقدمات کی سماعت کرتا تھا۔

اور اسیسر صاحبان بھی اکثریتی طبقہ کے وہ لوگ تھے، جو ملک و قوم سے غداری کر رہے تھے۔

لِہٰذا، ۴؍مئی ۱۸۵۸ء کو اس ظالم و جابر انگریز مجسٹریٹ کے روبرو، مولانا کافیؔ کا مقدمہ پیش ہوا اور بہت جلد فیصلہ سنا دیا گیا۔ (اخبارُ الصَّنادید۔ از نجم الغنی، رام پوری)

مقدمہ کی پوری تفصیل، آگے، تحریر ہے:

رودادِ مقدمۂ مولوی سید کفایت علی۔ ۴؍مئی ۱۸۵۸ء

مقدمہ مسٹر جان انگلسن، مجسٹریٹ کمیشن .... ۴؍مئی ۱۸۵۸ء

سرکاری مُدّعی

بنام: مولوی کفایت علی، کافیؔ

فیصلۂ عدالت کمیشن:

چوں کہ اس مُدّعا علیہ ملزم نے انگریزی حکومت کے خلاف، بغاوت کی۔

اور عوام کو قانونی حکومت کے خلاف، ورغلایا اور شہر میں لوٹ مار کی۔

ملزم کا یہ فعل، صریح بغاوتِ انگریزی سرکار رہا، جس کی پاداش میں ملزم کو سزائے کامل دی جائے۔

حکم ہوا: مدعا علیہ، پھانسی سے جان مارا جائے۔ فقط

دستخط انگریزی

جان انگلسن۔ ۶؍مئی ۱۸۵۸ء

مقدمہ کی پوری کارروائی، صرف، دو دن میں پوری کر دی گئی۔

۴؍ کو پیش ہوا، اور ۶؍ تاریخ کو حکم لگا دیا گیا اور اسی وقت، پھانسی دے دی گئی۔''

(ص ۱۴۲ تا ۱۴۴۔ ''**مراد آباد! تاریخ جدوجہدِ آزادی**''۔ از سید محبوب حسین، سبزواری، مراد آبادی۔ مطبوعہ مراد آباد)

جس وقت، مولانا کافیؔ صاحب کو قتل گاہ لے جایا جا رہا تھا

اُس وقت آپ اپنی ایک نعت شریف پڑھتے ہوئے خراماں خراماں تشریف لے گئے۔''

(ص ۹۴۔ **تذکرۂ علمائے ہند**۔ از رحمٰن علی)

نعت کے چند اشعار

کوئی گل باقی رہے گا، نَے چمن رہ جائے گا — پر رسول اللہ کا، دینِ حَسَنْ رہ جائے گا

ہم صفیرو! باغ میں ہے کوئی دَم کا چہچہا — بلبلیں اُڑ جائیں گی، سونا چمن رہ جائے گا

جو پڑھے گا صاحبِ لَولاک کے اوپر درود — آگ سے محفوظ اس کا، تن بدن رہ جائے گا

سب فنا ہو جائیں گے، کافیؔ ولیکن حشر تک

نعتِ حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا

(**۱۸۵۷ء کے مجاہد شُعرا**۔ از امداد صابری۔ مطبوعہ: دہلی)

حضرت مولانا کافی شہید کو مرادآباد جیل کے سامنے، مجمعِ عام کے روبرو پھانسی دی گئی۔
اور وہیں کسی مقام پر، رات کی تاریکی میں دفن کر دیا گیا۔
دفن کے سلسلے میں عوام کے درمیان، مختلف روایات، گردش کرتی ہیں۔
ایک روایت، حضرت مولوی **محمد** عمر صاحب نعیمی کے بیان کے مطابق، یہ ہے کہ:
مولانا کافی شہید کا جسمِ اطہر، قبر سے نکال کر، دوسری جگہ منتقل کیا گیا۔
یہ واقعہ، مولانا **محمد** عمر صاحب نعیمی کے بیان کے مطابق، تقریباً ۳۰ رسال بعد کا ہے کہ:
قبر، کسی وجہ سے کھل گئی تھی، تو دیکھا کہ:
حضرت مولانا کافی شہید کا جسمِ اَطہر، بروقتِ شہادت جیسا تھا، ویسا ہی موجود ہے۔
حشراتُ الارض سے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔
جسمِ اطہر کو اس حالت میں دیکھ کر عوام کا بہت بڑا مجمع، دیکھنے کو جمع ہو گیا۔
مولوی **محمد** عمر نعیمی فرماتے ہیں کہ:
ان کے نانا، شیخ کرامت علی ٹھیکیدار نے جسمِ اَطہر کو عقب جیل خانہ، دفن کر دیا۔''
(**۱۸۵۷ء کے مجاہد شُعرا**۔ از امداد صابری، مطبوعہ: دہلی)
اور اسی واقعہ کی دوسری شہادت، جناب مولوی سید ظفر الدین احمد مرحوم بن حضرت حاجی
مولوی سید نعیم الدین صاحب مرادآبادی کی ہے۔ وہ، بیان کرتے ہیں کہ:
ایک سڑک، اِس مقام سے نکالی جا رہی تھی۔
اور مولانا کافی شہید کے مزار کا نشان، نمایاں نہیں تھا۔ مزدور کام کر رہے تھے کہ:
مولانا کی قبر کھل گئی اور مزدور کا پھاوڑا، مولانا کافی شہید کی پنڈلی پر لگا۔
جسمِ اطہر، ویسا ہی تھا جیسا شہادت کے وقت تھا۔
بزرگ لوگوں نے چہرۂ مبارک دیکھ کر شناخت کر لیا
اور بھاری تعداد میں لوگ،، زیارت کرنے دوڑ پڑے۔''   (۱۸۵۷ء کے مجاہد شُعرا)
مزدوروں نے انجینئر سے بیان کیا۔
انجینئر، خود آیا اور میت کو صحیح سلامت دیکھ کر ڈر گیا اور احتراماً عوام کو ہٹا کر
قبر پر، دوبارہ تختہ وغیرہ لگوا کر، بالکل ٹھیک کرا دیا اور سڑک کا رُخ، تبدیل کر دیا۔
جس کی وجہ سے سڑک میں کچھ ٹیڑھا پن پایا جاتا ہے۔ جسم، کہیں منتقل نہیں ہوا۔

مرادآباد کے عوام، مولوی سید ظفر الدین نعیمی مرادآبادی کے بیان سے
زیادہ اتفاق کرتے ہیں اور اس بیان کو مولانا امداد صابری دہلوی صاحب نے بھی
اپنی کتاب ''**شہیدانِ وطن مرادآباد**'' میں تحریر کیا ہے۔
مولانا کافی شہید کی علمی قابلیت کے سلسلہ میں
مولانا عبدالغفور نَسّاخ، مؤلّفِ ''سخنِ شُعَرا'' فرماتے ہیں کہ:
مولانا کافی اپنے دَور کے نعت گو شُعَرا میں جواب نہیں رکھتے تھے۔
وہ مستند عالمِ دین تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت، تصنیف و تالیف میں گذرتا تھا۔
مولوی عبدالغفور صاحب کے بیان کے مطابق:
مولانا کافی شہید کی تصانیف میں احادیث کے تراجم، بہارِ خلد اور شاہ عبدالحق محدّث دہلوی
کے رسالۂ ترغیب اہلِ سعادت کا ترجمہ ''خیابانِ فردوس'' ہے۔''
(۱۸۵۷ء کے مجاہد شُعرا۔ از امداد صابری۔ مطبوعہ دہلی)
اور اسی قسم کی کتابیں اور دیگر رسالے ہیں۔ مولانا کافی، صاحبِ دیوان شاعر تھے۔
آپ کی تصنیف کردہ چند کتابوں کے نام، حسب ذیل ہیں:
(۱) امام ابوعیسیٰ **محمد** بن عیسیٰ، ترمذی (وصال ۲۷۹ھ/۸۹۲ء) کے
مشہور مجموعۂ احادیث ''اَلشَّمَائِلُ النَّبَوِیة'' معروف ''بہ شمائلِ ترمذی'' کا
منظوم اردو ترجمہ در صنفِ مثنوی۔ بنام ''**بہارِ خُلد**''۔
(۲) حضرت شیخ عبد الحق، محدّث دہلوی (وصال ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) کی فارسی کتاب
''تَرْغِیبُ اَھْلِ السَّعَادات عَلیٰ تَکثِیرِ الصَّلوٰتِ عَلیٰ سَیِّدِ الْکَائِنَات''
در بیانِ فضائلِ درود شریف کا منظوم اردو ترجمہ در صنفِ مثنوی۔ بنام ''**خیابانِ فردوس**''۔
(۳) محبتِ رسول، فضائلِ درود، مدحِ اہلِ بیت وصحابۂ کرام وغیرہ پر مشتمل
چالیس احادیث کریمہ کا منظوم اردو ترجمہ در صنفِ مثنوی۔ بنام ''**نسیمِ جنت**''۔
(۴) مولود شریف بہاریہ مع حُلیۂ مبارکہ (مثنوی)
(۵) مولانا **محمد** اسحٰق، بدایونی (متوفی ۱۲۹۷ھ/۸۰-۱۸۷۹ء) کے ایک رسالہ کی روشنی میں
اَحوالِ عاشقانِ رسول صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم پر مشتمل
ایک منظوم رسالہ: بنام ''**داستانِ صادقاں**''۔

(۶) منظوم واقعۂ اُستنِ حنّانہ درصنفِ مثنوی۔ بنام ''**جذبۂ عشق**''

(۷) حج وزیارتِ حرمین شریفین کے موقع پر روضۂ اطہر ومسجدِ نبوی کے ایمان افروز مناظر کا منظوم بیان درصنفِ مثنوی۔ بنام ''**تجملِ دربارِ رسالت**''

(۸) مختصر معراج نامہ (تضمین برشعرِ شیخ سعدیؔ شیرازی)

(۹) دیوانِ کافیؔ۔

ان کے علاوہ بھی بعض کتب ورسائل ہیں۔ صَرف ونَحو کے موضوع پر بھی آپ نے دادِ تحقیق دی ہے۔ مگر، افسوس کہ آپ کی بیشتر تحریرات، ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں اور گردشِ زمانہ نے ان میں سے اکثر کے ساتھ، نہ جانے کیا سلوک کیا ہے۔

نعت کے چند اشعار، ملاحظہ ہوں:

یا الٰہی! حشر میں خیرالوریٰ کا ساتھ ہو ۔۔۔ رحمتِ عالَم محمد مصطفیٰ کا ساتھ ہو
یا الٰہی! ہے یہی دن رات میری التجا ۔۔۔ روزِ محشر شافعِ روزِ جزا کا ساتھ ہو
بعدمرنے کے بھی کافیؔ کی ہے یارب! یہ دعا ۔۔۔ دفترِ اشعارِ نعتِ مصطفیٰ کا ساتھ ہو

بہارِ خلد ہے روے محمد ۔۔۔ شمیمِ جاں فَزا بوے محمد
دلِ وحشی ہے زنجیریں تڑاتا ۔۔۔ بشوقِ یادِ گیسوے محمد

○○○

اوّلین منصوبہ ساز وسالارِ انقلاب

مولانا سید احمدُ اللہ شاہ، مدارسی

بانیِ ریاستِ ''محمدی'' شاہجہاں پور

دلاور جنگ، مولانا سید احمدُ اللہ شاہ، مدراسی (متولد ۱۲۰۴ھ/ ۱۸۱۷ء۔ متوفی ۲/ ذوالقعدہ ۱۲۷۴ھ/ ۱۵/ جون ۱۸۵۸ء) **انقلاب ۱۸۵۷ء کے سالارِ اعظم تھے۔**

جن کا تدیُّن وتصوُّف اور جن کی شجاعت ومردانگی
تاریخِ ہند وتاریخِ انقلاب کے روشن ابواب ہیں۔

احمد علی نام، ضیاء الدین لقب اور دلاور جنگ، خطاب ہے۔ بعد میں احمدُ اللہ کے نام سے شہرت ملی۔ اپنی جمعیت کے ساتھ، جب سید احمدُ اللہ شاہ، مدراسی نکلتے

تو آپ کے ساتھ، ایک دَستہ، ڈنکا اور نقارہ پیٹتا ہوا چلتا تھا۔ اِس لئے تاریخوں میں آپ کا عُرف، کہیں ''**ڈنکا شاہ**'' اور کہیں ''نقارہ شاہ'' بھی جابجا ملتا ہے۔

مولانا سید احمدُ اللہ شاہ، مدراسی بن سید محمد علی (نواب چنیا پٹن تعلقہ پورنا ملّی) بن سید جلال الدین عادل، **جنوبی ہند کا ایک درخشاں ستارہ ہے**

جس نے شمالی ہند کے آفاق کو، مدتوں روشن ودرخشاں رکھا اور دہلی وآگرہ ولکھنؤ وفیض آباد وشاہجہان پور کے اندر، اپنی تگ وتاز اور معرکہ آرائیوں کی ایک نا قابلِ فراموش تاریخ، رقم کی۔

سید جلال الدین عادل، اُس خاندانِ قطب شاہی کے ایک فرد تھے، جسے ۱۶۸۷ء میں سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے گول کنڈہ (دَکن) پر قبضہ کے بعد، تخت وتاج سے محروم کردیا تھا۔

اچھی تعلیم وتربیت، صوم وصلوٰۃ واحکامِ شریعت کی پابندی، اَوراد وظائف سے دل چسپی

ہمت واولوالعزمی، فنونِ حرب میں مہارت اور خوش اخلاقی واعلیٰ ظرفی نے سید احمدُ اللہ شاہ مدراسی کو مجموعۂ صفات بنادیا تھا۔ خود، آپ کے والد، سید محمد علی، جہاں ایک طرف، نواب چنیاپٹن اور مُصاحب ومُشیرِ سلطان ٹیپو تھے، وہیں، دینداری اور فقر وتصوف سے انھیں خاصا قلبی وروحانی لگاؤ تھا۔

انگریزوں کے ساتھ، جنگِ سرنگا پٹنم، میسور کے درمیان، شہادتِ سلطان ٹیپو (۱۷۹۹ء) کے بعد، پورے علاقۂ مدراس کے حالات، خراب اور مسلمان، تباہی و بربادی کے شکار ہو چکے تھے۔

یہ ماحول، سید احمدُ اللہ شاہ نے ہوش سنبھالتے ہی دیکھا تھا۔ اور حالات کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا تھا۔

عنفوانِ شباب ہی میں مولانا سید احمدُ اللہ شاہ، اپنا گھر بار چھوڑ کر ریاضت ومجاہدہ وسَیر وسیاحت کے لئے نکل پڑے۔ پہلے، حیدرآباد دَکن (جنوبی ہند) پہنچے۔

اور وہاں کچھ دن، قیام کیا۔ اس وقت، مَرہٹے، حیدرآباد پر حملے کر رہے تھے۔

حیدرآباد کی طرف سے مرہٹوں کے خلاف، آپ نے جنگ میں حصہ لیا اور اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے۔ پھر، مدراس، واپس آئے اور وہاں سے انگلستان کا سفر کیا، جہاں، ملکہ وکٹوریہ کے شاہی مہمان ہوئے۔ وہیں سے مصر گئے، پھر، حج وزیارت کی نیت سے حجازِ مقدس کا سفر کیا۔

آپ کے ایک مُرید، مولانا فتح محمد، تائبؔ لکھنوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۱ء) نے آپ کے منظوم حالات، بنام "**تواریخِ احمدی**" (مطبوعہ ۱۲۹۷ھ مطبع انوارِ احمدی لکھنؤ) میں اس سفرِ حج وزیارت کا ذِکر، اِس طرح کیا ہے:

ہوا دل کو ذوقِ سفر پھر قبول — پئے اِقتباسِ حضورِ رسول
چلے، سر کے بل، جاں نثارِ نبی — ہوئے خاک بوسِ مزارِ نبی

عرب وتُرکی وایران وافغانستان ہوتے ہوئے مولانا سید احمدُ اللہ شاہ ہندوستان، واپس آئے۔ بیکانیر وسانبھر (راج پوتانہ، موجودہ راجستھان) کے علاقے میں بارہ (۱۲) برس رہ کر ریاضت ومجاہدہ واَوراد وظائف وچِلّہ کشی کی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کے پوتے، حضرت خواجہ حُسَام الدین سوختہ کا مزارِ مبارک، سانبھر (راج پوتانہ۔ موجودہ راجستھان) ہی میں ہے۔

یہاں کی آب وہوا اور فیضان نے آپ کو روحانی لذت سے سرشار کر دیا۔

بارہ برس، یہاں عبادت وریاضت میں گذارنے کے بعد، آپ، جے پور (راج پوتانہ) آئے اور حضرت میر قربان علی چشتی سے بیعت واِرادت کی نسبت، حاصل کرنے کے بعد

خرقۂ خلافت سے نوازے گئے۔

یہاں سے آپ، ٹونک (راج پوتانہ) آئے۔ نواب وزیر الدَّولہ کا عہدِ حکومت تھا۔
آپ، وعظ وتذکیر کے ساتھ، بعد نمازِ عصر، محفلِ سماع بھی منعقد کیا کرتے تھے۔

یہ بات، وہاں کچھ لوگوں کو ناپسند آئی اور سماع کے اوپر، سوال وجواب، شروع ہو گیا۔

آپ نے اپنے معترضین کو جواب دیا، مگر، ماحول اپنے حق میں نامناسب ونامساعِد دیکھ کر آپ، ٹونک سے گوالیار (موجودہ صوبہ مدھیہ پردیش) چلے آئے۔

ٹونک ہی میں آپ، حضرت محراب شاہ قلندر، گوالیاری کا شُہرہ سن چکے تھے۔

یہاں آکر آپ نے حضرت محراب شاہ کی خدمت میں حاضری دی۔

اور ان کے دامنِ کرم سے وابستہ ہونے کی خواہش، ظاہر کی۔

محراب شاہ نے فرمایا کہ:

"سَودا، بڑا کٹھن ہے۔ میں تو عرصہ سے تمہارا منتظر ہوں۔
مگر، تمہیں اِس کے لئے جان کی بازی لگانی ہوگی۔"

مولانا مدراسی نے برضا ورغبت، جب سب کچھ قبول کیا
تو آپ نے کچھ اَوراد ووظائف کی انھیں تلقین کی اور گلے لگا کر خلعتِ خلافت سے سرفراز کیا۔

حضرت قربان علی شاہ، چشتی، جے پوری اور حضرت محراب شاہ قلندر، قادری، گوالیاری سے چشتی وقادری خلافت پاکر، مولانا سید احمدُ اللہ شاہ، مدراسی، چشتیت وقادریت کا سنگم بن گئے۔

قادری نسبت نے آپ کے اندر، انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔

محراب شاہ قلندر، قادری، گوالیاری نے آپ سے عہد لیا تھا کہ:

وطنِ عزیز کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانا ہے۔

جسے آپ نے بسر وچشم قبول کیا تھا اور پھر اپنے مُرشد سے کیے گئے وعدہ کی تکمیل کے لئے آپ، پورے طور پر سرگرمِ عمل ہو گئے۔

اِسی ارادہ سے گوالیار سے ۱۸۴۶ء میں دہلی پہنچے۔ جہاں، آپ نے عُلما ومشائخ سے ملاقات کر کے انہیں آمادۂ جہاد کرنے کی مُہم شروع کی۔

اور پھر جلد ہی حضرت مفتی صدرُ الدین، آزردہ دہلوی، صدرُ الصُّدور دہلی (متوفی ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) کے مشورہ اور آپ کے تعارفی مکتوب کے ساتھ، آگرہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

جواُس وقت، نہایت اہمیت کا حامل، مقام تھا اور کثیر تعداد میں اہلِ علم وفضل کے اجتماع وقیام کی وجہ سے اسے متحدہ ہندوستان کے اندر، اس وقت ایک مرکزی حیثیت، حاصل تھی۔

مفتی اِنعام اللہ، گوپامئوی، سرکاری وکیل آگرہ (متوفی ۱۲۷۵ھ۔ ۱۸۵۹ء۔ مدفون، درگاہ ابوالعُلا، آگرہ) کے نام، مفتی صدرُالدین، آزردہ، دہلوی کے سفارشی مکتوب نے

آگرہ میں مولانا سید احمدُ اللہ شاہ، مدراسی کے لئے روابط وتعلقات

اور اپنے مقصد میں کامیابی کی راہیں کھول دیں۔

مفتی انعام اللہ، گوپامئوی، اُس وقت، سرکاری وکیل آگرہ

اور معروف ومعزز ومقتدر شخصیت وحیثیت کے حامل ومالک تھے۔

مولانا مدراسی کے وعظ وبیان میں ہزاروں مسلمانوں کا مجمع ہوتا تھا۔

جگہ جگہ، آپ کے تبلیغی واصلاحی دَورے ہوتے تھے۔

"**مجلسِ عُلما**" کے نام سے نہایت سرگرمی کے ساتھ آپ نے اپنے منصوبہ کے مطابق اپنے کام کو آگے بڑھایا۔ آپ کی شہرت ومقبولیت اور آپ کے تعلقات واثرات کا دائرہ کافی وسیع ہوگیا۔ بڑے بڑے عُلما وفُضَلا واُدَبا وشُعَرا، آپ کے گرویدہ ہوگئے۔

آپ کے عزائم اور آپ کی ہردل عزیزی نے حکومتِ وقت کو چوکنا کردیا۔

اور انگریز مخالف سرگرمیوں نے سرکاری کارِندوں کے ہوش اُڑا دیے۔

مولانا مدراسی کے مُرید، فتح محمد، تائبؔ لکھنوی نے اپنی مثنوی "**تواریخِ احمدی**" میں لکھا ہے کہ:

اپنے مریدوں سے مولانا مدراسی، جہاد کا عہد وپیمان لیا کرتے تھے۔

چنانچہ، تائبؔ ان کے بارے میں کہتے ہیں:

لیا، ان سے پھر امتحانِ جہاد　　**کہ کھینچیں نصاریٰ پہ تیغِ عناد**

مولانا سید محمد میاں، دیوبندی لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا مفتی محمد صدرُالدین صاحب جیسا اعلیٰ مدبِّر

جس نے حضرت سید احمدُ اللہ شاہ صاحب کی سیاسی تگ ودَو کے لئے آگرہ کا میدان، منتخب فرمایا۔

آپ نے خود ہی اس کی ذِمّہ داری بھی لی کہ:

حضرت مولانا شاہ احمدُ اللہ صاحب جیسے ہی آگرہ پہنچیں، بِلا کدوکاوش، کلیدی حضرات تک

ان کی رسائی ہوجائے اور، یہ ان کا اعتماد، حاصل کرلیں۔ چنانچہ، حسبِ روایت مفتی انتظام اللہ، شہابی:

"مفتی انعام اللہ، خان بہادر، جو محکمۂ شریعت کے مفتی، رہ چکے تھے، اب سرکاری وکیل تھے۔ حضرت آزردہؔ کے خط کے ذریعہ، شاہ صاحب (مدراسی) ان کے یہاں آکر مقیم ہوئے۔

ان کا گھر، عُلما کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مفتی صاحب کے صاحبزادے

مولوی اِکرامُ اللہ، صاحبِ "**تصویرُ الشُعَراء**" مُرید ہوئے۔

عُلما وفُضَلا کا یہ گلدستہ، جس کی شیرازہ بندی، اب تک علمی وادبی ذوق نے کر رکھی تھی

مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کے پہنچنے کے بعد، اس میں سیاسی رنگ، پیدا ہونا، شروع ہوا۔

اور "**مجلسِ عُلما**" کی شکل میں اس اجتماع کی تشکیل کی گئی۔

اس کے ارکان کی مختصر فہرست، ملاحظہ ہو:

مولوی شیخ اعتقاد علی بیگ صاحب، مولوی امام بخش صاحب، سید باقر علی صاحب ناظمِ محکمۂ دیوانی، مولوی نورُالحسن صاحب، سید مراتب علی صاحب، مولوی خواجہ تراب علی صاحب سید حسن علی صاحب، رحمت علی صاحب، مفتی ریاض الدین صاحب، مولوی غلام جیلانی صاحب، غلام مرتضیٰ صاحب، شیخ محمد شفیع صاحب، مولوی عبدالصَّمد صاحب، مولوی منصب علی صاحب، مولوی محمد عظیم الدین حسن صاحب، رسول بخش صاحب، باسِط علی صاحب، مومن علی صاحب، محمد قاسم صاحب، داناپوری، معین الدین صاحب، مولوی کریم اللہ خاں صاحب صدرُ الصُّدور، قاضی محمد کاظم علی صاحب، تاج الدین صاحب، طفیل احمد صاحب خیرآبادی

مولانا غلام امام شہیدؔ، مفتی عبدالوھّاب صاحب، گوپامئوی، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب مولوی فیض احمد صاحب بدایونی، مفتی انعام اللہ صاحب۔

یہ حضرات، صدارت، نظامت کے مختلف عہدوں پر فائز تھے، یا۔ وُکلا تھے۔

جنھوں نے اس مجلس کی رکنیت، منظور کی۔ اور دامے، درمے، قدمے، سخنے

شاہ صاحب کی تائید واِعانت، شروع کردی۔"

(ص ۴۱۸ تا ص ۴۲۰۔ **عُلماے ہند کا شاندار ماضی**۔ جلدِ چہارم۔

مؤلّفہ: سید محمد میاں، دیوبندی۔ مطبوعہ: کتابستان۔ گلی قاسم جان۔ دہلی ۶)

مزید تفصیلات کے لئے دیکھیں: **مولوی احمدُ اللہ شاہ اور پہلی جنگ آزادی**، از مفتی انتظام اللہ شہابی، اکبرآبادی۔ **ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی عُلما**، از مفتی انتظام اللہ، شہابی۔

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء۔ از پروفیسر محمد ایوب قادری (کراچی)۔ جنگِ آزادی کے مسلم مشاہیر
از محمد صدیق قریشی، جہلمی ۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد، از غلام رسول مہر۔
غدر کے چند علما، از مفتی انتظام اللہ شہابی، اکبر آبادی۔

سید خورشید مصطفیٰ رضوی لکھتے ہیں کہ:

مولانا سید احمدُ اللہ شاہ مدراسی کو انگریز، انقلاب ۱۸۵۷ء کا دل و دماغ اور دست و بازو سمجھتے تھے۔

''تحریکِ ۱۸۵۷ء کے لئے پورے ملک کو تیار کرنے میں مولانا شاہ احمدُ اللہ، مدراسی کا نام، سرِ فہرست آتا ہے۔ وہ ملک کے گوشے گوشے میں دورے کر کے عوام کو بغاوت کے لئے آمادہ کر رہے تھے۔

میلسن (Malleson) لکھتا ہے کہ:

بے شک، اس تمام سازش کا رہنما، مولوی (احمد اللہ شاہ) تھا۔ اور یہ سازش، تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ یقینی طور پر آگرہ، جہاں اس مولوی نے کچھ عرصہ، قیام کیا تھا۔ اور دہلی، میرٹھ، پٹنہ اور کلکتہ وغیرہ، سازش کے مرکز تھے۔

مولانا احمدُ اللہ شاہ نے جو خط و کتابت کی، اس کا تذکرہ، فیض آباد میں ان کی گرفتاری کے وقت، سرکاری کاغذات سے ملتا ہے۔ جن میں لکھا ہے کہ:

جب، مولوی کی تلاشی لی گئی، تو متعدد خطوط، برآمد ہوئے۔ جن سے اِس سازش پر پوری روشنی پڑتی تھی۔''

میلسن نے اپنی ایک دوسری کتاب ''**دی انڈین میوٹنی**'' (۱۸۹۱ء) میں

مولانا مدراسی کو بغاوت کا دست و بازو بتایا اور چپاتیوں کی تقسیم کا بانی، انھیں قرار دیا ہے۔

میلسن نے ۱۸۵۷ء کی پوری تاریخ، مرتّب کی ہے اور بغاوت کے تیس (۳۰) سال بعد پوری چھان بین کے بعد، یہ کتاب لکھی ہے۔ اس کے الفاظ، یہ ہیں:

That this man (Moulvi) Waz the brain and the hand of the canspiracy there can, I think be little daubt. During his travels he divised the scheme Knaown as chapati scheme. (Malleson:

Indian Mutiny PP.18)

**ترجمہ: میں سمجھتا ہوں کہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ:
یہی شخص، بغاوت کی سازش کا دماغ اور دست و بازو تھا۔
اپنے سفر کے دَوران، اسی نے، وہ اسکیم تیار کی جو ''چپاتی اسکیم'' کہلاتی ہے۔''**

مولانا احمدُ اللہ شاہ کو اعلیٰ صلاحیت کا مالک اور پختہ عزم و ہمت کا انسان قرار دیتے ہوئے میلسن، مزید لکھتا ہے کہ:

**مولوی نے شمالی مغربی صوبوں کا دَورہ کیا۔ اس کے دَورے کا مقصد، انگریزوں کے لئے راز ہی رہا۔ وہ کچھ عرصہ، آگرہ میں ٹھہرا۔ دہلی، میرٹھ، پٹنہ اور کلکتہ گیا۔
اس نے اس دورے سے واپسی کے بعد، باغیانہ اِشتہار، تمام اَوَدھ میں جاری کیے۔.......
کلکتہ میں قیام کے دَوران، غالبًا، مولوی نے وہاں کی دیسی سپاہ سے مسلسل رابطہ قائم کیے رکھا اور وہ طریقہ ڈھونڈھ نکالا، جس سے سپاہ کے فطری جذبات پر خصوصی اثر ڈالا جا سکے۔''** میلسن: انڈین میوٹنی (۱۸۹۱ء) ص ۳۳۔

(ص ۲۰۴ و ۲۰۵۔ تاریخ آزادیِ ہند، ۱۸۵۷ء۔ مؤلّفہ: خورشید مصطفیٰ رضوی۔ مطبوعہ: رضا لائبریری، رام پور)

میلسن، آگے چل کر لکھتا ہے:

**مولوی (احمدُ اللہ شاہ) اور اس کے ساتھیوں کے قاصدوں نے اپنا کام، پوری طرح انجام دیا تھا۔ سپاہیوں کی رہائش گاہوں پر، آدھی رات کی خفیہ کانفرنسیں، نہ صرف بارک پور (کلکتہ) بلکہ تمام شمالی مغربی ہندوستان میں ہو رہی تھیں اور انھیں اچھی طرح، باوَر کرایا جا رہا تھا کہ:
غیر ملکیوں نے اَوَدھ کو ہضم کر لیا اور اب، وہ اپنا باقی منصوبہ سپاہ کو عیسائی بنا کر پورا کریں گے۔'' انڈین میوٹنی ص ۵۳۔**

(بحوالہ ص ۲۰۹۔ تاریخ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء۔ از خورشید مصطفیٰ رضوی۔ مطبوعہ: رام پور)

میلسن نے پوری تحقیق کے بعد، اپنی کتاب میں میرٹھ کے بارے میں لکھا ہے کہ:

**''اگرچہ، بغاوت کے وقت، مولوی (احمدُ اللہ شاہ) یا اس کے ساتھی، غالبًا، موجود نہیں تھے مگر، انھوں نے فوج کی تمام رجمنٹوں میں کمیٹیاں بنا دی تھیں، جو اپنا کام کر رہی تھیں۔
انھیں کے آدمیوں نے آٹے میں ہڈیاں پیس کر ملائے جانے کی افواہ پھیلائی اور نئے کارتوسوں کے بارے میں معلومات، دیسی سپاہ کو، فراہم کیں۔''**

(Malleson: Indian Mutiny of 1857 P.66-Khaki Resala P.52-54)

واضح رہے کہ فوج میں کمیٹیاں بنانے کی تصدیق، جے سی ولسن کی رپورٹ سے بھی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں، ایک اور انگریز افسر، رابرٹ ہنری ویلیس ڈنلپ، جس نے اپنے چشم دید مشاہدات، کتابی صورت میں بیان کیے اور میرٹھ کے قرب وجوار کے حالات لکھے ہیں
اعتراف کرتا ہے کہ بغاوت کے لئے سازش، پہلے سے موجود تھی۔

(Dunlop (R.H.W) Services and adwenturs with Sen P.67)

(ص۲۳۶و۲۳۷۔ **تاریخِ جنگِ آزادیِ ہند، ۱۸۵۷ء**۔ مؤلّفہ: خورشید مصطفیٰ رضوی۔ مطبوعہ: رضا لائبریری، رام پور)

مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبرآبادی (متوفی ۱۹۶۸ء) لکھتے ہیں:

''مولانا سید احمدُ اللہ شاہ، دلاور جنگ، نواب چیناپٹن کے صاحبزادے، ابوالحسن تاناشاہ بادشاہِ گولکنڈہ کی اولاد سے تھے۔ عالم فاضل اور فنونِ حرب کے ماہر، مشرق ومغرب کی سیاحت کی۔
میر قربان علی، جے پوری اور حضرت محراب شاہ قلندر، گوالیاری کے مرید وخلیفہ تھے۔
قلندر صاحب نے جاں بازی وسرفروشی کی بیعت لی۔
اور انگریزوں کے اقتدار کے خلاف، جنگی مساعی کے لئے مقرر کیا۔
دلاور جنگ (احمدُ اللہ، مدراسی) دلی آئے۔ پھر آگرہ آکر قیام پذیر ہوگئے۔ بیعت کا سلسلہ جاری کیا۔ خان بہادر، مفتی انعام اللہ شہابی کے یہاں ''**مجلسِ علما**'' کی تشکیل کی۔
جب ہزار ہا مُرید ہو چکے، تو ان کو فنونِ حرب سے آگاہ کیا۔
امیر علی شاہ (امیٹھی، لکھنؤ) کی شہادت (۱۸۵۵ء) پر لکھنؤ آئے۔ فیض آباد گئے۔
حکومت نے نظر بند کر دیا۔ ۱۸۵۷ء رونما ہوا۔ جیل ٹوٹی۔ یہ بھی رہا ہو کر مع مُحبانِ وطن کے لکھنؤ آئے اور نصف لکھنؤ پر قبضہ کر لیا۔ اور اپنا اقتدار بڑھانا، شروع کیا۔
مَمّو خاں نے، برجیس قدر کو تختِ اَوَدھ پر بٹھایا اور نگراں، ملکۂ اودھ، حضرت محل تجویز ہوئیں۔ اَفواجِ کمپنی اور حضرت محل کے خوب خوب مقابلے رہے۔
مَمو خاں کی سِفلہ پروری اور سُنّی شیعہ کی پھوٹ نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔
مجبوراً، حضرت محل، شاہجہاں پور، روانہ ہوگئیں۔
شاہ صاحب پھر بھی انگریزوں سے ٹکر لیتے رہے۔
مگر مسلمان اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں، تباہی کی راہ پر لگ رہے تھے۔

شاہ صاحب نے بھی شاہجہاں پور کا رُخ، اختیار کیا۔
نواب خان بہادر خاں روہیلہ آپ کو بریلی بلا رہا تھا۔
پچاس ہزار روہیلہ آپ کے زیرِ علم رکھنے کی دعوت دی تھی۔
آپ، لکھنو سے شاہجہاں پور گئے۔ محمدی (شاہجہاں پور) میں حکومتِ اسلامی، قایم کی۔
شاہزادہ، فیروز شاہ، وزیر، مقرر ہوئے۔ جنرل بخت خاں، کمانڈر، مقرر ہوئے۔
خلافتِ راشدہ کی اِتباع میں حکومتِ شرعیہ کا نقشہ، قائم۔ سِکّہ، شاہ صاحب کے نام کا جاری ہوا۔

سِکّہ زد، بر ہفت کشور، خادمِ محراب شاہ
حامیِ دینِ محمد، احمدُ اللہ بادشاہ

(ص۲۶و۲۷۔ ''**غدر کے چند علما**''۔ مؤلّفہ: مفتی انتظام اللہ شہابی۔ مطبوعہ: دہلی)

مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبرآبادی اپنی ایک دوسری کتاب میں لکھتے ہیں:،
''(مولوی احمدُ اللہ شاہ) ہفتے میں تیسرے دن، بعد نمازِ عصر، قلعۂ اکبرآباد کے میدان میں مَردوں کو لے جا کر فنِ سپہ گری اور شہ سواری کی مشق کرایا کرتے۔
خود بھی ایسا نشانہ لگاتے، جس کا جواب، نہ تھا۔
تلوار کے ہاتھ، ایسے بجے تُلے ہوتے، جس کی دھوم تھی۔
مریدین، ثواب اور عبادت سمجھ کر یہ مشق کرتے تھے۔
مفتی انعام اللہ شہابی نے اپنی سواری کا گھوڑا اور بجلی سیف، شاہ صاحب کو نذر کی۔
آپ کا جلوس، جمعرات اور جمعہ کو باوقار اور نشان کے ساتھ، نکلا کرتا۔
پالکی میں خود بدولت، سوار ہوتے اور آگے، ڈنکا بجتا چلتا۔ ہزار ہا آدمی، جلوس میں ہوتے۔
جامع مسجد میں آپ کے زمانہ میں جتنے آدمی، جمع ہوگئے اتنے دیکھنے میں نہیں آئے۔
ڈنکے کی وجہ سے عوام میں ''**ڈنکا شاہ**'' کر کے بھی مشہور تھے۔''

(ص۲۳۔ ''**ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما**''۔ از مفتی انتظام اللہ، شہابی۔ دینی بکڈپو، اردو بازار۔ دہلی)

شاہ صاحب کے یہاں، محفلِ سماع کا اہتمام، خاص طور سے ہوتا تھا۔
مریدین پر توجہ ڈالی اور ادھر لوہے کے کڑھاؤ میں کوئلہ کے انگارے بھرے رہتے وہ مجلس میں پھیلا دیے جاتے۔ اس پر مریدین، لوٹتے۔ آگ، ان پر بالکل اثر نہ کرتی۔''

(ص۲۲۔ **ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما**۔ مطبوعہ: دہلی)

''حضرت شاہ صاحب، قصبات میں دورے کو تشریف لے جایا کرتے تھے۔
کچھ عرصہ کے لئے باہر گئے ہوئے تھے۔ حُکّام نے ان عہدہ دارانِ صدر پر
جن میں بڑا حصہ، عُلما کا تھا، رشوت کا مقدمہ چلایا۔
اکثر لوگ، شاہ صاحب کے مرید و مشیر و ہم نَوا تھے۔
مسٹر، وِلسن، جج ضلع مراد آباد، سماعتِ مقدمہ کے لئے مقرر ہوا۔
شاہ صاحب کو سفر میں اس واقعہ کی خبر لگی۔ آپ نے فرمایا:

''یہ امتحان کی گھڑی ہے۔ گھبرانا نہیں چاہیے۔ کسی کا بال، بیکا نہ ہوگا۔
چند دن کی آزمائش ہے۔ استقلال اور پامردی کو کام میں لایا جائے۔''

چنانچہ، مقدمہ پیش ہونے پر، جو گواہ آتے، ملزمین کی مقدس صورتیں دیکھ کر تھرّا جاتے۔
جھوٹی گواہی دینے کی جرأت، نہ ہوتی۔ مگر، اِنتقاماً، کچھ لوگوں کو سزا دی گئی۔
لوکل اخبار میں یہ خبر، اِس طرح، شایع ہوئی:

''عُمّالِ صدر کا مقدمہ، جو مراد آباد میں دائر تھا، صاحب سیشن جج کے محکمے میں اس نہج سے فیصل ہوا۔ مولوی غلام جیلانی، وکیل صدر، مولوی غلام امام شہید، پیشکار، و منشی سراج الدین، پیشکار کے حق میں چار چار سال کی قید کا حکم ہوا۔ اور منشی محمد قاسم، دانا پوری، مِسل خواں، تین سال اور مولوی بدرُ الحسن، مِسل خواں اور مولوی آلِ حسن صاحب، منصف صدر کو، دو دو سال۔
اب، ان صاحبوں کی اپیل، صدر میں دائر ہوئی اور مِسل مقدمہ مراد آباد سے
صدر میں طلب ہوئی۔ اللہ، اپنے فضل و کرم سے، سب صاحبوں کو بری کرے۔''

(اسعدُ الاخبار۔ نمبر ۱۴۸۔ جلد اول۔ ۱۷ر جمادیٰ الاولیٰ ۱۲۶۶ھ۔ مولوی قمرالدین خاں ایڈیٹر۔ ۱۸۵۰ء)

''دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ مولانا قاسم، دانا پوری، جن کا شمار اولیائے کرام میں ہے۔
اور ان کے ہزار ہا مرید، صاحبِ ریاضت و مجاہدہ، اُن کو رشوت سے متّہم کیا جانا، تعجب ہے۔
دوسرے صاحب، مولانا غلام امام شہید، جو عاشقِ رسول کہلاتے ہیں۔
اور ان کے بھی ہزار ہا مرید، آگرہ، حیدرآباد، مراد آباد میں تھے، وہ بھی رشوت میں ماخوذ۔
یہ سب، سیاستِ ملکی تھی۔ ان عُلما کو منتشر کرنا تھا۔ کیوں کہ:
جس مقصد کے لئے اٹھ رہے تھے، اس بہانے سے اس میں رکاوٹ ڈالنی تھی۔

غرض کہ حضرت احمدُ اللہ شاہ صاحب کی پیش گوئی، پوری ہوئی۔
یہ سب حضرات، بری ہوئے۔ مِسل مقدمہ، داخلِ دفتر ہوئی۔''

(ص ۲۴ و ۲۵۔ ''**ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی عُلما**''۔ از مفتی انتظام اللہ شہابی۔ مطبوعہ: دہلی)

مولوی امیر علی شاہ (امیٹھی لکھنؤ) کی شہادت (۱۸۵۵ء) در حادثۂ ہنومان گڑھی (اجودھیا) کی خبر، آگرے بھی پہنچی۔ حضرت احمدُ اللہ شاہ نے سن کر فرمایا:

اب، ہمارے کام کا وقت آگیا۔''

اوّلاً، گوالیار گئے۔ اپنے پیر و مرشد، محراب شاہ قلندر، قادری، گوالیاری سے ملے اور لکھنؤ کے سفر کی اجازت لی۔ سفرِ لکھنؤ میں کان پور پہنچے اور عظیم اللہ خاں سے ملاقات کی۔
جو، جذبۂ حبُ الوطنی کے ساتھ، انگریزی زبان کے بھی ماہر تھے۔
کان پور سے اُناؤ ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے اور گھاس منڈی میں قیام کیا۔
یہاں، مولانا فضلِ حق خیرآبادی سے ملاقات اور انگریزی اقتدار کے خلاف، تفصیلی گفتگو ہوئی۔
اس کے بعد لکھنؤ سے فیض آباد پہنچے اور وہاں، اپنی مُہم، شروع کر دی۔
جس طرح، قیامِ آگرہ کے دَوران، انگریزوں نے آپ کی سرگرمیوں پر نظر رکھنی شروع کی۔ مریدوں اور آپ کے ساتھیوں کو مشکوک قرار دیا۔ آپ کو گرفتار کرنے اور سزا دینے کی کوشش کی
اس کے بعد آپ کئی مقامات کا دورہ کرتے اور اپنا کام کرتے ہوئے حادثۂ ہنومان گڑھی، اجودھیا فیض آباد میں مولانا امیر علی، امیٹھوی کی شہادت (۱۲ر ذوالقعدہ ۱۲۷۱ھ/ ۲۸ر جولائی ۱۸۵۵ء) کی خبر سن کر، کان پور ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔
اُسی طرح، جب لکھنؤ کی زمین آپ پر تنگ ہونے لگی، تو آپ نے لکھنؤ چھوڑ کر فیض آباد کا رُخ کیا اور فیض آباد میں بھی آپ نے انگریزوں کے خلاف، اِس طرح، تقریریں کیں کہ ہزاروں آدمی آپ کے گرویدہ ہو گئے، اور انگریزوں کے خلاف، جذبۂ اِنتقام ان کے سینوں میں موجزن ہو گیا۔
آپ نے اپنے ساتھیوں اور مریدوں کو حربی اصول و قواعد اور اسلحہ سے مسلّح کیا۔
شہر کوتوال، فیض آباد نے آپ کو روکنا اور بزورِ قوت و طاقت، آپ کو زیر کرنا چاہا
مگر، آپ اس کے سامنے، سینہ سپر ہو گئے۔
ایک فوجی افسر سے آپ کی جھڑپ ہوئی تو ایک ہی وَار میں اسے زمین بوس کر دیا۔

مگر آپ، خود، بھی زخمی ہوگئے۔ اور گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیے گئے۔

سید خورشید مصطفیٰ رضوی لکھتے ہیں:

اکتوبر، یا نومبر ۱۸۵۶ء میں مولانا احمدُ اللہ شاہ، لکھنؤ آئے۔ وہ فقیرانہ لباس میں تھے۔
اور تمام ملک میں دَورے کر رہے تھے۔ لکھنؤ میں معتمدالدَّولہ کی سرائے اور پھر گھسیاری منڈی
میں ٹھہرے۔ بظاہر، قوالی کی محفل، منعقد کرتے۔ ارشاد و تلقین کرتے۔
مرید اور عقیدت مند جمع ہوتے تھے۔ لکھنؤ کا رسالہ ''**طلسم**'' لکھتا ہے:

''دوشنبہ اور پنج شنبہ کو، وہاں، مجمع، کثیر ہوتا ہے۔ شہر کا، بَرنا و پیر ہوتا ہے۔ مجلس، حال و قال
کی ہوتی ہے۔ لیکن، نئی چال کی ہوتی ہے کہ عین جوشِ حال میں فرش پر آگ گراتے ہیں۔
نہ فرش پر دھبّہ لگتا ہے، نہ حلق میں چھالے نظر آتے ہیں۔'' (**طلسم**، لکھنؤ۔ ۲۱ر نومبر ۱۸۵۶ء)

خفیہ انقلابی کارکن بھی فقیرانہ لباس میں لکھنؤ میں ہر طرف، سرگرم تھے اور عوام میں بغاوت کی
روح، پھونک رہے تھے۔ انگریز افسروں کو شبہ ہوا۔ ان فقیروں کو ہٹایا گیا اور پابندیاں لگائی گئیں۔
مگر، یہ اپنے کام سے باز نہ آئے۔ ایک جگہ سے ہٹائے جاتے، تو دوسری جگہ، دھونی رما دیتے۔
مولانا احمد اللہ سے بھی باز پرس ہوئی۔

کوتوال نے آکر دھمکانا چاہا۔ (بتاریخ ۲۰ر جنوری ۱۸۵۷ء) مگر، انھوں نے کہا:

''میں جہاد کو فرض جانتا ہوں۔ بے سروسامانی سے لاچار ہوں۔ اگر، سامان، بہم پہنچے، تو تیار ہوں۔''

ان کی سرگرمیوں پر بھی پہرہ لگا دیا گیا۔ انھوں نے تمام ملک میں خفیہ انقلابی تحریک کا
جال بچھا دیا تھا اور یہ سرگرمیاں، کم و بیش، دس سال سے جاری تھیں۔

انھوں نے بغاوت سے تقریباً، دو سال پہلے، انگریزوں کے خلاف
جہاد کا پرچار، شروع کیا اور دَورے کیے۔ ڈاکٹر وزیر خاں کا بیان۔
بحوالہ فریڈم **اسٹرگل اتر پردیش** (انگریزی) جلدِ دوم۔ ص ۱۴۷۔
(ص ۴۲۱۔ **تاریخِ جنگِ آزادیِ ہند، ۱۸۵۷ء**۔ از سید خورشید مصطفیٰ رضوی۔
مطبوعہ رضا لائبریری، رام پور۔ یو پی)

مولانا احمدُ اللہ شاہ، فروری ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ سے فیض آباد چلے گئے۔
اور برابر، اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ آخر، مجبور ہو کر ان کی گرفتاری کا حکم دے دیا گیا۔

پولیس نے گرفتاری سے انکار کر دیا، تو مسلَّح دَستے، روانہ کیے گئے۔

لیفٹیننٹ، تھرمس بورن نے ان سے بات کی اور کہا کہ:
وہ ہتھیار، جمع کر دیں۔ جب، فیض آباد چھوڑیں گے، تو ہتھیار، واپس مل جائیں گے۔''

اس پر مولانا احمدُ اللہ شاہ نے جو فقیرانہ لباس میں تھے، مَردانہ جواب دیا کہ:

''ہم، ہتھیار نہیں دیں گے۔ کیوں کہ، یہ ہمیں اپنے پیر سے ملے ہیں''۔

اس جواب اور تکرار پر، سِول گارڈ کے سپاہی بلائے گئے۔
پھر، درخواست کی گئی کہ ہتھیار واپس کر دو اور آزادی سے شہر سے باہر جا سکتے ہو۔
جواب، پھر، دوٹوک پایا کہ **''فقیر، اپنی مرضی سے شہر چھوڑے گا۔''**

.... ۱۷ر فروری کو ڈپٹی کمشنر فوربس مع چند افسروں کے، مولانا کے پاس گیا۔
اس کی فہمائش اور سوالات کے جواب بھی اسی دلیری سے
اور بے باکی سے ملے جو پہلے، ظاہر کی جا چکی تھی۔
اس پر طے کیا گیا کہ ان فقیروں پر اچانک حملہ کیا جائے۔
پہرہ دار دستہ، مددگار دستہ، جو رائفل اور سنگینوں سے مسلّح تھا اور دیگر سپاہ، حملہ آور ہو۔
مگر، مولانا کے ساتھیوں نے یہ اشارہ سمجھ لیا اور وہ سب، تلواریں سونت کر سپاہیوں پر
ٹوٹ پڑے۔ لیفٹیننٹ، ٹامس، بری طرح، زخمی ہوا، جس کو مولانا نے گھائل کیا۔
مولانا کے تین ہمراہی، شہید ہوئے۔ خود، مع چند جاں نثاروں کے، زخمی ہو کر گرفتار ہوئے۔''
(ص ۴۲۴ تا ۴۲۶۔ **تاریخِ جنگِ آزادیِ ہند ۱۸۵۷ء**۔ از خورشید مصطفیٰ رضوی۔ مطبوعہ: رضا لائبریری، رام پور)

فیض آباد، اَوَدھ میں مولانا سید احمدُ اللہ شاہ، مدراسی کی اسیری کے
چند ماہ بعد ہی انقلابِ ۱۸۵۷ء کا نقارہ بج اٹھا۔

مولانا امیر علی، امیٹھوی اور مولانا احمد اللہ شاہ، مدراسی کے مریدوں اور ساتھیوں نے
مولانا سکندر شاہ، فیض آبادی کی قیادت میں فیض آباد جیل پر حملہ کر کے
اس کا دروازہ توڑ ڈالا اور سارے قیدیوں کو جیل سے باہر نکال لائے۔
مولانا مدراسی نے بھی آزاد ہو کر، دوبارہ اپنی فوج اکٹھی کر لی اور لکھنؤ کا رُخ کیا۔
مقام چنہٹ ضلع لکھنؤ میں انگریزوں سے مقابلہ ہوا۔

جس میں آپ، انگریزوں پر غالب آ گئے۔لکھنؤ میں آپ نے ''ریزیڈنسی'' کی جنگ میں انگریزوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔اس کے علاوہ بھی لکھنؤ کے متعدد مقامات پر آپ نے کئی بار، انگریزوں سے، دودو ہاتھ کیا، مگر انھیں، بالآخر، لکھنؤ سے نکلنا پڑا۔

پہلے، آپ کا ارادہ، بریلی جا کر، نواب خان بہادر روہیلہ کے ساتھ، مورچہ بنانے کا تھا۔مگر، کسی وجہ سے اس پر عمل نہ ہو سکا، تو آپ، شاہجہاں پور کی طرف نکل گئے۔

یہاں آپ نے حملہ کر کے انگریزوں کو مغلوب کر دیا۔

مگر، انگریز، نئی تیاری کے ساتھ، چھ ہزار کی فوج لے کر آپ پر حملہ آور ہوئے۔

آپ کے ساتھ، بارہ سو آدمی تھے، لیکن، نہایت بہادری کے ساتھ، انگریزوں کا مقابلہ کیا۔

گھمسان کی جنگ کے بعد، انگریز، غالب آ گئے اور شاہجہاں پور شہر کے اندر داخل ہو گئے۔

ادھر، نواب، خان بہادر خاں روہیلہ، بریلی کے محاذ پر مغلوب ہو گئے۔

اس طرح، نواب خان بہادر و شاہزادہ فیروز شاہ وغیرہ نے
شاہجہاں پور کا رُخ کیا اور سولہ ہزار فوجی ان کے ساتھ ہو گئے۔

مولانا مدراسی اور جنرل بخت خاں نے مل جل کر انگریزوں پر حملہ کر دیا جس کے نتیجہ میں انگریز شکست کھا گئے اور شاہجہاں پور، دوبارہ، مولانا مدراسی کے قبضے میں آ گیا۔

فتح و شکست اور اُلٹ پھیر کے مختلف حالات و نتائج کے بعد
آخر میں **محمدی** (ضلع شاہجہاں پور) پہنچ کر ایک باضابطہ ریاست کی تشکیل ہوئی۔

اور یہاں، مولانا سید احمد اللہ شاہ و جنرل بخت خاں روہیلہ و شہزادہ فیروز شاہ و مولانا فیض احمد بدایونی و مولانا ڈاکٹر وزیر، اکبرآبادی وغیرہ نے اپنی ایک عارضی حکومت، قائم کر لی۔

مگر، کچھ دنوں بعد، سر، کالن کیمبل نے ایک بھاری فوج کے ساتھ ''**محمدی**'' پر حملہ کر دیا جس کا مذکورہ حضرات نے جم کر مقابلہ کیا۔تاہم، اس بار بھی اور یہاں بھی انھیں پیچھے ہٹنا پڑا۔

جس کے بعد کئی عُلما و اُمَرا و قائدین نے مجبوری و مایوسی کے عالَم میں نیپال کا رُخ کیا اور وہیں بے نام و نشان ہو کر انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام بَسر کیے۔

مولانا مدراسی نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور پوائیں (شاہجہاں پور) جا کر
از سرِ نَو، منظّم ہونے کا منصوبہ بنایا۔مگر، راجہ پوائیں نے غداری کی اور مولانا مدراسی کی شہادت

(جون ۱۸۵۸ء) کے ساتھ ہی انقلابِ ۱۸۵۷ء کا یہ باب، ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبرآبادی (متوفی ۱۹۶۸ء) لکھتے ہیں:

راجہ بلدیو سنگھ نے سرِ مبارک، جسمِ اطہر سے اُتارا اور کلکٹر صاحب بہادر شاہجہاں پور کے سامنے، پیش کر دیا، جو عرصہ تک کوتوالی پر لٹکا رہا۔نعش کو آگ میں پھونک دیا۔

اس پر، سرکارِ برطانیہ نے پچاس ہزار روپے نقد اور خلعتِ فاخرہ، راجہ پوائیں کو عطا کیا۔

یہ واقعۂ شہادت ۵/جون ۱۸۵۸ء مطابق ۱۳/ذوالقعدہ ۱۲۷۴ھ کو پیش آیا۔

دریا پار محلّہ، جہان آباد، متصل احمد پور مسجد کے پہلو میں سر، دفن کر دیا گیا۔

(**ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما**۔از مفتی انتظام اللہ، شہابی۔مطبوعہ: دہلی)

اِس آخری معرکہ کا ذکر کرتے ہوئے قائدِ انقلاب ۱۸۵۷ء
علّامہ فضلِ حق، خیرآبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) تحریر فرماتے ہیں:

(اس تحریر میں عامل سے مراد، مولانا سید شاہ احمدُ اللہ، مدراسی ہیں۔اور کافر زمیندار سے راجہ بلدیو سنگھ، پوائیں ضلع شاہجہاں پور، موجودہ ضلع لکھیم پور کھیری، یوپی، مراد ہے۔)

''اس موقع پر قابض و مسلَّط نصاریٰ سے قتال کے لئے دوسری طرف کا ایک عامل، اُٹھ کھڑا ہوا۔اس نے خیرات و مبرّات اور سعادات و حسنات کا کافی ذخیرہ اپنے اندر جمع کر لیا تھا۔

وہ بڑا ہی پاک طینت، صاف باطن، متقی، پرہیزگار، بہادر اور رسولِ ملاحم و نبیِ مراحم، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّم کا، ہم نام تھا۔

اس نے نصاریٰ کے لشکر پر حملہ کر کے پہلے ہی حملہ میں اُسے شکست دے دی۔

اپنی ساری کوششیں، ختم کر کے وہ بھاگے اور قصبہ کے ایک ہندو کے مضبوط و محفوظ مکان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔

اور عُظَماے نصاریٰ کے پاس، شہر میں پیغام بھیج کر مدد مانگی۔

انھوں نے ایک لشکر اور منافقین و دَہاقین کا جمِ غفیر، جنھوں نے عہد شکنی کی تھی ان محصورین کی مدد کو بھیجا۔

ادھر، اس نیک سرِشت بہادر عامل سے ایک دیہاتی کافر زمیندار نے

بڑا داؤ کھیلا۔ اس نے قسمیں کھا کر، اطمینان دلایا کہ:

’’جب دونوں جماعتیں، مقابلہ پر آجائیں گی

تو چار ہزار بہادروں کا گروہ لے کر مدد کو پہنچوں گا۔‘‘

جب، مقابلہ کی نوبت آئی، تو اس زمیندار کی قسموں پر بھروسہ کر کے

اس دیانت دار عامل نے اپنے تھوڑے سے بہادروں کے ساتھ

دشمن پر حملہ کر دیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ سامنے سے بندوقوں اور توپوں سے چہروں اور سینوں پر

نصاریٰ نے گولیاں برسائیں اور پیچھے سے اس غدار و مکار زمیندار کی

جماعت نے پُشت وسُرین کو، نشانہ بنانا، شروع کیا۔

وہ، دراصل، نصاریٰ کے اَعوان واَنصار اور شیاطین کے اَتباع واِخوان تھے۔

وہ خدا پرست عامل، معرکہ میں گر کر شہید ہوا۔ اور اس کی ساری جماعت نے

بھی اسی کے نقشِ قدم پر چل کر، جامِ شہادت، نوش کیا۔

(ص ۶۷، ۶۸۔ ترجمہ **الثَّورَۃُ الھِندِیَّہ**، بنام ’’**باغی ہندوستان**‘‘ از مولانا عبدالشاہد شیروانی، علی گڑھی۔ مطبوعہ: المجمع الاسلامی مبارک پور ضلع اعظم گڑھ۔ ۱۹۸۵ء۔
طبع اول مدینہ پریس، بجنور ۱۹۴۷ء۔ مع مقدمۂ مولانا ابوالکلام آزاد)

مولانا سید احمدُ اللہ، مدراسی کی شہادت (جون ۱۸۵۸ء) کے بعد

انگریزوں کا عام تأثر، یہ تھا کہ:

شمالی ہند میں ہمارا سب سے بڑا دشمن اور سب سے خطرناک انقلابی سپہ سالار، ختم ہو گیا۔

پروفیسر محمد ایوب، قادری (متوفی نومبر ۱۹۸۳ء۔ کراچی) لکھتے ہیں:

’’شاہ احمدُ اللہ صاحب کی شہادت پر، روہیل کھنڈ کی ہی جنگِ آزادی نہیں
بلکہ درحقیقت، ہندوستان کی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء ختم ہو گئی۔

یہ، وہ بہادر جاں باز مجاہد تھا، جس نے جنگِ آزادی کی تحریک کا آغاز، اس کی تبلیغ کی اور اس کو پروان چڑھایا۔ اور آخر میں اپنی جان دے کر اپنے عزائم ومقاصد کی بلندی پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔‘‘ (ص ۳۰۳۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء۔ از پروفیسر محمد ایوب قادری۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۷۶ء)

مولانا احمدُ اللہ شاہ، مدراسی کے بارے میں

جی ڈبلیو فارسٹر (ہسٹری دی انڈین میوٹنی۔ مؤلّفہ: جی ڈبلیو فارسٹر) لکھتا ہے:

’’اِس جگہ پر، جس کو فیض آبادی مولوی کہا گیا ہے، یہ بتا دینا، ضروری ہے کہ:

وہ، عالمِ باعمل ہونے کی وجہ سے مولوی تھا۔ روحانی طاقت کی وجہ سے صوفی تھا۔

اور جنگی مہارت کی وجہ سے، وہ سپاہی اور سپہ سالار تھا۔

مولوی فیض آبادی کا، احمد شاہ، نام تھا۔ ظلم، طبیعت میں، نہ تھا۔

ہر انگریز، اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔‘‘

چارلس بال، اپنی ایک کتاب کے نوٹ میں لکھتا ہے:

’’اَوَدھ کے باغیوں کی تجاویز اور سازش کی تحقیقات کی گئی، تو معلوم ہوا کہ:

اس مولوی کو انگریز حُکّام بحیثیت، احمد شاہ فقیر اور صوفی، عرصے سے جانتے تھے۔

شمالی مغربی صوبہ جات میں ظاہراً، مذہبی تبلیغ کی خاطر، وہ دَورے کر چکے تھے۔

لیکن، فرنگیوں کے لئے یہ راز ہی رہا۔

اپنے سفر کے دَوران، ایک عرصے تک، وہ آگرہ میں مقیم رہے۔ حیرت انگیز اثر

شہر کے مسلم باشندوں پر تھا۔ شہر کے مجسٹریٹ، ان کی جملہ نقل وحرکت پر نظر رکھتے تھے۔

عرصہ بعد، یقین ہو گیا کہ:

وہ برطانوی حکومت کے خلاف، ایک سازش کر رہے تھے۔

لیکن، پھر بھی ان کو کسی باغیانہ جُرم میں ملوث، نہ پایا گیا۔ وہ آزاد، رہے۔

آخر کار، جب بغاوت، رونما ہوئی اور فیض آباد کے فوجیوں میں بھی یہ لوگ پہنچے

تو یہ مولوی جو سابقاً غیر منظّم طریقے پر اپنے مریدین کو اُبھار، رہے تھے

گارد کی نگرانی میں تھے۔ ہنگامہ کرنے والوں نے ان کو چھڑا کر اپنا سردار بنا لیا۔

اس طرح، مولوی صاحب، ایک طاقتور فوج کے سپہ سالار بن گئے۔

اگرچہ، کچھ عرصہ تک، دوسرے باغی سرداروں کی طاقت چھپی رہی

لیکن، اس شخص کا اثر، باغیوں پر بھرپور تھا۔ چوں کہ، یہ قابل آدمی اور ظلم کے دھبّے سے پاک تھا

جو، نانا صاحب کے انتقام کے جوش کی خصوصیت تھی، اس سے، یہ بالکل پاک وصاف تھا، اس لئے

برطانوی حکومت بھی ایک حد تک اس کو اچھا جانتی تھی اور قابلِ نفرت، دل میں نہیں سمجھتی تھی۔''

(ص ۳۸ و ۳۹۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما۔ از مفتی انتظام اللہ شہابی۔ مطبوعہ: دہلی)

راجہ پوائیں، جگن ناتھ سنگھ کے بھائی، بلدیو سنگھ نے پچاس ہزار روپے کی لالچ میں
مولانا سید احمدُ اللہ شاہ کے ساتھ، غداری کی تھی۔ خورشید مصطفیٰ رضوی لکھتے ہیں:

۲۸ مئی ۱۸۵۸ء کو انگریزوں کی طرف سے
مولانا احمدُ اللہ شاہ کو گرفتار کرنے والے کے لئے پچاس ہزار روپے انعام کا اعلان کر دیا گیا۔
مولانا احمد اللہ نے اپنے ساتھیوں کے درمیان، یہ اشارہ بھی کر دیا تھا کہ:
اب ہم، نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے۔'' (ص ۶۲۴۔ تاریخِ جنگِ آزادیِ ہند، ۱۸۵۷ء)

(مولانا سید احمدُ اللہ شاہ کو) گولی لگنے کے بعد، راجہ اور اس کا بھائی، گڑھی سے باہر آئے۔
مولانا کے خون آلود سر کو تن سے جدا کیا اور قریب ہی تیرہ میل دور، انگریزی کیمپ (شاہجہاں پور)
میں لے گئے۔ انگریز افسر، رات کا کھانا کھا رہے تھے۔
اس وقت، راجہ نے اندر، داخل ہو کر، یہ تحفہ پیش کیا۔

اگلے دن، جسم کو جلا کر، راکھ، دریا میں بہادی گئی اور سر کو، کوتوالی پر لٹکا یا گیا۔
جب، یہ خبر انگلینڈ پہنچی، تو انگریزوں کی خوشی کا ٹھکانہ، نہ تھا۔
ہومز، خوشی سے بے تاب ہو کر کہتا ہے:
''شمالی ہند میں برطانیہ کا سب سے زیادہ خطرناک دشمن، ختم ہو گیا۔'' **(Holmes P.530)**

وہ، یہ بھی اعتراف کرتا ہے کہ:
اس پیمانے سے مناسبت دیکھی جائے
تو، تمام باغیوں میں وہی بادشاہت کے لئے سب سے زیادہ مستحق تھا۔''

میلسن کی رائے ہے کہ:
مولوی (احمد اللہ شاہ) بڑا عجیب انسان تھا.........
فوجی لیڈر کی حیثیت سے اس کی صلاحیت کے بہت سے ثبوت ملے ہیں۔
کوئی اور شخص، یہ ناز نہیں کر سکتا کہ:
اس نے سر، کالن کیمبل کو، دو مرتبہ، سرِ میدان، شکست دی۔.......

اگر، ایک انسان کو، جس کے وطن کی آزادی، بے انصافی سے چھین لی گئی ہو
اور جو اسے پھر آزاد کرانے کی کوشش کرے اور اس کے لئے جنگ کرے، مُحبِّ وطن کہا جا سکتا ہے
تو بیشک، مولوی، ایک سچا مُحبِّ وطن تھا۔
اس نے کسی بے کس کی موت سے اپنی تلوار کو، کلنک نہیں لگایا۔ نہتّے اور بے قصوروں پر
ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اس نے مَردانہ وار، آن بان کے ساتھ، ڈٹ کر، کھلے میدان میں
اُن غیر ملکیوں کا مقابلہ کیا، جنھوں نے اس کا ملک چھین لیا تھا۔
ہر ملک کے بہادر اور سچے لوگوں کو چاہیے کہ مولوی کو عزت سے یاد کریں۔''

(Malleson: Vo 4 P.381)

ایک اور مؤرخ، ٹامس سٹین نے لکھا:
''وہ، بڑی قابلیت رکھتا تھا۔ وہ، ایسا شجاع تھا کہ خوف نہیں کرتا تھا۔
اپنے عزم کا پکا اور مستقل مزاج تھا۔ باغیوں میں اس سے بہتر، کوئی سپاہی نہ تھا۔
کہا جاتا ہے کہ اس نے ہی چپاتیاں، تقسیم کرائیں۔''

تاریخِ ہندوستان از ذکاء اللہ، دہلوی۔ جلد ۳۔ ص ۹۲۔ (بحوالہ ص ۶۲۶ و ص ۶۲۷۔ **تاریخِ جنگِ آزادیِ ہند ۱۸۵۷ء**۔ مؤلّفہ: سید خورشید مصطفیٰ رضوی۔ مطبوعہ: رضا لائبریری، رام پور۔ یوپی)

علامہ احمد سعید، کاظمی، امروہوی (شیخ الحدیث، دارالعلوم انوار العلوم، ملتان، پنجاب)
فرماتے ہیں:

''۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جن اکابر علما و مشائخِ اہلِ سنّت نے
انگریز کے خلاف، جہاد کا فتویٰ، صادر کیا
ان میں علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی، مفتی عنایت احمد، کاکوروی، مولانا کفایت علی، کافیؔ
مراد آبادی، مولانا احمدُ اللہ شاہ، مدراسی اور مولانا فیض احمد، بدایونی، پیش پیش تھے۔
یہی، وہ، بزرگانِ دین تھے، جن کی یلغار سے ایوانِ فرنگ میں تہلکہ مچ گیا۔''

(روزنامہ امروز۔ ملتان۔ شمارہ ۱۷/۱ اکتوبر ۱۹۷۸ء)

○○○

شاہجہاں پور کے سر پرستِ انقلاب

مفتی مظہر کریم، دریابادی

مفتی مظہر کریم، دریابادی (متوفی ۱۲۸۹ھ/اکتوبر ۱۸۷۳ء)

معروف اردو ادیب وصحافی، مولانا عبدالماجد، دریابادی (متوفی ۱۹۷۷ء) کے دادا تھے۔

یعنی مولانا عبدالماجد دریابادی، فرزندِ مولوی عبدالقادر، دریابادی، فرزندِ مفتی مظہر کریم، دریابادی۔

مفتی مظہر کریم، دریابادی ایک طویل مدت تک، شاہجہاں پور میں سر رشتہ دار فوجداری تھے جہاں انقلابِ ۱۸۵۷ء میں آپ نے نمایاں کردار ادا کیا۔ عید گاہِ شاہجہاں پور میں ایک بھاری اجتماع کے درمیان آپ نے انگریزی اِقتدار کے خاتمہ کی دعا کرائی تھی۔

ڈاکٹر محمد ایوب، قادری (کراچی) نے ایک یورپین لیڈی جرنلسٹ ''**مریم**'' کی تحریر کردہ رپورٹ، نقل کی ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ:

مفتی مظہر کریم، دریابادی کے مکان، واقع شاہجہاں پور پر ایک جلسہ یکم مئی ۱۸۵۷ء کو ہوا جس میں تقریر کرتے ہوئے، مولوی سرفراز علی نے انگریزوں کے خلاف، ہندوستانیوں کو مشتعل کیا۔

مریم کے الفاظ میں مولوی سرفراز علی کی تقریر کا اہم حصہ، یہ ہے:

''مولوی صاحب نے اپنا ہاتھ، داڑھی پر پھیرتے ہوئے آہستہ آہستہ کچھ پڑھا۔

پھر، ہر چہار سَمت، نظر ڈال کر فرمایا:

آپ کو معلوم ہے کہ فرنگی، مکّاری سے ہمارے آقا بن بیٹھے۔ ملک میں سوداگری کے بھیس میں آئے۔ سیاسیات میں دخل انداز ہو کر ایک صوبہ دار کو دوسرے کے خلاف بھڑکایا۔ اور خود، تنازعات کا فائدہ اٹھانے لگے۔ اس طرح انہوں نے کرناٹک پر قبضہ کر لیا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ کس عَیّاری سے انہوں نے کلکتہ کو دارُالسّلطنت بنایا۔ کبھی، خوشامد سے اور کبھی، مکاری سے اور کبھی، دونوں سے بادشاہِ وقت پر اثر ڈالا۔ بنگال کی صوبہ داری کی مسند لے لی۔

پھر، میسور کی حکومت، حاصل کر لی۔ مرکزی ہندوستان کے سبزہ زاروں پر قبضہ جمایا۔

روہیل کھنڈ جیسے نفیس صوبہ پر، دسترس، حاصل کر لی۔ پنجاب اور برما پر، دست درازی کی۔

بالآخر، ایک نمایاں تخریب سے، جس کی کوئی مثال، تاریخ میں نہیں ملتی

انہوں نے شاہِ اَوَدھ کو، بلا وجہ معزول کیا اور باغِ ہند کے غیر متنازعہ آقا، بَن بیٹھے۔

اِس طرح، تھوڑا تھوڑا کر کے انہوں نے ہمارا سب ملک چھین لیا۔

اور اپنی ملعون حکومت، ملک کے گوشہ گوشہ میں قائم کر لی۔

............آپ کہیں گے کہ:

ہم محکوم قوم ہیں۔ قدرت کی طرف سے ہمارا یہی مَقسوم ہے۔ ہم کو، شکایت کا حق نہیں۔

یہی سہی۔ لیکن، اے بھائیو! اب تو ہمارا دین و مذہب بھی خطرے میں ہے۔

ملکی حکومت گئی، کافر کی اِطاعت بھی کی۔

کیا، اب ہم، وہ ناقابلِ انتقال نعمت بھی حوالے کر دیں، جو ہم کو، رسول اللہ ﷺ سے ملی ہے؟

شاید، آپ، یہ معلوم کرنا چاہیں گے کہ: میرے بیانات، کن واقعات پر مبنی ہیں؟

دوستو! جان بوجھ کر کافروں کی عیّاریوں پر، پردہ نہ ڈالو۔

کیا، ملک کے طول وعرض میں ان کے پادری، نہیں پھیل گئے ہیں؟

کیا، وہ، نصرانی عقائد کے ممنوعہ بیج نہیں بورَہے ہیں؟

کیا، سادہ لوح اَن پڑھوں کو، ان کے مذہب سے، نہیں نکالا جا رہا ہے؟

کیا، انہوں نے گیہوں کے آٹے میں ہڈی کا بُرادہ، ملا کر، فروخت کرنے کا حکم نہیں دیا ہے؟

کیا، انہوں نے فوج کے سپاہیوں کو گائے اور سُوّر کی چربی لگا کر، کارتوس نہیں دیے ہیں؟

اور اس ناپاک شے کے استعمال کو بزور جاری کرنے کے لئے

کیا، انہوں نے ہر اُس شہر میں جہاں، دیسی فوج ہے

دو ہزار لوہے کی ہتھکڑیاں ڈَھلوا کر، اس حکم کے ساتھ، نہیں بھیجی ہیں کہ:

جو کوئی، دانت سے کاٹنے پر انکار کرے، اُس کو فوراً گرفتار کر کے جیل بھیج دیا جائے؟

برادرانِ ہند! تمھاری قومی تقدیس، خطرے میں ہے۔

تمھارے مذہبی امتیاز پر، جو تمھارا طُرّہ ٔافتخار ہے

گمراہ کُن نَو وَارِدِ فرنگیوں نے ہلّہ بول دیا ہے۔ مسلّح ہو کر کھڑے ہو جاؤ۔

بتاؤ تو اَب کب اٹھو گے؟ افسوس! کیا، ہم میں کوئی بھی ایسا صاحبِ فہم نہیں

جس میں اپنے مذہب کے تقدس کے خاطر، ایسی مردانہ ہمت ہو کہ:

وہ ہماری مذہبی آزادی میں دخل اندازی کا مقابلہ کرے؟ کیا، ہم، مُردہ ہیں؟ بالکل، مُردہ ہیں؟''

اِس پُر جوش تقریر میں عید کی نماز کے بعد، بغاوت کا اعلان کیا گیا۔

اور لفظ ''دین'' کو نشانِ امتیاز، قرار دیا گیا۔

اِختتامِ تقریر پر، سب اہلِ جلسہ، جوش میں آ گئے اور نعرے لگانے لگے۔''

(ص: ۳۲ تا ص ۳۶۔ تحریکاتِ ملّی۔ از ڈاکٹر ابو سلمان، شاہجہاں پوری)

اِس تقریر اور بعض تاریخی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ:

انقلاب کی اصل تاریخ، خفیہ طور پر ۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء مقرر تھی۔

مگر، میرٹھ کے فوجی، اپنے جذبات پر قابو، نہ رکھ سکے اور دس مئی ہی سے اس کا آغاز ہو گیا۔

مفتی مظہر کریم، دریابادی کے پوتے، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی (سرسید نگر، علی گڑھ۔ یو پی) نے آپ کا ایک مختصر تعارف ''**انقلاب ۱۸۵۷ء نمبر**''، ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ۔ شمارہ اپریل و مئی ۲۰۰۷ء میں تحریر کیا ہے، جسے یہاں، بِلفظہٖ، نقل کیا جا رہا ہے:

''لکھنؤ اور فیض آباد کے درمیان اور لکھنؤ سے تقریباً ۴۲ میل دور واقع ایک مردم خیز قصبہ ہے: **دریاباد**۔ جو ۱۸۶۱ء تک، یا اس کے کچھ بعد تک یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمے کے تقریباً، پانچ سال بعد تک، ضلع رہا۔ اس کے بعد، بارہ بنکی کو ضلع کا مستقر بنایا گیا اور دریاباد کو، کوئی انتظامی حیثیت، حاصل، نہ رہی۔

اس قصبے میں قدوائی خاندان بھی آباد ہے۔ جس کے مورثِ اعلیٰ، قاضی القُضاۃ شیخ مُعِزُّ الدین، ملقّب، بہ قدوۃُ الدینِ والعلم، یا۔ عُرفِ عام میں قاضی قدوہ تھے۔

ایک زیادہ صحیح روایت کے مطابق:

وہ اناطولیہ سے شہاب الدین غوری کے عہد میں ہندوستان آئے اور انھیں قضا کا منصب، عطا ہوا۔

اور سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں انھوں نے حسبِ فرمائشِ سلطان، لکھنؤ کا رُخ کیا اور جگور، رسولی، قدیم نام ''ہرسولی'' وغیرہ میں زمینداروں پر فتح پا کر اجودھیا پہنچے اور وہیں، سکونت، اختیار کی۔

ان کا مزار، بابری مسجد (اجودھیا) سے تقریباً، ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔

جسے مسجد کے ساتھ، شہید کر دیا گیا۔

انھیں جاگیریں بھی عطا ہوئیں اور ان کی اولاد، مسولی، بڑاگاؤں، بھیارہ، رسولی، دریاباد میں اور کچھ جگور اور ضلع فیض آباد میں آباد ہوئی۔

قاضی صاحب کا شوقِ جہاد اور غایتِ تشرُّع و تقویٰ، سب روایتوں میں مشترک ہے۔

قاضی صاحب، قدوائی خاندانوں کے شجرے کے مطابق، نسلاً اسرائیلی تھے۔

شجرہ ٔنسب، ہریشون بن حضرت موسیٰ سے ہوتا ہوا

حضرت لاوا، انگریزی قالب میں Levi فرزندِ سوم، حضرت یعقوب تک پہنچتا ہے۔

لکھنؤ اور جوارِ لکھنؤ کے شیوخِ صدیقی، عثمانی، و انصاری، جو اپنی اعلیٰ نسبی پر فخر کے خوگر تھے انھوں نے بڑھ کر قدوائیوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی لڑکیاں، ان کے عقد میں دیں۔

انھیں قاضی قدوہ کی نسل میں، ان سے کوئی دس پشتوں میں

ایک بزرگ اور نمایاں ہستی، مخدوم شیخ محمد آب کش، دریابادی متوفی ۸۸۰ھ مطابق ۱۳۲۷ء (جو اِس قصبہ کے بانی تھے) کی نظر آتی ہے۔ ان کی گیارہویں پشت میں

مولوی مظہر کریم پیدا ہوئے۔ فقہ اور مشیخت، ان کے والد، مخدوم بخش کا خاندانی ورثہ تھا۔

مولوی مظہر کریم، جو چار بھائیوں میں منجھلے تھے، انھوں نے علم و فضل کی تحصیل، خود کی۔ تعلقات، خود ان کے اور ان کے بڑے بھائی، مولوی حکیم نور کریم (جو طبیب گر کہلاتے تھے) کے **فرنگی محل، لکھنؤ سے بہت بڑھے ہوئے تھے۔**

اور فرنگی محل اُس وقت تک تھا: دارُ العلم والعمل۔

محض قافیہ کی رعایت سے نہیں، واقعہ کے اعتبار سے بھی۔

معاصر عُلمائے فرنگی محل (لکھنؤ) کے نام، مولانا عبدالحکیم، مولانا عبدالحلیم، مولانا عبدالرزّاق مولانا عبدالحئ، مولانا محمد نعیم کے ہیں اور فتاویٰ کی تائید میں دستخط، اُن کے ملتے ہیں۔

بدایوں، بریلی، رام پور، شاہجہاں پور اور دہلی کے عُلما سے بھی تعلقات تھے۔

فتاویٰ کے سلسلے میں مولانا مفتی صدرالدین ، آزردہ، شاہی مفتی دہلی، مولانا فضلِ حق خیرآبادی، مولانا سعدُ اللہ، رام پوری، مولانا فضلِ رسول، بدایونی کے نام، بار بار ملتے ہیں۔

انگریزی حکومت، نئی نئی، قائم ہوئی تھی۔ کہیں، قائم ہوچکی تھی، کہیں، قائم ہورہی تھی۔

ان علاقوں میں جو آج، ریاستِ اتر پردیش کہلاتا ہے، ایسٹ انڈیا کمپنی کا حکم، چل رہا تھا۔

شاہ جہاں پور، ضلع قرار پاچکا تھا۔ مفتی مظہر کریم، ۱۸۲۹ء میں

بسلسلۂ تلاشِ ملازمتِ انگریزی، شاہجہاں پور پہنچے اور ایک ادنیٰ عہدے سے ترقی کرتے ہوئے

سَو (۱۰۰) روپے کے مشاہرے پر، سررشتہ دار فوجداری ہوگئے۔

اُس وقت کے معیار سے تنخواہ اور اختیارات، دونوں کے لحاظ سے بلند اور ذِمّہ داری کا عہدہ تھا۔

انگریز کلکٹر پر مفتی صاحب کا خاصا اثر تھا۔ جب مفتی صاحب ان سے ملنے جاتے، تو خاندانی روایتوں میں سننے میں آیا ہے کہ کلکٹر اپنے مسلمان خانساماں سے چائے بنوا کر پیش کرتا تھا۔

جب، مجاہدینِ آزادی نے شاہجہاں پور پر قبضہ کرلیا اور انگریز حُکّام کو قتل کردیا تو مفتی صاحب کے قیامِ شاہجہاں پور کی مدت اُس وقت، ستائیس (۲۷) سال سے زیادہ ہوچکی تھی۔

اتنے طویل قیام سے پردیس، دیس بن چکا تھا اور مسافرت میں شان، وطن کی ہوچکی تھی اور عمائدینِ شہر سے مفتی صاحب کے بہت گہرے مراسم و روابط، عزیزوں کے سے، قائم ہوچکے تھے۔ ان کا شمار، شہر کی بااثر شخصیتوں میں ہوتا تھا اور ان کا عوام اور حُکّام پر، بڑا اچھا اثر تھا۔

مفتی صاحب نے انگریزوں کے خلاف، جہاد کا فتویٰ دیا۔ گیارہ مہینے سے زیادہ، شاہجہاں پور اور اس کے گردونواح کے علاقے میں مجاہدینِ آزادی کی حکومت، جنرل خان بہادر خاں کی سربراہی میں قائم رہی۔ ان مجاہدین میں غیور اور بہادر روہیلے اور جان ہتھیلی پر رکھنے والے راجپوت تھے۔

مفتی صاحب نے جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔

ان کے گھر پر مجاہدینِ آزادی کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ ان جلسوں میں جنگی حکمتِ عملی تیار کی جاتی تھی اور دوسرے انتظامی امور کے بارے میں بھی اہم فیصلے کیے جاتے تھے اور ان معاملوں میں مفتی صاحب کی رائے کو اہمیت دی جاتی تھی۔

مولانا احمدُ اللہ، مدراسی، جو عُرفِ عام میں ''مولانا فیض آبادی'' کہلاتے تھے، مفتی صاحب کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ جب مجاہدین کو انگریزی فوجوں نے شاہجہاں پور میں شکست دی اور اس پر

انگریزوں کا قبضہ ہوگیا، تو مجاہدینِ آزادی کے دوسرے لیڈروں کی طرح، مفتی صاحب کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔

ایک انگریز، ٹی، ایف فینتھم نے ۱۸۵۸ء میں بنارس کے ایک پریس سے شاہجہاں پور میں انگریزی حکومت کے تسلُّط کے بعد شاہجہاں پور میں ۱۸۵۷ء میں ہونے والے واقعات کی ایک طویل داستان، انگریزی میں شائع کی اور اس میں مفتی صاحب کو بغاوت کا سرغنہ ٹھہرایا۔

اور اسی کے ساتھ، اس نے مفتی صاحب کے اثر و اقتدار کو، ہر جگہ، تسلیم کیا۔

انگریزی تسلُّط کے بعد مفتی صاحب کو گرفتار کیا گیا۔ اس نے ان پر یہ الزام لگایا کہ انگریزی حکومت کے خلاف، جہاد کے فتویٰ پر، ان کے دستخط تھے۔ مفتی صاحب کو بغاوت کے اِلزام میں چودہ (۱۴) سال کی سزا، بہ عبورِ دریائے شور دی گئی۔ یعنی انھیں انڈمان بھیج دیا گیا۔

جہاں، ان کا ساتھ، مولانا فضلِ حق خیرآبادی اور مفتی عنایت احمد، کاکوروی جیسے سالاروں کا، رہا۔

اسیری کے دَوران، مفتی صاحب نے علمی مشغلہ، جاری رکھا۔

اپریل ۱۸۵۹ء میں گورنمنٹ کی طرف سے، یہ اشتہار، شائع کیا گیا کہ:

''مفیدِ عام کتابوں کے ترجمے پر، اہلِ علم کو بشرطِ پسندِ حکومت، معقول انعام، نقد عطا ہوگا۔''

مفتی عنایت احمد کاکوروی صاحب اور مفتی مظہر کریم صاحب نے اس اعلان سے فائدہ اٹھا کر عربی جغرافیہ کی ایک ایک کتاب، اردو ترجمے کے لئے انتخاب کرلی۔

مفتی عنایت احمد صاحب نے تَقْوِیمُ الْبُلْدَان کو لیا۔

اور مفتی مظہر کریم صاحب نے مَرَاصِدُ الِاطِّلاع فِی اَسْمَاءِ الْاَمْکِنَۃ وَ الْبِقاع۔

مصنّفہ صفی عبدالمومن کا اُردو میں ترجمہ کیا۔

(یہ غیر مطبوعہ ضخیم ترجمہ، قلمی نسخہ، یا مخطوطہ کی صورت میں عَمِّ مرحوم، مولانا عبدالماجد، دریابادی کے کتب خانہ میں عرصہ تک رہا اور راقم السُّطور (محمد ہاشم، قدوائی) کو بھی اس کی ورق گردانی کا شرف، حاصل ہوا)

جب، انعام کا وقت آیا تو بجائے نقد رقم کے، رہائی کو پیش کیا گیا۔

چنانچہ، بقیہ میعادِ اَسیری، معاف کردی گئی اور اپنے وطن، دریاباد (اَوَدھ) واپس آ گئے اور خانہ نشین ہوگئے اور خاموشی کے ساتھ، انھیں خدمات میں لگے رہے۔

انھوں نے ۱۴/اکتوبر ۱۸۷۳ء کو، داعیِ اجل کو لبیک کہا اور آبائی قبرستان میں

مدفون ہوئے۔ ان کی بیوی کا چھ مہینے پہلے، انتقال ہو چکا تھا۔ دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں کل سات اولادیں چھوڑیں۔ چھوٹے فرزند، مولوی عبدالقادر، ڈپٹی کلکٹر تھے اور ان کے چھوٹے بیٹے، نامور عالمِ دین، مفسرِ قرآن اور ادیبِ جلیل، مولانا عبدالماجد، دریابادی تھے۔

اور بڑے بیٹے، مولوی عبدالمجید، ڈپٹی کلکٹر تھے۔

اور راقم السُّطور (محمد ہاشم، قدوائی) کے والدِ ماجد تھے۔

مفتی صاحب کا خاص فن، فقہ تھا۔ جزئیات کے گویا، حافظ تھے۔ اِستفتا، بکثرت آتے تھے۔ بعض، دور دراز سے بھی۔ فتاویٰ، ہزاروں کی تعداد میں قلم سے نکلے، جو **فتاویٰ مظہریہ** کے نام سے موسوم ہوئے۔ لیکن، افسوس ہے کہ یہ فتاویٰ، غیر مطبوعہ رہے۔ عام کتبِ فتاویٰ کی طرح ان فتاویٰ میں فہرستِ مضامین بھی تھی اور ان کی ترتیب بھی بڑی جامع اور مکمل تھی۔

مفتی صاحب کے کمال کا شہرہ، سُن کر، شاہ آباد، بلگرام، محمدی، تلہر، جلال آباد، بدایوں اور بریلی سے اِستفتا آتے تھے اور یہ سب استفتا مع جواب، واپس بھیجے جاتے تھے۔

سرکاری ملازمت کے ساتھ، استفتا کے جوابات دیتے رہتے تھے۔

مگر، اس کے باوجود، انھوں نے بہت سی کتابیں، جمع کر لی تھیں۔

جن میں فقہ کی چھوٹی بڑی کتابوں کو ملا کر، بڑی کثیر تعداد کا حوالہ اپنے فتووں میں دیتے تھے۔

فقہ کی متعدد کتابیں، اپنے ہاتھ سے نقل کیں۔ خط، بڑا پختہ تھا۔

حضرت رسالت مآب ﷺ سے خاص طور سے شیفتگی تھی۔

عقائد میں ہم مسلک، علمائے بدایوں کے تھے۔

"**غَایۃُ الُمَرَام فِی تَحقیقِ الُمولُودِ وَالُقِیام**" کے نام سے ایک کتاب، اپنے ایک عزیز قریب کے نام سے محفلِ میلاد اور اس میں قیامِ تعظیمی کی حمایت اور جواز میں چھپوائی۔

مناقبِ غوثیہ، یعنی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی مدح اور توصیف میں ایک غیر مطبوعہ تصنیف چھوڑی۔

فارسی میں بھی متعدد فقہی مسائل سے متعلق "**مسائلِ مذہبیہ**" کے نام سے ایک تصنیف تھی۔ جو غیر مطبوعہ رہی۔" (ص ۹۶ و ۹۷۔ **انقلابِ ۱۸۵۷ء نمبر**۔ ماہنامہ، نیا دور، لکھنؤ۔ شمارہ اپریل/مئی ۲۰۰۷ء)

○○○

صدر امینِ بریلی و مجاہدِ انقلاب
مفتی عنایت احمد، کاکوروی

غریقِ بحرِ رحمت، حضرت مفتی عنایت احمد، کاکوروی (متولد ۱۲۲۸ھ/۱۸۱۳ء۔ متوفی ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء) بن منشی محمد بخش بن منشی غلام محمد بن منشی لطف اللہ

نسلاً، قریشی اور مذہباً، حنفی تھے۔ آبا و اَجداد میں امیر حُسَام نام کے ایک شخص، بغداد سے ہندوستان آئے اور دیوہ (موجودہ ضلع بارہ بنکی۔ اتر پردیش) اَوَدھ میں مقیم ہو گئے۔

امیر حُسَام کے صاحبزادے، ضیاء الدین، دیوہ کے قاضی، مقرر ہوئے۔

اسی دیوہ میں مفتی عنایت احمد کا ۹/شوال ۱۲۲۸ھ کو تولُّد ہوا، اور جب آپ کے والد، منشی محمد بخش اپنی سسرال، کاکوری (موجودہ ضلع لکھنؤ) منتقل ہوئے، تو آپ بھی اپنی نانیہال میں مستقل سکونت پذیر ہو گئے جس کی نسبت سے آپ کو، کاکوری کہا جانے لگا۔

مفتی صاحب کی ابتدائی تعلیم، دیوہ اور کاکوری میں ہوئی۔ مزید تعلیم کے لئے آپ نے ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۵ء میں رام پور کا سفر کیا۔ جہاں، مولانا سید محمد رام پوری سے صرف و نحو اور مولانا نورُ الاسلام و مولانا حیدر علی سے دیگر علوم و فنون کی کتابیں پڑھیں۔

پھر، دہلی آ کر، مولانا شاہ محمد اسحاق، دہلوی سے درسِ حدیث و سندِ حدیث، حاصل کی۔

دہلی کے بعد علی گڑھ پہنچے اور مولانا بزرگ علی، مارہروی (متوفی ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۵ء) شاگردِ حضرت شاہ عبدالعزیز و حضرت شاہ رفیع الدین، فرزندانِ شاہ ولی اللہ، محدّث دہلوی سے جامع مسجد، علی گڑھ میں، علومِ نقلیہ و عقلیہ کی تکمیل کی۔ اور یہیں اپنے استاذ، مولانا بزرگ علی مارہروی کے وصال کے بعد، ان کی جگہ، مدرس ہو گئے۔ اور بعد میں منصبِ اِفتا پر بھی فائز ہوئے۔

تدریس و افتا کے ساتھ، آپ کی شہرت و نیک نامی بڑھتی گئی۔

ادب و ریاضی میں آپ، درجۂ کمال پر فائز تھے۔ کچھ دنوں بعد، آپ، سرکاری ملازم بھی ہو گئے۔
علی گڑھ میں منصف کے عہدہ پر آپ کا تقرر رہا، پھر، صدر امین بن کر، بریلی، تشریف لے گئے۔

علی گڑھ کے تلامذہ میں مفتی لطف اللہ، علی گڑھی (متوفی ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء) و مولانا سید حسین شاہ، بخاری اور بریلی کے تلامذہ میں قاضی عبد المجید، قاضیِ شہر و مولانا فدا حسین، منصفِ شہر و نواب عبد العزیز خاں، بریلوی، نبیرۂ حافظ رحمت خاں روہیلہ، مشہور ہیں۔

نواب، صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن، شیروانی، علی گڑھی (متوفی اگست ۱۹۵۰ء) حضرت مفتی لطف اللہ، علی گڑھی، تلمیذِ مفتی عنایت احمد، کاکوروی کے شاگرد تھے۔

اپنے استاذ کے انتقال کے بعد، مولانا شیروانی نے ایک تعارفی کتابچہ، بنام ''**استاذُ العُلَما**'' تحریر کیا، جو، دارُ المصنّفین، اعظم گڑھ سے شائع ہوا، اس کتابچہ میں اپنے دادا اُستاذ مفتی عنایت احمد، کاکوروی کے بارے میں مولانا شیروانی لکھتے ہیں:

''اپنے وطن، دیوہ ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ۹ ر شوال ۱۲۲۸ھ، تاریخِ ولادت ہے۔
تیرہ (۱۳) برس کی عمر میں رام پور جا کر مولوی سید محمد صاحب، بریلوی سے صرف و نحو اور مولوی حیدر علی صاحب (رام پوری) ٹونکی اور مولوی نورُ الاسلام صاحب سے دوسری درسی کتابیں پڑھیں۔

وہاں سے، دہلی جا کر، شاہ اسحٰق صاحب سے حدیث پڑھی۔ دہلی سے علی گڑھ آئے۔ مولوی بزرگ علی صاحب (مارہروی) سے جامع مسجد (علی گڑھ) میں پڑھا۔ فنِ ریاضی کی تکمیل کی۔
بعدِ فراغ، وہیں، مدرس مقرر ہوئے۔

ایک سال، مدرس رہ کر، مفتی و منصف کے عہدہ پر علی گڑھ ہی میں تقرر ہو گیا۔
اسی دَور میں مفتی لطف اللہ صاحب کے تلمذ کا سلسلہ، شروع ہوا۔
مولوی سید حسین شاہ صاحب بخاری نے بھی اسی زمانے میں پڑھا۔
سید صاحب، مدرسِ فاضل ہو جانے کے بعد بھی فرمایا کرتے تھے کہ:

''مفتی صاحب، ہدایہ، مجھ کو اجلاس پر پڑھاتے۔ میں حاضر رہتا۔ جب، دَورانِ مقدمہ میں فرصت ملتی، اشارہ ہوتا۔ میں پڑھنا، شروع کر دیتا۔ اسی اثنا میں پھر مصروف ہو جاتے۔

باوجود اس کے ایسا پڑھایا کہ ساری عمر، اس کی یاد رہی۔
کول سے بریلی کا تبادلہ ہوا۔ بھیکن پور کے لئے ایک فخر، یہ بھی ہے کہ:
مفتی صاحب نے، اثنائے راہ میں یہاں مع مستورات کے، قیام فرمایا تھا۔
بریلی کے قیام میں صدر امین ہوئے۔ وہاں کے تلامذہ میں
قاضی عبد الجلیل صاحب قاضیِ شہر اور مولوی فدا حسین، منصف، شامل تھے۔
بڑا کارنامہ، نواب عبد العزیز خاں کا (باوجود، ان کی آزاد مُنشی و صاحبزادگی کے) پڑھا دینا تھا۔
نواب صاحب، نواب رحمت خاں حافظ الملک شہید مرحوم کے پوتے تھے۔''

(ص ۵ و ص ۶۔ ''**استاذُ العلما**'' مؤلفہ: نواب حبیب الرحمٰن خاں، شیروانی، علی گڑھی۔ مطبوعہ: دارُ المصنّفین، اعظم گڑھ)

''قصہ مختصر، صدرِ اعلیٰ کا پروانہ آ گیا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہو گیا۔
اس کے فرو ہونے پر، الزامِ بغاوت میں انڈمان بھیج دیے گئے۔ یہ ۱۲۷۴ھ کا واقعہ ہے۔
چار سال، جزیرۂ مذکور میں رہے۔ جنگل میں منگل۔
اکابر عُلما کے قدموں کی برکت سے، ان دنوں یہ بدنام جزیرہ، دار العلوم بن گیا تھا۔
علاوہ مفتی صاحب کے، مولوی فضلِ حق، خیر آبادی، مفتی مظہر کریم صاحب، وغیرہ عُلما بھی وہاں تھے۔ اور سب کے سب
باوجود مصیبتِ قید اور غریب الوطنی کے، خدمتِ علم میں مصروف تھے۔
محقّقِ خیر آبادی کے ذہنِ وقّاد کے متعدد نتائج، وہیں، وجود پذیر ہوئے۔
مفتی مظہر کریم صاحب نے ''مَرَاصِدُ الْاِطِّلاع'' کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔
مفتی عنایت احمد صاحب نے کلام مجید، حفظ کیا۔ ''تواریخ حبیبِ اِلٰہ'' سیرت میں تالیف کی۔
تاریخی نام ہے۔ ۱۲۷۵ھ نکلتے ہیں۔ منشی امیرُ اللہ تسلیم نے الفاظ ''تواریخِ نبی'' تاریخ نکالی ہے۔
یہ کتاب، حکیم امیر خاں کی فرمائش سے لکھی تھی، جو انڈمان میں سرکاری ڈاکٹر تھے۔
اور جن کی غم خواری کا دیباچہ میں اعتراف فرمایا ہے۔''

(ص ۶۔ ''**استاذُ العلما**'' مرتّبہ: نواب حبیب الرحمٰن خاں، شیراونی)

''ایک انگریز نے ''تَقْوِیْمُ الْبُلْدَان'' کے ترجمہ کی فرمائش کی۔ جو، دو برس میں ختم ہوا۔
یہی ترجمہ، رہائی کا سبب بنا۔ صَرف کا رسالہ، علم الصیغہ بھی وہیں لکھا۔

۱۲۷۷ھ میں رہائی پا کر، کاکوری (اَوَدھ) آئے۔ وہاں، شاگردِ رشید، مولوی لطف اللہ صاحب بھی حاضر ہوئے۔ تاریخ، پیش کی:

چوں بفضلِ خالقِ ارض وسما اوستاذم شد، زِقیدِ غم رِہا
بہرِ تاریخِ خلاصِ آنجناب برنوشتم ''**اِنَّ اُستاذِی نَجَا**'' ۱۲۷۷ھ

مستقل قیام، کان پور، فرمایا۔ مدرسہ فیضِ عام کی بنیاد ڈالی۔

پچیس، یا تیس روپے ماہوار، تنخواہ لیتے تھے۔ مسلمان تُجّارِ کان پور، مصارفِ مدرسہ کے کفیل تھے۔

.........دو برس کے بعد، حج کا ارادہ کیا۔ شاگرد، جمع ہوئے۔ مولوی سید حسین شاہ صاحب

واصف بخاری، مولوی لطف اللہ صاحب، نواب عبدالعزیز خاں صاحب

مولوی سید عزیز الدین صاحب شکارپوری۔

استاذ کے سامنے، درس بھی دیا۔ مفتی صاحب، شاگردوں کی بہاریں دیکھ دیکھ کر باغ باغ ہوتے تھے۔ بِالآخر، مولوی سید حسین شاہ صاحب کو مدرسِ اول

اور مولوی لطف اللہ صاحب کو، مدرسِ ثانی، مقرر فرما کر، حج کو روانہ ہو گئے۔

اس زمانے میں جہاز، ہوائی (بادبانی) تھا۔

جَدَّہ کے قریب پہنچ کر جہاز، پہاڑ سے ٹکرا کر ڈوب گیا۔

مفتی صاحب، بحالتِ نماز، اِحرام باندھے ہوئے غریق وشہید ہو گئے۔

یہ واقعہ، ۷/شوال ۱۲۷۹ھ کا ہے۔ باوَن (۵۲) برس کی عمر ہوئی۔

شرحِ ہدایۃ الحکمہ، صدر شیرازی، تصدیقات حمد اللہ اور شرح چغمینی پر حواشی۔

اردو میں بہت سے مفیدِ عام رسالے، جن کے نام، عموماً، بے تکلف، تاریخی ہیں۔'' اِلیٰ آخِرِہٖ۔

(ص ۷۔ ''**استاذُ العلما**''۔ مرتّبہ: نواب حبیب یار خاں، شیروانی، علی گڑھی۔ مطبوعہ: دارُ المصنّفین، اعظم گڑھ)

انقلابِ ۱۸۵۷ء میں مفتی صاحب کی سرگرمی کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں:

''تحریکِ ۱۸۵۷ء کے شروع ہوتے ہی انگریزوں کے خلاف

وہاں (بریلی) بڑا جوش وجذبہ تھا اور بڑے خاص انداز سے تیاریاں، جاری تھیں۔

قائدینِ تحریک، حالات کا بالکل اندازہ نہیں ہونے دیتے تھے۔ انقلاب سے پہلے بریلی میں اس تحریک کے، دو ممتاز کارکن موجود تھے۔ مولوی سرفراز علی اور دوسرے

مفتی عنایت احمد، کاکوروی۔'' (**جنگ آزادی ۱۸۵۷ء**۔ بقلم پروفیسر محمد ایوب قادری۔ مطبوعہ کراچی)

میاں عبدالرشید، کالم نگار، روزنامہ، نوائے وقت، لاہور لکھتے ہیں:

آپ، بریلی میں نواب، خان بہادر خاں، روہیلہ کی زیرِ قیادت، جہادِ حریت کی تنظیم کے لئے سرگرمِ عمل رہے۔ اُن دنوں، روہیل کھنڈ، بریلی، مجاہدینِ آزادی کا اہم مرکز تھا۔

اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے جَدِّ امجد، مولانا رضا علی خاں بریلوی

اس تحریک کے قائدین میں سے تھے۔

مفتی عنایت احمد نے مجاہدین کی تنظیم پر ہی اِکتفا، نہ کیا، بلکہ نواب، خان بہادر خاں، روہیلہ کے دستِ راست کی حیثیت سے مختلف معرکوں میں عملی حصہ بھی لیا۔''

(**جنگ آزادی نمبر**۔ ترجمانِ اہلِ سنّت، کراچی۔ شمارہ جولائی ۱۹۷۵ء)

۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء میں مفتی صاحب کو آگرہ کا صدرُ الصُّدور بنائے جانے کا حکم نامہ، صادر ہو گیا تھا اور آپ، بریلی سے آگرہ جانے کی تیاری میں مصروف تھے کہ:

اچانک، مئی ۱۸۵۷ء کی جنگ، شروع ہو گئی۔

اور آپ، آگرہ، نہ جا کر بریلی اور رام پور میں سرگرم ہو گئے۔

اور نواب، خان بہادر خاں، نبیرۂ حافظ رحمت خاں روہیلہ نے

روہیل کھنڈ میں آزادی کا جو پرچم اٹھا رکھا تھا، آپ، اس کے مؤیّد وحامی اور شریکِ کار ہو گئے۔

قیامِ بریلی کے دَوران، حضرت مفتی صاحب نے ''**جلسۂ تائیدِ دین متینِ**'' کے نام سے ایک تبلیغی واصلاحی ادارہ، قائم کیا تھا۔

جس کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری (کراچی) لکھتے ہیں:

''مفتی صاحب نے اپنی صدارت میں بریلی میں دینی لٹریچر کی نشر واشاعت کے لئے ایک انجمن کی بھی تشکیل کی تھی۔ جس میں بریلی، بدایوں، پیلی بھیت مرادآباد، آنولہ، امروہہ، وغیرہ کے شُرفا وَاُمَرا کی امدادی رُقوم سے لٹریچر، تیار کر کے تقسیم کیا جاتا تھا۔

اور زیادہ تر، یہ کتابیں، مفتی عنایت احمد کاکوروی کی تالیف ہوتی تھیں۔

یہ کتابیں، اصلاحی اور تبلیغی تھیں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ جنگِ آزادی سے پہلے
ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ سب سے پہلی اصلاحی انجمن تھی۔"
(جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء۔ بقلم: پروفیسر محمد ایوب قادری۔ مطبوعہ: کراچی)

سید الطاف علی، بریلوی، ڈائرکٹر اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی لکھتے ہیں:

"مفتی صاحب، بریلی میں صدر امین تھے۔ ان کے، حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے خاندان سے بھی روابط تھے۔ چنانچہ، نئی انقلابی حکومت کی ہر طرح امداد واعانت کرنے کا فتویٰ، مفتی صاحب نے ہی دیا تھا۔" (ص: ۴۰۔ **نواب خان بہادر خاں شہید۔**
مؤلفہ: سید الطاف علی، بریلوی۔ مطبوعہ: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ کراچی۔ ۱۹۶۶ء)

مجاہدین کے لئے مالی امداد وتعاون پر مشتمل، وہ فتویٰ جو بریلی میں جاری ہوا تھا
اور جس پر مفتی عنایت احمد کاکوروی کے دستخط تھے، انقلاب کی چنگاری بجھنے کے بعد
جب عُلما وقائدینِ انقلاب کی داروگیر کا سلسلہ شروع ہوا
تو اسی فتویٰ کی بنیاد پر مفتی صاحب کے خلاف، انگریزوں نے مقدمہ چلایا
اور اُس وقت کے عام دستور کے مطابق کچھ رسمی ونمائشی عدالتی کارروائی کر کے
آپ کو حبسِ دوام، در جزیرۂ انڈمان (کالا پانی) کی سزا دی گئی۔
جہاں آپ نے چار سال تک کسی طرح اپنے ایامِ اسیری کی مشقتیں جھیلیں۔
خوش قسمتی سے ایک انگریز نے آپ سے تَقْوِیمُ الْبُلْدان کے ترجمہ کی خواہش، ظاہر کی
جسے آپ نے قبول فرمایا۔ اور دو سال کی مدت میں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔
یہی علمی کام، آپ کی رہائی کا سبب بن گیا۔
اور ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء میں آپ، جزیرۂ انڈمان سے رہا ہو کر ہندوستان، واپس آئے۔

تَقْوِیمُ الْبُلْدَان (عربی) مؤلفہ: عمادُ الدین ابوالفداء اسمٰعیل بن علی بن محمود بن المنصور الأیوبی (متوفی ۷۳۲ھ/۱۳۳۱ء) جغرافیہ وفلکیات کی وقیع تحقیقات پر مشتمل ہے۔
جس کا مفتی عنایت احمد، کاکوروی نے مستند اور سلیس اردو ترجمہ کیا ہے۔

جزیرۂ انڈمان میں مفتی عنایت احمد، کاکوروی وعلاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی کی تاریخی وعلمی خدمات کے بارے میں مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی لکھتے ہیں:

"علاّمہ (فضلِ حق) جزیرۂ انڈمان پہنچے۔ مفتی عنایت احمد، کاکوروی، صدر امین بریلی وکول مفتی مظہر کریم، دریابادی اور دوسرے مجاہد عُلما، وہاں پہنچ چکے تھے۔
ان عُلما کی برکت سے یہ جزیرہ، دار العلوم بن گیا۔ ان حضرات نے تصنیف وتالیف کا سلسلہ، وہاں بھی قائم رکھا۔ خرابیِ آب وہوا، تکالیفِ شاقّہ وجدائیِ اَحباب واَعِزّہ کے باوجود علمی مشاغل، جاری رہے۔

مفتی صاحب نے "**علم الصیغہ**" جیسی، صَرف کی مفید کتاب، جو آج تک، داخلِ نصاب ہے، وہیں لکھی۔ سرکاری ڈاکٹر، حکیم امیر خاں کی فرمائش سے "**تواریخِ حبیبِ اِلٰہ**" (۱۲۷۵ھ) بھی تالیف کی۔ ان دونوں کتابوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ:

ان حضرات کے سینے، علم کے سفینے بن گئے تھے۔ تاریخی یادداشت، ترتیبِ واقعات قواعدِ فنون، ضوابطِ علوم، سبھی حیرت انگیز کرشمے دکھا رہے ہیں۔

ایک انگریز کی فرمائش پر "تَقْوِیمُ الْبُلْدان" کا ترجمہ کیا، جو دو برس میں ختم ہوا۔
اور، وہی رہائی کا سبب بنا۔" (ص ۲۲۵۔ **باغی ہندوستان**۔ از مولانا عبدالشاہد، شیروانی
مطبوعہ: المجمع الاسلامی، مبارک پور ۱۹۸۵ء)

"علاّمہ فضلِ حق نے بھی کئی مفید تصانیف لکھیں۔ انھیں میں سے رسالہ
"**اَلثَّوْرَۃُ الْھِنْدِیۃ**" اور قَصائدِ فِتنۃُ الْھِند ہیں۔
یہ رسالہ اور قصائد، جہاں، تاریخی ہیں، وہیں، عربی ادبیت کے بھی شاہکار ہیں۔
...... یہ رسالہ مع قصائد، علاّمہ نے مفتی عنایت احمد، کاکوروی کے ذریعہ
۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء میں خَلَفُ الصِّدق، مولانا عبدالحق خیرآبادی کے پاس بھیجا تھا کہ:
"اَبّن میاں کو جا کر، یہ تحفہ دے دینا۔"
پنسل اور کوئلہ سے لکھے ہوئے مختلف پرچے تھے، جن کو کئی ماہ کی محنت کے بعد درست اور مرتّب کر پائے تھے۔" (ص ۲۲۶۔ **باغی ہندوستان**۔ مطبوعہ: مبارک پور ۱۹۸۵ء)

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ:
حضرت مفتی صاحب نے مراجعتِ کتب کے بغیر، محض اپنے حافظہ کی مدد سے
۱۲۷۵ھ میں "**تواریخِ حبیبِ اِلٰہ**" (اردو) اور ۱۲۷۶ھ میں "**علم الصیغہ**" (فارسی) لکھا

اور ۱۲۷۷ھ میں ہندوستان واپسی کے بعد، جب ان دونوں کتابوں کا مواد
اصل مراجع و مآخذ سے ملایا، تو بالکل، درست پایا۔
۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ میں جزیرۂ انڈمان سے رہائی کے بعد
حضرت مفتی عنایت احمد، کاکوروی نے کان پور کو اپنی دینی و علمی آماج گاہ بنایا
اور ''**مدرسہ فیض عام**'' قائم کر کے درس و تدریس میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔
یہیں سے ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۲ء میں آپ نے حج و زیارتِ حرمین شریفین کے سفر کا ارادہ کیا
اور اپنے دو عزیز تلامذہ، مولانا سید حسین شاہ بخاری کو مدرسِ اول
اور مولانا لطف اللہ، علی گڑھی کو مدرسِ ثانی، مقرر فرما کر سفر کے لئے روانہ ہوگئے۔
اس سفرِ حج میں آپ کو امیرُ الحجاج بنایا گیا اور شوق و وارفتگی کے ساتھ
سارا قافلۂ حُجّاج، بحری جہاز سے سرزمینِ حجاز کی سرحدوں میں داخل ہوا ہی تھا کہ:
ایک سخت چٹان سے آپ کا جہاز ٹکرایا اور شدتِ ضرب سے پاش پاش ہوگیا۔
صرف، باون (۵۲) سال کی عمر میں بتاریخ ۷/شوال ۱۲۷۹ھ/ ۱۷/اپریل ۱۸۶۳ء
حضرت مفتی صاحب مع قافلۂ حُجاج کے، شہید و غریقِ رحمت ہوگئے۔
حضرت مفتی صاحب، متورّع و متّقی عالمِ دین تھے۔ آپ نے اپنی ساری زندگی
خدمتِ دین اور تعلیم و تعلّم میں گذاری۔ جامع و ماہرِ علوم و فنون مدرس ہونے کے ساتھ
وسیعُ المطالعہ اور ژرف نگاہ محقق و مصنف بھی تھے۔
قوم و ملّت کا درد بھی آپ کے سینے میں موجزن تھا۔ آپ کا اصلاحی و تبلیغی جذبہ بھی بیدار تھا۔
اور عملی کوشش کی طرف بھی آپ کی بھرپور توجہ تھی۔
آپ، جہاں بھی رہے، نیک نام اور سرگرمِ عمل رہے۔
جس کا اندازہ، آپ کی زندگی کے مختلف گوشوں کے سرسری مطالعہ سے ہی ہوجاتا ہے۔
مفتی عنایت احمد، کاکوروی، جس وقت کالا پانی / جزیرۂ انڈمان پہنچے اور رمضان کا مہینہ آیا
تو وہاں کوئی حافظ، نہ تھا، جو تراویح پڑھا سکے۔ آپ نے اللہ پر بھروسہ کر کے امامتِ تراویح کی
نیت کرلی۔ چنانچہ، روزانہ ایک پارہ، حفظ کرتے اور اسے تراویح میں سنا دیتے۔
اس طرح، ختمِ رمضان کے ساتھ، وہ مکمل حفظِ قرآن کی نعمت سے سرفراز ہوگئے۔

حضرت مفتی صاحب کی تصانیف و رسائل کی تعداد، تقریباً، دو درجن ہے، جو اِس طرح ہیں:
علم الفرائض، ملخّصات الحساب، تصدیق المسیح ردع کلمۃ القبیح، الکلام المبین فی آیاتِ
رحمۃ للعالمین، نقشۂ مواقع النُّجوم۔ ان کے علاوہ
شرح ہدایۃ الحکمۃ، صدر شیرازی و تصدیقات حمدُ اللہ و شرح چغمینی پر آپ کے وقیع حواشی ہیں۔
زمانۂ قیامِ بریلی ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء میں آپ نے مندرجہ ذیل کتابیں، تالیف فرمائیں:
فضائلِ درود و سلام، بیانِ قدر شبِ براءت، فضائلِ علم و عُلماء دین، محاسنُ العملِ الافضل
مع التتمات، رسالہ در مذمّتِ میلہ ہا۔ ہدایاتُ الاضاحی، **اَلدُّرُّ الفَرِید فِی مَسائلِ الصِّیَامِ**
وَالْقِیام وَالْعِیدِ۔ ضَمَانُ الْفِردوس۔
جزیرۂ انڈمان (کالا پانی) میں تالیف کی گئی آپ کی کتابوں کے نام، یہ ہیں
احادیثُ الحبیبِ المتبرّ کہ، تواریخ حبیبِ الہ، وظیفۂ کریمہ، خجستہ بہار
علم الصیغہ، ترجمۂ **تَقْوِیمُ الْبُلْدان**۔
سفرِ حج و زیارت کے دَوران، حضرت مفتی عنایت احمد، کاکوروی کی ایک نہایت عالمانہ
ومحققانہ کتاب ''**لَوَامِعُ الْعُلُوْمِ وَاَسرَارُالعلوم**'' کا مسوّدہ تھا۔
جسے آپ، بڑی محنت و عرق ریزی کے ساتھ، مرتّب فرما رہے تھے۔
افسوس کہ یہ نہایت اہم ذخیرۂ علوم و فنون، غرقِ دریا ہوگیا۔
اور ایک بڑے خزانہ سے ہمیں محروم ہوجانا پڑا۔
اس میں چالیس (۴۰) علوم کا خلاصہ لکھنا، پیشِ نظر تھا۔ ہر علم کا نام بھی بے نقطہ تھا۔
مثلاً: علم التفسیر کا نام، عِلمُ کلامِ اللّٰہ، علمِ حدیث کا نام، عِلمُ کلامِ الرَّسول
علمِ فقہ کا نام، عِلمُ الْاَحکام، وغیرہ۔
مفتی عنایت احمد صاحب نے چالیس (۴۰) فن کے ایک ایک مسئلہ کا انتخاب کیا تھا
اور ہر مسئلہ پر چالیس ورق لکھنے کا اِلتزام، اِس صفت کے ساتھ تھا کہ:
مسئلہ بھی بے نقطہ ہو اور اس پر پوری بحث بھی شگفتہ عبارت میں اسی اِلتزام کے ساتھ
کی جائے۔ تفسیر میں وَ عَلَّمَ آدَمَ الْاَسمَاءَ کُلَّھَا کی آیت
اور حدیث میں کلُّ مُسْکِرٍ حَرَامٌ (رَوَاہُ مسلم) منتخب فرمائی۔ بڑا حصہ مکمل ہو چکا تھا۔

ڈاکٹرمسعودانور،علوی،کاکوروی (شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ)

مفتی صاحب کی کتب ورسائل کا تعارف کراتے ہوئے اپنے ایک تحقیقی مضمون میں لکھتے ہیں:

(۱) علم الفرائض:۔۱۲۱۲ھ میں تحریر فرمایا۔ یہ رسالہ ۱۲۱۴ھ میں مطبع مصطفائی سے طبع ہو چکا ہے۔

(۲) ملخّصاتُ الحساب:۔ فَنِّ ریاضی سے متعلق یہ مطبوعہ رسالہ ۱۲۶۲ھ میں لکھا گیا۔

(۳) تصدیقُ المسیح رَدُعُ کلمۃِ القبیح :۔ ۱۲۶۸ھ میں تحریر کیا گیا۔ یہ بھی چھپ چکا ہے۔

(۴) الکلام المبین فی آیاتِ رحمۃٍ للعٰلمین :۔۱۲۷۰ھ۔ تاریخی نام ہے اور مطبوعہ ہے۔

(۵) بیانِ قدرِ شبِ براءَت:۔۱۲۷۲ھ۔ تاریخی نام ہے۔ یہ بھی طبع ہو چکا ہے۔

(۶) فضائلِ علم وعُلماے دین:۔۱۲۷۲ھ میں لکھی گئی یہ کتاب، غالبًا، طبع نہ ہو سکی۔

(۷) رسالہ درمذّمتِ میلہ ہا:۔۱۲۷۲ھ میں لکھا گیا یہ رسالہ، ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

(۸) ضمانُ الفردوس:۔۱۲۷۲ھ سالِ تصنیف ہے۔ طبع ہو چکا ہے۔

(۹) ہدایاتُ الاضاحی:۔۱۲۷۲ھ میں یہ کتاب، تصنیف فرمائی۔ یہ بھی طبع ہو چکی ہے۔

(۱۰) اَلدُّرُّ الْفَرِیْد فِی مَسَائِلِ الْصِّیَام وَالْقِیَام وَالْعِید:۔۱۲۷۲ھ میں لکھی گئی، مطبوعہ ہے۔

(۱۱) محاسنُ العملِ الافضل مع التتمات:۔۱۲۷۲ھ میں یہ رسالہ، مرتّب ہوا۔ مطبوعہ ہے۔

(۱۲) فضائلِ درود وسلام:۔۱۲۷۲ھ میں مرتّب ہوا، مطبوعہ ہے۔

(۱۳) وظیفۂ کریمہ:۔ یہ رسالہ، جزیرۂ انڈمان میں قیام کے دَوران
مفتی صاحب نے تحریر فرمایا۔۱۲۷۲ھ میں مرتّب فرمایا، یہ بھی مطبوعہ ہے۔

(۱۴) خجستۂ بہار:۔ شیخ، سعدؔی شیرازی (متوفی ۶۹۱ھ/۱۲۹۱ء) کی گلستان کی طرز پر ہے۔
۱۲۷۲ھ میں اس کی تصنیف فرمائی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ
کتب خانہ انوریہ، خانقاہِ کاظمیہ، کاکوری شریف (لکھنؤ) میں موجود ہے۔

(۱۵) علمُ الصیغہ :۔ عربی صَرف کا نہایت جامع رسالہ ہے جو مختلف مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔ ۱۲۷۶ھ میں انڈمان میں اسے تصنیف فرمایا۔
اس رسالہ کے محرِّک، کوئی حافظ وزیر علی صاحب تھے۔

(۱۶) تواریخِ حبیبِ اِلٰہ: یہ کتاب اپنی نوعیت کی اردو میں پہلی تصنیف ہے، جو سیرتِ پاک ﷺ پر لکھی گئی۔ (جزیرہ انڈمان میں اپنی یادداشت کے سہارے، اسے ۱۲۷۵ھ میں مفصّل ومستند طور پر

مفتی صاحب نے تحریر فرمایا) اپنی اِفادیتِ عامّہ کی وجہ سے یہ کتاب، متعدد بار، طبع ہو چکی ہے۔

(۱۷) احادیثُ الحبیبِ المتبرَّ کہ:۔۱۲۷۵ھ سالِ تصنیف ہے۔
۱۲۷۶ھ میں مطبع پنجابی، لاہور سے طبع ہو چکا ہے۔

(۱۸) ترجمۂ تقویم البُلدان: جزیرۂ انڈمان میں اس کتاب کا سلیس اردو ترجمہ فرمایا اور یہی ترجمہ، بظاہر آپ کی رہائی کا سبب بنا۔

اس کا ایک قلمی نسخہ، کتب خانہ انوریہ، خانقاہِ کاظمیہ، کاکوری شریف (لکھنؤ) میں مولوی مظفر احمد صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا، موجود ہے۔

(۱۹) نقشۂ مَواقع النجوم:۔ یہ نقشہ، علمِ ہیئت کا ہے، مسٹر، ٹامسن، لیفٹینٹ گورنر ممالکِ مغربی وشمالی نے جو خود، علمِ ہیئت کے عالم تھے، بہت پسند کیا اور فرطِ مسرت میں
مفتی صاحب کو"خان بہادر" کا خطاب دیا۔

(۲۰) لوامعُ النجوم واسرارُ العلوم:۔ اس کتاب میں چالیس علوم کا خلاصہ لکھنا، پیشِ نظر تھا افسوس کہ یہ کتاب، مکمل، نہ ہو سکی، اور اس کا، ناتمام مسوّدہ بھی
مفتی صاحب کے ساتھ، سمندر میں غرق ہو گیا۔

اِن تصانیف کے علاوہ، آپ نے شرح ہدایۃ الحکمۃ لِلعلاّمہ صدرُ الدین الشیرازی تصدیقاتِ حمدُ اللہ، سندیلوی، اور شرحِ چغمینی پر، مفید حواشی بھی تحریر فرمائے۔

راقمُ الحروف (مسعودانور، علوی، کاکوری) نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ:
مفتی صاحب، جب انڈمان سے واپس، وطن، تشریف لائے
تو اپنے ساتھ، بکسوں میں کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پُرزے اور مٹی کے ٹکڑے بھر کر لائے تھے جن پر کوئلے اور پنسل سے کتابیں لکھی ہوئی تھیں۔ کاکوری (لکھنؤ) پہنچ کر
ان منتشر پُرزوں اور ٹھیکروں سے کتابوں کو دوسرے کاغذوں پر نقل فرمایا۔"

(ص:۱۳۹و۱۴۰۔ "۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور روہیل کھنڈ"۔

ماہنامہ ضیاءِ وجیہ، رام پور، یوپی، انڈیا۔ شمارہ جنوری وفروری ۲۰۱۱ء)

پنجاب کے مشہور عالم وشیخِ طریقت، حضرت مولانا سید مہر علی شاہ چشتی
(گولڑہ ضلع راول پنڈی، پنجاب۔ متولد یکم رمضان المبارک ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۴/اپریل

۱۸۵۹ء بروز دوشنبہ۔ متوفی ۲۹ صفر ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۱ مئی ۱۹۳۷ء بروز سہ شنبہ)

کے اَحوال وخدمات پر مشتمل کتاب "**مہرِ منیر**" مطبوعہ: پاک و ہند۔ مؤلَّفہ: حضرت مولانا فیض احمد (گولڑہ شریف ضلع راول پنڈی) میں تفصیل کے ساتھ، اِس کا ذکر ہے کہ:

حضرت سید مہر علی شاہ نے علی گڑھ میں حضرت مفتی لطفُ اللہ، علی گڑھی، تلمیذِ مفتی عنایت احمد کاکوروی سے تعلیم، حاصل کی اور حضرت مفتی لطف اللہ صاحب

اپنے اس شاگردِ رشید پر خصوصی شفقت وعنایت فرمایا کرتے تھے۔

انھوں نے آپ کو قرآنِ حکیم، کتبِ احادیث، صحاحِ ستّہ، وغیرہ وغیرہ کی سندیں، عطا فرمائیں جو آج تک، گولڑہ شریف (راول پنڈی، پنجاب) میں بطورِ تبرک، محفوظ ہیں۔

حضرت مولانا فیض احمد فیض، گولڑوی، مزید لکھتے ہیں:

"علی گڑھ میں مولانا لطف اللہ کی ذاتِ گرامی، شہرۂ آفاق تھی۔

آپ، مفتی عنایت احمد کے شاگردِ رشید تھے۔ جو مولانا بزرگ علی (مارہروی) علی گڑھی متوفی ۱۲۶۲ھ اور مولانا شاہ محمد اسحٰق، دہلوی، متوفی ۱۲۶۲ھ کے مشہور شاگرد تھے۔

مفتی (عنایت احمد) صاحب، کافی عرصہ، علی گڑھ میں اپنے استاد، مولانا بزرگ علی کے مدرسہ میں تعلیم دیتے رہے۔ اور اسی زمانہ میں مولانا لطف اللہ

آپ (مفتی عنایت احمد، کاکوروی) کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔

مفتی صاحب، بعد میں حکومت کی طرف سے بعہدۂ منصف، مقرر ہو گئے تھے۔

اور آپ نے مولانا لطف اللہ کو اپنا سر رشتہ دار، مقرر فرمایا تھا۔

اِس دَوران، تحریکِ آزادیِ ہند، شروع ہوئی اور مفتی صاحب نے انگریز حکومت کے خلاف خان بہادر خاں، روہیل کھنڈ کا ساتھ، دے کر جہاد میں حصہ لیا اور انگریزوں کے خلاف، فتویٰ دیا۔

اس پر انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں غدر کے دیگر مجاہدین کے ساتھ

آپ کو بطورِ سزا، جزائرِ انڈمان میں عمر قید کے لئے ملک بدر کر دیا۔" الخ۔

(ص ۷۳ و ۷۴۔ مہرِ منیر۔ مرتَّبہ: مولانا فیض احمد۔ مطبوعہ: پاک و ہند)

جزیرۂ انڈمان سے رہائی کے بعد، ہندوستان واپس آکر آپ نے کان پور میں "**مدرسہ فیض عام**" قائم کیا۔ ۱۲۷۹ھ میں بہ اِرادۂ حج، روانہ ہوئے۔ جدّہ کے قریب

جہاز ایک پہاڑی سے ٹکرا کر غرق ہو گیا، جس میں علم کا یہ آفتاب بھی غروب ہو گیا۔

آپ، ایک اعلیٰ پیمانہ کے مصنف ومدرِّس ہونے کے ساتھ، بہت بڑے مدبّر اور مجاہد بھی تھے۔

حج پر، روانہ ہوتے وقت، آپ اپنے شاگرد، مولانا لطفُ اللہ کو اپنا جانشین، مقرر فرما گئے جنھوں نے ابتداءً، کان پور اور پھر، علی گڑھ میں علومِ دینیہ کی اِشاعت کے سلسلے میں وہ کارہائے نمایاں، انجام دیے کہ:

ہندوستان کی علمی دنیا نے، ان کا "**استاذُ العلما**" کے خطاب سے اعتراف کیا۔ اس دَور کے نامور عُلما میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جس نے **استاذ العلما** کے گلشنِ علم سے فیض، نہ حاصل کیا ہو۔

اس وقت، مولانا (لطفُ اللہ) کی شاگردی، فضل وکمال کی اعلیٰ اور بلند ترین سند شمار ہوتی تھی۔" الخ۔ (ص ۷۴۔ مہر منیر۔ مطبوعہ: پاک و ہند)

مولانا سید محمود شاہ (راول پنڈی) جو مدتِ دراز تک مولانا لطف اللہ، علی گڑھی شاگردِ مفتی عنایت احمد، کاکوروی کے مدرسۂ علی گڑھ میں مدرس رہ چکے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ:

ایک مرتبہ، کسی فتویٰ کے سلسلے میں مولانا احمد رضا خاں اور مولانا لطف اللہ کے درمیان قدرے، شکر رنجی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر، بعد میں صلح صفائی ہو گئی اور دوستانہ مَراسم، قائم رہے۔

مولانا لطف اللہ کے اکثر فارغ التحصیل شاگرد، مولانا احمد رضا خاں کے کہنے پر ان کے مدرسہ میں بطور مدرس، ملازم رہے۔ جیسا کہ حیاتِ اعلیٰ حضرت بریلوی میں تحریر ہے۔"

(ص ۷۴۔ مہر منیر۔ از مولانا فیض احمد، گولڑوی۔ مطبوعہ: پاک و ہند)

○○○

مُناظرِ اسلام ومُجاہدِ اِنقلاب
مولانا رحمتُ اللہ، کیرانوی

رَدِّ نصاریٰ کے باب میں مولانا رحمت اللہ، عثمانی، کیرانوی (متولد جمادیٰ الاولیٰ ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷ء۔ متوفی ۲۴ر رمضان ۱۳۰۸ھ/ ۲رمئی ۱۸۹۱ء) کا نام، متحدہ ہندوستان کے طبقۂ عُلَما میں معروف اور مجاہدینِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے درمیان، نمایاں ہے۔ آپ کی ایک عظیم الشان دینی وعلمی خدمت، مدرسہ صولتیہ، مکہ مکرَّمہ کی تاسیس اور ''اِظہارُ الْحق'' کی تالیف ہے۔

مولانا رحمت اللہ، عثمانی، کیرانوی، مہاجر مکی سے پہلے، ردِّ نصاریٰ کے باب میں مولانا سید آلِ حَسن، موہانی (متولد ۱۲۰۲ھ/ ۱۷۸۷ء۔ متوفی ۱۷ر ربیع الاول ۱۲۸۷ھ/ ۱۸۶۹ء در حیدر آباد دَکن) کا نام آتا ہے، جو مولانا حسرت موہانی (متوفی ۱۹۵۱ء) کے پَر نانا تھے۔

پادری فنڈر کی کتاب ''میزانُ الحق'' مطبوعہ ۱۸۳۳ء اور پادری اسمتھ کی کتاب ''دینِ حق'' مطبوعہ ۱۸۴۳ء کے جواب میں مناظرِ اسلام، مولانا سید آلِ حَسن، موہانی نے ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں ''**اِستفسار**'' کے نام سے ایک معرکۃُ الآرا اور لاجواب کتاب لکھ کر شایع کی۔

رَدِّ نصاریٰ میں مولانا آلِ حسن، موہانی کو ملکۂ راسخہ، حاصل تھا۔ مولانا رحمتُ اللہ، کیرانوی نے بھی اپنی مشہور کتاب ''**اِزَالَۃُ الْاَوْھَامْ**'' کے حاشیہ پر، **استفسار** کو نقل کر دیا ہے۔

پادری فنڈر سے آپ نے تحریری مناظرہ کیا، جو ۲۲ر جولائی ۱۸۴۲ء سے ۴ر فروری ۱۸۴۵ء تک جاری رہا۔ دیندار وعلم نواز، نواب محی الدولہ، معتمدِ نظام الملک خامس، حیدر آباد دَکن کی توجہ ودلچسپی سے چھ سو روپے ماہانہ مشاہرہ پر، ناظمِ صدارتِ عالیہ، حیدر آباد دَکن کی حیثیت سے مولانا سید آلِ حسن، موہانی کا تقرر اور حیدر آباد ہی میں پچاسی (۸۵) سال کی عمر میں

۱۲۸۷ھ/ ۱۸۶۹ء میں مولانا سید آلِ حسن، موہانی کا انتقال ہوا۔

تَنْقِیحُ الْعِبَادَات، مؤلَّفہ: مولانا سید آلِ حَسَن، موہانی (موہان، ضلع اُنّاؤ۔ اتر پردیش) کا **ابتدائیہ**، آپ کے پوتے، سید محمد حیاتُ الحسن، موہانی کے قلم سے ہے۔ جو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس ابتدائیہ میں مولانا سید آلِ حَسَن، موہانی کے مختصر حالات، درج ہیں۔

مشہور مجاہدِ تحریکِ آزادی، سید فضل الحسن، حسرت موہانی (متوفی ۱۹۵۱ء) سید آلِ حَسَن، موہانی کے نواسے تھے۔ جنھوں نے ۱۳۲۹ھ میں ''**تَنْقِیحُ الْعِبَادَات**'' کا ایک نسخہ، اردو پریس، علی گڑھ سے شائع کیا تھا۔

مولانا سید آلِ حَسَن، موہانی، بلند پایہ صاحبِ علم وقلم، عالم ومناظرِ اسلام اور عاشقِ رسول تھے۔ جس کا اندازہ، اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے اپنی کتاب ''**مولدِ نبوی**'' کا آغاز، اِس شعر سے کیا ہے:

امروز، شاہِ شاہاں، مہماں شدست، مارا
جبریل، بالملائک، درباں شدست، مارا

آپ کی چند تصانیف کے نام، درج ذیل ہیں:

(۱) کتابِ مرغوب، در مآخذِ جواباتِ نصاریٰ۔ (۲) رسالہ، وحدتِ وجود۔ (۳) تقریر، در بحثِ لامتناہی۔ (۴) میلادنامۂ مصطفوی۔ (۵) دامِغۂ علویہ۔ (۶) انتخاب ترجمۂ ارشاداتِ عیسویہ۔ (۷) **تَنْقِیحُ الْعِبَادَات**۔ (۸) مجمعُ النُّورین، در بیانِ الوہیت ونبوت۔ (۹) رسالہ، نجاتِ اُخروی۔ (۱۰) اِستفسار۔ (۱۱) استبشار۔ (۱۲) تذکرۂ شہادتِ سیدُ الشُّھدا۔ (۱۳) تذکرۃُ الموتیٰ۔ (۱۴) فوائدِ مثنوی مولانا روم۔ (۱۵) ترجمۂ بعض آیاتِ قرآنی۔ (۱۶) اَبحاثِ مختلفہ۔

مولانا سید آلِ حَسَن، موہانی، اپنی کتاب ''**تَنْقِیحُ الْعِبَادَات**'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''جاننا چاہیے کہ اس قولِ اَخیر کا رواج دینے والا فرقہ، وہابیہ کا ہے۔
جو تیرہ صدی میں پیدا ہوا ہے۔ سو، انھوں نے اور بھی باتیں، غلط نکالی ہیں۔
اور کہتے ہیں کہ: یہ سب باتیں، دین کی ہیں۔
اَزاں جملہ، یہ کہ: قرآن شریف میں جو، یہ فرمایا ہے کہ:
یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔ یعنی، مشرکین، پکارتے ہیں، غیر اللہ کو۔
یا۔ فرمایا ہے: لَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَداً۔ تو، مطلق، ماسِوَا اللہ کے لئے فرمایا ہے۔
یا۔ رسولُ اللہ ﷺ نے جو فرمایا:
اِذَا سَأَلْتَ فَاسْئَلِ اللّٰہَ وَ اِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰہِ۔
تو، یہاں، بالکل، ماسوا اللہ سے مانگنے کو منع فرمایا۔

اور فرقۂ وہابیہ، ایسی آیتوں اور حدیثوں کو ایسے محل میں لاتے ہیں۔
بلکہ صاف تحریر لکھتے اور وعظ میں بیان کرتے ہیں۔
جس سے صاف، ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں، مطلق سے ماسوا اللہ، مراد نہیں۔
بلکہ وہی اشخاص، مراد ہیں، جو نظر نہیں آتے۔ جیسے: اَرواح اور فرشتے۔
حالاں کہ یہ تخصیص، قطعاً، باطل ہے۔ اور تحریفِ معنوی، قرآن اور حدیث کی لازم آتی ہے۔
اسی کا نام، بدعتِ ضالّہ ہے۔ جو جہنم کو کھینچ لے جانے والی ہے۔''

(ص۲۲ و ص۲۳۔ **تَنْقِیْحُ الْعِبَادَات**۔ مؤلّفہ: سید آلِ حَسَن، موہانی۔ مطبوعہ: اردو پریس، علی گڑھ)

''وہابیہ، طعنہ دیا کرتے ہیں کہ اکثر مشائخِ ہند میں ہوتا رہا ہے کہ:
مسجد کے پاس، مقبرہ، یا مقبرہ کے پاس، مسجد بنائی جاتی ہے۔
اس کو وہابیہ کہتے ہیں کہ: عین قبرستان میں نماز پڑھنا ہے۔
اور یہ نہیں دیکھتے کہ: **جہاں سے اسلام، نکلا ہے۔ وہیں سے یہ چلا آیا ہے کہ:**
مسجدِ نبوی اور مرقدِ مصطفوی **عَلیٰ صَاحِبِھِمَا الصَّلوٰۃُ وَ السَّلام**
اور اس کے ساتھ، حضرت صدیق و حضرت فاروق، رَضِیَ اللہُ عَنْھُمَا کی قبر، ایک ہی جگہ بنی ہے۔
اَزاں جملہ، تعظیمِ تبرکات کہ:
اس کو بھی وہابیہ، شرک **فِی الْعِبَادَۃ** اور بُت پرستی کہتے ہیں۔
حالاں کہ قرآن شریف سے ظاہر ہے کہ:
وہ صندوق، جس میں تبرکات، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون عَلَیْھِمَا السَّلام کے رکھے رہتے تھے، ایسا متبرک اور واجبُ التعظیم تھا کہ فرشتے، اسے اٹھایا کرتے تھے۔
پس! حضرت خاتم النّبیّٖن **عَلَیْہِ الصَّلوٰۃُ وَ السَّلام** کے تبرکات، بطریقِ اولیٰ، واجبُ التعظیم ٹھہرے۔'' (ص۳۹ و ص۴۰۔ **تَنْقِیْحُ الْعِبَادَات**، مؤلّفہ: سید آلِ حَسَن، موہانی۔ مطبوعہ: اردو پریس، علی گڑھ)

''جن عُلماے ہند کو، وہابیہ، اپنا مقتدا جانتے ہیں۔ یعنی، خاندان، شاہ ولی اللہ صاحب کا۔
سو، ان کے والد کے وقت سے ان کے پوتوں تک مجلس، رسول اللہ **صَلّی اللہُ عَلَیْہِ وَسلّم** کی اور اپنے پیروں کا عرس، باستثنا، گانے کے۔ کیا کرتے تھے۔
اور اس کو بہتر، جانا کرتے تھے۔ یعنی، تعیُّنِ تاریخ کرتے تھے۔''

(ص۴۵۔ **تَنْقِیْحُ الْعِبَادَات**۔ مؤلّفہ: سید آلِ حَسَن، موہانی۔ مطبوعہ: اردو پریس۔ علی گڑھ)

''مولوی اسمٰعیل صاحب (دہلوی) اور سید احمد صاحب (رائے بریلوی)
اگر چہ، اگلے بزرگوں کی باتوں کو شرک اور بدعتِ ضالّہ، بتایا کرتے تھے

مگر، آپ، انھوں نے بہت سی باتیں نکالیں کہ خیر القرون میں اس کا نشان اور پتہ بھی، نہیں ملتا۔''

(ص۴۵۔ **تَنْقِیْحُ الْعِبَادَات**۔ مؤلّفہ: سید آلِ حَسَن، موہانی۔ مطبوعہ: اردو پریس۔ علی گڑھ)

اپنی کتاب **''آثارِ رحمت''** کے دیباچہ (محرّرہ ۲۹/ رمضان ۱۳۸۵ھ/ ۲۰/ جنوری ۱۹۶۶ء۔ در مدینہ منورہ) میں مولانا امداد صابری، دہلوی لکھتے ہیں:

''مولانا (سید آلِ حَسن، موہانی) کی ایک کتاب، رسولِ خدا، **صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم** کی ولادت پر ہے، جس کی ابتدا، اِس شعر سے ہوئی ہے:

اِمروز شاہِ شاہاں، مہماں شُدست مارا
جبریل با ملائک، درباں شُدست مارا

مولانا سید آلِ حَسن، موہانی، اکثر میلاد النبی ﷺ کی مجلسوں میں مذکورہ شعر پڑھا کرتے تھے۔
آخر میں تو ان کا دستور بن گیا تھا کہ:
سال میں ایک مرتبہ، اپنے ہی گھر میں مجلسِ میلادِ نبوی، منعقد فرماتے۔
اور اِس شعر کے پہلے مصرع کو پڑھنے کے بعد، حال سے بے حال ہو جاتے۔ ہچکیاں بندھ جاتیں جو گھنٹوں، جاری رہتیں۔ حتیٰ کہ پڑھنے سے مجبور ہو جاتے۔ اور بالآخر، کسی دوسرے شخص کو پڑھنا پڑتا۔
مولانا انوارُ الحق صاحب فرنگی محلی، لکھنوی سے آپ، بیعت تھے، جن کو آپ ''میاں'' کہا کرتے تھے۔'' (ص۱۸۔ **آثارِ رحمت**۔ مؤلّفہ: مولانا امداد صابری، دہلوی۔ مطبوعہ: دہلی۔
ناشر: مولانا عبد الباری، معرفت تاج بکڈپو، پریمیٹ مسجد، مدراس)۔

مولانا سید آلِ حَسن، موہانی کی کتاب، **تَنْقِیْحُ الْعِبَادَات** کے ابتدائیہ سے استفادہ کر کے مولانا امداد صابری نے مذکورہ حالات، درج کیے ہیں۔

مولانا رحمت اللہ، کیرانوی، کبیرُ الاولیا، مخدوم، جلال الدین، پانی پتی (وصال ۷۶۵ھ) کی اولاد میں سے ہیں۔ جن کا سلسلۂ نسب، خلیفۂ سوم، حضرت عثمان بن عفان، **رَضِیَ اللہُ عَنْہُ** سے ملتا ہے۔ کبیرُ الاولیا، مخدوم، جلال الدین، پانی پتی کی تربیت
حضرت بوعلی شاہ قلندر، پانی پتی نے فرمائی تھی۔

مولانا رحمت اللہ، کیرانوی کے جدِّ اعلیٰ، شیخ عبد الرحمٰن گازرونی، سلطان محمود غزنوی کی فوج میں شرعی حاکم تھے۔ پانی پت (پنجاب۔ موجودہ صوبہ ہریانہ) کی فتح کے بعد، شاہی فرمان کے ذریعہ پانی پت کا علاقہ، آپ کے سپرد ہوا۔ آپ کا مزار، پانی پت میں زیرِ قلعہ ہے۔
حضرت بوعلی شاہ قلندر، پانی پتی نے کبیرُ الاولیا، مخدوم، جلال الدین، پانی پتی کو

حضرت خواجہ شمس الدین تُرک، پانی پتی کی خدمت میں بھیج کر، انھیں آپ کا مرید کرایا۔
خواجہ شمس الدین تُرک، پانی پتی، خلیفۂ حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر کلیری نے کبیر الاولیا کو اپنی اجازت وخلافت سے بھی نوازا۔ کبیر الاولیا، مخدوم، جلال الدین کی ۶۳۵ھ میں ولادت ہوئی تھی اور ایک سو تیس سال کی عمر میں ۷۶۵ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

خانوادۂ کبیر الاولیا، شیخ جلال الدین، پانی پتی کی دسویں پشت میں ایک مشہور عالم
مولانا قاضی، ثناء اللہ، مجدِّدی، پانی پتی (متولد ۱۱۴۳ھ/ ۱۷۳۰ء۔ متوفی ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء) تھے۔
جنھوں نے **حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغه** کا درس، اس کے مؤلّف اور اپنے استاذ
حضرت شاہ ولی اللہ، محدِّث دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) سے لیا تھا۔
حضرت شاہ عبدالعزیز، محدِّث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) نے
مولانا ثناء اللہ، مجدِّدی، پانی پتی (متوفی ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء) کو ''**بیہقیِ وقت**'' کا
اور حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں، نقشبندی، مجدِّدی، دہلوی نے ''**عَلَمُ الْهُدیٰ**'' کا خطاب، دیا تھا۔
حضرت مرزا مظہر جان جاناں، نقش بندی، مجدِّدی، دہلوی (متولد ۱۱۱۰ھ۔ متوفی ۱۱۹۵ھ)
قاضی ثناء اللہ، مجدِّدی، پانی پتی (وصال ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء) سے بڑی محبت فرمایا کرتے تھے۔
اِسی وجہ سے قاضی ثناء اللہ نے اپنی تفسیرِ قرآن کی نسبت
آپ کی طرف، کرتے ہوئے ''**تفسیرِ مظہری**'' کے نام سے موسوم کیا۔
قاضی ثناء اللہ، مجدِّدی، پانی پتی کی تصانیف کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔

خلیل اللہ، معروف بہ خلیل الرحمٰن بن حکیم نجیب اللہ

یکے از اولادِ کبیرُ الاولیا، مخدوم جلال الدین، پانی پتی کے گھر میں مولانا رحمت اللہ کی ولادت جمادیٰ الاولیٰ ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷ء کو کیرانہ میں ہوئی۔ کیرانہ، مظفر نگر سہارن پور کا ایک قصبہ ہے۔
ابتدائی تعلیم کے بعد، مولانا رحمت اللہ، کیرانوی نے مدرسہ مولوی حیات، دہلی میں تعلیم، حاصل کی۔
دہلی میں آپ نے مولانا محمد حیات، پنجابی و مولانا عبدالرحمٰن، چشتی اور مولانا امام بخش، صہبائی دہلوی سے عربی و فارسی کی اعلیٰ تعلیم، حاصل کی۔
پھر، یہیں، چند ماہ تک، پیشکاری وخطوط نویسی کی ملازمت کی۔ اس کے بعد لکھنؤ جا کر مفتی سعدُ اللہ، مرادآبادی (شاگردِ شاہ عبدالعزیز، محدِّث دہلوی و مفتی صدرُ الدین آزردہ دہلوی) سے مسلَّم الثبوت اور میر زاہد کا درس لیا۔ شاہ عبدالغنی، مجدِّدی، دہلوی سے آپ نے دورۂ حدیث بھی پڑھا۔
مولانا اِمداد صابری، دہلوی لکھتے ہیں:
''زمانے کے ناسازگار حالات اور خاص طور پر ہندوستان میں نصاریٰ کے بڑھتے ہوئے

اثر واِقتدار کو روکنے کی فکر نے آپ کو اس کا موقع نہیں دیا کہ اطمینان کے ساتھ، تعلیم و تدریس کا فیضِ عام جاری رکھتے۔ تکمیلِ تعلیم اور اکبر آباد (آگرہ) کے یادگارِ زمانہ مناظرہ (در ۱۸۵۴ء) کے درمیانی عرصہ میں چند سال تک، کیرانہ کی مسجد میں مولانا نے ایک دینی مدرسہ، قائم کیا تھا۔
اس مدرسے کے فیض یاب طلبہ میں سے بعض اصحاب نے مکہ معظّمہ میں بھی حضرت مولانا سے شرفِ تلمذ، حاصل کیا اور اسباق میں شرکت کی۔ جن میں سے قابلِ ذکر اسما، یہ ہیں:
مولانا عبدالسمیع، رام پوری (سہارن پوری) مصنّفِ حمدِ باری، مولانا احمدُ الدین صاحب چکوالی، مولانا نوراحمد صاحب، امرت سری، مولانا شاہ ابوالخیر صاحب، مولانا شرف الحق صاحب صدیقی، مولوی قاری شہاب الدین صاحب، عثمانی، کیرانوی، مولانا حافظ الدین صاحب، دُجانوی مولانا عبدالوہّاب صاحب، دہلوی، بانی مدرسہ باقیاتُ الصّالحات، مدراس، مولانا امام علی صاحب عثمانی، مولانا بدرالاسلام صاحب عثمانی، کیرانوی، مہتممِ حمیدیہ کتب خانہ شاہی۔ قسطنطنیہ۔''
(ص ۱۲۵۔ **آثارِ رحمت**۔ مؤلّفہ: اِمداد صابری، دہلوی۔ مطبوعہ دہلی)

جب، اسلام و قرآن اور پیغمبرِ اسلام، صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّم پر
عیسائیوں کے حملے، تیز ہونے لگے، مسیحی مشنریوں کی سرگرمیاں بڑھنے لگیں
اور مسلمان کو وَرغلانے کی کوشش، ناقابلِ برداشت ہونے لگی
تو ''مولانا رحمت اللہ صاحب نے انھیں حالات کے پیشِ نظر، اپنے استاذ
شاہ عبدالغنی، سکنہ خانقاہ غلام علی شاہ، مجدِّدی کی فرمائش پر، اِزَالَةُ الْاَوْهَام کی ترتیب، شروع کردی۔''
(ص ۱۲۷۔ **آثارِ رحمت**۔ مطبوعہ دہلی)

اِزَالَةُ الْاَوْهَـــام ۵۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ یکم رمضان ۱۲۶۹ھ میں سیدُ المطابع دارُ السَّلطنت، شاہجہان آباد (دہلی) کوچہ بلاقی بیگم میں سید قوام الدین کے اِہتمام سے طبع ہوئی۔
اس کے حاشیہ پر کتاب ''**اِستفسار**'' مصنّفہ: مولانا آلِ حَسن، موہانی چھپی ہے۔
مولانا رحمت اللہ، کیرانوی نے اس کتاب کے دیباچہ میں تحریر کیا ہے کہ:
''یہ کتاب، میں نے پہلے، اردو میں لکھی تھی، لیکن، اہلِ اسلام کے اہلِ علم، فارسی زبان سے زیادہ رغبت رکھتے ہیں، اِس لئے مجبوراً، ان کے اِصرار پر، اس کو، فارسی زبان میں تبدیل کیا۔''
اس کتاب میں پادری فنڈر کے ''**میزانُ الحق**'' کے اعتراضات کے دنداں شکن جوابات ہیں اور رَدِّ نصاریٰ کے اکثر مباحث کا مُسکِت جواب بھی ہے۔'' (ص ۱۳۲۔ **آثارِ رحمت**)
اِزَالَةُ الْاَوْهَام کی طباعت کے سلسلے میں مولانا رحمت اللہ، کیرانوی
دہلی آکر، تگ ودَو کررہے تھے کہ اسی دَوران

مولانا ڈاکٹر وزیر خاں، اکبر آبادی سے دہلی میں ہی آپ کی ملاقات ہوگئی۔
ان کی دعوت و اِصرار پر آپ آگرہ گئے اور وہاں کے عُلَما و مشائخ سے
ملاقات و گفتگو کے بعد، آپ، پادری فنڈر سے مناظرہ کے لئے تیار ہوئے۔
مولانا وزیر خاں، انگلستان میں رہنے کی وجہ سے انگریزی زبان سے اچھی طرح، واقف تھے
اور عیسائی مذہب کی کتابیں بھی وہاں سے آپ لائے تھے، جن کا اچھا خاصا مطالعہ کر لیا تھا۔

۱۸۵۴ء میں مولانا رحمت اللہ اور مولانا وزیر خاں نے، دو مناظرے کیے۔

ایک چھوٹا مناظرہ، ربیع الآخر ۱۲۷۰ھ میں پادری فرنچ کے بنگلے میں
پادری فرنچ اور کئی پادریوں سے ہوا۔ اس مناظرہ کا ذکر، مولانا رحمت اللہ، کیرانوی نے اپنی کتاب
اِزَالَۃُ الشُّکُوک (جلد دوم) میں کیا ہے۔
دوسرے مناظرہ کے لئے پادری فنڈر سے بتاریخ ۲۳/مارچ تا ۸/اپریل ۱۸۵۴ء
ان حضرات کی خط و کتابت ہوئی۔ اِس خط و کتابت کے ذریعہ، عیسائیوں کی طرف سے
پادری فنڈر کے ساتھ، پادری فرنچ اور مسلمانوں کی طرف سے مولانا رحمت اللہ، کیرانوی
اور مولانا ڈاکٹر وزیر خاں، اکبر آبادی کے نام، مناظرین کی حیثیت سے منظور ہوئے۔
اور ۱۰/۱۱/۱۲/اپریل ۱۸۵۴ء مناظرہ کی تاریخ طے ہوئی، جس کا انعقاد، اکبر آباد (آگرہ) میں ہوا۔
اِزَالَۃُ الشُّکُوک، از مولانا رحمت اللہ، کیرانوی، جلدِ دوم کے حوالہ سے
آثارِ رحمت۔ مؤلَّفہ: مولانا اِمداد صابری، دہلوی، مطبوعہ: دہلی میں
کچھ تفصیلاتِ مناظرہ (۱۸۵۴ء) درج کر دی گئی ہیں۔
مولانا رحمت اللہ اور پادری فنڈر کے درمیان ہونے والی خط و کتابت اور مناظرہ کی روداد
"اَلْبَحْثُ الشَّرِیف فِی اِثْبَاتِ النَّسْخِ وَالتَّحْرِیف" مطبوعہ فخر المطابع، شاہجہاں آباد
۱۲۷۰ھ، مرتّبہ: وزیر الدین بن شرف الدین، بزبانِ فارسی بھی موجود ہے۔
مزید روداد اور ختمِ مناظرہ کے بعد، مولانا وزیر خاں اور پادری فنڈر کے درمیان
مُراسلت (از ۱۵/مئی تا ۱۷/اگست ۱۸۵۴ء) کو کتابی شکل میں مباحثۂ مذہبی، حصہ اول کے نام سے
سید عبداللہ، اکبر آبادی نے مطبع منعمیہ، اکبر آباد سے ۱۲۷۱ھ میں باہتمام: منشی محمد امیر خاں، طبع کرایا
جو، فارسی زبان میں ایک سو اٹھاسی (۱۸۸) صفحات پر مشتمل ہے۔
اسی کا اردو ترجمہ، بنام، **مباحثۂ مذہبی**، دوسرا حصہ، سید عبداللہ نے مطبع منعمیہ، آگرہ ہی سے چھپوایا
جس کے، دو سو چار (۲۰۴) صفحات ہیں۔
مولانا امداد صابری، دہلوی لکھتے ہیں:

"۱۸۵۴ء کے اکبر آباد (آگرہ) کے مناظرہ کے دوسرے ہیرو، ڈاکٹر وزیر خاں، اکبر آبادی
تھے۔ اور اس مناظرہ میں شریک ہونے والوں میں مولوی فیض احمد، رسوا، بدایونی بھی تھے۔
ان حضرات کے یہ تعلقات، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مُمِد، ثابت ہوئے۔
اور انھوں نے متفق ہو کر، اس جنگِ آزادی میں بہت نمایاں اور اہم کردار ادا کیا۔
جب، میرٹھ کے مجاہدین نے دہلی میں جنگِ آزادی کا، بِگل بجایا۔
چوں کہ مولانا رحمت اللہ صاحب کا، دہلی کے علمی طبقے اور لال قلعہ کے شہزادوں پر اثر تھا
اور ان سے تعلقات بھی تھے، اس وقت بہادر شاہ ظفر اور دوسرے مجاہدین کے ساتھ
مولانا رحمت اللہ صاحب نے بھی جنگِ آزادی کا نقشہ بنانے میں حصہ لیا اور جنگ میں شمولیت فرمائی۔
اور ڈاکٹر محمد وزیر خاں، اکبر آبادی اور مولوی فیض احمد، بدایونی کے ساتھ
دہلی کی جنگِ آزادی میں شریک ہوئے۔" (ص ۳۱۸ و ۳۱۹۔ آثارِ رحمت۔ مطبوعہ: دہلی)

مولوی ذکاء اللہ، دہلوی (متوفی ۱۹۱۰ء) جو انگریز حامی ذہن رکھتے تھے، انھوں نے
اپنے انداز میں مولانا رحمت اللہ، کیرانوی کی دہلی آمد اور خاموش واپسی کا ذکر، اِس طرح کیا ہے:
"سب سے اول، مولوی رحمت اللہ، کیرانہ سے اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت
ہے؟ وہ بڑے فاضل تھے۔ عیسائی مذہب کے رَد میں صاحبِ تصنیف تھے۔ وہ قلعہ کے پاس
مولوی حیات کی مسجد میں اُترے۔ اس دانش مند مولوی کے نزدیک
دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی بلکہ ایک ہنگامۂ فساد برپا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر، اپنے وطن کو چلا گیا۔"
(۶۷۵۔ جلدِ سوم۔ "**تاریخ عروجِ سلطنتِ انگلشیۂ ہند**"۔ از مولوی ذکاء اللہ، مطبوعہ: دہلی۔ ۱۹۰۳ء)

دوسری طرف، ۳۰/جون ۱۸۵۷ء کے اپنے روزنامچہ میں
سرکاری مُخبر، عبداللّطیف خاں نے لکھا کہ:
"مردمِ نجیب آباد کہ، بہ شمار، دو صد میرسیدند، باقتدائے مولوی رحمت اللہ، کیرانہ نژاد
بمنازعت برآمدند و بمراجعت، درآمدند" (۸۷۔ "**روزنامچہ عبداللّطیف**"۔ مطبوعہ: دہلی)
دو سو، اہلِ نجیب آباد، مولوی رحمت اللہ، کیرانوی کی قیادت میں دہلی پہنچے۔
اور آمادۂ پیکار ہوئے۔ پھر، واپس چلے گئے۔"
"اِس زمانہ میں عصر کی نماز کے بعد، مجاہدین کی تنظیم و تربیت کے لئے
کیرانہ کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر، نقارہ کی آواز پر لوگوں کو جمع کیا جاتا تھا۔
اور اعلان ہوتا تھا کہ: **"ملک، خدا کا اور حکم، مولوی رحمت اللہ کا"**۔
اس جُملہ کے بعد، جو کچھ کہنا ہوتا اور پروگرام بنانا ہوتا، وہ عوام کو بتایا جاتا۔

کیرانہ کے محاذ پر، بظاہر، شکست کے آثار، نظر نہیں آتے تھے۔
مگر، بعض اَبنائے وطن کی زمانہ سازی اور مُخبِروں کی سازش نے حالات کا رُخ، بدل دیا۔
کیرانہ میں انگریزی فوج اور توپ خانہ، داخل ہوا۔ محلّہ دربار کے دروازہ کے سامنے توپ خانہ، نَصب کیا گیا اور فوج نے محلّہ دربار میں محاصرہ کرنے کے بعد
قتل و غارت گری کا سلسلہ، شروع کیا۔''

(ص ۲۴۶۔ آثارِ رحمت۔ مؤلّفہ: امداد صابری، دہلوی۔ مطبوعہ: دہلی)۔

مولانا کیرانوی کی تلاش میں انگریزوں نے پنجیٹھ گاؤں کا محاصرہ کرلیا، جو کیرانہ کے قریب مسلم گوجروں کی آبادی تھی، چودہ آدمیوں کو انھوں نے گرفتار کر کے سختی کے ساتھ مولانا کا پتہ پوچھا، مگر، یہ لوگ، کسی طرح کچھ بتانے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔
مولانا کو، جب، اس کی اطلاع ہوئی، تو آپ نے چودھری عظیم الدین سے کہا کہ:
''میری وجہ سے، یہ لوگ، گرفتارِ مصیبت ہوئے ہیں۔
اِس لئے میں اپنے آپ کو، فوج کے حوالے کر دیتا ہوں۔''
جس کے جواب میں چودھری عظیم الدین نے
نہایت جرأت مندانہ کردار کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ:
''چودہ آدمی نہیں، بلکہ اگر پورا گاؤں، گرفتار ہو جائے اور اسے پھانسی دے دی جائے۔
جب بھی آپ کو فوج کے حوالے، نہیں ہونے دیا جائے گا۔''
فوج سے بچنے کے لئے چودھری نے یہ دانشمندانہ مشورہ دیا کہ:
''آپ ''کھُرپا'' لے کر کھیت میں گھاس کاٹنے چلے جائیں۔''
چنانچہ، مولانا کیرانوی نے ایسا ہی کیا اور ان کا اپنا بیان ہے کہ:
گوروں کی فوج، اسی کھیت کی پگڈنڈی سے گذری، جہاں، مَیں، گھاس کاٹ رہا تھا اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو کنکریاں اُٹھتی تھیں، وہ میرے جسم پر لگ رہی تھیں۔
بعد میں مولانا کیرانوی کے خلاف، انگریزوں نے فوجداری مقدمہ چلایا اور گرفتار کر کے انھیں انگریزوں کے حوالے کرنے والے کے لئے
ایک ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا۔
آپ کی ساری جائداد و املاک، ضبط کر کے نیلام کر دی گئی۔ یہاں تک کہ آپ کے آبائی وطن پانی پت (پنجاب۔ موجودہ صوبہ ہریانہ) کی موروثی جائداد بھی جنوری ۱۸۶۴ء میں نیلام کر دی گئی۔
۱۸۵۷ء کی داروگیر سے بچنے کے لئے مولانا رحمت اللہ، کیرانوی

اپنا نام، مصلح الدین رکھ کر، جے پور، جودھ پور، پیادہ پا سفر کرتے ہوئے
سورت (گجرات) پہنچے اور وہاں سے، بحری جہاز کے ذریعہ، پریشاں حالی کے ساتھ
کسی طرح آگے کے مقامات طے کرتے ہوئے مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔
طوافِ خانۂ کعبہ کے دَوران، حاجی امداد اللہ، مہاجرِ مکی (متوفی ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء) سے ملاقات ہوگئی، جو آپ سے پہلے، مکہ مکرمہ پہنچ چکے تھے۔
یہ دَور، سلطنتِ عثمانیہ تُرکیہ کے سلطان، عبدالعزیز خاں، تُرکی کی حکومت کا تھا۔
اور مسجدِ حرام میں شیخ الاسلام، حضرت احمد بن زَینی دحلان شافعی (متوفی ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء) کا حلقۂ درس، مرجعِ عوام و خواص تھا۔ شریف عبداللہ بن عَون محمد، اس وقت، امیرِ مکّہ تھے۔
شیخ احمد زَینی دَحلان (شافعی) کے حلقۂ درس میں مولانا کیرانوی نے شریک ہونا، شروع کیا۔
اور ان کی دعوت پر ایک روز، آپ، حاجی امداد اللہ، مہاجرِ مکی کے ساتھ
ان کے دولت کدے پر حاضر ہوئے۔
حاجی صاحب نے شیخ دحلان سے آپ کا باضابطہ تعارف کرایا۔
مناظرۂ اکبر آباد اور انگریزوں کے خلاف، آپ کی جد و جہد کا ذکر کیا، جس سے شیخ دحلان بہت مسرور ہوئے اور اسی ملاقات میں مولانا کیرانوی کو شیخ دحلان نے مسجدِ حرام میں
درس کی اجازت دی اور عُلَماے مسجدِ حرام کے رجسٹر میں آپ کا نام، درج کرایا۔
مولانا رحمت اللہ، کیرانوی و مولانا ڈاکٹر وزیر خاں، اکبر آبادی اور مولانا فیض احمد عثمانی، بدایونی سے مناظرۂ آگرہ ۱۸۵۴ء میں شکستِ فاش اٹھانے کے باوجود
پادری فنڈر ۱۸۵۸ء میں قسطنطنیہ، تُرکی پہنچ گیا اور بے شرمی و ڈِھٹائی کے ساتھ
وہ سلطان عبدالعزیز خاں، تُرکی سے مل کر اپنی فتح کی لاف زَنی کرنے لگا۔
سلطان نے حقیقتِ حال جاننے کے لئے امیرِ مکہ کے نام، فرمان، جاری کیا کہ:
''حُجاج و زائرینِ ہند سے مناظرہ کی اصل روداد، معلوم کی جائے۔''
اب، اس کے آگے کا حال، مولانا اِمداد صابری، دہلوی کی زبانی سنیے:
''امیرِ مکّہ نے شیخ العُلَما، سید احمد دحلان سے اس فرمان کا ذکر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ:
جس عالم سے پادری فنڈر کا مناظرہ ہوا ہے، وہ عالم، یہاں، خود، موجود ہیں۔
چنانچہ، دوسرے دن، شیخ الاسلام (احمد دحلان) مولانا رحمت اللہ کو
اپنے ہمراہ لے کر امیرِ مکہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔
اس ملاقات کے بعد، امیرِ مکہ نے فوراً، بارگاہِ شاہی میں مناظرہ اور جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے

حالات اور مولانا رحمت اللہ کی موجودگی کے بارے میں لکھ کر بھیج دیا۔

چنانچہ، مولانا رحمت اللہ صاحب، خاص اعزاز و اکرام کے ساتھ ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں شاہی مہمان کی حیثیت سے روانہ ہوئے۔

جب وہاں پہنچے تو شاہی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرائے گئے۔

سلطان عبدالعزیز بکمالِ التفاتِ شاہانہ، روزانہ آپ کو بعد نمازِ عشا، شرفِ باریابی، عطا فرماتے۔

اس مخصوص صحبت میں اکثر، خیرالدین پاشا، تونسی، صدرِ اعظم

اور شیخ الاسلام وغیرہ اکابرِ سلطنت بھی شریک ہوتے تھے۔

جب، پادری فنڈر کو مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کی

آمد کی اطلاع ہوئی، تو وہ قسطنطنیہ سے چلا گیا۔

سلطان نے، ان ملاقاتوں میں مناظرہ (۱۸۵۴) اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے حالات نہایت، دل چسپی کے ساتھ سنے اور مناظرہ کے نتیجے سے بہت خوش ہوئے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کی اس جلیل القدر دینی خدمت کی یہ قدر افزائی فرمائی کہ:

آپ کی واپسی کے وقت، خلعتِ فاخرہ کے ساتھ، تمغۂ مجیدی، درجۂ دوم

اور گراں قدر وظیفہ کی امداد سے سرفراز فرمایا۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کی ملاقات کے بعد، سلطان عبدالعزیز خاں صاحب نے عیسائی مشنریوں کے فتنہ وفساد کو روکنے کے لئے سخت قدم اٹھائے، جس کا ذکر، پنجاب ریلیجیس بکڈپو انارکلی، لاہور کی مطبوعہ کتاب ''**صلیب کے علمبردار**'' مؤلّفہ: پادری برکت میں ہے۔''

(ص ۲۵۵۔ **آثارِ رحمت**۔ از امداد صابری۔ مطبوعہ: دہلی)

سلطان عبدالعزیز خاں، تُرکی کی خواہش اور خیرالدین پاشا کی تحریک پر

رجب ۱۲۸۰ھ میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے ''**اظہارُ الحق**'' مرتّب کرنی، شروع کی۔

جسے، آخر ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ میں چھ ماہ کی قلیل مدت میں لکھ کر، سلطان عبدالعزیز کی خدمت میں آپ نے پیش کی اور اس کتاب میں سلطان کا ذکر کرنے کی بجائے، حسب ذیل الفاظ میں

شیخ العُلَماء سید احمد دحلان شافعی مکی کا ذکر، آپ نے فرمایا:

سَیّدِی وَ سَنَدِی مَولانَا السَّیّد احمد بن زَینی دَحلان ۔ اَدامَ اللّٰہُ
فَیْضَہٗ اِلیٰ یومِ الْقِیام۔ اَمَرَنِی اَنْ اُتَرْجِمَ بِاللِّسانِ العربی
ھٰذِہِ الْمَبَاحِث الْخَمْسَۃ مِنَ الْکُتَبِ الَّتِی اَلَّفْتُ فِی ھٰذَا الْبَاب۔
لِاَنَّھَا کانَتْ امَّا بِلِسَانِ الْفُرْسِ وَ امَّا بِلِسانِ مُسْلِمِی الْھِند۔

شیخ العُلَما (احمد زَینی دحلان) کے ذکر پر، خیرالدین پاشا نے

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب سے فرمایا کہ:

آپ نے امیرُ المؤمنین کی خواہش پر یہ کتاب، تحریر کی ہے، مگر، اس کے مقدمہ میں آپ نے شیخ العُلَما کا ذکر فرمایا ہے۔ حالاں کہ ان کی جگہ پر، امیرالمؤمنین، سلطان عبدالعزیز کا نام آنا چاہیے تھا۔''

مولانا نے، بلا تکلّف اور بلا جھجک، یہ جواب دیا:

اس خالص مذہبی خدمت میں کسی دنیاوی غرض ومقصد کا کوئی شائبہ، نہ آنا چاہیے۔

اس کے علاوہ، مکہ معظّمہ میں خود، شیخ العُلَما مجھ سے ان حالات کے قلمبند کرنے کی خواہش کر چکے تھے اور ابتدائی مواد کی ترتیب کا کام بھی، مَیں نے شروع کر دیا تھا۔

اور دوسری وجہ، یہ ہے کہ اس کتاب کی تالیف کا اصل سبب، شیخ العُلَماء ہیں۔

کسی وجہ سے اگر، وہ مجھے امیرِ مکہ تک نہ پہنچاتے، تو میری رسائی یہاں تک، نہ ہوتی اور اس خدمت کا موقع، نہ ملتا۔'' (ص ۳۵۔ ''**ایک مجاہد معمار**''۔ مؤلّفہ: محمد سعید، ناظم مدرسہ صولتیہ، مکہ مکرمہ)

مولانا صاحب کی اِس صاف گوئی اور قدر شناسی کا خیرالدین پاشا پر بہت اچھا اثر ہوا۔

اور، یہ دلائل سن کر قائل ہو گیا۔'' (ص ۲۵۷۔۲۵۸۔ ''**آثارِ رحمت**''۔ مطبوعہ: دہلی)

قسطنطنیہ کے دَورانِ قیام، علُما واُمرَ اسے بہت سے موضوعات پر

تبادلۂ خیال ہوتا تھا، جس کی روشنی میں آپ نے ضرورت محسوس کی کہ:

ایک ایسی کتاب لکھی جانی چاہیے، جس میں عقلی دلائل کے ساتھ، بعثت ونبوت، حشر ونشر نزولِ وحی، وغیرہ کا اِثبات ہو۔ چنانچہ، ۱۲۸۱ھ میں ''**تنبیہات**'' کے نام سے ایک وقیع کتاب لکھی جس کی طباعت، خیرالدین پاشا تونسی، صدرِ اعظم کے حکم سے ہوئی۔

اِظہَارُ الحق، جلدِ اول ودوم، از مولانا رحمت اللہ، مطبوعہ مصر میں بھی

یہ کتاب، شامل اور شایع ہو چکی ہے۔

تمہید کتاب میں مولانا کیرانوی، اِظھارُ الحق کی تصنیف کے اسباب

اور اس کے محرّک، شیخ احمد زَینی دحلان، شافعی کا ذکر، اِس طرح کرتے ہیں:

(امَّا بعد) فَیَقُولُ الْعبدُ الرَّاجِی اِلیٰ رَحمۃِ رَبّہٖ الْمَنّان
رَحمتُ اللّٰہ بن خلیل الرَّحْمٰن، غَفَرَ اللّٰہُ لہٗ وَلِوَالِدَیْہِ، وَأحْسَنَ اِلَیْھِمَا وَاِلَیْہِ۔
اِنَّ الدَّولَۃَ الْاِنْجلیزِیَّۃَ لَمَّا تَسَلَّطَتْ عَلٰی مَمْلَکۃِ الْھِند تَسَلُّطاً قَوِیًّا
وَبَسَطُوا بِسَاطَ الأَمْنِ وَالْاِنْتِظَام بَسطاً مَرضیاً، وَمِنْ اِبتداءِ سَلطنتِھِم
اِلیٰ ثلاثٍ وَ أَرْبَعِین سَنَۃً، مَاظَھرتِ الدَّعْوۃُ مِنْ عُلَما ئِھِم اِلیٰ مَذھبِھِم۔

وَبَعدهَاأخذُوافِى الدَّعْوَةِ وَكانُوايَتدرَّجُونَ فِيهَا،حتىّٰ أَلَّفُواالرَّسائِلَ وَالْكُتُبَ فِى رَدِّ أَهلِ الْاِسلام،وَقَسَّمُوهَافِى الْاَمْصارِ بينَ الْعَوَام۔

وَشَرَعُوافِى الْوَعْظِ فِى الأسْوَاقِ، وَمَجامِعِ النَّاسِ،وَالشَّوَارِعِ الْعامَّة۔

وَكانَ عَوامُ اَهْلِ الأسلام اِلىٰ مُدَّةٍ مُتَنفِّرِين عَنْ اِسْتِماعِ وَعْظِهِم وَ مُطالعةِ رَسائِلِهِم، فَلَمْ يَلْتَفِتْ أحَدٌ مِنْ عُلَماءِ الْهِندِ اِلىٰ رَدِّ تِلكَ الرَّسائل لكِنْ تَطرَّقَ الْوَهْنُ بعدَ مُدَّةٍ، فِى تَنَفُّرِ بَعضِ الْعَوَام ۔ وَحَصَلَ خَوفُ مَزَلّةِ أقدامِ بَعضِ الْجُهَّالِ الَّذِيْنَ هُمْ كَا لْاَنْعَام، فَعِنْدَ ذٰلِك تَوَجَّهَ بَعضُ عُلَماءِ أهلِ الْاِسلامِ اِلٰى رَدِّهِم۔

وَاِنّى وَاِنْ كُنْتُ مُنْزَوِياً فِى زَاوِيَّةِ الْخُمُولِ، وَمَا كُنْتُ مَعْدُوْداً فِى زُمْرَةِ عُلَمَاءِ الْفُحُوْلِ،وَلَمْ أكُنْ أَهْلاً لِهٰذا الْخَطبِ الْعَظيمِ الشَّأن۔

لكنِّى لَمَّا اطَّلَعْتُ علىٰ تَقْرِيْرَاتِهِم وَتَحْرِيْرَا تِهِم، وَوَصَلَتْ اِلَيَّ رَسائِلُ كثيرةٌ مِنْ مُؤَلِّفاتِهِم، اِسْتَحْسَنْتُ أنْ أجْتَهِدَ أيضاً، بِقَدرِ الْوُسْعِ وَالْاِمكان۔

فَأَلَّفْتُ أوَّلاً اَلْكتبَ وَالرَّسائلَ، لِيَظهرَ الْحَالُ لِأولِى الْألباب۔

وَاسْتَدعيتُ ثانياً مِنَ الْقِسِّيْسِ الَّذى كانَ بارِعاً

وَأَعْلىٰ كَعْباًمِنْ عُلَمَاءِ الْمَسِيحينَ الَّذِيْنَ كانُوا فِى الْهِندِ مُشْتَغِلين بِالطَّعْن وَالْجَرْحِ عَلٰى الْمِلَّةِ الاسْلَامِيةِ تَحْرِيْراً وَتَقرِيراً۔

أعْنِى مؤلِّفَ (**مِيزَان الْحق**)أنْ يَقَعَ بَيْنِى وَبينَهُ الْمُناظَرة، فِى الْمَجلسِ الْعَامِ لِيَتَّضِحَ حَقَّ الْاِتّضاح أنَّ عَدمَ تَوَجُّهِ عُلَمَاءِ الْمُسلمِين

لَيْسَ لِعَجزِهِمْ عَنْ رَدِّ رَسائِلِ الْقِسِّيْسين كَمَا هُوَمَزْعُومُ بَعضِ الْمَسِيْحِين۔

فَتَقَرَّرَتِ الْمناظرةُ فِى الْمَسائلِ الْخَمْسِ الَّتى هِىَ أمّهَاتُ الْمَسائلِ الْمُتنازَعةِ بينَ الْمَسِيحين وَالْمُسلِمين۔

أعْنِى: التَّحْرِيفَ،وَالنَّسْخَ، وَالتَّثْلِيث وَحَقِّيَةَ الْقُرآن وَنُبُوَّةَ محمدٍ ﷺ۔

فَانْعَقَدَ الْمَجلِسُ الْعَامُ فِى شَهرِ رَجب سَنَةَ ألفٍ وَمِائَتَيْن وَسَبْعِين مِنْ هِجْرةِ سَيِّدِ الْأوَّلِين وَالْآخرينﷺفِى بَلدةِ أكبرأباد۔(الهند)

وَكَانَ بعضُ الْأحِبَّاءِ الْمُكرَّم أَطَالَ اللّٰهُ بَقاءَ هٗ، مُعِيْناً لِى فِى هٰذا الْمَجلس وَكانَ بَعضُ الْقِسِّيسين مُعِيْناً لِلقِسِّيسِ الْمَوصوف۔

فَظَهَرَتِ الْغلبةُ لَنَا بِفَضْلِ اللّٰهِ فِى مَسْألَتَى النَّسْخِ وَالتَّحْرِيْفِ اللَّتَينَ كانَتَا مِنْ أَدَقِّ الْمَسائلِ وَأقدَمِهَافِى زَعْمِ الْقِسِّيسِ، كَمَا تَدُلُّ عَلَيْهِ عبارَتُهٗ فِى كِتابِ

حَلِّ الْاِشْكال، فَلَمَّا رَأى ذٰلِكَ سَدَّ بابَ الْمُناظَرَة فِى الْمَسَائلِ الثَّلاثِ الْبَاقية۔

ثُمَّ وَقَعَ لِى الْاِ تّفاقُ أنْ وَصَلْتُ اِلىٰ مَكَّة، شَرَّفَهَا اللّٰهُ تعالىٰ۔

وَحَضَرْتُ عَتبَةَ الأسْتَاذِ الْعَلاَّمةِ وَالنِّحرِيرِ الْفَهَّامَةِ،عينِ الْعِلم وَالدِّرايَةِ،يَنْبُوعِ الْحكمِ وَالرِّوَايَةِ،شَمْسِ الْأُدَبَاءِ،تَاجِ الْبُلَغَاءِ،مِقْدَامِ الْمُحقِّقِين،سَنَدِ الْمُدَقِّقِين اِمامِ الْمُحَدِّثِين،قُدْوَةِالْفُقَهَاءِ وَالْمُتَكَلِّمين،فَلْذَةِ كَبدِ الْبَتُولِ

سَمِيِّ الرَّسولِ الْمَقْبُولِ،سَيِّدِى وَ سَنَدِى

مَوْلانَاالسَّيِّداَحْمَد بن زَيْنِى دَحْلان اَدامَ اللّٰهُ فَيْضَهٗ اِلىٰ يومِ الْقِيام۔

اَمَرَنِى اَنْ اُتَرْجِمَ بِاللِّسانِ الْعَرَبِىِّ هٰذِهِ الْمَباحِث الْخَمْسَةَ مِنْ الْكُتُبِ الَّتِى اَلَّفْتُ فِى هٰذا الْبَابِ لِاَنَّها كَانَتْ اِمّابِلِسَانِ الْفُرْس وَاِمَّا بِلِسَان مُسْلِمِى الْهِنْد۔

وَكَانَ سَببُ تَالِيفِى فِى هٰذَين اللِّسانَيْن

أَنَّ اللِّسانَ الْأَوَّل مَألوفُ الْمُسْلِمِين فِى تِلْكَ الْمَمْلِكَةِ،وَاللِّسَانَ الثَّانى لِسانُهُم۔

وأنَّ الْقِسِّيسينُ الْوَاعِظِيْنُ الْمُقِيْمِين فِى تِلكَ الْمَمْلَكَةِ

مَاهِرُوْنَ فِى اللِّسَانِ الثّانِى يَقِيْناً،وَوَاقِفون عَلىٰ اللِّسان الْأوِّل أَيْضاً،قَلِيْلاً۔

لاسِيِّماالْقِسِّيس الَّذِى نَاظَرَنِى فَاِنَّهٗ كَانَتْ مَهارَتُهٗ فِى الْاَوَّل أشَدَّ مِنَ الثّانى۔

وَرَأَيْتُ اِطَاعَةَ أمْرِمَوْلاى بِمَنْزِلَةِ الْوَاجب،وَشَمَّرْتُ عَنْ سَاقِ الْجدِّ لِاِمْتِثَالِ أمْرِهٖ،فَارْجُوْ مِمَّنْ سَلَكَ مَسْلَكَ الْاِنْصَافِ،وَتَنَكَّبَ عَنْ طَرِيْقِ الْاِعْتِسَافِ أَنْ يَسْتُرَ خَطِيئَاتِى،وَيَجُرُّ قَلَمَ الْاِصْلاح عَلىٰ هَفَوَاتِى۔

وَأسْأَلُ اللّٰهَ الْمُيَسّر لِكُلِّ الصِّعَابِ أنْ يَمُنَّ عَلَىَّ بِمَا يُرْشِدُنِى اِلٰى الْحَقِّ وَالصَّوَابِ،وَ يَجْعَلَ هٰذا الْكتابَ مَقْبُولاً لَدى الْاَنام، مُنْتفعاً بِهٖ الْخَاص وَ الْعَامِ وَيَصُوْنَهٗ عنْ شُبهاتِ الْمُبْطِلين، وأوْهَامِ الْمُنْكِرِيْن۔

وهُوَ الْوَلِىُّ لِلتَّوفِيْقِ، وَبِيَدِهٖ أزِمَّةُ التَّحْقِيق۔

وَهُوَ عَلىٰ كُلِّ شَئٍ قَدِيرٌ، وَبِالْاِجابَةِ جَدِيرٌ۔

وَسَمَّيْتُهٗ (اِظْهَار الْحَق) وَرَتَّبْتُهٗ عَلىٰ مُقَدَّمَةٍ وَسِتَّةِ أَبْوَاب۔

(ص:۰۷اِلىٰ ص ۹ ۔**اِظهَارُ الْحَقِّ** لِلشَّيخ رَحْمَةِ اللّٰهِ بن خليل الرَّحمٰن اَلْهِندى۔دارُ ابن الْهَيْثَم۔اَلْقَاهِرَة،جمهورية مصر العربية۔

اَلطَّبْعَةُ الْاُوْلىٰ سَنَةَ **١٤٢٤**مِنَ الْهِجْرَة/٢٠٠٥م مِنَ الْمِيْلاد۔

اِظهارُ الحق،مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی وہ شہرۂ آفاق تصنیف ہے

جس کا نصاریٰ کی طرف سے آج تک کوئی جواب، نہ دیا جاسکا۔

اِس وقت، راقم سطور (یٰس اختر مصباحی) کے پیشِ نظر، **اِظھَارُ الْحَق** (عربی) مطبوعہ: دار ابن الھیثم، قاہرہ، مصر۔۱۴۲۴ھ/۲۰۰۵ء ہے۔ جس کے دو حصے ایک جلد میں ہیں۔

ابو عبدالرَّحمٰن عازِم بن سَعد کی تحقیق کے ساتھ، اِس کی طباعت ہوئی۔

جو اپنے مقدمہ میں اِظھار الحق کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

فَھُوَادَقُّ دِرَاسَةً نَقْدِيَةً فِي اِثْبَاتِ وُقُوعِ التَّحْرِيْفِ وَالنَّسْخِ فِي التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِيلِ، وَاِبْطَالِ عقيدةِ التَّثليثِ وَاُلُوْهِيَّةِ الْمَسِيْحِ واِثْبَاتِ اِعجازِ الْقُرآنِ وَنُبُوَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم وَالرَّدِّعَلىٰ الْمُسْتَشْرِقِين وَالْمُتَنَصِّرِين ۔

(مُقَدَّمَۃ اِظْھَارُ الْحَقُ ۔ دارُ ابن الْھَيْثَم۔ اَلْقَاھِرۃ،مِصر)

دوسرے حصے کے آخر میں مولانا کیرانوی نے لکھا ہے کہ:

۱۷؍رجب ۱۲۸۰ھ کو، مَیں نے اِظْھَارُ الْحَق لکھنا شروع کیا۔

اور آخر ذوالحجہ ۱۲۸۰ھ میں اس سے فارغ ہوا۔

اس کا تاریخی نام ''تَائِیدُ الْحَق بِرَحْمَۃِ اللّٰه'' (۱۲۸۰ھ) ہے۔

کامیاب و بامراد دَورۂ قسطنطنیہ سے واپسی کے بعد، مسجدِ حرام، مکہ مکرَّمہ میں ایک عرصہ تک، مولانا کیرانوی نے درس و تدریس کا سلسلہ، جاری رکھا۔

اِس دَوران آپ نے رائج کتبِ درس و طریقۂ تعلیم کا گہرائی سے مطالعہ کر کے اس میں کافی اصلاحات کیں اور الگ سے ایک اچھی اور باضابطہ درس گاہ قائم کرنے کی تحریک کرتے ہوئے یکم رمضان ۱۲۹۰ھ کو، اس کے لئے اپیل جاری کی۔

جو رفتہ رفتہ، کامیابی سے ہم کنار ہوئی اور مدرسہ صولتیہ، مکہ مکرمہ کا قیام عمل میں آیا۔

مولانا رحمت اللہ، کیرانوی نے، تین مرتبہ، قسطنطنیہ کا سفر کیا۔

(۱) ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء (۲) ۱۳۰۱ھ (۳) ۱۳۰۴ھ۔

دوسرے سفر کے موقع پر آپ کو سلطانِ تُرکی، عبدالمجید خاں کی طرف سے ''**پایۂ حرمین**'' کا خطاب ملا۔

مسجدِ حرام میں درس کے دَوران جو مشاہیر عُلَما، مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے شاگرد ہوئے ان میں سے چند نام، ذیل میں درج ہیں:

شریف حسین بن علی، سابق امیر مکہ و بانیِ حکومتِ ہاشمیہ، شیخ احمد عبداللہ مرداد، شیخُ الائمہ والخطباء مسجدِ حرام، شیخ عبدالرحمٰن سراج، مفتیِ احناف و شیخ العُلَماء مکہ معظّمہ، شیخ اسعد احمد دَھَّان، قاضیِ مکہ مکرمہ

شیخ عبدالرحمٰن دَھَّان، مدرس مسجدِ حرام و صدر مدرس مدرسہ صدیقیہ، شیخ عبدالرحمٰن شیبی، کلید بردارِ خانۂ کعبہ شیخ عابد حسین مالکی، مفتیِ مالکیہ، مکہ مکرَّمہ، شیخ عبداللہ زَوَاوِی، مفتیِ شافعیہ، مکہ مکرمہ، مولانا ضیاء الدین بن عبدالوہّاب، مہتمم مدرسہ باقیاتُ الصَّالحات، ویلور، مدراس، قاری عبداللہ، صدر مدرس شعبۂ تجویدِ قرآن مدرسہ صولتیہ، مکہ مکرَّمہ، قاری عبدالرحمٰن، الہ آبادی، مولانا محمد سعید، ناظمِ مدرسہ صولتیہ، مکہ مکرمہ شیخ عبداللہ سراج، مفتیِ احناف و قاضی القضاۃ و وزیر اعظم حکومتِ ہاشمیہ، حجاز۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی، انگریزوں کے عزائم سے اِس حد تک واقف اور ان سے اتنا چوکنّا رہتے تھے کہ سلطان عبدالحمید تُرکی کے دَور میں انگریزوں نے حکومتِ تُرکی سے عدن میں جہازوں کا کوئلہ رکھنے کے لئے تھوڑی سی جگہ، مانگی تھی۔

جب، مولانا کیرانوی کو اس بات کا علم ہوا، تو آپ نے سلطانِ تُرکی کو ایک خط لکھا کہ:

بحری اعتبار سے عدن، بڑی اہم جگہ ہے۔

اگر، آپ نے انگریزوں کو یہ جگہ دے دی، تو بہت خطرناک، ثابت ہوگی

اور اس طرح پورے عدن پر انگریز، قبضہ کر لے گا۔

اور اس کا اثر، دوسرے ممالکِ اسلامیہ پر بھی پڑے گا۔''

اِس مشورہ پر سلطان نے توجہ نہیں دی اور جگہ دے دی۔ جس کا نتیجہ، ہمارے سامنے ہے۔ انگریز، عدن پر قابض ہے اور عرب ممالک کے لئے پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔ عدن کو آزاد کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ (ص ۲۷۰۔ **آثارِ رحمت**۔ مؤلّفہ: امداد صابری، دہلوی، مطبوعہ دہلی)

کلکتہ کی ایک مخیِّر و باہمت و خداترس خاتون، **صولتُ النساء بیگم**، ۱۲۹۰ھ میں اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ، مکہ مکرمہ، حاضر آئیں۔ وہ صدقۂ جاریہ کی نیت سے مکہ مکرمہ میں ایک رباط (سرائے) کی تعمیر کرانا چاہتی تھیں۔ ان کے داماد، جو مسجد حرم شریف میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے درس میں شرکت کیا کرتے تھے، اُنھوں نے اِس سلسلے میں مولانا کیرانوی سے مشورہ کیا۔ آپ نے فرمایا کہ:

مکہ مکرَّمہ میں رباطیں، بہت سی ہیں۔ یہاں ایک اچھے مدرسہ کی سخت ضرورت ہے۔''

داماد نے اپنی خوش دامن، **صولتُ النِّساء** صاحبہ سے اس کا ذکر کیا۔

وہ، دوسرے روز، مولانا کیرانوی کے پاس آئیں اور گفتگو کے بعد وہ برضا و رغبت، تعمیرِ مدرسہ کے لئے تیار ہو گئیں۔

چنانچہ، محلّہ خندریسہ، مکہ مکرمہ میں ایک قطعہ آراضی خرید کر، اس مدرسہ کی تعمیر، شروع ہوگئی۔

رمضان ۱۲۹۰ھ میں مدرسہ کا آغاز ہوا، ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں اس کی تعمیر ہوئی۔

محرمُ الحرام ۱۲۹۱ھ سے اس کا سنِ قیام، شمار کیا جاتا ہے۔

چہار شنبہ ۱۲؍شعبان ۱۲۹۱ھ میں مدرسین وطلبہ کو اس مدرسہ میں منتقل کیا گیا۔
اس کا نام، **صولۃ النساء بیگم** کے نام کی نسبت سے ’’**مدرسہ صولتیہ**‘‘ رکھا گیا۔
سلطان عبدالحمید، تُرکی کی دعوت پر ۱۳۰۱ھ میں مولانا رحمت اللہ، کیرانوی نے
قسطنطنیہ کا دوسرا سفر کیا اور وہاں، شاہی مہمان کی حیثیت سے قیام کیا۔
اُمَرا وحُکّام اور سلطان عبدالحمید سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔
اِسی سفر میں سلطان عبدالحمید نے آپ کو ’’**پایۂ حرمین**‘‘ کا خطاب دیا۔
۱۳۰۴ھ میں بھی سلطانِ تُرکی کی دعوت پر آپ نے قسطنطنیہ کا سفر کیا۔
اِعزاز واِکرام کے ساتھ، وہاں، قیام اور ملاقاتیں ہوئیں۔ سلطان عبدالحمید تُرکی نے
اس سفر ۱۳۰۴ھ میں آپ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ آپ یہیں تشریف رکھیں
اور واپس نہ جائیں۔ لیکن، آپ نے اسے منظور نہ کیا اور اس جواب کے ساتھ، واپس چلے آئے کہ:
**اَعِزَّہ وَ اَقارِب کو چھوڑ کر ترکِ وطن کر کے خدا کی پناہ میں اس کے دروازہ پر آکر پڑا ہوں۔
وہی لاج رکھنے والا ہے۔ آخری وقت میں امیرُ المؤمنین کے دروازے پر مَروں
تو قیامت کے دن کیا مُنہ دکھاؤں گا؟‘‘**
حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو موتیا بند کا عارضہ تھا۔
علاج کامیاب نہ ہوسکا اور ۱۳۰۵ھ میں آپ، قوتِ بصارت سے محروم ہوگئے۔
مدرسہ صولتیہ، مکہ مکرمہ کی دیکھ بھال اور دیگر مصروفیات کی وجہ سے ضعف وناتوانی بڑھتی چلی گئی۔
یہاں تک کہ ایک سال بیمار رہ کر پچھتر (۷۵) سال کی عمر میں بروز جمعہ بتاریخ ۲۲؍رمضان المبارک
۱۳۰۸ھ/مئی ۱۸۹۱ء مکہ مکرّمہ میں آپ کا انتقال ہوگیا اور جنت المعلی میں آپ کی تدفین ہوئی۔
آغازِ اَمر سے ہی حضرت حاجی امداداللہ، مہاجر مکی، چشتی صابری
مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے معاونِ وشریکِ کار رہے اور آپ کے انتقال کے بعد
حاجی صاحب نے مدرسہ صولتیہ کی مکمل سرپرستی کی اور اسے ترقی دینے کی کوشش کرتے رہے۔
مولانا محمد سعید بن مولانا محمد صدیق بن مولانا حکیم علی اکبر کو مولانا کیرانوی نے
بارہ (۱۲) سال کی عمر میں ہی ہندوستان سے مکہ مکرّمہ بلا کر اچھی دینی تعلیم دلائی تھی۔
یہ مولانا محمد سعید، مولانا کیرانوی کے بڑے بھائی، حکیم علی اکبر کے پوتے تھے۔
انھوں نے مولانا کیرانوی اور حاجی صاحب کی صحبت وتربیت سے کافی فیض اٹھایا تھا۔
مولانا کیرانوی کے انتقال کے بعد، حاجی امداداللہ صاحب کے برادرزادہ، حافظ احمد حسین
امینُ الحجاز کو مدرسہ صولتیہ کے حساب کا نگراں اور مولانا محمد سعید کو مدرسہ کا ناظم بنایا گیا۔

جس کو انھوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا۔ مولانا محمد سعید کا انتقال ۱۳۵۷ھ میں ہوا۔
مولانا رحمت اللہ، کیرانوی کی تصانیف کے نام، یہ ہیں:
اِزَالَۃُ الْاَوْهَام، اِزَالَۃُ الشُّکُوک، اِعجازِ عیسوی، اَحسنُ
الْاَحادیث فی اِبْطالِ التَّثلیث، بُروقِ لامعه، اَلْبَحثُ الشَّریف
فِی اِثباتِ النَّسخ وَالتَّحریف، معدلُ اِعوجاجِ الْمِیزان
تَقلیبُ الْمَطاعِن، مِعیارُ التَّحقیق، اِظهارُ الحق، آدابُ الْمُریدین۔
مولانا شاہ ابوالحسن زید، فاروقی، مجدّدی، دہلوی (متوفی دسمبر ۱۹۹۳ء) لکھتے ہیں:
’’حضرت مولانا عبدالحق، الٰہ آبادی، مہاجر مکہ وشیخ الدّلائل نے
"اَلدُّرُّ الْمُنَظَّم فِی بیانِ حُکمِ مَولِدِ النَّبیِّ الْمُعَظَّم" اپنے پیرومُرشد، محدّثِ دارالھجرہ
حضرت شاہ عبدالغنی، مجدّدی قَدَّسَ اللّٰهُ اَسرارَهُما کے اشارے، بلکہ امر پر لکھی ہے۔
صفحہ ۱۱۳ پر لکھا ہے کہ:
۱۲۸۷ھ میں مسجدِ نبوی میں بارہ ربیع الاول، روز یکشنبہ کو، یہ مبارک محفل، منعقد ہوئی۔
اور آپ اس میں شریک ہوئے اور پھر آپ نے قیام کیا۔
اور صفحہ ۱۱۴ پر لکھا ہے کہ:
’’بہ تصریح تمام فرمودہ بودند وبرائے اِبلاغ ایں امر، تاکید تمام فرمودہ بودند۔
چنانچہ، ایں اُمرا، حسبِ فرمودۂ حضرت ایشاں، بنابر خیرخواہیِ برادرانِ مسلمین
بحیطۂ تقریر وتحریر آورد۔ وَبِاللّٰهِ التَّوفیق۔ وَ اللّٰهُ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعالیٰ اَعْلَمُ وَ عِلْمُهٗ اَتَم۔‘‘
اِس مبارک کتاب پر، آٹھ حضرات نے تقریظیں لکھی ہیں۔
جنابِ مؤلّف رَحِمَہُ اللّٰہُ نے جس ترتیب اور جن الفاظ سے مُقرِّظین کے نام
اور ان کی عبارات کو لکھا ہے، یہ عاجز، اس کو نقل کرتا ہے:
(۱) **تقریظ**:۔ عُمدۃُ العُلَماء، زُبدۃُ العُرَفاء، حضرت مرشدنا ومولانا شاہ
ابوالخیر، فاروقی، نقشبندی، مجدّدی، نَفَعَنَا اللّٰهُ بِطُولِ بَقاءِہ۔
(۲) **تقریظ**:۔ عُمدۃُ الواصِلین، زُبدۃُ المقرَّبین، حضرت مولانا شاہ حاجی امدادُاللہ صاحب
فاروقی، چشتی، مہاجر مکۂ معظّمہ۔
(۳) **تقریظ**:۔ جناب مولوی محمد رحمتُ اللہ صاحب، مہاجر مکہ معظّمہ۔
(اِلیٰ آخِرِہٖ۔ ص ۵۳۲۔ **مقاماتِ خیر**۔ از ابوالحسن زید، فارقی۔ درگاہِ حضرت شاہ ابوالخیر، دہلی۔
طبعِ دوم۔ ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء۔ طبعِ اول۔ ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء)

۱۳۰۶ھ میں علمِ رسول، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیهِ وَسَلَّم کے موضوع پر حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری، ہاشمی (متوفی ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء) اور مولانا خلیل احمد، انبیٹھوی، سہارن پوری (متولد صفر ۱۲۶۹ھ۔ متوفی ربیع الآخر ۱۳۴۶ھ) خلیفۂ مولانا رشید احمد، گنگوہی (متوفی ۱۳۲۲ھ) کے درمیان ہونے والے مباحثۂ بھاول پور، پنجاب کی مطبوعہ تفصیلی روداد

بنام ''تَقۡدِیسُ الۡوَکِیل عَنۡ تَوهِینِ الرَّشِیدِ وَ الۡخَلِیل'' پر

مذہب و مسلکِ اہلِ سُنَّت کے اِثبات اور مولانا غلام دستگیر، قصوری کی تائید و حمایت میں

حضرت مولانا رحمتُ اللہ، کیرانوی کی تحریری تصدیق و تقریظ اور مولانا عبد السمیع بیدِل، رام پوری

سہارن پوری (متوفی ۱۳۱۸ھ۔ شاگرد مفتی صدرُ الدین، آزردہ، دہلوی و مولانا رحمتُ اللہ کیرانوی و خلیفۂ حاجی امداد اللہ، مہاجر مکی) کی مشہور کتاب

''انوارِ ساطعه در بیانِ مولود و فاتحه'' طبعِ دوم ۱۳۰۷ھ پر بھی

مولانا رحمتُ اللہ، کیرانوی کی تحریری تصدیق و تائید، مطبوع و موجود ہے۔

۱۳۰۲ھ میں میرٹھ سے ایک فتویٰ، چار ورقی، پھر، چوبیس ورقی، شائع ہوا تھا۔

جس میں بعض جدیدُ المسلک عُلمائے دہلی و سہارن پور نے

متعدد معمولاتِ سَوادِ اعظم اہلِ سنَّت و جماعت کو بدعت و ممنوع و ناجائز، قرار دیا تھا۔

مولانا رحمت اللہ، کیرانوی کے شاگرد، مولانا عبد السمیع بیدِل، رام پوری، سہارن پوری (وصال ۱۳۱۸ھ) خلیفۂ حاجی امدادُ اللہ، مہاجر مکی (وصال ۱۳۱۷ھ) نے

۱۳۰۲ھ ہی میں **''انوارِ ساطعه در بیانِ مولود و فاتحه''** کے نام سے اس فتویٰ کا تفصیلی و تحقیقی جواب لکھا۔ جس کا جواب ۱۳۰۴ھ میں مولانا خلیل احمد، انبیٹھوی، سہارن پوری (متوفی ۱۳۴۶ھ) نے ''براہین قاطعه'' کے نام سے تحریر کیا۔ اور مولانا رشید احمد، گنگوہی (متوفی ۱۳۲۲ھ) کی

تصدیق و تائید کے ساتھ، براہین قاطعه کی اِشاعت ہوئی۔

مولانا عبد السمیع بیدِل، رام پوری، سہارن پوری نے ۱۳۰۶ھ و ۱۳۰۷ھ میں

اپنی کتاب **انوارِ ساطعه** پر نظرِ ثانی کر کے اسے مزید مفید و جامع بنا دیا۔

جو بہت سے عُلمائے عرب و عجم کی تصدیق و تائید کے ساتھ، شائع ہوئی۔

حضرت مولانا رحمت اللہ، کیرانوی نے انوارِ ساطعه کی تصدیق و تقریظ میں تحریر فرمایا ہے کہ:

''اِس رسالہ کو میں نے اول سے آخر تک، اچھی طرح سُنا۔ اسلوبِ عجیب و طرزِ غریب بہت ہی پسند آیا۔ اگر، اِس کے وصف میں کچھ لکھوں، تو لوگ، اسے مبالغہ پر حمل کریں گے۔

اِس لئے اسے چھوڑ کر، دعا پر، اِکتفا کرتا ہوں کہ:

خدا تعالیٰ، اس کے مصنف کو اجرِ جمیل اور ثوابِ جزیل، عطا فرمائے۔

اور اس رسالہ سے مُنکِروں کے تعصُّبِ بے جا کو توڑ کر، ان کو راہِ راست پر لا دے۔

اور مصنف کے علم اور فیض اور تندرستی میں برکت بخشے۔

میرے اساتذۂ کرام کا اور میرا عقیدہ، مولد شریف کے باب میں قدیم سے یہی تھا اور یہی ہے۔ بلکہ بحلف، سچ سچ، ظاہر کرتا ہوں کہ میرا اِرادہ، یہ ہے کہ ع

بریں زیستم، ہم بریں بہ گذرم

اور عقیدہ، یہ ہے کہ:

اِنعقادِ مجلسِ میلاد، بشرطے کہ منکرات سے خالی ہو، جیسے تغنّی اور باجہ اور کثرت سے روشنیِ بے ہودہ نہ ہو، بلکہ روایاتِ صحیحہ کے موافق، ذکرِ معجزات اور ذکرِ ولادتِ حضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡهِ وَسَلَّم سے کیا جاوے اور بعد اس کے، اگر طعام پختہ، یا شیرینی بھی تقسیم کی جاوے، اس میں کچھ حرج نہیں۔

بلکہ اس زمانہ میں، جو، ہر طرف سے پادریوں کا شور اور بازاروں میں حضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡهِ وَسَلَّم اور ان کے دین کی مذمَّت کرتے ہیں اور دوسری طرف سے آریہ لوگ۔ خدا، ان کو ہدایت دے۔ جو، پادریوں کی طرح، بلکہ ان سے زیادہ شور مچا رہے ہیں، ایسی محفل کا اِنعقاد اُن شروط کے ساتھ، جو میں نے اوپر ذکر کیں، اِس وقت، فرضِ کفایہ ہے۔

میں مسلمان بھائیوں کو، بہ طور نصیحت کے، کہتا ہوں کہ:

ایسی مجلس کرنے سے نہ رُکیں اور اقوالِ بے جا، مُنکِروں کی طرف سے جو تعصُّب سے کہتے ہیں، ہرگز، اِلتفات، نہ کریں۔ اور تعیُّنِ یوم میں اگر یہ عقیدہ نہ ہو کہ:

اس دن کے سِوا اور دن، جائز نہیں، تو کچھ حرج نہیں، اور جواز، اس کا، بخوبی، ثابت ہے۔

اور قیام، وقتِ ذکرِ میلاد کے چھ سو برس سے جمہور عُلمائے صالحین کے متکلّمین اور صوفیۂ صافیہ اور عُلمائے محدّثین نے جائز رکھا ہے۔

اور صاحبِ رسالہ نے اچھی طرح، ان امور کو ظاہر کیا ہے۔

اور تعجب ہے ان مُنکِروں سے ایسے بڑھے کہ:

فاکِهانی مَغربی کے مقلِّد ہو کر جمہور سَلفِ صالح کو متکلّمین اور محدِّثین اور صوفیہ سے ایک ہی لڑی میں پرو دیا۔ اور ان کو ضال اور مُضِل بتایا۔

اور خدا سے نہ ڈرے کہ اس میں ان لوگوں کے استاذ اور پیر بھی تھے۔ مثل حضرت شاہ عبد الرحیم، دہلوی اور ان کے صاحب زادے، شاہ ولی اللہ، دہلوی، اور ان کے صاحب زادے، شاہ رفیع الدین، دہلوی، اور ان کے بھائی، شاہ عبد العزیز، دہلوی، اور ان کے نواسے

حضرت مولانا محمد اسحٰق، دہلوی۔ قَدَّسَ اللّٰہُ اَسۡرَارُھم۔

سب کے سب، انہیں ضال مُضِل میں داخل ہوئے جاتے ہیں۔

اُف! ایسی تیزی پر کہ جس کے موافق (مطابق) جمہور متکلّمین اور محدّثین اور صوفیہ سے حرمین اور مصر اور شام اور یمن اور دیارِ عجمیہ میں لاکھوں، گمراہی میں ہوں اور، یہ چند حضرات، ہدایت پر۔

یَااَللّٰہ! ہمیں اور ان کو ہدایت کر، اور سیدھے رستہ پر چلا۔ آمِیۡن ثُمَّ آمِیۡن۔

........اور جو میرے ان اقوال کی تائید اور سند، مؤلِّفِ رسالہ نے جابجا، تحریر فرمائی ہے اسی پر، اِکتفا کرتا ہوں۔ وَاللّٰہُ اَعۡلَم وَعِلمہٗ اَتَم۔ فقط۔

اَمَرَ بِرَقۡمِہٖ وَقَالَ بِفَمِہٖ اَلرَّاجی رَحمۃَ ربِّہٖ الۡمَنَّان

محمد رحمت اللّٰہ بن خلیل الرَّحمٰن ، غَفَرَلَھُمَااللّٰہُ الۡحَنَّان۔

(**انوارِ ساطعہ در بیانِ مولود و فاتحہ**، مؤلِّفہ: مولانا عبدالسمیع، بیدلؔ رام پوری، سہارن پوری

(طبعِ دوم ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۸ء) وص: ۴۲۰ تا ۴۲۲۔ مطبوعہ: باہتمام طلبۂ درجۂ فضیلت (۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء)

الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور۔ ضلع اعظم گڑھ، یوپی۔ ۲۰۰۷ء۔ ورضا اکیڈمی بمبئی۔ ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۸ء)

حاجی امداد اللّٰہ، مہاجرِ مکی، چشتی، صابری (وصال ۱۳۱۷ھ) نے بھی اپنی مختلف تحریرات کے ذریعہ ''انوارِ ساطعہ'' کی تصدیق و تائید کی ہے۔ یہ تحریریں، انوارِ ساطعہ، طبعِ قدیم اور مطبوعہ مبارک پور و بمبئی میں از ص: ۴۲۲ تا ۴۲۵، منقول و مطبوع ہیں۔

اِسی طرح ''**تَقۡدِیسُ الوَکِیل عَنۡ تَوھِینِ الرَّشید وَالۡخَلِیل**'' مؤلَّفہ: حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری، لاہوری (وصال ۱۳۱۵ھ) جو براہینِ قاطعہ کی عبارتوں کے نتیجے میں ہونے والے مناظرۂ بھاول پور، پنجاب، در ۱۳۰۶ھ کی روداد پر مشتمل ہے، اس کی تصدیق کرتے ہوئے

مولانا رحمت اللّٰہ کیرانوی، تحریر فرماتے ہیں:

''بعد حمد اور نعت کے کہتا ہے: **رَاجِی رَحۡمَۃ ربِّہٖ الۡمَنَّان رَحۡمۃُ اللّٰہ بن خلیل الرَّحمٰن غَفَرَلَھُمَا الۡحَنَّان** کہ:

مدت سے بعض باتیں، جناب مولوی رشید احمد صاحب کی سنتا تھا۔

جو میرے نزدیک اچھی نہ تھیں، اعتبار نہ کرتا تھا کہ انہوں نے ایسا کہا ہوگا۔

اور مولوی عبدالسمیع صاحب کو، جو، اُن کو میرے سے رابطہ، شاگردی کا ہے

جب تک مکہ معظّمہ میں نہیں آئے تھے، تحریراً، منع کرتا تھا اور مکہ معظّمہ میں آنے کے بعد تقریراً بہت تاکید بِالمشافہۃ منع کرتا تھا کہ آپس میں مختلف، نہ ہوں۔

.........عُلمائے مدرسہ، دیوبند کی تحریر اور تقریر، بتواتُر، مجھ تک پہنچی کہ:

تمام افسوس سے کچھ کہنا پڑا۔ اور چُپ رہنا، خلافِ مصلحت سمجھا گیا۔ سو، کہتا ہوں کہ:

''مَیں، جناب مولوی رشید کو رشید سمجھتا تھا، مگر میرے گمان کے خلاف کچھ اور ہی نکلے''

جس طرف آئے، اُس طرف ایسا تعصُّب برتا کہ:

اُس میں ان کی تقریر اور تحریر دیکھنے سے رد مٹا کھڑا ہوتا ہے۔

حضرت (مولوی رشید احمد) نے، اول، قلم اِس پر اٹھایا کہ:

جس مسجد میں جماعت ہوئی ہو، اُس میں دوسری جماعت، جائز نہیں۔

گو، بغیر اذان اور تکبیر کے ہو اور دوسری جگہ ہو، جائز نہیں۔

آپ کا اور آپ کے متبعین کا، وہ حکم تو نہ تھا

جو، نجدیوں کا وقت، حکومتِ مکہ معظّمہ کے تھا کہ جو جماعتِ اول میں حاضر، نہ ہو، اُس کو سزا دیتے تھے۔

سو، آپ کا اور آپ کے متبعین کا ایسا حکم، جاہلوں کے واسطے، مَنَّ وسَلویٰ ہو گیا کہ:

سب موسموں میں، خاص کر شدتِ گرمی کے موسم میں، عُذر ہاتھ لگ گیا کہ:

عُذر کے سبب، اب تو جماعت، فوت ہو گئی ہے، دوسری جماعت، جائز نہیں۔

دوکان اور گھر چھوڑ کر کس واسطے، مسجد میں جاویں؟

...............پھر، حضرت مولوی رشید احمد

رَسُول اللّٰہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّم کے نواسے کی طرف، متوجہ ہوئے

اور ان کی شہادت کے بیان کو بڑی شدت سے محرم کے دنوں میں

گو، کیسا ہی روایتِ صحیح سے ہو، منع فرمایا۔

حالاں کہ حضرت شاہ ولی اللّٰہ صاحب سے جناب مولانا اسحٰق مرحوم تک، عادت تھی کہ:

عاشورہ کے دن، بادشاہِ دہلی کے پاس جا کر، روایتِ صحیح سے بیانِ شہادت کرتے تھے۔

یہ سب، ان (کے) مشائخِ کرام و اساتذۂ عِظام میں ہیں۔

سو، آپ کے تشدُّد کے موافق (مطابق) ان مشائخِ کرام وَاساتذۂ عِظام کا جو حال ہے، وہ ظاہر ہے۔

اور میرے نزدیک، اگر، روایاتِ صحیحہ سے حال، شہادت کا بیان ہو، تو فائدہ سے خالی نہیں۔

......پھر، حضرت رشید نے، جو، نواسے کی طرف، توجہ کی تھی، اس پر بھی اِکتفا، نہ کر کے خود، ذاتِ نبوی، **صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلیٰ اِخۡوَانِہٖ وَآلِہٖ وَاَصۡحابِہٖ وسَلَّم** کی طرف، توجہ کی۔

پہلے، مولود کو ''کنھیّا کا جنم اشٹمی'' ٹھہرایا اور اس کے بیان کو حرام بتلایا۔

اور کھڑے ہونے کو، گو، کوئی کیسے ہی ذوق و شوق میں ہو، بہت بڑا مُنکر فرمایا۔

اِس ٹھہرانے، بتلانے، فرمانے سے لکھوکھا عُلَمائے صالحین
اور مشائخ مقبولِ ربّ العالمین، ان کے نزدیک، بُرے نفرتی ٹھہر گئے۔
پھر، ذاتِ نبوی میں اِس پر بھی اِکتفا، نہ کرکے اور اِمکانِ ذاتی سے تجاوز کرکے
چھ خاتم النبیین، بِالفعل، ثابت کر بیٹھے۔
اور اِمکانِ ذاتی کے باعتبار تو کوئی حد ہی، نہ رہی۔
اور ان کا مرتبہ، کچھ بڑے بھائی سے بڑا، نہ رہا۔
اور بڑی کوشش، اِس میں کی کہ:
حضرت (محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّم) کا علم
شیطانِ لعین کے علم سے کہیں کم تر ہے۔ اور اس عقیدہ کے خلاف کو، شرک فرمایا۔
پھر، اس توجہ پر، جو ذاتِ اقدسِ نبوی کی طرف تھی، اِکتفا، نہ کیا۔
ذاتِ اَقدسِ الٰہی کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور جنابِ باری تعالیٰ کے حق میں دعویٰ کیا کہ:
اللہ کا جھوٹ بولنا، ممتنع بِالذّات نہیں۔ بلکہ اِمکان، جھوٹ بولنے کو، اللہ کی بڑی صفت کمال کی
فرمائی (اللہ کا بڑا وصف، کمال کا، فرمایا)۔ نَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ ھٰذِہِ الۡخُرَافات۔
میں اِن اُمورِ مذکورہ کو ظاہر اور باطن میں بہت بُرا سمجھتا ہوں۔
اور اپنے مُحِبین کو منع کرتا ہوں کہ:
حضرت مولوی رشید کے، اور ان کے چیلے چانٹوں کے ایسے ارشادات، نہ سُنیں۔
اور میں جانتا ہوں کہ مجھ پر بہت کھلم کھلا، تبرّا ہوگا۔
لیکن، جب جمہور عُلَمائے صالحین اور اولیائے کاملین اور رسولِ ربّ العالمین
اور جنابِ باری جہاں آفریں، اُن کی زبان اور قلم سے نہ چھوٹے، تو مجھے کیا شکایت ہوگی؟
........بعض جگہ، بعض چیزوں میں مشہور ہیں۔
جیسے میری بستی کرانہ اور نانوتہ، جس کے رہنے والے، مولوی قاسم اور مولوی یعقوب وغیرھُمَا تھے
نحوست میں مشہور ہے کہ: عوام، صبح کو، ان کا نام بھی نہیں لیتے۔
کرانہ کو بیر پوں والا شہر، اور نانوتہ کو چھوٹا شہر کہتے ہیں۔ اور کرسی اور کاندھلہ
اور انبیٹھ، جو حمق میں مشہور ہیں، اور ان بستیوں کے اَہالی میں کچھ نہ کچھ، تاثر ہوتے ہیں۔
میری بستی کی تاثیر، میرے میں یہ ہوئی کہ: ایسا زمانہ نحوست دیکھا۔
اَللّٰہ تعالیٰ، مولوی خلیل احمد کو، ان کی بستی کے خواص سے بچاوے۔
اور حضرت مولوی غلام دستگیر صاحب کو، اُن کے رَد میں جزائے خیر، عطا فرمائے۔

آمین ثُمَّ آمین۔
اَلۡعَبد محمد رَحمةُ اللّٰه بن خليل الرَّحمٰن، غَفَرَلَهُمَا الۡمَنَّان۔
۱۵/ ذوالقعدہ ۱۳۰۷ھ۔ از مکہ معظّمہ۔
(ص ۴۱۵ تا ص ۴۲۲۔ تَقۡدِیسُ الۡوَکیل عَنۡ تَوهِین الرَّشیدِ وَالۡخَلیل۔
مؤلّفہ: مولانا غلام دستگیر قصوری، لاہوری، ہاشمی۔ مطبوعہ: نوری کتب خانہ بالمقابل ریلوے اسٹیشن، لاہور، پاکستان)
مولانا غلام دستگیر قصوری کے ایک خلاصۂ تحریر، مشتمل بر اِنکار و تردیدِ مسلکِ جدید
وتائیدِ مذہبِ قدیم کی، ربیع الاول ۱۳۰۸ھ میں مکہ معظّمہ کے اندر، تصدیق وتائید کرتے ہوئے
حضرت حاجی امداداللہ، مہاجرِ مکی (وصال ۱۳۱۷ھ) نے تحریر فرمایا:
''تحریر بالا، صحیح اور درست ہے اور مطابق، اعتقادِ فقیر کے ہے۔
اللہ تعالیٰ، اس کے کاتب کو جزائے خیر دے۔'' (ص: ۴۴۴۔ تقدیس الوکیل، مطبوعہ: لاہور)
۱۳۰۷ھ میں عارف بِاللہ، حضرت سید مہر علی شاہ، چشتی (گولڑہ شریف ضلع راول پنڈی
پنجاب۔ متولد یکم رمضان ۱۲۷۵ھ/ ۱۴/ اپریل ۱۸۵۹ء۔ متوفی ۲۹/ صفر ۱۳۵۶ھ/ ۱۱ مئی ۱۹۳۷ء)
اپنے سفرِ حج و زیارت کے موقع پر، مدرسہ صولتیہ، مکہ مکرمہ میں قیام پذیر تھے۔
اَثنائے قیام، دو موضوعات پر مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور سید مہر علی شاہ چشتی
شاگردِ مفتی لطف اللہ، علی گڑھی، شاگردِ مفتی عنایت احمد، کاکوروی کے درمیان
جو ایمان افروز گفتگو ہوئی، وہ، اِس طرح ہے:
مولانا رحمت اللہ، کیرانوی نے حضرت سید مہر علی شاہ سے سوال کیا کہ:
نبیِ کریم، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّم ارشاد فرماتے ہیں:
میں نے حضرت عیسیٰ عَلَیۡہِ السَّلام اور دجّال کو طواف کرتے دیکھا۔
جو دونوں، دو آدمیوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر، طواف کر رہے تھے۔
لیکن، ایک دوسری حدیث میں ہے کہ دجّال، کعبہ شریف میں داخل نہیں ہو سکے گا۔
عُلَما نے اس کی مختلف تاویلیں کی ہیں، لیکن، کسی تاویل سے تسلی نہیں ہوئی۔
آپ کے نزدیک، اِن دونوں احادیث میں مطابقت کی کیا صورت ہے؟
اِس سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت سید مہر علی شاہ نے ارشاد فرمایا:
پہلی حدیث میں لفظ یَطُوۡفُ آیا ہے۔ کعبہ شریف کا ذکر نہیں ہے۔
ہر شخص، باری تعالیٰ عَزَّ اِسۡمُهٗ کے کسی نہ کسی اسمِ صفاتی کا مظہر ہوتا ہے۔
اور دو دیگر اَسما، اِس اِسم کے معاون اور ماتحت ہوتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلام، اسمِ ھادِی کے مظہر ہیں۔
اور اس اِسم کے دو معاون اَسما کی معاونت سے، اس اسم کا طواف کر رہے ہیں۔
اور دَجّال، اسمِ مُضِل کا مظہر اور اس اسم کے ماتحت اَسما کی مدد سے، اس اسم کا طواف کر رہا ہے۔
حضرت سید مہر علی شاہ کی، اس تاویل کا ماخذ ''**فتوحاتِ مکّیہ**'' ہے۔
مولانا کیرانوی کو، یہ وضاحت، بہت پسند آئی۔
حدیث کا مطلب، یہ ہے کہ:
رسولِ اکرم، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مشاہدہ فرمایا کہ:
عیسیٰ بن مریم اور دَجّال، دونوں اپنے اپنے بیت اللہ اَسمائی کا طواف کر رہے ہیں۔
ایک، یَھْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ کے اظہار میں۔
اور دوسرا، یُضِلُّ مَنْ یَشَاءُ کے اسباب میں سرگرم و کمر بستہ ہے۔
ہادی اور مُضِل کا موصوف، چوں کہ ذاتِ واحدہ ہے
لِھٰذا، عالمِ رُؤیا میں رسولِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو ایک ہی بیت اللہ مشہود ہوا۔
دوسری حدیث میں دَجّال کی عدمِ رسائیِ بیت اللہ کا ذکر ہے۔ وہ بھی، صحیح ہے۔
ہمارا ایمان ہے کہ:
حسبِ ارشادِ نبوی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم
دجّال کو، عالمِ شہادت میں بیت اللہ تک، رسائی، نہ ہوگی۔
ندائے یارسول اللہ کے تعلق سے مولانا کیرانوی کے اِستفسار پر حضرت سید مہر علی شاہ نے فرمایا:
بخاری شریف میں متفق علیہ حدیث ہے کہ:
نکیرین، مُردہ سے چند سوالات کرتے ہیں۔ جن میں ایک سوال یہ ہوتا ہے:
مَاکُنْتَ تَقُوْلُ فِی ھذا الرَّجُلِ لِمُحَمَّدٍ۔
(تم، اس شخص، محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بارے میں کیا اعتقاد رکھتے تھے؟)
ھٰذا، موضوع ہے، محسوس مُبصر قریب کے لئے۔
اور اَلرَّجُل، موضوع ہے، مذکر مفرد کے لئے جو بنی آدم سے ہو۔
لِھٰذا، وہاں، قبر میں محسوس مبصر قریب، مَرد کا ہونا، ضروری ہے۔
اور وہ خود، آں حضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذاتِ گرامی ہے۔ کیوں کہ:
جب تک کسی لفظ کے وضعی معنیٰ ہو سکیں، غیر وضعی معنی، مراد لینا، خلافِ اصل ہے۔
اور جب ایک ہی وقت میں کثیرُ التَّعداد مخلوق، مرتی ہے اور حسبِ مضمونِ حدیثِ مذکور

ہر جگہ، رسولِ پاک، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا، بیک وقت، موجود ہونا، ثابت ہُوا۔
تو، کیا بعید ہے کہ روئے زمین پر، ہر جگہ آپ، حاضر ہوں؟
اِس تقریر کا، یہ اثر ہوا کہ حضرت حاجی رحمت اللہ صاحب گرویدہ ہو گئے اور فرمایا کہ:
یہ تو علمِ لَدُنی ہے۔ ہم، سالہا سال سے بخاری شریف کی یہ حدیث، درس میں پڑھا رہے ہیں
لیکن، اِن معانی کی طرف، کبھی، ذہن ہی نہیں گیا، جو آپ نے اِستنباط کیے ہیں۔
حضرت حاجی رحمت اللہ صاحب چوں کہ ایک محقق اور منصف مزاج عالم تھے، اِس لئے شرعی دلیل
سے ندائے غائبانہ کی معقول وجہ، سمجھ میں آجانے پر فوراً اپنے سابقہ مسلک کو تبدیل فرمالیا۔''
(ص ۱۱۹۔ **مہرِ منیر**۔ مرتّبہ: مولانا فیض احمد۔ مطبوعہ: لاہور و دہلی)
۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء میں جب، میاں جی نذیر حسین، بہاری، دہلوی (متوفی رجب ۱۳۲۰ھ/اکتوبر ۱۹۰۲ء)
نے حج کیا، تو ہندوستان اور حجاز کے عُلَمائے اَحناف نے، ان کے اِعتزال و توہُّب کو سخت نشانہ بنایا۔
اور مکہ مکرَّمہ میں ان سے عثمان نوری پاشا، گورنر مکہ مکرمہ نے سوال و جواب بھی کیا۔
جس کی تفصیل ''**الحیاۃ بعد المماۃ**'' مؤلّفہ: مولانا فضلِ حسین، بہاری (شاگردِ مولانا نذیر حسین
دہلوی) اور ''**اہلِ حدیث اور سیاست**۔ مؤلّفہ: مولانا نذیر رحمانی میں مذکور ہے۔
مولانا نذیر احمد، رحمانی (غیر مقلّد عالم) لکھتے ہیں کہ:
''اِس سلسلے میں عُلَمائے اَحناف نے میاں جی نذیر حسین سے باز پُرس
اور ان کے تعاقب کے لئے، جو کمیٹی تشکیل دی تھی، اُس کے ارکان میں:
حاجی امداد اللہ، مہاجر مکی، مولانا خیرُ الدّین، دہلوی (مولانا ابوالکلام آزاد کے والد)
مولانا عبد القادر، بدایونی (مولانا فضلِ رسول، عثمانی، بدایونی کے فرزند و خلیفہ) اور دیگر حضرات تھے۔
اِس کمیٹی کے صدر، مولانا رحمتُ اللہ، کیرانوی تھے۔
(دیکھیے ص ۳۲۹۔ **اہلِ حدیث اور سیاست**۔ مؤلّفہ: نذیر احمد، رحمانی۔ اِدارۃُ البحوث الاسلامیہ۔
جامعہ سلفیہ، بنارس۔ اِشاعتِ سوم۔ ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء)
انقلابِ ۱۸۵۷ء میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی عملی شرکت سے متعلق
ایک دستاویز (جس کا کچھ ذکر گذر چکا ہے) یہ ہے کہ:
آپ نے ایک دَستہ کے ساتھ، انگریزوں سے جنگ کی۔
جس کی شہادت دیتے ہوئے سرکاری مُخبِر، عبداللّطیف اپنے روزنامچہ میں لکھتا ہے:
''۶/ ذو القعدہ۔ ۳۰/ جون...... کچھ دن چڑھے نصیر آباد کے لشکر نے ڈٹ کر مقابلہ کیا
اور سپہ گری کا حق ادا کر دیا۔ لیکن، شکست کھائی۔

اور آج ہی، دن ڈَھلے، دوسو اہلِ نجیب آباد، مولوی رحمت اللہ کیرانوی کی قیادت میں پہنچے اور آمادۂ پیکار ہوئے۔ لیکن (پھر) واپسی، اختیار کی۔

(ترجمہ از فارسی: ص ۱۴۲۔ ''**۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ**''۔ مرتّبہ: پروفیسر خلیق احمد نظامی۔
شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ ندوۃُ المصنّفین، اردو بازار، دہلی۔ ۱۹۷۱ء)

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں (مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے) نمایاں حصہ لیا۔
نَواحِ کیرانہ میں جماعتِ مجاہدین کے سردار تھے۔ مولوی ذکاءاللہ نے لکھا ہے:
''مولوی رحمت اللہ، اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے؟
وہ بڑے عالم، فاضل تھے۔ عیسائی مذہب کے رَد میں صاحبِ تصانیف تھے۔
وہ قلعہ کے پاس، مولوی محمد حیات کی مسجد میں اُترے۔ اِس دانش مند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت، نہ تھی، بلکہ ایک ہنگامۂ فساد برپا تھا۔''
جب ہنگامۂ دار و گیر شروع ہوا، تو مولانا کسی صورت سے نکل کر حجاز پہنچ گئے۔
اور وہیں ۲؍مئی ۱۸۹۱ء کو وصال ہوا۔''

(ص ۱۹۲۔ ''**۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ**''۔ مؤلّفہ: پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ مطبوعہ: دہلی)

انقلابِ ۱۸۵۷ء شروع ہوا، تو مولانا کیرانوی کی گرفتاری کا اِشتہار، شایع ہوا۔
کسی طرح، بچتے بچاتے، مکہ مکرّمہ پہنچے۔ وہاں، مدرسہ صولتیہ قائم کر کے علمی و دینی خدمت میں مصروف رہے اور پوری زندگی، یہ خدمت انجام دیتے ہوئے مکہ مکرّمہ ہی میں آپ کا وصال بھی ہوا۔
۲۴؍رمضان ۱۳۰۸ھ/ ۲؍مئی ۱۸۹۱ء میں وصال ہوا۔ اور جنّتُ المعلیٰ، مکہ مکرّمہ میں آپ کی تدفین ہوئی۔ **رَحِمَهُ اللّٰهُ تعالیٰ رَحْمَةً وَاسِعَةً**۔

○○○

فاضلِ توریت وانجیل و مجاہدِ انقلاب
مولانا ڈاکٹر وزیر علی خاں، اکبر آبادی

مولانا ڈاکٹر وزیر علی خاں، بہاری ثُمَّ اکبر آبادی (متوفی ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۳ء)
سرزمینِ بہار سے آگرہ آکر، آباد ہوئے تھے۔
ان کے والد، محمد نذیر خاں نے انھیں ابتدائی تعلیم کے بعد، مُرشد آباد (بنگال) بھیج کر انھیں انگریزی تعلیم دلائی اور اس کے بعد انگلینڈ بھیج دیا۔
مولانا وزیر خاں نے انگلینڈ میں ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم، حاصل کی۔
چوں کہ آپ کا ذوق، علمی تھا، اِس لئے بڑی محنت سے آپ نے یونانی اور عِبرانی زبانیں بھی سیکھیں اور انجیل و توریت وغیرہ کا مع شروح و حواشی، عمیق مطالعہ کیا۔
ہندوستان، واپسی کے بعد، پہلے، کلکتہ کے بڑے اسپتال میں
حکومت کی جانب سے اسسٹنٹ سرجن، مقرّر رہوئے۔ اس کے بعد، آگرہ آئے۔
یہاں، مفتی انعام اللہ، گوپامئوی، وکیل صدر سے رَبط و ضَبط ہوا۔ مولانا سید احمدُ اللہ شاہ مدراسی نے آگرہ میں ''**مجلسِ عُلَما**'' بنائی تھی، جس کے اہم ممبر، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں بھی بن گئے اور جہادِ حُرِّیت کا جوش و جذبہ آپ کے اندر پیدا ہوا، جس نے رفتہ رفتہ ایک انقلابی شکل، اِختیار کر لی۔
مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبر آبادی (متوفی ۱۹۶۸ء) لکھتے ہیں:
''ڈاکٹر وزیر خاں صاحب کو، انگریز دشمنی اور حُرِّیت نوازی کا چسکا شاہ (احمدُ اللہ، مدراسی) صاحب کے فیضِ صحبت سے پڑا۔
شاہ صاحب، انگریزی حکومت کے خلاف، میدان، تیار کر رہے تھے۔

چنانچہ، جی فارسٹر اپنی تصنیف ''**اِنڈین میوٹنی**'' میں
مولانا احمدُ اللہ شاہ، مدراسی کے بارے میں لکھتا ہے:
''اَوَدھ کے باغیوں کی تجاویز اور سازش کی تحقیقات کی گئی، تو معلوم ہوا کہ:
اِس مولوی کو انگریز حکّام، بہ حیثیت، احمد شاہ فقیر اور صوفی
عرصہ سے جانتے تھے۔ شمالی مغربی صوبہ جات میں ظاہراً، مذہبی تبلیغ کی خاطر
پھر چکے تھے۔ لیکن، فرنگیوں کے لئے، یہ راز ہی رہا۔
اپنے سفر کے دَوران، ایک عرصہ تک، وہ آگرہ میں مقیم رہے۔
حیرت انگیز اثر، شہر کے مسلم باشندوں پر تھا۔
شہر کے مجسٹریٹ ان کی جُملہ نقل وحرکت پر نظر رکھتے تھے۔
عرصہ بعد، یقین ہوگیا کہ:
وہ، برطانوی حکومت کے خلاف، ایک سازش کر رہے تھے۔
لیکن، پھر بھی ان کو، باغیانہ جُرم میں ملوث، نہ پایا گیا۔ وہ آزاد، رہے۔''
غرض کہ شاہ صاحب نے علُما کی مجلس، جس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے قائم کی تھی
وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کو ختم کرنا تھا۔'' الخ۔
(ص ۸۱۔ ''**غدر کے چند علُما**''۔ مؤلّفہ: مفتی انتظام اللہ شہابی۔ مطبوعہ دینی بک ڈپو۔ اردو بازار، دہلی ۶)
انقلابِ ۱۸۵۷ء سے پہلے، ۱۸۵۴ء میں آگرہ کے اندر مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان
ایک تاریخی مناظرہ ہوا تھا، جس سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات، کافی بھڑک اٹھے تھے۔
پادری فنڈر نے علُما کو مناظرہ کا چیلنج دیا، جسے آپ کی تجویز پر ''**مجلسِ علُما**'' نے
منظور کیا اور اس مناظرہ میں مسلمانوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فتحِ مبین سے نوازا۔
مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبر آبادی (متوفی ۱۹۶۸ء) لکھتے ہیں:
''انگلستان سے بڑے بڑے علُمائے عیسویت، ہندوستان، روانہ کیے جاتے۔
قِسّیسِ اعظم، فنڈر، ۱۸۵۳ء میں ہندوستان آیا۔ گورنروں کے یہاں، قیام کرتا تھا۔
دلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اسلام کے خلاف، وعظ کہا کرتا تھا۔
یہ عربی فارسی کا بڑا عالم اور فنِ مناظرہ کا واقف کار ہی نہیں، بلکہ بڑا شاطر تھا.............
اس کو معلوم ہوا کہ صدر نظامت کی وجہ سے آگرہ، علُما کا مرکز بنا ہوا ہے۔

اس کو خیال ہوا کہ اگر، یہاں کے علُما کو مناظرہ میں شکست دے دی جائے
تو کثیر التعداد اہلِ اسلام، اپنے مذہب سے منحرف ہوکر، مشرف بہ عیسویت ہو جائیں گے۔
اس زعمِ باطل میں آگرہ آیا۔ اعلیٰ حُکّام کے یہاں مقیم ہوا، اور مشاہیر علُما کو، کھلا چیلنج دے دیا۔
''**مجلسِ علُما**'' میں مشورہ ہوا اور ڈاکٹر وزیر خاں نے پادری فنڈر کا چیلنج، منظور کرلیا۔
اور اپنے دوست، مولوی رحمت اللہ، کیرانوی کو، بلا بھیجا۔
وہ، بھی ڈاکٹر صاحب کی طرح، شوقیہ، مذہبِ عیسویت کا مطالعہ کیے ہوئے تھے۔
مولوی رحمت اللہ نے پادری فنڈر سے خط وکتابت کے ذریعہ، مناظرہ، شروع کر رکھا تھا۔
چنانچہ، مولوی صاحب آگرہ آئے۔'' (ص ۸۲۔ ''**غدر کے چند علُما**''۔ مطبوعہ: دہلی)
اپنے رسالہ ''**اَسبابِ بغاوتِ ہند**'' مطبوعہ ۱۸۵۸ء (مشمولہ ''حیاتِ جاوید''
مؤلّفہ: خواجہ الطاف حسین حالؔی۔ مطبوعہ: قومی کونسل برائے فروغِ اردو۔ نئی دہلی) میں
سرسید احمد خاں (متوفی ۱۳۱۵ھ/مارچ ۱۸۹۸ء) نے لکھا ہے کہ:
''حکومت نے، پادریوں کو اتنی چھوٹ، دے رکھی تھی کہ:
وہ، جگہ جگہ تقریریں کرتے تھے اور عیسائیت کی تبلیغ کے ساتھ
مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہب کے بارے میں سخت حملے اور دل آزار باتیں کیا کرتے تھے۔
مفت لٹریچر، تقسیم کرتے تھے اور انگریز حُکّام، لوگوں کو پادریوں کے وعظ وتقریر میں شرکت
کے لئے، بعض اوقات، مجبور کیا کرتے، جس سے ہندو اور مسلمان، ناراض ہوجایا کرتے تھے۔
مشنری اسکول کے امتحانات میں ہونے والے مذہبی سوالات کے جوابات
جو طلبہ، عیسائی مذہب کے مطابق، دیا کرتے، اُنھیں انعام دیا جاتا۔ وغیرہ وغیرہ۔
آگے، سرسید لکھتے ہیں:
یہ سب خرابیاں، لوگوں کے دلوں میں ہورہی تھیں کہ:
دفعۃً، ۱۸۵۴ء میں پادری، اے ایڈمنڈ نے دارُالامارت، کلکتہ سے
عموماً اور خصوصاً، سرکاری معزّز نوکروں کے پاس، چھٹیات بھیجیں۔ جن کا مطلب، یہ تھا کہ:
اب ''تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی۔ تار برقی سے سب جگہ، خبر ایک ہوگئی۔
ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد ورفت، ایک ہوگئی۔
مذہب بھی ایک چاہیے۔ اس لئے مناسب ہے کہ:

تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔''

میں سچ کہتا ہوں کہ ان چھٹیات کے آنے کے بعد، خوف کے مارے
سب کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ پانو تلے کی مٹی نکل گئی۔ سب کو یقین ہو گیا کہ:
ہندوستانی، جس وقت کے منتظر تھے، وہ وقت، اب آ گیا۔
اب جتنے سرکاری نوکر ہیں، اوّل سب کو، کِرِسْٹان ہونا پڑے گا اور پھر تمام رَعیّت کو۔
سب لوگ، بے شک سمجھتے تھے کہ:
یہ چھٹیاں، گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں۔'' الخ۔

(ص ۸۲۱ و ۸۲۲۔ ''**حیاتِ جاوید**''۔ مؤلّفہ: خواجہ الطاف حسین حالؔی۔
مطبوعہ: قومی کونسل برائے فروغِ اردو، نئی دہلی)

۱۸۵۴ء میں آگرہ کے اندر، پادری فنڈر سے مولانا رحمتُ اللہ، کیرانوی کی سرپرستی و نگرانی میں فیصلہ کن مناظرہ ہوا۔ مولانا ڈاکٹر وزیر خاں، اکبر آبادی، مسلمانوں کی طرف سے مناظرِ اول، اور مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی، ان کے خصوصی معاون تھے۔

ان کے علاوہ، معروف شخصیتوں میں مولانا مظفر علی شاہ جعفری قادری، مفتی اِکرام اللہ گوپاموی، مولانا غلام امام شہید، مولانا سراج الحق بن مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی، مولانا طفیل احمد، خیرآبادی، مولانا سراج الاسلام، امامِ جامع مسجد، اکبر آباد، وغیرہ، شریکِ مناظرہ تھے۔

سید سلیمان ندوی (متوفی ۱۹۵۳ء۔ کراچی) لکھتے ہیں:

''اور خصوصیت کے ساتھ، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمتُ اللہ، کیرانوی کا وجود، تو رَدِّ عیسائیت میں تائیدِ غیبی سے کم نہیں۔
اور کون، باور کر سکتا تھا کہ اس وقت:
پادری فنڈر کے مقابلے کے لئے ڈاکٹر وزیر خاں جیسا آدمی پیدا ہو گا۔
جو عیسائیوں کے تمام اَسرار کا واقف اور ان کی مذہبی تصانیف کا ماہر کامل
اور یونانی و عبرانی کا ایسا واقف، جو عیسائیوں کو، خود ان ہی کی تصنیفات سے ملزم ٹھہرائے گا۔
اور مولانا رحمتُ اللہ صاحب کے ساتھ، مل کر، اسلام کی حفاظت کا قلعہ، دَم کے دَم میں کھڑا کر دے گا۔'' (ص ۱۵، دیباچہ ''**حیاتِ شبلی**''، از سید سلیمان ندوی، مطبوعہ: دارُالمصنّفین، اعظم گڑھ)

کتاب اللہ کا تغیُّر و تبدُّل سے محفوظ رہنا، رسولِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّم کی رسالت

ثابت کرنا اور اِبطالِ تثلیث کے لئے تحریفِ انجیل کا ثبوت پیش کرنا، مسلم عُلَما کی ذِمّہ داری تھی۔

جب کہ پادری فنڈر اور اس کے حواریوں کے ذِمّہ، یہ ثابت کرنا تھا کہ:
موجودہ انجیل میں کوئی تحریف نہیں ہے۔ اور یہ، وہی صحیفۂ آسمانی ہے
جو حضرت عیسٰی **عَلَیْہِ السَّلام** پر، نازل ہوا تھا۔ اور عیسائیوں کا عقیدۂ تثلیث، برحق ہے۔
اس مناظرہ میں شکستِ فاش کے بعد، پادری فنڈر کو، صرف آگرہ نہیں
بلکہ ہندوستان سے فرار ہونا پڑا۔ پوری رودادِ مناظرۂ آگرہ، اسی دَور میں شایع ہو چکی ہے۔

مولانا ڈاکٹر وزیر خاں، بہاری، اکبر آبادی، انقلاب ۱۸۵۷ء کے نمایاں قائدین میں تھے۔
انہوں نے اور مولانا فیض احمد عثمانی، بدایونی نے آگرہ سے دہلی پہنچ کر
انقلاب میں سرگرمی کے ساتھ، حصہ لیا اور انقلابیوں کی ہدایت و قیادت کا فریضہ، انجام دیا۔

سرکاری مُخبِر، عبداللّطیف اپنے روزنامچہ میں لکھتا ہے:
۲۷ رشوال۔ ۲۱ رجون (۱۸۵۷ء)

''اکبر آباد کے چالاک ڈاکٹر، وزیر خاں کی طبیعت، شورش و فساد کی طرف، مائل ہوئی۔
آج انھوں نے فسادیوں کے ساتھ، اِشتعال انگیز نعرہ لگایا اور ایک آگ سی لگا دی۔''

(فارسی سے ترجمہ۔ ص ۱۳۹۔ ''**۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ**''۔ مرتّبہ: پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ مطبوعہ: دہلی)

مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبر آبادی، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:
''ڈاکٹر وزیر خاں، مَردانہ وار نکل آئے۔ آگرہ میں، جو فوج، فدائیوں کی آئی
اُس کی سرپرستی، ڈاکٹر صاحب نے کی۔ انگریز، قلعہ بند ہو گئے۔
یہ مولوی فیض احمد، بدایونی کو، ساتھ لے کر دہلی پہنچے۔ بہادر شاہ کا دربار جَما ہوا تھا۔
بریلی سے جنرل بخت خاں آ چکے تھے۔ ''**وار کونسل**'' بنی ہوئی تھی۔
مرزا مغل، خضر سلطان جواں بخت، مرزا عبداللہ، حکیم احسنُ اللہ خاں، نواب زینت محل
مفتی صدرُ الدین خاں، مولوی امام بخش، صہبائؔی، اس کے ارکان تھے۔
ڈاکٹر (وزیر خاں) بھی مجلسِ شوریٰ میں داخل کر لیے گئے۔ جنرل بخت خاں، لارڈ گورنر تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے ہمراہ لیا۔ مولوی فیض احمد، مرزا مغل کے پیشکار، مقرر ہوئے۔
جنرل (بخت خاں) صاحب نے انگریزی فوج کو، جہاں مقابلہ ہوا، شکست دی۔
مرزا مغل ایک معرکہ میں منہ کی کھا آئے۔ ادھر، مرزا الٰہی بخش نے مرزا مغل کو گانٹھ لیا تھا

اورخوف زدہ کر دیا تھا کہ جنرل، روہیلہ ہے۔نواب، غلام قادر خاں روہیلہ کے خاندان سے ہے۔
بہادر شاہ اورتمہارے پردے میں انگریزوں کو نکال کر، خود تخت نشین ہونا چاہتا ہے۔

مرزا مغل، کان کے کچے۔ دوست دشمن کو، نہ پہچان سکے۔

جنرل بخت خاں نے ایک مورچہ، خود سنبھالا۔

دوسرا مورچہ، کشمیری گیٹ کا، مرزا مغل کے سپرد کیا۔

مرزا نے وقت پر ہمت، ہاردی۔ جیتی ہوئی بازی، ہاتھ سے جاتی رہی۔

جنرل بخت نے، یہ رنگ دیکھ کر، ڈاکٹر وزیر خاں سے کہا:

''اپنی فوج کو علیحدہ کرلو اور اپنے ہم نوا، جو، ہوں، اُن کو ساتھ لو۔ یہ مغل بچے، انگریز سے ساز باز کر گئے۔ نتیجہ، یہ نظر آتا ہے کہ ہم سب، یہیں، کھیت ہو کے رہ جائیں گے۔''

مقبرۂ ہمایوں، جا کر، بادشاہ کی خدمت میں جنرل بخت خاں، باریاب ہوا۔

اور سب حال، عرض کیا۔ اور کہا کہ آپ میرے ساتھ چلیے۔

مگر، نواب، زینت محل نے بادشاہ کو، اس کی ہمراہی کے لئے آمادہ، نہ ہونے دیا۔

آخرش، جنرل صاحب، دلی سے روانہ ہوگئے۔ ان کے جاتے ہی مقبرۂ ہمایوں میں بہادر شاہ گرفتار کر لیے گئے۔'' الخ۔ (ص ۸۶ و ۸۷۔ ''غدر کے چند عُلَما''۔ مؤلّفہ: مفتی انتظام اللہ، شہابی۔ مطبوعہ: دہلی)

جنرل بخت خاں، روہیلہ، ڈاکٹر وزیر خاں، اکبر آبادی اور مولانا فیض احمد، بدایونی مع اپنی فوج کے، دہلی سے لکھنؤ چلے گئے اور وہاں، مولانا سید احمدُ اللہ شاہ، مدراسی سے مل کر ان کے پرچم کے نیچے، انگریزوں کے خلاف، مورچہ بندی کی۔

بعد کے حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ:

لکھنؤ چھوڑ کر سب کو شاہجہاں پور جانا پڑا۔ پھر، جب وہاں بھی انگریزوں سے شکست کی نوبت آئی، تو جتنے عُلَما وقائدین، وہاں، مولانا سید احمدُ اللہ، مدراسی کے ساتھ تھے، اُن میں سے اکثر نے نیپال کا رخ کیا اور وہیں روپوشی وکس مپرسی کی زندگی گذار کر، اِس جہان سے رخصت ہوگئے۔

مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبر آبادی لکھتے ہیں:

''سب ساتھی، جدھر، موقع ملا، چلتے ہوئے۔ ڈاکٹر وزیر خاں، حجاز، روانہ ہوگئے۔
مکہ معظّمہ جا کر مولوی رحمت اللہ، کیرانوی کے پاس، مقیم ہوگئے۔ اور اپنا مَطَب، وہاں کھول لیا۔
ایک عرب سردار، عبداللہ الیمنی سے تعلقات ہوگئے۔ اس کی بیوی، سخت علیل ہوئی۔

جانبر ہونے کی کوئی توقع، نہ تھی۔ ڈاکٹر وزیر خاں کے علاج سے اس کو شفا ہوئی۔

عبداللہ الیمنی نے ڈاکٹر صاحب کی مالی خدمت کرنی چاہی، مگر آپ نے منظور، نہ کی۔

عبداللہ، آپ کا بڑا معتقد ہوگیا۔

حکومتِ برطانیہ کا ہندوستان پر، کامل تسلُّط ہوگیا، تو اپنے باغیوں کی تلاش میں سرگرمِ سَعی رہی۔ ہندوستان میں جو ہاتھ لگا، پھانسی، یا۔ انڈمان کی سزا دی گئی۔

ڈاکٹر صاحب کی تلاش، جاری تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ، مکہ معظّمہ میں ہیں۔

تو سلطان عبدالعزیز (خاں، تُرکی) سے مُراسلات کا سلسلہ، جاری کیا اور لکھا کہ:

ہمارا باغی، آپ کی قلمرو میں ہے، اس کو ہمیں دیا جائے۔''

سلطان نے شریف، عبداللہ، امیرِ مکہ کو لکھا۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے اظہارِ واقعہ کیا۔
اور کہا کہ آپ کو بچانا، میرے امکان سے باہر ہے۔ البتّہ، عبداللہ الیمنی سے آپ ملیے۔

چنانچہ، ڈاکٹر صاحب ان سے ملے۔ عرب سردار نے، ان سے کہا:

ڈاکٹر صاحب! دس ہزار عرب میرے قبیلہ کے ہیں۔

بچہ بچہ، کٹ جائے گا، جب کوئی آپ کو ہاتھ لگا سکتا ہے۔

اور شریفِ مکہ کو کہلا بھیجا کہ: سلطانِ روم (تُرکی) کو لکھ دیں کہ:

ڈاکٹر صاحب، عبداللہ الیمنی کی امان میں ہیں۔ کوئی، آنکھ نہیں ملا سکتا۔''

چنانچہ، سلطان نے صاف انکار لکھ دیا کہ: ڈاکٹر صاحب کو نہیں دیا جا سکتا۔

حکومتِ برطانیہ، خاموش ہوگئی۔'' (ص ۸۹۔ ''غدر کے چند عُلَما''۔ مطبوعہ: دہلی)

مولانا ڈاکٹر وزیر خان، بہاری، اکبر آبادی نے مکہ مکرمہ ہی میں چودہ (۱۴) سال تک طبابت کر کے اپنی زندگی بسر کی اور وہیں ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۳ء میں آپ کا انتقال بھی ہوا۔

جنت المعلیٰ، مکہ مکرَّمہ میں آپ کی تدفین ہوئی۔ رَحِمَهُ اللّٰهُ تعالیٰ رَحْمَةً وَاسِعَةً۔

○○○

فارسی واردو کے ادیب وشاعر وشہیدِ انقلاب

مولانا امام بخش، صہبائی، دہلوی

مولانا امام بخش، صہبائی (متوفی ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء) خَلفِ مولانا محمد بخش، تھانیسری کوچہ چیلان، دہلی میں رہتے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب، یہ ہے:

''سلسلہ، ان کے نسب کا، ان کے والدِ مرحوم ومغفور کی طرف سے
تو فاروقِ حق وباطل، عمر بن خطاب **عَلَیْہِ رِضْوَانُ اللّٰہِ الْوَھَّاب** تک۔
اور زُبدۂ مستورات، سراپردۂ عفت وعصمت، حضرت والدہ شریفہ **غَفَرَ اللّٰہُ لَھَا** کی جانب سے
قُدوۂ وَاصلاں، درگاہِ رہنمائے سالکاں۔ عرفان دستگاہ، محبوبِ سبحانی
سید عبدالقادر، جیلانی، **رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِ** تک پہنچتا ہے۔''

(**گلستانِ سخن** از مرزا قادر بخش صابر، گورگانی۔ بحوالہ، **دلی کالج**، اردو میگزین نمبر۔ دہلی)

مولانا صہبائی نے عربی وفارسی کی تعلیم، مولانا عبداللہ خاں علوی سے حاصل کی۔
فارسی اور اردو زبان کے بلند پایہ شاعر ہوئے۔ کئی تصانیف
مثلاً: حدایق البلاغہ، انتخاباتِ نظم، قواعدِ اردو، وغیرہ آپ کی یادگار ہیں۔

سرسید احمد خاں (متوفی مارچ ۱۸۹۸ء) نے ''**آثارُ الصَّنادید**'' کے ص ۶۳۰ تا ص ۶۴۳ میں، مولانا صہبائی کے بارے میں اپنے تأثرات اور فارسی نثر ونظم کے نمونے، پیش کیے ہیں۔ ان کے ذکر کا آغاز، اِس طرح کیا ہے:

''زَنگ زُدائے آئینۂ سخنوری، مصقل مرأۃِ معنی پروری، نخلبندِ حدیقۂ کمالاتِ صوری پردہ کشائے حُسنِ جلائلِ معنوی، معجزہ طرازِ طرزِ تازہ، بزم افروز حمائدِ بے اندازہ ساقیِ خم کدۂ سخن سرائی، مولوی امام بخش، متخلّص بہ صہبائی۔

نسب، آپ کا، والد ماجد کی طرف سے حضرت عمر فاروق **رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عنہٗ** تک اور والدہ مشفقہ کی طرف سے حضرت غوث الثقلین، سید عبدالقادر جیلانی، **رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِ** تک

پہنچتا ہے۔'' (ص ۶۳۰ و ۶۳۱۔ ''**آثارُ الصَّنادید**''۔ از سرسید، مطبوعہ: اردو اکاڈمی، دہلی)

''کمالاتِ ظاہری اور جَلائلِ معنوی اور حسنِ اخلاق اور حمائدِ اَطوار میں پسندیدۂ خلائق ومقبولِ خلائق ہیں۔ خُلقِ خوش، آپ کا آئینۂ بہار اور اَوضاعِ حمیدہ، آپ کے محمودِ روزگار۔
اِس جُزوِ زَمان میں ایسی جامعیت کے ساتھ کوئی کم گذرا ہے۔ اور طُرفہ، یہ کہ:
فنونِ متعارفہ، مثل تحقیقِ لغت واِصطلاحاتِ زبان اور تدقیقِ مقاماتِ کتابی
اور تکمیلِ عروض وقافیہ واِستکمالِ فن معمّا، وغیرہا میں ایسا کمال، بہم پہنچایا ہے کہ:
ہر فن میں یک فنّی کہنا چاہیے۔ **پذیرفتہ از ہر فنے روشنی۔ جداگانہ، در ہر فنے یک فنی۔**
شروحِ کتب اور رسائلِ قواعدِ زبانِ فارسی اور رسائلِ علمِ عروض وقافیہ اور مُعَمّا جو آپ کے ریختۂ قلم نزاکت رقم ہیں، ایسے نفائسِ مقاصد اور جَلائلِ مطالب پر مشتمل ہیں کہ:
مُتَتَّبعانِ فنونِ مذکورہ کو، ان فوائدِ جلیلہ کا حصول، بعد ایک عمر دراز کے بھی، متعسَّر ہے۔''

(ص ۶۳۱۔ ''**آثارُ الصَّنادید**''۔ مطبوعہ: دہلی)

مسٹر، ٹامسن، لیفٹیننٹ، گورنر نے، دہلی کالج (دہلی) کے لئے
فارسی کے ایک ماہر استاذ کا ۱۸۴۰ء میں انتخاب وتقرر کرنا چاہا
تو ''مفتی صدرُالدین خاں، صدرُالصَّدور نے لفٹنٹ گورنر سے عرض کی کہ:
ہمارے شہر میں فارسی کے استاذ، صرف تین شخص ہیں:
ایک: مرزا، نوشہ (مرزا غالبؔ)۔ دوسرے: حکیم مومنؔ خاں۔ تیسرے: امام بخش، صہبائیؔ۔
لیفٹیننٹ بہادر نے تینوں کو بُلوایا۔
مرزا نوشہ، بھلا، یہ روگ، کیوں پالنے لگے؟ انھوں نے تو انکار کر دیا۔
مومنؔ خاں نے، یہ شرط رکھی کہ ماہانہ سو روپے سے کم کی خدمت، قبول نہ کروں گا۔
مولوی امام بخش، صہبائیؔ کا کوئی ذریعۂ معاش، نہ تھا۔
انھوں نے، یہ خدمت، چالیس روپے ماہانہ پر قبول کی۔ بعد کو پچاس روپے ہو گئے۔''

(ص ۱۶۳۔ ''**مرحوم دلی کالج**''۔ از ڈاکٹر عبدالحق۔ مطبوعہ: انجمن ترقی اردو نئی دہلی ۱۹۸۹ء۔ وطبقاتُ الشُّعَرا وتاریخِ نثرِ اردو)

مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبر آبادی (متوفی ۱۹۶۸ء) لکھتے ہیں:
مرزا غالبؔ اور مولانا امام بخش صہبائیؔ میں گہری دوستی تھی۔

دلی کے سبھی اصحابِ علم وفضل، مولانا صہبائی کے قدرداں تھے۔
مفتی صدرالدین، آزردہ اور علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی کے دولت کدے پر
مولانا صہبائی کی تقریباً، روزانہ کی آمد ورفت تھی۔ جہاں، دینی وعلمی وادبی مذاکرے رہتے۔
معمولی پڑھے لکھے کی تو گذر ہی نہ تھی۔
شب میں مفتی صدرالدین خاں کے یہاں، محفل جمتی۔
مولانا صہبائی، ہر دو جگہ کے بیٹھنے والے تھے۔'' (ص ۱۲۔ ''**غدر کے چند علما**''۔ مطبوعہ: دہلی)
مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء) اپنے والد ماجد
حضرت مولانا خیرالدین، دہلوی کے بیان کردہ واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:
''مفتی (صدرُالدین) صاحب کا دیوان خانہ، دہلی کے منتخب افراد کا مجمع ومرکز تھا۔
جاڑا، گرمی، برسات، کوئی موسم ہو، لیکن، شب کی کوئی مجلس، قضا نہیں کرتا تھا۔
ہرفن کے اکابر کو، وہاں، ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جاسکتا تھا۔
اگر، کوئی نو وارِد، دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے فضل وکمال کو
بیک مجلس دیکھ لے، تو، وہ سیدھا، مفتی صاحب کے دیوان خانہ کا رُخ کرتا۔
ان صحبتوں کے ایک رکن، مولانا صہبائی بھی تھے۔ کالج سے لوٹتے، گھر آتے
پھر شام کو ہواخوری کے بجائے، مولانا فضلِ حق، خیرآبادی کے یہاں جاتے۔
وہاں، سہ پہری فواکہات کرتے۔ شب میں بعد نمازِ عشا، مفتی صاحب کے یہاں جاتے۔
یہاں کی مجلس، برخاست ہوتی، تو گھر جا کر سو جاتے۔''
(ص ۱۳۔ ''**غدر کے چند علما**''۔ از مفتی انتظام اللہ، شہابی، مطبوعہ: دہلی)
خواجہ الطاف حسین، حالی (متوفی ۱۹۱۴ء) لکھتے ہیں:
صہبائی، جن کی نظم ونثر اور دیگر رسائل اور شروح، تین جلدوں میں چھپ کر
شایع ہو چکی ہیں۔'' (**یادگارِ غالب**۔ مطبوعہ: دہلی)
بابائے اردو، مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:
''مولوی امام بخش، صہبائی، صدر مدرس فارسی، اپنے وقت کے بہت بڑے فارسی ادیب تھے۔
مصنف اور شاعر بھی تھے۔ ان کی کتابیں، نصابِ تعلیم میں داخل تھیں۔
ان کی تصانیف اب تک پڑھائی جاتی ہیں۔ شہر میں ان کی بڑی عزت تھی۔

علاوہ فارسی کی مشہور تالیفات کے، اردو صَرف ونحو پر بھی ایک اچھی کتاب لکھی۔
جس کے آخر میں بہ ترتیبِ حروفِ تہجی، اردو کے محاورات
اور کہیں کہیں، ضربُ الامثال بھی درج ہیں۔
حَدایقُ البلاغت (تصنیف: شمس الدین) کا اردو ترجمہ کیا۔ شُعرَاے اردو کا انتخاب بھی
تیار کیا۔ جو، اسی زمانے میں طبع ہو کر شایع ہوا۔'' (ص ۱۶۲۔ ''**مرحوم دلی کالج**''۔ مطبوعہ: دہلی)
مولانا امام بخش، صہبائی، انگریز مخالف ذہن اور مجاہدین کے ساتھ، ہمدردی رکھتے تھے۔
قلعۂ معلیٰ کی مجلسِ شوریٰ اور بعض مشوروں اور سرگرمیوں میں شریک ہو کر
انگریزی اِقتدار کے خاتمہ کے آرزومند اور کوشاں بھی تھے۔
مگر، ان کی گرفتاری اور شہادت، اچانک، اس طرح ہوئی کہ:
کوچہ چیلان، دہلی کے کسی گھر میں ایک انگریز، داخل ہوا
اور بُرے ارادہ سے زنان خانہ کی طرف جانے کی کوشش کی۔
اِس حرکت پر مشتعل ہو کر کسی نے اسے زخمی کر دیا۔
اس کی خبر، جب انگریزی کمان افسر کو ملی، تو اس نے حکم دیا کہ:
اس محلّہ کے تمام مردوں کو قتل کر دیا جائے۔ یا۔ گرفتار کر کے لایا جائے۔
اس حکم کی تعمیل میں بہت سے مرد، اسی محلّہ اور گھر میں قتل کر دیے گئے۔
اور باقی ماندہ افراد کو گرفتار کر کے جمنا کے کنارے، لے جا کر، گولیوں سے بھون دیا گیا۔
انھیں گرفتار شدگان میں مولانا امام بخش، صہبائی اور مشہورِ روزگار خوشنویس، سید محمد امیر
عُرف، میر پنجہ کش تھے۔ اِس حادثہ میں مولانا صہبائی
اپنے کنبہ کے تقریباً اِکیس (۲۱) افراد کے ساتھ، شہید کر دیے گئے۔
معینُ الدّین، کوتوال، جو جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانہ میں
پہاڑ گنج (دہلی) کے تھانیدار تھے، وہ اپنے چشم دید حالات، بیان کرتے ہیں:
''نواب شیر جنگ خاں کے صاحبزادے، محمد علی نے، جو دادری کے راجہ
کے بھتیجے تھے، اپنے تحفظ کے لئے اپنے مکان کے دروازے، بند کر لیے تھے۔
چند گورکھوں اور یورپینوں نے
جو، شہر میں لوٹ مار میں مصروف تھے، دروازوں کو کھولنے کی کوشش کی۔

کوشش میں ناکام رہنے کے باعث، وہ دیواروں پر چڑھ گئے۔
ایک اَنّا، جو یہ نظارہ دیکھ کر وحشت زدہ ہوگئی، اپنی گود میں بچہ لیے
کنویں میں گر پڑی۔ گھر کی دیگر خواتین نے اس کی تقلید کی۔
اوراسی کنویں میں گرکر، ہلاک ہوگئیں۔
محمد علی نے وَسطِ مکان سے گولی چلائی اور تین یورپیوں کو، مار گرایا۔
اس پر ایک بڑی فوج، مکان پر حملہ آور ہوئی۔ اور تمام اہلِ خانہ کو قتل کر ڈالا۔
محمد علی بھی مقتولین میں تھے، مگر آخری وقت تک لڑتے رہے تھے۔
ساٹھ (٦٠) ہتھیار بند، جن میں امام بخش صہبائی اور ان کے صاحبزادے بھی شامل تھے
جو اسلامی کالج سے متعلق تھے، باغی سمجھ کر قتل کر دیے گئے۔
ان میں فلاح اللہ خاں بھی تھے، جو اپنے زمانے کے مشہور طبیب تھے۔''

(ص ٨٧۔ ''**غدر کی صبح وشام**''۔ مطبوعہ: دہلی ١٩٢٦ء۔
بحوالہ ص١٠١ ''**داستانِ شرف**'' مؤلّفہ: امداد صابری۔ مطبوعہ، دہلی)

راقم الدّولہ ظہیر دہلوی لکھتے ہیں:
''میاں محمد امیر، پنجہ کش، خوش نویس، جن کا ثانی، روے زمین پر نہیں۔
مولوی امام بخش، صہبائی اور ان کے دو بیٹے اور میاں نیاز علی واقعہ خواں
اور چیلوں کے کوچے کے اور بہت سے شریف خاندان لوگ۔
سنا گیا ہے کہ اس محلّہ کے چودہ سو (١٤٠٠) آدمی گرفتار کر کے راج گھاٹ کے دروازہ کے
دریا پر لے جائے گئے اور انھیں، بندوقوں کی باڑھیں ماردی گئیں۔
اور لاشیں، دریا میں پھنکوادی گئیں۔ عورات کا یہ حال ہوا کہ:
گھروں میں سے نکل کر بچوں سمیت، کنوؤں میں جا گریں۔
چیلوں کے کوچہ کے تمام کنویں، لاشوں سے پٹ گئے تھے۔''

(''**داستانِ غدر**''۔ از راقم الدّولہ ظہیر دہلوی۔ اَریب پبلیکیشنز، پٹودی ہاؤس، نئی دہلی ٢)

مولانا صہبائی کے بھانجے، مولانا قادر علی، بیان کرتے ہیں:
''میں، صبح کی نماز اپنے ماموں، مولانا صہبائی کے ساتھ
کٹرہ مہر پرور کی مسجد میں پڑھ رہا تھا کہ گورے، دَن دَن کرتے آپہنچے۔

پہلی رکعت تھی کہ امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔
شہر کی حالت، نہایت خطرناک تھی۔ اور دلی، حشر کا میدان بنی ہوئی تھی۔
ہماری بابت، مُخبِروں نے بغاوت کی اطلاعات، سرکار میں دے دی تھیں۔
اِس لئے ہم سب گرفتار کر کے، دریا کے کنارے پر لائے گئے۔
ابھی غدر کو ایک ہفتہ بھی، نہ ہوا تھا اور پھانسیوں کے بجائے، باغی، گولیوں کا نشانہ
بن رہے تھے۔ مسلّح سپاہیوں نے اپنی بندوقیں، تیار کیں۔ ہم تیس چالیس آدمی
ان کے سامنے کھڑے تھے کہ ایک مسلمان افسر نے ہم سے آکر کہا کہ:
موت، تمہارے سر پر ہے۔ گولیاں، تمہارے سامنے ہیں اور دریا، تمہاری پشت پر ہے۔
تم میں جو لوگ، تیرنا جانتے ہیں، وہ دریا میں کود پڑیں۔''
میں بہت اچھا تیراک تھا۔ مگر، ماموں صاحب، یعنی مولانا صہبائی اور ان کے صاحبزادے
مولانا سوز، تیرنا، نہیں جانتے تھے۔ اِس لئے دل نے گوارا، نہ کیا کہ ان کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں۔
لیکن، ماموں صاحب نے مجھے اِشارہ کیا، اِس لئے میں دریا میں کود پڑا۔
پچاس، یا ساٹھ گز، گیا ہوں گا کہ:
گولیوں کی آوازیں میرے کانوں میں آئیں اور صف بستہ لوگ گر کر مر گئے۔''

(ص ٩٣ و ٩٤۔ ''**دلی کی آخری بہار**''۔ مصنّفہ: راشد الخیری۔ و مرتّبہ: ضمیر حسن، دہلوی۔
مطبوعہ: اردو اکاڈمی، دہلی۔ ٢٠٠٣ء)

افسوس کہ:

گھروں سے کھینچ کے کُشتوں پہ کُشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے، نہ کفن ہے، نہ رونے والے ہیں

اس اَلمناک شہادت کی خبر سن کر حضرت مفتی صدرالدین آزردہ کا دل تڑپ اٹھا
اور زبان، بے اختیار، پکار اٹھی کہ:

کیوں کر آزردہ، نکل جائے، نہ سودائی ہو — قتل اس طرح سے، بے جرم، جو صہبائی ہو

کسی دوسرے شاعر کے زخمی دل کا نالۂ پُر درد ہے کہ:

وہی صہبائی جو تھے صاحبِ قولِ فیصل — ایک ہی ساتھ ہوئے قتل، پدر اور پسر

○○○

مرادآباد کے ممتاز عالم وشہیدِ انقلاب

مولانا وَہاج الدین، مرادآبادی

مولانا وہاج الدّین، عُرف مولوی منو (شہادت ۲۴ر رمضان ۱۲۷۴ھ/ ۸رمئی ۱۸۵۸ء)
خَلفِ مولوی جمیلُ الدّین بن مولوی وجیہُ الدّین بن مفتی شیرمحمد۔

مرادآباد کے ممتاز عالم اور بااثر رئیس تھے۔ شجاع و بلند اخلاق اور ہم درد وغم گسار تھے۔
دینی جذبہ اور قوم پروری میں بے مثال تھے۔

حُکّامِ شہر، آپ کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ عوام وخواص میں آپ یکساں مقبول تھے۔

مولانا حمیدُ الدّین، خواہرزادۂ مولانا وہاج الدّین، مرادآبادی کے نواسے، جناب عزیز احمد قادری چشتی نے اپنے نانا کی زبانی، سنے ہوئے واقعاتِ انقلابِ ۱۸۵۷ء قلم بند کردیے تھے۔
اسی مضمون سے اَخذ واِقتباس کرکے کچھ حالات وخدمات، یہاں، نذرِ قارئین ہیں۔

یہ مضمون، سنڈے ایڈیشن، روزنامہ، الجمعیۃ، دہلی، شمارہ ۲۵رمئی ۱۹۵۷ء میں شائع ہو چکا ہے
جسے "عُلمائے ہند کا شاندار ماضی" جلدِ چہارم، مطبوعہ دہلی میں بھی نقل کیا گیا ہے۔

مولانا وہاج الدین، مرادآبادی (شہادت ۲۴ر رمضان ۱۲۷۴ھ/ ۸رمئی ۱۸۵۸ء)

عربی فارسی اردو کے علاوہ، انگریزی زبان پر بھی پوری قدرت رکھتے تھے۔

انھوں نے انگریزی زبان اپنے حقیقی چچا، مولانا محمد اسمٰعیل کی، لندنی بیوی سے سیکھی تھی
جو ایک تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھنے والی مہذّب خاتون تھیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مولوی وہاج الدین، عُرف منّو نے ایک قائد کی حیثیت سے انتہائی سرگرمی سے کام کیا اور متعلقہ اِسکیم کے تحت، پارٹیاں، قائم کرنے کے لئے پوشیدہ طور پر بذاتِ خود اور نمائندوں کے ذریعہ، سربرآوردہ لوگوں کو حصولِ آزادی کی اس تحریک میں شرکت کی

آپ، دعوت دیتے رہے۔ چندروٗسا، آپ کو اس کارِ نیک میں پیش پیش دیکھ کر، ساتھ ہوگئے۔
اور اِس طرح ایک بڑی جماعت، وجود میں آگئی۔

۱۹رمئی (۱۸۵۷ء) کو مولوی وہاج الدین، عُرف مولوی منّو کی قیادت میں
ضبط ونظم کے ساتھ، حُریت نوازوں کا ایک جمِ غفیر، جیل خانہ (مرادآباد) کی طرف گیا۔

ہجوم نے مولوی منّو صاحب کا اشارہ پاتے ہی جیل خانہ، پاش پاش کردیا۔

قائد نے، سب سے پہلے، پرچم لہرایا اور تمام قیدیوں کو آزاد کرکے ان کے خورد ونوش اور دیگر ضروریات کا انتظام کیا۔ بعد ازاں، ان کے حسبِ خواہش، جس نے اس جماعت میں شامل ہونا چاہا، شامل کیا، اور باقی لوگوں کو، زادِراہ دے کر خدا حافظ کہہ دیا۔

قائد نے شامل ہونے والے لوگوں کا ایک جتھّہ بنا کر
سید اکبر علی صاحب اور سید گلزار علی صاحب کی سپردگی میں اَوَدھ کی سَمت، روانہ کردیا۔

اِس دَوران، جان کرافٹ وِلسن، حُریت نوازوں کے مارچ کی خبر پاتے ہی روپوش ہوگیا۔

مرادآباد جیل خانہ ٹوٹنے کی خبر، روہیل کھنڈ میں پہنچتے ہی عہدیداران کا سارا رعب ودبدبہ یخ بستہ ہوکر رہ گیا تھا۔ ان کی جس قدر بھی دہشت، عوام کے دلوں پر تھی، یکسر غائب ہوگئی۔
مرادآباد سے ایک وفد، قصبہ آنولہ، بریلی، بھیجا گیا۔

وفد کے صدر، مولوی کفایت علی صاحب کافیؔ تھے۔ جنھوں نے اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی، جواں مردی، شجاعت اور دانش مندی سے سرانجام دیے۔

پھر، مرادآباد تشریف لے آئے۔

ریاستِ رام پور کی منجمد فضا میں حرکت پیدا کرنا، بہت ہی مشکل کام تھا۔ مگر، فِدائے قوم مولوی وہاج الدین، عُرف مولوی منّو ہی کی یہ قوم پروری، حُبُّ الوطنی اور شجاعت تھی کہ:
سر ہتھیلی پر رکھ کر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ، خطرات کی اس وادی میں کود پڑے۔
وہ، بے خوف ہوکر، رام پور خاص اور گردونواح کے قصبوں اور دیہاتوں میں جلسے کرتے پمفلٹ پڑھ کر سناتے اور اِس طرح، اپنے سپوتوں کو، بیدار کرکے
جنگِ آزادی کی تحریک میں شمولیت کی دعوت دیتے۔

مرزا، ناظم بخت کے بیٹے اور فرخ سیر بادشاہ کے نواسے، فیروز شاہ کا
جب مرادآباد میں ورود ہوا، تو شہر کے خواص اور عوام، سب ہی نے شاندار طریقے پر استقبال کیا۔

مولوی وہاج الدین، عُرف مولوی منّو، فیروز شاہ کے دستِ راست تھے۔
مولوی صاحب اور سید صاحب مذکور اور دیگر روسائے شہر، ان کی ہر قسم کی معاونت کرتے رہے۔
شاہزادہ، فیروز شاہ نے شہر کا گشت کیا اور فرداً فرداً، اُن رؤسا کے یہاں بھی گیا
جو، جنگِ آزادی میں شریک، نہ تھے اور اپنے دروازے، مقفّل کر چکے تھے۔
مرادآباد میں فیروز شاہ اور اس کے ہمراہ، فوج کا پڑاؤ، اُس باغ میں ہوا تھا
جس باغ کی کوٹھی میں کبھی آنتوں والا صاحب، رہتا تھا۔ مقامِ مذکور، اُس سڑک پر واقع ہے
جو سڑک، گل شہید کے برف خانہ کے چوراہے سے بڑے اسٹیشن کو جاتی ہے۔
ریاستِ رام پور کے نواب، یوسف علی خاں، حُریت پسندوں سے الگ تھے۔
انگریزوں نے موقع غنیمت سمجھ کر پورا پورا فائدہ اٹھایا۔
انگریزوں نے نوابِ رام پور کی کثیر فوج لے کر مرادآباد پر چڑھائی کر دی۔
شاہزادہ، فیروز شاہ کی سرپرستی میں مولوی وہاج الدین، عُرف مولوی منّو کے علمِ جہاد کے زیرِ سایہ، مجاہدینِ جنگِ آزادی نے نواب کی فوج اور انگریزوں سے خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ حتیٰ کہ بعض خواتین، مردانہ لباس، زیبِ تن کر کے میدان میں آئیں اور مخالفین کے دانت کھٹّے کر دیے۔ لیکن، ساز و سامان میں انگریزوں کا مقابلہ، نہ کر سکے۔ بالآخر، شکست ہوئی۔
انگریز، شہر پر قابض ہو گئے۔ شاہزادہ، فیروز شاہ، **سنبھل** والی سڑک سے روانہ ہو کر **گندرکی** ہوتا ہوا قصبہ **آنولہ** سے گذر کر بریلی پہنچا۔
اگرچہ، انگریزوں نے اس کا تعاقب کیا، مگر، فیروز شاہ کی گرد کو بھی، نہ پا سکے۔
انگریزوں نے برسرِ اقتدار آتے ہی شمعِ حُریت کے پروانوں کی ایک طویل فہرست بنائی۔
فہرست میں اضافہ ہوتا رہا۔ گرفتاریاں، شروع کر دی گئیں۔ مُحبانِ وطن کے لئے سزائے موت کا حکم، جاری ہونے لگا۔ شہر کی مختلف سَمتوں میں پھانسی گھر، قائم کیے گئے۔ پھانسیوں کا مرکز سرائے پختہ کے سنبھلی گیٹ کے متصل رکھا گیا۔ جہاں، جاں نثاروں کو آزادی سے پھانسیاں دی جانے لگیں۔ حُریت کے پروانوں کے لئے کوئی قانون اور کوئی انصاف، نہ تھا۔
جو شخص، جس کا بھی نام لے دیتا، اس کو انتہائی بے رحمی سے پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا جاتا اور پھانسی کے بعد، انہیں، وہیں، دفنا دیا جاتا تھا۔
شُہدَاے مِلّت کی یادگار میں اب بھی ایک محلّہ، آباد ہے۔

جو، گُل شہید کے نام سے مشہور و معروف ہے۔
ایک شخص نے جو مولوی وہاج الدین، عُرف مولوی منّو کے دسترخوان کا نمک خوار تھا مُخبری کی خدمت، انجام دی۔
رمضان المبارک کا مہینہ اور عصر و مغرب کے درمیان کا وقت تھا کہ:
فوجی دستہ نے مولانا کی قیام گاہ کا محاصرہ کر لیا۔ پہلے، یہی نمک خوار مُخبِر آگے بڑھا۔
مولانا، تنہا، مکان میں تشریف فرما تھے۔ ان کو اپنی آمد کی خبر کرائی۔
مولانا وہاج الدین صاحب، ان دنوں، انتہائی محتاط تھے، مگر آنے والے کا نام سنتے ہی اُن کی اِحتیاط اور وقت کی نزاکت، نرم دلی اور خلوص و ہمدردی کے نیچے، دب گئی۔
اور انھوں نے فوراً ہی صدر دروازہ کھول دینے کا حکم، صادر فرما دیا۔
دروازہ کھلتے ہی، ساتھ ساتھ، فوجی رسالہ بھی دیوان خانہ میں داخل ہوا اور آزادی سے آگے بڑھا۔ اس پر ایک نمک حلال ملازم نے تیوری بدل کر مداخلت کی، جسے اسی وقت، شہید کر دیا گیا۔
مولوی صاحب نے اپنی بندوق، جو قریب ہی رکھی تھی، اٹھائی۔
لیکن، معاً، اُن پر گولیاں برس پڑیں اور اُن کی روح
کلمہ پڑھتی ہوئی، قفسِ عُنصری سے عالَمِ بقا کو پرواز کر گئی۔
آقا اور غلام ملازم کی نعش، فوجی رسالہ اپنے ساتھ لے گیا۔
اور ان کی تمام آبائی جائداد، ضبط کر لی گئی۔
مولانا وہاج الدین صاحب اور ان کے ملازم، دونوں کی پختہ قبریں، محلّہ کنجری سرائے میں کچہری روڈ پر، نعل بندوں کی مسجد کے قریب، ایک حظیرے میں ہیں۔
(**علمائے ہند کا شاندار ماضی**، جلدِ چہارم۔ مطبوعہ: دہلی)
سید محبوب حسین، سبزواری، مرادآبادی لکھتے ہیں:
''سرسید کے نزدیک، جس شخص نے بھی انگریز کے خلاف، جنگِ آزادی میں حصہ لیا یا۔ جنگِ آزادی میں جان و مال، یا۔ کسی دیگر قسم کی قربانی دی وہ اوّل درجہ کا جاہل، نالائق اور غنڈہ آدمی تھا۔ (**خیر خواہانِ ہند**۔ مرتبّہ: سرسید احمد خاں)
چنانچہ ۱۸۶۰ء میں جب سرسید، مرادآباد میں صدرُ الصُّدور تھے
اُس وقت انھوں نے ایک کتاب ''**خیر خواہانِ ہند**'' کے نام سے تحریر کی تھی۔

اس میں انھوں نے، ہر اُس شخص کو، جس نے کسی بھی طرح انقلابی تحریک میں حصہ لیا ہو
اُس کے، اس فعل کو، قابلِ ملامت، تحریر کیا ہے۔
اس میں مجاہدین کے خلاف لکھنے کے علاوہ، جن لوگوں نے ملک وقوم کے ساتھ، غداری کی
اور انگریزوں کی حمایت میں جنگِ آزادی کو، ناکام بنانے کی بھرپور کوشش کی
سرسید نے، اس کتاب میں ان غدّاران قوم کا بہت ہی اچھے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔
اور ان کو ہندوستان کا انتہائی معزز شہری کہہ کر تحریر کیا ہے۔
اور ان کی غدارانہ حرکات کو نہایت ہی قابلِ تعریف اور ملک وقوم کی خدمت، قرار دیا ہے۔
اس کتاب میں مولوی وہاج الدین، عُرف مولوی منو کو، جن الفاظ میں یاد کیا ہے
وہ الفاظ، سرسید جیسی عظیم اور قابلِ احترام ہستی کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ ملاحظہ ہو:
"۲۱ مئی ۱۸۵۷ء کو، ایک گروہ، بدمعاشوں کا، رام پور سے آیا۔"
حکیم، نجم الغنی رام پوری، تاریخ 'اخبار الصّنادید' میں
ان مجاہدین کی رام پور سے آمد، ۱۹ مئی ۱۸۵۷ء تحریر کرتے ہیں۔
بہر حال! یہ لوگ، دریائے رام گنگا کے پوربی کنارے پر ٹھہرتے ہیں۔
جب یہ خبر، حُکّام کو ملی کہ ایک گروہ، بدمعاشوں کا، مولوی منو نے شہر میں بلوہ کرنے
اور لوٹ مار کرنے کے لئے بُلوایا ہے، جس کا نام، جہاد رکھا ہے، بس اتنا سا یہ محرکہ ہے کہ:
شہر مراد آباد میں مسلمانوں نے جہاد کیا تھا اور محمدی جھنڈا کھڑا کیا تھا۔
سرسید احمد خاں، آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:
یہ منو، پوتا ہے، مولوی وجیہ الدین کا، جو، سَرغنہ ہے ان بدمعاشوں کا، اور بھتیجا ہے
مولوی اسماعیل کا، جو، شاہِ اَوَدھ کی طرف سے سفیر بن کر لندن گئے تھے۔
اس بدمعاش، منو کا اصل نام، وہاج الدین تھا اور مطلق، پڑھا لکھا، نہیں تھا۔"
(**خیر خواہانِ ہند**۔ مرتّبہ: سرسید احمد خاں)
"**سرکشیٔ ضلع بجنور**" نامی کتاب میں، جو ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی کے حالات وواقعات
سرسید مرحوم نے قلمبند کیے ہیں، اس کتاب کے نام سے ہی مؤلّف کے خیالات اور ذہن کا
پتا چلتا ہے۔ مجاہدینِ بجنور نے انگریزوں کی غلامی کی ذلّت کو ختم کرنے کے لئے جو، جانی و مالی
قربانی دی، وہ سرسید کے خیال میں حُبُّ الوطنی نہیں تھی، بلکہ ایک غنڈہ گردی تھی، جو کی گئی۔"

(**سرکشیٔ ضلع بجنور**۔ مرتّبہ: سرسید احمد خاں)
مولانا وہاج الدین، عُرف مولوی منو نے جذبۂ حُبُّ الوطنی سے سرشار ہو کر
جان و مال کی پروا کیے بغیر اپنی تحریر و تقریر سے ضلع مراد آباد کے عوام میں ذوقِ جہاد پیدا کیا۔
اور ملک کے کچلے ہوئے عوام کو آزادی کی نعمت سے آگاہ کیا۔
چنانچہ، ضلع کے عوام، مولوی منو کے جھنڈے کے نیچے، جمع ہونا، شروع ہو گئے۔
دریائے رام گنگا پر مولوی عبدالرحمٰن، عُرف مولوی مستو کی شہادت اور غیر منظّم عوام کی شکست
کے بعد مولوی وہاج الدین، عُرف مولوی منو نے عوام کو دوبارہ منظّم کیا۔
اور ٹھاکر دوارہ اور سنبھل کی طرف، اپنے سفیر، روانہ کیے، جن لوگوں نے جا کر عوام کو
انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ (**محاربۂ عظیم**۔ از منشی، کنھیّا لال)
اس تمام کارروائی کی، ایک غدار نمک خوار شخص نے ضلع کے انگریز افسران کو مُخبری کی۔
اور وہ تمام خُفیہ معلومات بھی فراہم کرادیں، جو مولوی منو نے مرتّب کی تھیں۔
اور ان تمام لوگوں کے نام و پتہ بھی انگریز حاکم کو بتادیے
جو عوام اور مولوی صاحب کے درمیان، رابطہ کا، کام، انجام دے رہے تھے۔
مولوی صاحب کے ہمراہ، مقامی آبادی کے لوگ، کثیر تعداد میں شریک ہو چکے تھے۔
اس طرح ایک کثیر جماعت، آزادی کے متوالوں کی وجود میں آچکی تھی۔
لہٰذا، ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو جب یہ خبر ملی کہ میرٹھ چھاؤنی کی انگریزی فوج، باغی ہوگئی ہے
تو ضلع مجسٹریٹ، مسٹر، سی بی سانڈرس کے چھکّے، چھوٹ گئے۔"
(**اخبار الصّنادید**۔ مرتّبہ: حکیم نجم الغنی خاں، رام پوری)
اس نے، اسی وقت، تمام ضلع کے انگریزوں کو ایک جگہ، جمع کیا اور باہم، مشورہ کیا کہ:
اس نازک وقت میں کیا ہونا چاہیے؟ باہم، یہ طے ہوا کہ:
تمام عورتوں و بچوں کو کچھ انگریزوں کے ہمراہ، نینی تال، روانہ کر دینا چاہیے۔
اور باقی انگریز، حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے یہاں، موجود رہیں۔
اس مشورے کے بعد ضلع مجسٹریٹ، مسٹر، سی بی سانڈرس نے ضلع کا انتظام
ایک معمّر اور تجربہ کار اور مستقل مزاج انگریز، مسٹر، جان کرافٹ ولسن کے سپرد کیا۔

۲۱؍مئی ۱۸۵۷ء کو، دریاے رام گنگا پر، اسی انگریز نے
نہتے مجاہدین پر شب خون مار کر منتشر کر دیا تھا۔

مجاہدین کی شکست کے بعد مولوی وہاج الدین، عُرف مولوی منو نے عوام کو دوبارہ منظّم کیا اور معمولی ہتھیاروں کے ساتھ اپنی قیادت میں مجاہدین کی ایک کثیر جماعت کو ہمراہ لے کر جیل کی طرف بڑھے۔ (**محاربۂ عظیم**۔ از منشی، کنھیّا لال)

مجاہدین، بڑے نظم وضبط کے ساتھ، جیل کے دروازے کے سامنے
مولوی صاحب کے اشارے کے منتظر، کھڑے ہوگئے۔

مولوی منو نے تکبیر کا نعرہ، بلند کر کے جیل پر حملہ کیا۔ ہجوم، نعرہ کی آواز سن کر جیل پر ٹوٹ پڑا۔ منٹوں میں جیل کا پھاٹک، ٹوٹ گیا۔ محافظ دستہ نے معمولی سا مقابلہ کیا۔
جس میں آٹھ (۸) محافظ، ہلاک ہوئے، باقی، فرار ہوگئے۔

جیل کا پھاٹک کھول دیا گیا۔ سبز رنگ کا اسلامی جھنڈا، جیل پر لہرا دیا گیا اور تمام قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ قیدیوں کے رہا کرنے کے بعد، مولوی صاحب نے ان کے خورد ونوش کا معقول انتظام کر دیا۔ جو لوگ، مجاہدین میں شامل ہونے کے واسطے، تیار ہوئے، ان کو شامل کر لیا گیا۔
اور جو لوگ اپنے گھر جانا چاہتے تھے، ان کو سفر خرچ، دے کر، روانہ کر دیا گیا۔
ان قیدیوں میں ایک شخص، ٹھاکر دوارہ کا پونگا، اہیر بھی تھا۔

اِس کارروائی کے ساتھ، مولانا وہاج الدین، عُرف منو نے مجاہدین کا شمار کرایا جو تعداد میں، بارہ سو (۱۲۰۰) کے قریب تھے۔ کچھ مجاہدین کے پاس، معمولی قسم کے ہتھیار بھی تھے۔

مولانا صاحب نے مجاہدین کی ایک جماعت، تیار کر کے، عجلت کے ساتھ
سید گلزار علی ولد سید اکبر علی، امروہوی کی قیادت میں
امروہہ پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ کر دی۔ (تاریخِ واسطیہ)
یہ لوگ، رات ہی میں روانہ ہوگئے۔

مولوی منو کے فتویٰ اور تحریر وتقریر سے ضلع کے عوام، بھڑک اٹھے تھے۔ شہر و دیہات میں آزادی کی لڑائی پھیلتی جا رہی تھی اور انگریزی راج، آہستہ آہستہ، ختم ہوتا جا رہا تھا۔

افسوس کہ نواب رام پور نے اپنی فوجی قوت سے انگریزی اقتدار کو دوبارہ آنے میں

بے حد، مدد کی، جس کی وجہ سے اس علاقے میں جنگِ آزادی، ناکام ہوگئی۔
اور مسلمانوں کو تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ واقعات، ۱۸۵۷ء میں پیش آرہے تھے۔ مجاہدینِ آزادی کا قافلہ، آہستہ آہستہ ۱۸۵۸ء تک پہنچا کہ شہزادہ، فیروز شاہ، ۷؍رمضان المبارک ۱۲۷۴ھ مطابق ۲۲؍اپریل ۱۸۵۸ء مع فوج، مراد آباد پہنچا۔ شکست کے بعد، مولوی صاحب اپنے مکان میں روپوش ہوگئے۔

اس وقت، شہر میں گھر گھر، مسلمانوں کی گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔ مولوی وہاج الدین عُرف مولوی منو کی گرفتاری کے لئے ان کے ایک نمک خوار، فخر الدین کلال کو مال و زر کا لالچ دے کر، اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ گرفتار کرا دے۔ (**محاربۂ عظیم**۔ از منشی، کنھیّا لال)

اس غدار نے وعدہ کر لیا اور ایک دستہ، فوجی سپاہیوں کا لے کر، مولوی صاحب کے مکان پر پہنچا۔ حسبِ دستور، دروازہ پر دستک دی اور اپنے آنے کی اطلاع، مولانا صاحب کو کرائی۔
مولوی صاحب نے کہہ دیا کہ آنے دو۔
یہ غدار، دروازہ کھلتے ہی مع فوجی دستہ کے، مکان میں داخل ہوا۔
ملازموں نے روکا، مگر، یہ لوگ نہیں رکے اور مکان کے اندر، داخل ہوگئے۔
مولوی صاحب، دالان کے اندر، تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ روزہ دار تھے۔
اور رمضان المبارک کی ۲۴؍تاریخ تھی۔ (**اخبار الصّنادید**۔ مرتّبہ: حکیم نجم الغنی، رام پوری)

عصر ومغرب کے درمیان کا وقت تھا۔ مولوی صاحب، تلاوتِ قرآن پاک کر رہے تھے کہ وقتِ اَجَل آپہنچا۔ ملازم کے روکنے پر، پہلے، اس کو گولی ماری۔
اس کے بعد، مولوی وہاج الدین، عُرف منو پر گولیوں کی بوچھار کر دی۔
مولوی صاحب، برابر میں رکھی ہوئی بندوق بھی نہیں اٹھا سکے کہ شہید ہوگئے۔

فوجی دستہ، مولوی صاحب کی لاش اور ان کے ملازم کی لاش اٹھا کر لے گیا اور رات کی تاریکی میں ایک ایسے مقام پر دفن کر دیا، جس کا مشکل سے سراغ مل سکا۔ (**گزیٹر، مراد آباد**)

مولوی صاحب کی شہادت کے بعد، ان کے اہل وعیال کے ساتھ، بے حد ظلم وستم کیا گیا اور تمام جائدادیں، ضبط کر کے، عورتوں اور بچوں کو مکان سے نکال دیا۔
اور کوڑی کوڑی کا محتاج کر دیا گیا۔ اس وقت، انگریز کا، ہندوستانیوں پر، ہر قسم کا تشدُّد، جائز تھا۔

جو،اس وقت کے مؤرخ کی نظر میں
انگریز بہادر کا بے حد، انصاف اور کم سے کم، سزا تھی، جو ہندوستانیوں کو دی جا رہی تھی۔

مولوی صاحب کی قبر، محلّہ کنجری سرائے کے اُس مقام پر واقع ہے، جہاں، بالاجی کا مندر ہے۔ کچہری روڈ پر، اس کے سامنے، سڑک جو مغرب کی سمت کو جاتی ہے، دیہاتی بک کی کروٹ سے تھوڑی دور، لبِ سڑک، نیم کے درخت کے سایہ میں دو قبریں ہیں اور بہت چھوٹی سی مسجد بھی قریب ہی میں واقع ہے اور ایک چھوٹا مکان ایک مسلمان کا ہے، جو اس مزار کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

شہیدوں کے مزار پر ایک خاموش قسم کا پُر کیف ماحول ہے۔
جس سے انسان کے دل پر خود بخود، یہ اثر محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کوئی شہید، آرام فرما ہے۔
بقول: شہزادی، زیب النساء:

برمزارِ ما غریباں، نے چراغے نے گُلے
نے پرِ پروانہ سوزد، نے صدائے بلبلے

۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کو، جب، شہر مراد آباد پر آفتاب، طلوع ہو رہا تھا
تو غاصب انگریز کا آفتابِ اقبال، غروب ہونے کے قریب تھا کہ:
غدار ہندوستانیوں نے خود ہی سہارا دے کر، غروب ہونے سے بچا لیا۔
اور اپنی غلامی کو، نوے (۹۰) سال تک اور بڑھا دیا۔

جس وقت، مولوی وہاج الدین، عُرف منو کی قیادت میں مراد آباد جیل پر عوامی حملہ ہوا محافظوں نے تھوڑی مزاحمت کے بعد، راہِ فرار، اختیار کی۔ جیل کا پھاٹک توڑ دیا گیا اور قیدی رہا کر دیے گئے۔ انگریزی جھنڈا اُتر چکا تھا اور سبز رنگ کا جھنڈا لہرا دیا گیا۔''

(ص ۲۵۔ **خان بہادر شہید**)

قیدیوں میں سے، جن لوگوں نے آزادی میں شامل ہونا چاہا
اُن کو شریک کیا۔ باقی لوگوں کو سفر خرچ دے کر واپس کر دیا۔''

(ص ۱۲۰ تا ۱۲۵۔ ''**مراد آباد! تاریخِ جدوجہدِ آزادی**''۔ مؤلّفہ: سید محبوب حسین، سبزواری، مراد آبادی۔ مطبوعہ: مراد آباد۔ یوپی)

○○○

بریلی کے عالم و مجاہدِ انقلاب
مولانا رضا علی خاں، بریلوی

قندھار سے ہندوستان آکر رہائش پذیر ہونے والے وہ آبا و اَجداد، جن سے مولانا رضا علی خاں، بریلوی (متولد ۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۹ء۔ متوفی جمادیٰ الاولیٰ ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۵ء) کا سلسلۂ نسب ملتا ہے، وہ، اِس طرح ہے:

مولانا رضا علی خاں، بریلوی ولد مولانا محمد اعظم خاں ولد حافظ محمد کاظم علی خاں ولد محمد سعادت یار خاں ولد محمد سعید اللہ خاں، قندھاری۔

خانوادۂ رضویہ، بریلی (روہیل کھنڈ) کے مورثِ اعلیٰ، شجاعت جنگ، شہزادہ سعیدُ اللہ خاں قندھاری، افغانی قبیلہ بڑھیچ کے ایک بہادر اور نامور فرزند تھے، جو قندھار سے لاہور آئے۔

یہاں آپ، منصبِ شش ہزاری پہ فائز ہوئے اور گورنر لاہور نے
شیش محل، لاہور میں آپ کو اِعزاز و اِکرام کے ساتھ ٹھہرایا۔

ہندوستان پر، بزمانۂ سلطان محمد شاہ، جب نادر شاہ دُرّانی نے ۱۷۳۱ء میں حملہ کیا
اُس وقت کی یہ بات ہے۔ پھر آپ، لاہور سے دہلی، منتقل ہو گئے۔

دہلی میں سعید اللہ خاں کو فوج میں اعلیٰ منصب ملا اور روہیل کھنڈ (سابق نام: کٹھیر) میں ایک بڑی مُہم، سَر کرنے کے اِنعام میں آپ کو بریلی کا صوبہ دار بنائے جانے کے لئے شاہی فرمان، جاری ہوا، مگر، آپ کے بسترِ علالت پر ہونے کی وجہ سے اس پر عمل، نہ ہو سکا۔

اپنے آبا و اَجداد کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے خانوادۂ رضویہ بریلی کے ایک معروف عالمِ دین، حضرت مولانا حسنین رضا بریلوی (متوفی ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء) بن مولانا حسن رضا بریلوی (متوفی ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء) بن مولانا نقی علی بریلوی (متوفی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) بن مولانا رضا علی بریلوی (متوفی ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۵ء) تحریر فرماتے ہیں:

''اِس ضلع میں، ان (شہزادہ، سعید اللہ خاں) کو ایک جا گیر، عطا ہوئی
جو، ۱۸۵۷ء میں ضبط ہوکر، تحصیل مِلک ضلع رام پور میں شامل کر دی گئی۔
اس جا گیر کا مشہور اور بڑا موضع، دھنیلی تھا، جو، اَب بھی موجود ہے۔
بریلی کی سکونت، اِس لئے مستقل ہوگئی کہ:
اسی دَور میں کوہستانِ روہ کے کچھ پٹھان خاندان، یہاں آکر
آباد ہوگئے تھے۔ ان کے لئے ان کا جوار، بڑا خوش گوار تھا۔
اِس واسطے کہ ان سے بُوئے وطن آتی تھی۔
سعید اللہ خاں صاحب، جب پیرانہ سالی سے دست کش ہوئے
تو اپنی آخری عمر، یادِ الٰہی میں متوکّلانہ گذار دی۔ اور جس میدان میں ان کا قیام تھا
وہیں، دفن ہوئے۔ مسلمانوں نے اسی میدان کو قبرستان میں منتقل کر لیا۔
یہ میدان، اب محلّہ معماران، بریلی کے متصل، واقع ہے۔
اور، اسی مناسبت سے اب تک شاہزادہ کا تکیہ کہلاتا ہے۔
اس وقت، ان کے صاحبزادے، سعادت یار خاں، وزیر دربارِ دہلی
ہو چکے تھے۔ انھوں نے دہلی میں اپنی وزارت کی دو نشانیاں چھوڑیں:
بازار سعادت گنج اور سعادت خاں کی نہر۔
نہ معلوم، حوادثِ روزگار کے دستِ ستم سے
ان میں سے کوئی نشانی بچ سکی ہے، یا نہیں؟
ان کی مُہرِ وزارت بھی، اس خاندان میں میری جوانی تک موجود رہی۔''

(ص ۱۴۱۔ ''**سیرتِ اعلیٰ حضرت**''۔ مکتبہ: مشرق، بریلی۔ طبعِ اول ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء۔
ازمولانا حسنین رضا بریلوی، متوفی ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء)

محمد اعظم خاں، فرزندِ سعادت یار خاں کے بارے میں

حضرت مولانا محمد ظفر الدین، قادری، رضوی، عظیم آبادی (متوفی ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء) لکھتے ہیں:

''ان (سعادت یار خاں) کے تین صاحبزادے تھے: (۱) اعظم خاں (۲) معظم خاں (۳) مکرم خاں۔ جو بڑے بڑے مناصبِ جلیلہ پر فائز تھے، جو ایک ہزار ماہوار سے کم، نہ تھا۔
اعظم خاں صاحب، بریلی، تشریف فرما ہوئے اور مُتبَتِّل اِلیٰ اللہ ہوکر
زُہدِ خالص و تَرکِ دنیا، اختیار فرمایا۔ شاہزادہ کا تکیہ، جو محلّہ معماران بریلی میں ہے
آج بھی انھیں کی نسبت سے مشہور ہے۔ انھوں نے وہیں قیام فرما لیا تھا اور وہیں ان کا مزار ہے۔
ان کے صاحبزادے، حافظ محمد کاظم علی خاں صاحب، ہر پنج شنبہ کو سلام کے لئے حاضر ہوتے۔''

(ص ۸۲۔ ''**حیاتِ اعلیٰ حضرت**، حصہ اول''۔ (محرَّرہ ۱۹۳۸ء) ترتیبِ جدید، مطبوعہ: رضا اکیڈمی۔ ممبئ)

مزید، لکھتے ہیں:

''حضرت، حافظ کاظم علی خاں صاحب (فرزندِ محمد اعظم خاں)
شہر بدایوں کے تحصیل دار تھے۔ اور یہ عہدہ، آج کل کی کلکٹری کے قائم مقام تھا۔
دوسو سواروں کی بٹالین، خدمت میں رہتی تھی۔
آٹھ گاؤں، جا گیر (مغل) شاہی دربار سے دَوامی لاخراجی، معافی، عطا ہوئے تھے۔''

(ص ۸۴۔ **حیاتِ اعلیٰ حضرت**، حصہ اول۔ طبعِ جدید۔ رضا اکیڈمی۔ بمبئ)

مولانا حسنین رضا بریلوی اپنے آبا و اَجداد کے اوّل الذکر حالات کے بعد لکھتے ہیں:

''حافظ کاظم علی خاں صاحب مرحوم کے دَور میں مغلیہ حکومت کا زوال، شروع ہو گیا تھا۔
ہر طرف بغاوتوں کا شور اور ہر صوبے میں آزادی و خود مختاری کا زور ہو رہا تھا۔
اس وقت کوئی تدبیر، کارگر، نہ ہوئی، تو حافظ کاظم علی خاں، دہلی سے لکھنؤ آ گئے۔
ادھر، انگریزوں کا زور بڑھ رہا تھا اور حکومت میں تعطُّل پیدا ہو گیا تھا۔
آپ نے اَوَدھ کی سلطنت میں بھی کارہائے نمایاں، انجام دیے۔
ان کو بھی یہاں، دربارِ اَوَدھ سے ایک جا گیر عطا ہوئی، جو ہم لوگوں تک، باقی رہی اور ۱۹۵۴ء میں جب، کانگریس نے دیہی جائدادیں، ضبط کیں، تو ہماری معافی بھی ضبطی میں آ گئی۔
حافظ کاظم علی خاں صاحب نے دو بیٹے اپنے وارث، چھوڑے اور جا گیریں چھوڑیں۔

ان کے دو بیٹے، مولانا رضا علی خاں صاحب اور حکیم تقی علی خاں صاحب تھے۔

حکیم تقی علی خاں صاحب نے فنِ طب میں مہارت، حاصل کی۔

اور ریاستِ جے پور (راجپوتانہ) میں طبیبِ خاص ہوئے۔

مولانا رضا علی خاں صاحب (جو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کے حقیقی دادا تھے)

پہلے شخص ہیں، جو، اس خاندان میں دولتِ علمِ دین لائے۔

اور علمِ دین کی تکمیل کے بعد، انھوں نے سب سے پہلے، مَسندِ افتا کو رونق بخشی تو اس خاندان کے ہاتھ سے تلوار چھوٹی اور تلوار کی جگہ، قلم نے لے لی۔

اب، اس خاندان کا رُخ، ملک کی حفاظت سے دین کی حمایت کی طرف ہوگیا۔"

(ص ۱۴۱۔ "سیرتِ اعلیٰ حضرت"۔ مکتبہ مشرق، بریلی)

حافظ کاظم علی خاں بریلوی کو حضرت مولانا انوارُ الحق، فرنگی محلی لکھنوی (متوفی شعبان ۱۲۳۶ھ/ مئی ۱۸۲۱ء) سے سلسلۂ قادریہ رزّاقیہ میں اجازت وخلافت، حاصل تھی۔

آپ، ہر سال، بارہ ربیع الاول کو میلادِ مبارک کی محفل کیا کرتے۔

جو خانوادۂ رضویہ میں اب تک، جاری ہے۔

مفتی صدرُ الدین آزردہ، صدرُ الصُّدور دہلی (متوفی ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) کی عدالت میں محمد اعظم خاں کے ایک کٹہرہ، واقع، دہلی کی ملکیت کے مقدمہ نمبر ۵۵، ۱۸۴۵ء کا فیصلہ رضا علی خاں ولد حافظ محمد کاظم علی خاں ولد محمد اعظم خاں کے حق میں ہوا۔

مولانا رحمٰن علی، ممبر کونسل ریاستِ ریواں (موجودہ مدھیہ پردیش) مؤلّفِ "**تذکرۂ عُلمائے ہند**" (متوفی ۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء) امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے حقیقی دادا مولانا رضا علی، بریلوی (متوفی ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۵ء) کے بارے میں لکھتے ہیں:

(فارسی سے ترجمہ) "مولانا رضا علی خاں صاحب بریلوی بن محمد کاظم علی خاں بن محمد اعظم خاں بن محمد سعادت یار خاں بہادر، بریلی، ملکِ روہیل کھنڈ کے بزرگ ترین عُلمائے کرام سے اور قومِ افغان، بڑھیچ سے تھے۔

ان کے آبا وَ اَجداد، سلاطینِ دہلی کے دربار میں بڑے عالی مرتبہ منصبِ شش ہزاری پر فائز تھے۔

مولانا رضا علی خاں صاحب ۱۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے اور شہرِ ٹونک (راج پوتانہ) میں مولوی خلیلُ الرحمٰن صاحب مرحوم ومغفور سے علومِ درسیہ، حاصل کر کے ۲۲ سال کی عمر میں ۱۲۴۵ھ کو سندِ فراغ، حاصل کر کے مُشارٌ اِلیہ اَماثل وَ اَقران ومشہورِ اطراف وزمان ہوئے۔

خصوصاً، فقہ وتصوف میں کامل مہارت، حاصل کی۔

بہت پُر اثر تقریر فرماتے۔ آپ کے اوصاف، شمار سے باہر ہیں۔

خصوصاً، سبقتِ کلام، زُہد وقناعت، علم وتواضع، تجرید وتفرید، آپ کی خصوصیات سے تھیں۔

۲/ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۶ھ میں اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی۔

(**تذکرۂ عُلمائے ہند**۔ از مولانا رحمٰن علی۔ طبع دوم ۱۹۱۴ء۔ نولکشور، لکھنؤ ومطبوعہ: کراچی ۱۹۶۱ء)

مولانا رضا علی بریلوی (متولد ۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۹ء۔ متوفی ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۵ء) کا سلسلۂ اجازت وخلافت اور سندِ حدیث، مولانا خلیل الرحمٰن کے واسطہ سے بحرالعلوم، حضرت علاّمہ محمد عبدالعلی، فرنگی محلی لکھنوی (متوفی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) تک، متصل ہے۔

خلیفۂ حضرت شاہ محمد آفاق، نقش بندی، مجدّدی، دہلوی قُدِّسَ سِرُّہٗ

حضرت مولانا شاہ فضلِ رحمٰن، گنج مرادآبادی (متولد ۱۲۰۸ھ/۹۳-۱۷ء ومتوفی ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء)

تلمیذِ حضرت مولانا نورُ الحق، فرنگی محلی، لکھنوی وتلمیذِ حضرت شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی وشاہ محمد اسحٰق، دہلوی سے، حضرت مولانا رضا علی بریلوی کو بیعت وارادت اور انہیں سے اجازت وخلافت، حاصل تھی۔

مفتی محمد عوض، بدایونی ثم بریلوی، جب، ۱۸۱۶ء میں بریلی سے ٹونک (راج پوتانہ) چلے گئے اور وہیں ۱۸۲۱ء میں آپ کا انتقال ہوا، جس کی وجہ سے بریلی کی مسندِ اِفتا، خالی ہوئی تو اسے حضرت مولانا رضا علی بریلوی نے رونق بخشی۔

اور بِحَمْدِہٖ تَعالیٰ، یہ سلسلۂ اِفتا، نسلاً بعد نسلٍ، آج تک، خانوادۂ رضویہ میں جاری ہے۔

متحدہ ہندوستان میں رائج ومشہور "**خطبۂ علمی**" حضرت مولانا رضا علی بریلوی ہی کے تحریر کردہ ہیں۔ جو آپ کے ایک عزیز شاگرد، مولانا محمد حسن علمی، بریلوی (متوفی ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء) کے نام سے شائع ہوکر، متحدہ ہندوستان کے شہر شہر میں مقبول ہوئے۔

مولانا رضا علی بریلوی کے ایک دوسرے شاگرد ومرید، مولانا فخر الدین تھے۔

جوسندیلہ، ہردوئی (اَودھ) کے باشندے تھے۔انگریزوں کے خلاف، انقلابِ ۱۸۵۷ء میں
جنگ کرتے ہوئے، بریلی ہی میں آپ، شہید اور وہیں، مدفون ہوئے۔

مولانا رضاعلی بریلوی، عالمِ دین ہونے کے ساتھ، بہادر اور بَطلِ حریت بھی تھے۔
فرنگی اقتدار کے خلاف، آپ نے بریلی میں مورچہ سنبھال رکھا تھا۔

جنرل ہڈسن جیسے برطانوی جنرل نے آپ کا سر، قلم کرنے کا انعام، پانچ سو روپے مقرر کر رکھا
تھا۔مگر، اپنے مقصد میں، وہ، ناکام رہا۔(ائمّۂ اہلِ سُنّت نمبر۔ ماہنامہ **طریقت**، دہلی۔
شمارہ اپریل ۱۹۲۰ء۔بقلم محمد احسن، نانوتوی۔بحوالہ ص:۹۶۔مولانا رضاعلی خاں بریلوی اور جنگِ آزادی۔
مؤلّفہ: مولانا محمد شہاب الدین رضوی۔مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء)

جب، آپ نے جنگِ آزادی میں برطانوی حکومت کے خلاف، حصہ لیا
تو انگریزوں نے آپ کے اِحاطہ میں نقب زنی کر کے پچیس گھوڑے چوری کر لیے۔
کیوں کہ آپ اپنے تمام گھوڑے، مجاہدینِ آزادی کو انگریزوں کی پناہ گاہ پر
شب خون مارنے کے لئے مفت دیا کرتے تھے۔

برطانوی مؤرخ، میلسن اور روہیل کھنڈ گزٹ ۱۸۷۷ء کے حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ:
بریلی کے اندر، جب، لوگوں میں برطانوی حکومت کے خلاف، شورش پھیلی
تو اس یورش کے تمام تر ذمّہ دار، جنرل بخت خاں اور ان کے ساتھی، شاہ رضاعلی ولد کاظم علی
ولد سعادت یار خاں، پٹھان تھے، جو بریلی کے عوام کو برطانوی حُکّام کے خلاف اُکسانے میں
نہ صرف مجرم ٹھہرے، بلکہ انہوں نے بریلی کی عوام کو برطانوی فوج کے خلاف مقابلہ کے لئے
بے حد برافروختہ کیا۔ اگر، مُلّا رضا علی، اپنے عقیدت مندوں سمیت ہمارا مقابلہ نہ کرتا
تو بریلی شہر پر ہمارا قبضہ، آسان ہوتا۔مگر، مولوی رضا علی خاں کی وجہ سے برطانوی افواج کو
کافی کشت وخوں کے مرحلے سے گذرنا پڑا۔ پھر بمشکل، بریلی پر قبضہ ہوسکا۔''

(ص ۹۹۔**مولانا رضا علی بریلوی اور جنگِ آزادی**۔مؤلّفہ: مولانا محمد شہاب الدین رضوی۔
مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی، ۲۰۰۷ء)

حضرت مولانا محمد ظفرالدین، قادری، رضوی، عظیم آبادی (وصال ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء لکھتے ہیں:
''۱۸۵۷ء کے بعد جب، انگریزوں کا تسلُّط ہوا اور انھوں نے شدید مظالم کیے

تو لوگ، ڈر کے مارے، پریشان پھرتے تھے۔ بڑے لوگ اپنے اپنے مکانات چھوڑ کر
گاؤں وغیرہ چلے گئے۔لیکن، حضرت مولانا رضا علی خاں صاحب، رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ
محلّہ ذخیرہ (بریلی) اپنے مکان میں برابر تشریف رکھتے۔
اور پنج وقتہ نمازیں، مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کیا کرتے تھے۔
ایک دن، حضرت، مسجد میں تشریف رکھتے تھے کہ ادھر سے گوروں (انگریزوں) کا گذر ہوا۔
انھیں خیال ہوا کہ شاید مسجد میں کوئی شخص ہو، تو اسے پکڑ کر پیٹیں۔
مسجد میں گھُسے، اِدھر اُدھر گھوم آئے۔ بولے کہ مسجد میں کوئی نہیں ہے۔
حالاں کہ حضرت، مسجد ہی میں تھے۔اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اندھا کر دیا تھا کہ حضرت کو دیکھنے
سے معذور، رہے۔'' (ص ۔۸۷۔**حیاتِ اعلیٰ حضرت**، حصہ اول۔ترتیبِ جدید۔مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی)

حضرت شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء)
اور علاّمہ فضلِ امام خیرآبادی (متوفی ۱۲۴۴ھ/ ۲۹۔۱۸۲۸ء) کے شاگرد
مفتی صدرالدین، آزردہ دہلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) سے
مولانا رضاعلی، بریلوی نے فنِ شاعری میں اِکتسابِ فیض کیا تھا اور شاعری بھی کیا کرتے تھے۔

۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء میں مسندِ اِفتا پر، رونق افروز ہونے کے بعد
۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۵ء تک مولانا رضاعلی، بریلوی نے اپنے فرائض، بحسن وخوبی، انجام دیے۔
ساٹھ سال کی عمر میں ۶ / جمادی الاولیٰ ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۵ء کو بریلی میں آپ کا وصال ہوا۔
قبرستان، بہاری پور۔سِوِل لائن، نزدِ سٹی اسٹیشن، بریلی، آپ کی آخری آرام گاہ ہے۔

حکیم عبدالحیٔ، رائے بریلوی، ناظمِ دارُالعلوم ندوۃ العُلما، لکھنؤ (متوفی ۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۳ء)
نے آپ کے بارے میں لکھا ہے کہ:
''مولانا محمد رضاعلی خاں نے ۲۳ برس کی عمر میں علومِ منقولہ کی تکمیل کی۔
اپنے معاصرین کے درمیان، ممتاز تھے۔علمِ فقہ میں بڑی مہارت، حاصل کی تھی۔''
(ترجمہ از **نزھۃ الخواطر**، جلد ۷۔مطبوعہ: حیدرآباد دکن)

حضرت مولانا مفتی نقی علی، بریلوی (متولد ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء۔متوفی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء)
فرزندِ حضرت مولانا رضاعلی، بریلوی (متوفی ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۵ء) کے بارے میں

حضرت مولانا حسنین رضا، بریلوی (متوفی ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء) لکھتے ہیں:

''جب، ان (مولانا رضا علی، بریلوی) کے بیٹے
مولانا نقی علی خاں صاحب رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ نے بھی ان سے سندِ تکمیل، حاصل کر لی
تو اِفتا اور زمینداری، یہ دونوں کام، مولانا نقی علی خاں کے سپرد ہو گئے۔
مولانا نقی علی خاں صاحب، رَحْمَةُ اللّٰه عَلَيْهِ نے بھی علاوہ فتویٰ نویسی کے
چھوٹی بڑی پچیس کتابیں، تصنیف فرمائیں، جن میں سے کچھ ہی کتابیں چھپ سکیں۔
"سُرُورُ الْقُلُوب فِي ذِكْرِ الْمَحبوب" اور "جَوَاهِرُ الْبَيَانُ فِي اَسْرارِ الْاَرْكان"
یہ دونوں ضخیم کتابیں، بار بار چھپ کر، دنیا میں پھیل چکی ہیں۔
ان کا شمار، شہر کے رؤسا میں تھا اور ہندوستان کے بڑے عُلما میں گنے جاتے تھے۔
ان کا، اس دنیا میں سب سے بڑا شاہکار، اعلیٰ حضرت (امام احمد رضا) قُدِّسَ سِرُّهٗ
جیسے جلیلُ القدر فاضل کی تربیت ہے۔ جو، صدیوں، ان کا نام، زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔''

(ص ۴۲۔ ''سیرتِ اعلیٰ حضرت''۔ مطبوعہ: بریلی)

مولانا رحمٰن علی، ان کے حالات میں لکھتے ہیں کہ:

''مولوی نقی علی خاں بریلوی، ذہنِ ثاقب ورَائے صایب داشت۔
خالق تعالیٰ وَے را بعقلِ معاش و معاد، ممتازِ اَقران آفریدہ بود۔
علاوہ شجاعتِ جبلّی، بصفتِ سخاوت و تواضع و اِستغنا، موصوف بود۔
عمرِ گرانمایۂ خودِ باشاعتِ سُنَّت وَ اِزالۂ بدعت، بسر بُردہ۔
اعلانِ مناظرۂ دینی، مسمیٰ، بنامِ تاریخی ''اِصلاح ذات الْبَين'' بتاریخ بست و ششم شعبان
سال دوازدہ صد و نود و سہ ہجری، شایع فرمودہ۔
و در اِمتناعِ مماثلتِ رسولِ اَکرم ﷺ سَعیِ مَوفور بکار بُردہ کہ رسالہ ''تَنْبِيهُ الْجُهَّال''
بآں، خبرمی دہد۔ اِلیٰ آخِرِہٖ۔ (تذکرۂ عُلمائے ہند۔ مطبوعہ: نول کشور، لکھنؤ ۱۹۱۴ء)

ذیل میں مولانا رحمٰن علی کے تحریر کردہ حالات کا پورا ترجمہ، ملاحظہ فرمائیں:

''مولوی نقی علی خاں، بریلوی بن مولوی رضا علی خاں، ساکن روہیل کھنڈ
غرّۂ رجب ۱۲۴۶ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد ماجد سے تعلیم و تربیت پائی۔

اور علومِ درسیہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ ذہنِ ثاقب و رائے صائب رکھتے تھے۔
حق تعالیٰ نے، ان کو عقلِ معاش و معاد، دونوں میں ممتازِ اَقران بنایا تھا۔
علاوہ فطری شجاعت کے، آپ، صفتِ سخاوت و تواضع و اِستغنا سے موصوف تھے۔
اپنی تمام قیمتی عمر، اشاعتِ سُنَّت و اِزالۂ بدعت میں صَرف فرمائی۔
مسئلۂ اِمتناعِ نظیرِ محمدی میں ایک دینی مناظرہ کا اعلان، بنامِ تاریخی ''اِصلاح ذات الْبَين''
۲۶ رشعبان المعظم ۱۲۹۳ھ میں شایع فرمایا اور مسئلۂ اِمتناعِ نظیرِ حضور نبیِ اَکرم ﷺ میں
بہت سَعیِ بلیغ فرمائی اور مخالفین کا رَد کیا۔ جس کا مفصَّل بیان
''تنبيهُ الْجُهَّال بِالْهامِ الْبَاسِطِ الْمُتَعال'' میں طبع ہو کر، شایع ہو چکا ہے۔''
۱۲۹۴ھ میں تاجدارِ مارہرہ مطہَّرہ، سیدنا شاہ آلِ رسول، احمدی قُدِّسَ سِرُّهٗ کی خدمت میں
حاضر ہو کر شرفِ بیعت سے مشرف ہوئے اور جملہ سلاسلِ قدیمہ و جدیدہ و سندِ حدیث شریف
اور خلافت سے معزز و ممتاز ہو کر ۱۲۹۵ھ میں حج و زیارتِ حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔
اور حضرت سیدی شیخ احمد بن زَین دحلان و دیگر عُلمائے حرمین شریفین سے
اجازت و سندِ حدیث، حاصل کی۔
سلخ ذی القعدہ ۱۲۹۷ھ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا اور جان، جاں آفریں کے سپرد کیا۔''

(تذکرۂ عُلمائے ہند۔ از مولوی رحمٰن علی۔ مترجم پروفیسر محمد ایوب قادری۔ مطبوعہ پاکستان ہسٹاریل سوسائٹی، کراچی)

مولانا سید ہدایت علی بریلوی (تلمیذِ مفتی محمد عوض بدایونی ثم بریلوی و علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی) لکھتے ہیں:

''مجمعِ مَکارمِ اَخلاق، مَنبعِ جود و اشفاق، مقبولِ بارگاہِ ربُّ العالمین، مدّاحِ سیدُ المرسلین
ہادیِ امتِ رسولِ خدا، بحرِ مَوّاجِ علمِ صدق و صفا، افضل عُلمائے زماں
مولوی محمد نقی علی خاں بن مولوی محمد رضا علی خاں، بریلوی ہیں۔
ان کی تعریف میں زبانِ قلم، لال ہے۔ انسان سے ان کی خوبیوں کا بیان، محال ہے۔''

(تقریظ، بر سرورُ الْقُلوب۔ مؤلّفہ: مولانا مفتی نقی علی بریلوی۔ مطبوعہ: بریلی)

پانچ جمادیٰ الآخرہ ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء کو محبُّ رسول، تاجُ الفحول، حضرت مولانا عبد القادر
قادری، برکاتی، مجیدی، بدایونی (متوفی ۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء) کے ساتھ
مولانا نقی علی بریلوی اور آپ کے فرزند، امام احمد رضا، قادری، برکاتی، بریلوی

مارہرہ شریف پہنچ کر خاتم الاکابر، حضرت سید شاہ آلِ رسول، احمدی
قادری، برکاتی مارہروی (متوفی ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء) سے
بیعت ہوئے اور اجازت وخلافت وسندِ حدیث سے نوازے گئے۔

جنرل بخت خاں اور خان بہادر خاں، روہیلہ، پٹھان تھے۔ ان دونوں کا نسبی علاقہ قبیلہ بڑھیچ سے تھا۔ خود، مولانا رضا علی خاں بریلوی بھی قبیلہ بڑھیچ سے نسبی علاقہ رکھتے تھے۔
اِس لئے ان میں باہم، ربط وہمدردی اور اخوت ووابستگی تھی۔

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا بگل بجتے ہی مجاہدینِ جنگِ آزادی، میدان میں نکل پڑے اور انھوں نے دادِ شجاعت دی۔

بریلی میں بھی مولانا رضا علی بریلوی نے جنرل بخت خاں کو راست اِقدام کی ہدایت دی۔
اور آناً فاناً، مجاہدین، میدان میں نکل پڑے۔ اور انگریزوں کے چھکّے چھڑا دیئے۔
ایک انگریز مؤرخ نے مولانا رضا علی بریلوی کو، یوں، سراہا ہے:

اور بریلی، روہیل کھنڈ کا مرکز تھا۔ عوام، مولانا رضا علی خاں بریلوی کے
عقیدت مند تھے۔ جنرل بخت خان اور خان بہادر خاں کو
آپ کی تائید، حاصل تھی۔ انگریز، مولانا کو اپنا دشمن، تصور کرتے تھے۔
اور آپ کو ہر ممکن طور پر قتل کرنے کے لئے کوشاں تھے۔
لٰھذا، آپ کا سر قلم کرنے والے کو برطانوی جنرل نے انعام دینے کا
اعلان کر رکھا تھا، جس میں انگریزوں کو، کامیابی نہیں ہوئی۔

(الف) روہیل کھنڈ گزیٹر ضلع بریلی، مملوکہ محافظ خانۂ حکومتِ یوپی، بریلی ۱۸۷۷ء۔
(ب) ''حیاتِ مفتیٔ اعظم''۔ از مرزا عبدالوحید بیگ۔ بریلوی۔ ص ۲۵۔ مطبوعہ: بریلی۔

مولانا رضا علی خاں بریلوی، جنگِ آزادیٔ ہند کے عظیم رہنما تھے۔
عمر بھر، فرنگی اقتدار کے خلاف، برسرِ پیکار رہے۔ جنرل ہڈسن، برطانوی کمانڈر نے مولانا کا سر قلم کرنے کے لئے پانچ سو روپے کا انعام، مقرر کیا تھا، مگر، وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا۔
محاربۂ عظیم، از کنھیّا لال۔ ص ۲۸۷۔ مطبوعہ: لکھنؤ ۱۹۱۶ء۔
مشہور صحافی ومؤرخ، میاں محمد شفیع، رقم طراز ہیں:

''آفریں ہے، روہیل کھنڈ کے اُن مجاہدین پر جنھوں نے بریلی کے میدان
میں شجاعت اور قربانی کی مثال، قائم کردی اور بتادیا تھا کہ:
مسلمان، بے چارگی میں بھی شیرِ نیساں اور پیل دماں ہے۔
جب، وہ اللہ کے نام پر تلوار اٹھاتا ہے
تو کائنات کو ٹھکرا کر موت سے ہم آغوش ہوجاتا ہے۔
باطل کا ہجوم اس کے ضمیر کو زیر نہیں کرسکتا۔
طاقت وجبروت کے سینے میں، وہ پنجے ڈال دیتا ہے۔''
(''۱۸۵۷ء''۔ از میاں محمد شفیع۔ ص ۶۰۔ مطبوعہ: لاہور)

مولانا رضا علی بریلوی کو شیخِ طریقت، اُویسِ زمان، حضرت مولانا شاہ فضلِ رحمٰن، گنج مراد آبادی رَحمَۃُ اللّٰہِ عَلَیہِ (شاگردِ حضرت شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی وخلیفۂ شاہ محمد آفاق، مجدّدی نقشبندی، دہلوی) سے بیعت وخلافت، حاصل تھی اور سلسلۂ نقشبندیہ میں مرید کرتے تھے۔

مولانا مفتی نقی علی، بریلوی بن مولانا شاہ رضا علی، بریلوی، رجب المرجب ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۰ء کو بریلی میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد سے اِکتسابِ علوم وفنون کیا۔
نبیرۂ حافظُ الملک، حافظ رحمت خاں روہیلہ
مولانا نواب، نیاز احمد خاں، ہوشؔ بریلوی لکھتے ہیں:

''گلدستۂ اَوصافِ فراواں، اَفضلُ الامثال وَ الاقران، جناب مولوی محمد نقی علی خاں خَلفُ الصِّدق، مولوی محمد رضا علی خاں، مرحوم ومغفور، نَوَّرَ اللّٰہُ مَرقدَہٗ۔
شہر بانس بریلی میں سکونت پذیر ہیں۔ حُسنِ ظاہری میں بے نظیر ہیں۔ باپ دادا، ان کے عرصۂ دراز سے چمن پیرائے علم ودولت رہے۔ مولوی صاحب بھی ایامِ طفولیت سے تا حال بفضلِ ایزدِ منّان، صرصرِ حوادث سے بچ کر، گلچینِ خیابانِ فضل وعزت رہے۔''
(تقریظ بر سُرورُ القُلوب فِی ذِکرِ النَّبیِ المَحبوب، مؤلّفہ: مولانا نقی علی بریلوی۔ مطبعِ صبحِ صادق، سیتاپور۔ اَوَدھ)

والد ماجد سے سندِ فراغت، حاصل کی اور مسندِ اِفتا کو رونق بخشی۔
مولانا نقی علی بریلوی، تبحرِ علمی، فضل وکمال اور مشاغلِ علمی میں نہایت جامع تھے۔

درس وتدریس آپ کا مشغلہ تھا۔آپ کی ذات، مَرجعِ عُلما تھی۔

سیکڑوں عُلما ومفتیانِ عِظام اورتشنگانِ علوم کومولانا نقی علی بریلوی نے فیض یاب کیا۔

امام احمد رضا، قادری، برکاتی، بریلوی، آپ کے نامور فرزند وتلمیذ ہیں۔

مولانا حسن رضا خاں حسؔن بریلوی ومفتی محمد رضا خاں، بریلوی (فرزندانِ مولانا نقی علی بریلوی) مولانا نواب مرزا بریلوی اور مولانا غلام قادر بیگ بریلوی (متوفی ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۷ء) وغیرہ،، آپ کے تلامذہ ہیں۔

مولانا نقی علی، قادری، برکاتی، بریلوی نے ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء میں فریضۂ حج ادا کیا۔
آپ کے ہمراہ، فرزندِ اکبر، امام احمد رضا، قادری، برکاتی، بریلوی بھی تھے۔

۲۶رشوال ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء میں بریلی سے عازمِ سفر ہوئے۔

اِس حالت میں کہ شدید علیل تھے۔جسمانی ضعف، زیادہ بڑھ گیا تھا۔

چنداَحباب نے عرض کیا کہ:

کیفیت، نازک ہے۔آئندہ پرملتوی فرمادیں۔

آپ نے جواباً، ارشادفرمایا:

"مدینہ طیبہ کے قصد سے قدم، دروازہ سے باہر رکھوں۔

پھر، چاہے روح، اُسی وقت، پرواز کرجائے۔"

(ص۳۷۔حیاتِ مفتی اعظم۔ازمرزاعبدالوحید بیگ بریلوی۔مطبوعہ: بریلی ۱۹۹۰ء)

مولانا نقی علی، قادری، برکاتی، بریلوی بھی اپنے والد، مولانا رضا علی بریلوی کی طرح عالمِ دین ومفتیِ شرعِ متین اور بطلِ حُریت تھے۔

انگریزی اِقتدار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے عُلماے اہلِ سُنَّت نے جہاد کا فتویٰ صادر فرمایا۔اس فتویٰ کے مطابق، جہاد کی تیاری اور عملاً، جہادِ آزادی کرنے کے لئے
جہاد کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔اس کے آپ، رُکنِ رکین، مقرر ہوئے۔

انگریزوں کے خلاف، جنگ کرنے والے مجاہدین کومناسب مقامات پر گھوڑے
اوررَسد پہنچانا آپ کے ذِمَّہ تھا۔جس کو آپ، بحسن وخوبی، انجام دیتے رہے۔

آپ کی تقاریر، انتہائی پُراثر ہوتی تھیں۔ان تقاریر نے مسلمانوں میں

جہادِ آزادی کا جوش وَولولہ بھر دیا تھا۔

اِکیاون (۵۱) سال کی عمر میں، ذوالقعدہ ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء میں وصال پاکر والدِ ماجد، مولانا رضا علی خاں، بریلوی کے بغل میں جگہ پائی۔

سِٹی قبرستان، بریلی میں آپ کا مزار شریف ہے۔

○○○

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں

علّامہ فضلِ حق خیرآبادی کی فِکری قیادت
اور جہاد کا فتویٰ

آخری مغل بادشاہ، بہادر شاہ ظفر (متوفی ۱۸۶۲ء۔ بحالتِ اَسیری در رَنگون) کو میرٹھ (بتاریخ ۱۰/مئی ۱۸۵۷ء) سے، دہلی (بتاریخ ۱۱/مئی ۱۸۵۷ء) پہنچنے والے فوجیوں اور دہلی کے سبھی انقلابیوں نے متفقہ طور پر اپنا بادشاہ سمجھا اور اس کی سرپرستی میں انگریزوں کے خلاف، جنگ کا اعلان کیا۔

مگر، مغل سلطنت اس وقت اپنے اِنحطاط و زوال کے آخری دَور سے گذر رہی تھی۔
بہادر شاہ ظفر، خود کبیرُ السّن وضعیفُ الرّائے تھا۔ اس کے شاہزادے، عیش وعشرت کے دلدادہ و ناتجربہ کار و نااہل بلکہ ناکارہ تھے۔ لال قلعہ، دہلی، سازشوں کا اڈّہ
اور کئی مقربینِ بہادر شاہ انگریزوں کے جاسوس وآلۂ کار بن چکے تھے۔
فوجی آلات واسلحہ، عسکری تربیت، جنگی قوت سے شاہی فوج، بڑی حد تک محروم تھی۔
مالی وسائل اور قوم کے اندر، دفاعی قوت کی کمی تھی۔
دوسری جانب، انگریز مُستعِد وچاق و چوبند اور ہر طرح مُسلّح تھے۔
نتیجہ اور انجام، جو کچھ انقلاب ۱۸۵۷ء کا ہُوا، وہ سب کے سامنے اور تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے اِستحصال اور انگریزوں کے ظلم وہَوسِ ملک گیری کے ساتھ اَسبابِ انقلاب ۱۸۵۷ء کی نشان دہی کرتے ہوئے امامُ الحکمۃِ والکلام، قائدِ جنگِ آزادی
علّامہ فضلِ حق خیرآبادی (وصال بحالتِ اَسیری در جزیرۂ انڈمان ۱۲/صفر ۱۲۷۸ھ/۲۰/اگست ۱۸۶۱ء)
اپنے رسالہ **اَلثَّوْرَۃُ الْھِنْدِیَّۃ** (عربی) میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

(عربی سے ترجمہ) ''وہ برطانوی نصاریٰ، جن کے دل، ممالکِ ہند کے دیہات وبلاد پر قبضہ اور اس کے اَطراف واکناف وسرحدات پر تسلُّط کے بعد، عداوت وکینہ سے بھر گئے تھے۔
اور تمام ذی عزت اَعیان کو ذلیل وخوار کر کے ان میں سے ایک کو بھی
اِس قابل نہ چھوڑا تھا کہ سرِ نافرمانی کو جُنبش دے سکے۔
انھوں نے تمام باشندگانِ ہند کو، کیا، امیر، کیا، غریب، چھوٹے بڑے، مقیم ومسافر، شہری ودیہاتی سب کو، نصرانی بنانے کی اسکیم بنائی۔ اُن (نصاریٰ) کا خیال تھا کہ اِن (اہلِ ہند) کو، نہ تو کوئی مددگار ومُعاون، نصیب ہو سکے گا اور نہ اِنقیاد واطاعت کے سِوا، سَرتابی کی انھیں جرأت ہو سکے گی۔
یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ سب لوگ انھیں کی طرح مُلحد ہو کر
ایک ہی مِلّت پر جمع ہو جائیں اور کوئی بھی ایک دوسرے سے ممتاز فرقہ نہ رہ سکے۔
انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ:
مذہبی بنیاد پر حکمرانوں سے، باشندوں (ہندوستانیوں) کا اختلاف، تسلُّط وقبضہ کی راہ میں سنگِ گراں، ثابت ہوگا۔ اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا۔
اس لئے پوری جاں فشانی اور تن دہی کے ساتھ، مذہب ومِلّت کے مٹانے کے لئے
طرح طرح کے مکر وحیلہ سے کام لینا، شروع کیا۔
انھوں نے بچوں اور نافہموں کی تعلیم اور اپنی زبان ودین کی تلقین کے لئے
شہروں اور دیہاتوں میں مدرسے قائم کیے۔
پچھلے زمانے کے علوم ومعارف اور مدارس ومکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔
دوسری ترکیب، یہ سوچی کہ مختلف طبقوں پر، اس طرح، قابو، حاصل کیا جائے کہ:
زمینِ ہند کے غلّے کی پیداوار، کاشت کاروں سے لے کر نقد دام ادا کیے جائیں۔
اور ان غریبوں کو خرید وفروخت کا کوئی حق نہ چھوڑا جائے۔ اس طرح، بھاؤ کے گھٹانے بڑھانے اور منڈیوں تک اَجناس پہنچانے اور نہ پہنچانے کے وہ خود ہی ذِمّہ دار بن بیٹھیں۔
اس کا مقصد، اس کے سِوا کچھ نہ تھا کہ خَلقِ خدا، مجبور ومعذور ہو کر، ان کے قدموں میں آ پڑے۔
اور خوراک نہ ملنے پر، ان نصاریٰ اور ان کے اَعوان واَنصار کے ہر حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے۔
ان ترکیبوں کے علاوہ، ان کے دل میں اور بھی بہت سے مقاصد چھپے ہوئے تھے۔
مثلاً: مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنا، شریف وپردہ نشین خواتین کا پردہ ختم کرانا۔
نیز، دوسرے اَحکامِ دینِ مُبین کو مٹانا۔ وَغیر ذالِک۔
نصاریٰ نے اپنے مکر کی ابتدا، اِس طرح کی کہ:

سب سے پہلے اپنے ہندو مسلم لشکریوں کو ان کے رُسوم واُصول سے ہٹانے
اور مذہب وعقائد سے گمراہ کرنے کے درپے ہوئے۔
ان کا گمان تھا کہ جب بہادر لشکری اپنے دین کو بدلنے اور احکامِ نصرانیت بجالانے پر
آمادہ ہوجائیں گے، تو پھر دوسرے باشندوں کو سزا وعِقاب کے ڈر سے خود ہی مجالِ انکار، نہ ہو سکے گی۔
انھوں نے ہندو لشکریوں کو، جو تعداد میں زیادہ تھے، گائے کی چربی
اور مسلمان سپاہیوں کو، جو تھوڑی تعداد میں تھے، سُوَّر کی چربی چکھانے پر، زور ڈالا۔
یہ شرمناک رَوِش دیکھ کر دونوں فرقوں میں اضطراب پیدا ہوگیا اور اپنے اپنے مذہب واِعتقاد کی
حفاظت کی خاطر، ان (نصاریٰ) کی اِطاعت واِنقیاد سے منہ موڑ لیا۔
ان (اہلِ ہند) کے اس اضطراب نے خرمنِ امن پر، چنگاری کا کام کیا۔ اِلیٰ آخِرِہٖ۔
(ص ۲۹ تا ۳۳۔ **باغی ہندوستان** (ترجمہ **اَلثَّوْرَۃُ الْھِنْدِیہ لِلعلاّمہ فضلِ حق اَلْخَیر آبادی**)
مترجم: محمد عبدالشاہد، شروانی، علی گڑھی۔ طبعِ چہارم: المجمع الاسلامی۔ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ۔ یوپی۔ انڈیا۔
۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء۔ طبعِ اول: مدینہ پریس، بجنور ۱۹۴۷ء۔ مع مقدمۂ مولانا ابوالکلام آزاد)
بہر حال! ایسے صبر آزما اور سنگین حالات میں دہلی ورُوہیل کھنڈ واَوَدھ کے انقلابیوں سے
جو کچھ ممکن ہوا، وہ انھوں نے کیا اور اپنی جان کی بازی لگا کر اپنے دین ومِلّت کے
تحفظ ودفاع اور ملک ووطن کی حرمت وناموس کی خاطر، سَر بکف ہوکر میدانِ جنگ میں نکل آئے۔
اس وقت کے بعض ممتاز عُلما اور مسلم قائدین، جو کچھ کر سکتے تھے، وہ انھوں نے کیا۔
اور دار وگیر وقید وبند اور گولی وپھانسی کی سزا سے دوچار ہوئے۔
جسے پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل لرزنے لگتے ہیں۔
تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت، منکشف ہوتی ہے کہ:
طبقۂ عُلما میں، دو حضرات ایسے ہیں جو انگریزی حکومت کے ظلم واِستحصال کے خلاف
۱۸۵۷ء سے پچیس تیس سال پہلے ہی، ذہنی وفکری طور پر، اضطراب وبے چینی کے شکار اور آمادۂ پیکار تھے۔
انھیں مناسب موقع کا انتظار تھا اور جب وقت (مئی ۱۸۵۷ء) آیا، تو وہ کھل کر سامنے آگئے۔
ان میں سے ایک، دِلاوَرِ جنگ، مولانا احمد اللہ شاہ، مدراسی (شہادت در ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء)
اور دوسرے، قائدِ جنگِ آزادی، علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی (وصال بحالتِ اَسیری، در جزیرۂ انڈمان۔
۱۲/صفر ۱۲۷۸ھ/۲۰/اگست ۱۸۶۱ء) ہیں۔
مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی (متوفی ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء) سابق لائبریرین
مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، علاّمہ فضلِ حق، خیر آبادی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''علمی قابلیت کا اندازہ تو اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ:
ایک جانب، شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کا ڈنکا، منقولات میں بج رہا تھا
اور دوسری طرف، اسی دہلی میں مولانا فضلِ امام (خیر آبادی) کا، سِکّہ چل رہا تھا۔
طلبہ، دونوں دریاؤں سے سیراب ہو رہے تھے۔
مفتی صدرالدین خاں آزردہ وعلاّمہ فضلِ حق (خیر آبادی) وغیرہُما بھی دوسرے طلبہ کی طرح
حدیث، ایک جگہ پڑھتے تھے اور منطق وفلسفہ، دوسری جگہ'' (ص ۱۳۸۔ سوانح علاّمہ فضلِ حق۔
در ''**باغی ہندوستان**'' از محمد عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی۔ مطبوعہ: المجمع الاسلامی، مبارک پور۔ متعدد ایڈیشن)
سر سید احمد خاں (متوفی ۱۳۱۵ھ/مارچ ۱۸۹۸ء) علامہ فضل حق خیر آبادی کے بارے میں لکھتے ہیں:
''جمیع علوم وفنون میں یکتائے روزگار ہیں۔
اور منطق وحکمت کی، تو گویا، انھیں کی فکرِ عالی نے بِنا ڈالی ہے۔ بارہا، دیکھا گیا کہ:
جو لوگ (اپنے) آپ کو، یگانۂ فن سمجھتے تھے، جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا
دعوائے کمال کو فراموش کر کے، نسبتِ شاگردی کو اپنا فخر سمجھتے۔
(ص ۵۲۶۔ **آثارُ الصَّنادید**۔ از سر سید احمد خاں۔ مطبوعہ اردو اکاڈمی، دہلی۔ ۲۰۰۰ء۔
رئیس احمد جعفری، ندوی (۱۹۱۲ء۔ ۱۹۶۸ء) لکھتے ہیں:
''اکبر بادشاہ ثانی کا زمانہ تھا، دہلی میں ریزیڈنٹ رہا کرتے تھے۔
(مولانا فضل حق، خیر آبادی) اُن کے محکمہ کے سر رشتہ دار ہوگئے۔
ابوظفر ولی عہد (بہادر شاہ ظفر) سے دوستانہ مراسم تھے۔ قلعہ میں آتے جاتے تھے۔
دِلّی وہ دِلّی تھی کہ ایک طرف، حدیث وفقہ کا دَور دَورہ تھا، دوسری طرف، منطق وفلسفہ کی
گرم بازاری۔ شعر وسخن کے گلی کوچے میں چرچے، بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر، موجود۔
ان (فضل حق خیر آبادی) کے ہم سبق، مفتی صدرالدین، آزردہؔ۔
دوستوں میں مولوی امام بخش صہبائیؔ، علاّمہ عبداللہ علوی، حکیم مومن خاں مومنؔ، مرزا اسدُاللہ خاں
غالبؔ، ضیاءالدین خاں نیّرؔ، شاہ نصیرالدین نصیرؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، حکیم آغا جان عیشؔ
حافظ عبدالرحمٰن احسانؔ، میر حسن تسکینؔ جیسے باکمال لوگ تھے۔
شام کو، مولانا (فضل حق) کے یہاں، نشست رہا کرتی۔''
(ص ۸۵۹۔ **بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد**۔ مؤلّفہ: رئیس احمد جعفری، ندوی۔ کتاب منزل، لاہور۔ ۱۹۵۶ء)
دِلاور جنگ، مولانا احمد اللہ شاہ، مدراسی کے والد، نواب محمد علی
سلطان ٹیپو (شہادت ۱۷۹۹ء) کے مُصاحِب ومُشیر اور چِنیا پٹن، تعلقہ پورنا ملّی، جنوبی ہند کے

نواب تھے۔ مولانا مدراسی پر، ریاضت ومجاہدہ وفقر وتصوف کا غلبہ تھا۔

اپنے مُریدوں وعقیدت مندوں کے ساتھ کہیں نکلتے
تو ایک دستہ، نقارہ اور ڈنکا پیٹتا ہوا آپ کے ساتھ چلتا تھا۔
اسی لئے تاریخ میں کہیں کہیں آپ کو ''نقارہ شاہ'' اور ''ڈنکا شاہ'' کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے۔

حیدرآباد دکن، مدراس، انگلستان، مصر، وغیرہ ہوتے ہوئے حجازِ مقدس پہنچ کر حج وزیارت کے بعد ترکی وایران وافغانستان ہوتے ہوئے، جب مولانا مدراسی، واپس ہندوستان آئے
تو، بیکانیر وسانبھر (موجودہ راجستھان) میں، بارہ (۱۲) سال تک ریاضت ومجاہدہ وچلّہ کشی کی۔
جے پور (موجودہ راجستھان) کے میر قربان علی چشتی کے مُرید وخلیفہ ہوئے۔
یہاں سے ریاستِ ٹونک (راج پوتانہ) گئے اور وہاں مجلسِ سماع، منعقد کرنے لگے۔
جس پر کچھ لوگ، چیں بہ جبیں اور معترض ہوئے۔
مولانا مدراسی، کبیدہ خاطر ہوکر، ٹونک (موجودہ راجستھان) سے گوالیار (موجودہ مدھیہ پردیش) چلے گئے۔ گوالیار میں محراب شاہ قلندر، قادری، گوالیاری کی بارگاہ سے منسلک ہوئے
اور اجازت وخلافت سے نوازے گئے۔

مولانا احمد اللہ، مدراسی، جب محراب شاہ قلندر گوالیاری سے وابستہ ہوکر ان سے فیض یاب ہوئے
توانھوں نے یہ ہدایت فرمائی کہ تم، ہندوستان سے انگریزوں کو نکال باہر کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنا۔
اپنی اس ہدایت پر عمل کرنے کا انھوں نے عہد وپیمان بھی لیا۔

چنانچہ، مولانا مدراسی اپنی مُہم میں لگ گئے اور اسے کامیاب بنانے کے لئے دہلی پہنچ کر حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی (وصال ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) وعلامہ فضلِ امام، خیرآبادی (وصال ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء) کے شاگرد اور علاّمہ فضل حق، خیرآبادی (وصال ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) کے ہم سبق ساتھی اور گہرے دوست حضرت مفتی صدرالدین، آزردہ، دہلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) صدرُ الصُّدور دہلی سے

۱۸۴۶ء میں ملاقات کی اور اپنے عزم کا، ان سے اظہار کیا۔
مفتی آزردہ نے فرمایا کہ: اس کے لئے مناسب جگہ، دہلی نہیں، بلکہ آگرہ ہے۔
اس مہم کے لئے آگرہ کے اندر، بہتر اور مؤثر طریقے سے ماحول سازی ہوسکتی ہے۔''

اس مشورہ اور ہدایت کے ساتھ، مفتی آزردہ نے مفتی انعام اللہ، سرکاری وکیل آگرہ (ساکن، گوپامئو ہردوئی، اَوَدھ۔ **متوفی ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۹ء) کے نام، ایک سفارشی خط بھی لکھا۔**

جسے لے کر مولانا مدراسی آگرہ پہنچے اور وہاں ''مجلسِ عُلما'' قائم کرکے اپنی مُہم میں شب وروز، مصروف ہوگئے۔ اس سلسلے میں آپ نے میرٹھ، پٹنہ، کلکتہ، وغیرہ کے بھی دورے کیے۔

مولانا انعام اللہ، گوپامئوی، سرکاری وکیل آگرہ کے یہاں، اہلِ علم وادب کی آمد ورفت، ہمیشہ رہتی تھی جن سے رابطہ پیدا کرکے مولانا مدراسی نے **''مجلسِ عُلما''** قائم کی تھی۔

اس مجلسِ عُلما کے اَرکان میں مولانا غلام امام شہید، سید شاہ محمد قاسم، دانا پوری، مولانا کریم اللہ مرادآبادی، جج آگرہ، مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں، اکبرآبادی، وغیرہ تھے۔

حادثۂ ہنومان گڑھی ۱۸۵۵ء (اجودھیا۔ اَوَدھ) میں مولانا امیر علی امیٹھوی کی شہادت (۱۸۵۵ء) اور سلطنتِ اودھ کی پالیسی نے علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی، صدرُ الصُّدور لکھنؤ کو انگریزی ڈپلومیسی سے سخت متنفّر کیا اور لکھنؤ میں مولانا احمد اللہ، مدراسی وعلاّمہ خیرآبادی کی ۱۸۵۵ء میں تفصیلی ملاقات وتبادلۂ خیالات نے انگریزوں کے خلاف مہم کو نئی قوت وتوانائی بخشی۔

اس تاریخ ساز ملاقات کا ذکر، جناب عشرت رحمانی نے اپنی کتاب
(ص ۱۲۳۔ **جنگِ آزادی کے نامور مجاہدین۔** مطبوعہ: مقبول اکیڈمی، شاہراہِ قائدِ اعظم، لاہور ۱۹۹۳ء)
میں کیا ہے، جن کے دادا، نواب احمد یار خاں، حادثۂ ہنومان گڑھی (اجودھیا) کے وقت
۱۸۵۵ء میں لکھنؤ کے کوتوال تھے۔

انقلابِ ۱۸۵۷ء کے ایک معروف مؤرخ، سید خورشید مصطفیٰ رضوی لکھتے ہیں:
''تحریکِ ۱۸۵۷ء کو ملک گیر پیمانے پر مُنظّم کرنے میں علما نے اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔
ان میں سب سے نمایاں نام، مولوی احمد اللہ شاہ کا ہے۔''
(ص ۲۱۰۔ **تاریخِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء۔** مؤلّفہ: سید خورشید مصطفیٰ رضوی۔ مطبوعہ: رضا لائبریری، رام پور، یوپی)

۱۸۵۷ء کی تاریخ کا محقق وماہر انگریز مؤرخ، میلسن اپنی مشہور کتاب **''دی انڈین میوٹنی''** (۱۸۹۱ء) میں مولانا مدراسی کو انقلابِ ۱۸۵۷ء کا دماغ اور دست وبازو
اور چپاتیوں کی تقسیم کا انھیں، بانی، قرار دیتا ہے۔ میلسن لکھتا ہے کہ:
(انگریزی سے ترجمہ) میں سمجھتا ہوں کہ اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ:
یہی شخص (احمد اللہ) بغاوت کی سازش کا دماغ اور دست وبازو تھا۔
اپنے سفر کے دوران اسی نے وہ اسکیم تیار کی، جو چپاتی اسکیم کہلاتی ہے۔''
(ص ۱۸۔ **دی انڈین میوٹنی (۱۸۹۱ء)** مطبوعہ لندن)

MALLESON-(GEORGE BRUCE)INDIAN MUTINY OF 1857'

LONDON'1891

میلسن، مزید لکھتا ہے کہ:
(انگریزی سے ترجمہ) مولوی (احمد اللہ) نے شمالی صوبوں کا دورہ کیا۔

اس کے دورے کا مقصد، انگریزوں کے لئے راز ہی رہا۔

کچھ عرصہ آگرہ میں ٹھہرا۔ دہلی، میرٹھ پٹنہ اور کلکتہ گیا۔

اس دورے سے واپسی کے بعد، اس نے باغیانہ اشتہار، تمام اَوَدھ میں جاری کیے۔

........کلکتہ میں قیام کے دَوران، غالبًا، مولوی نے وہاں کی دیسی سپاہ سے مسلسل رابطہ قائم رکھا۔ اور وہ طریقہ ڈھونڈ نکالا، جس سے سپاہ کے فطری جذبات پر خصوصی اثر ڈالا جاسکے۔''

انڈین میوٹنی۔ مؤلّفہ: میلسن۔ ص ۳۳۔ (ص ۲۰۵۔ **تاریخ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔**

مؤلّفہ: سید خورشید مصطفیٰ رضوی۔ مطبوعہ: رضا لائبریری، رام پور۔ یوپی)

اَوَدھ اور رُوہیل کھنڈ کے وسیع حلقے کو مولانا مدراسی نے اپنی عسکری آماجگاہ بنایا۔

اور مئی ۱۸۵۷ء کا انقلاب، شروع ہونے سے پہلے ہی آپ، علی الاعلان اپنی حربی تیاریوں میں مصروف اور پُرعزم تھے۔ چنانچہ، سید خورشید مصطفیٰ رضوی لکھتے ہیں:

''اکتوبر، یا نومبر ۱۸۵۶ء میں مولانا احمد اللہ شاہ، لکھنؤ آئے۔ وہ فقیرانہ لباس میں تھے اور تمام ملک میں دورے کر رہے تھے۔ لکھنؤ میں معتمدُ الدّولہ کی سَرائے اور پھر گھسیاری منڈی میں ٹھہرے۔

بظاہر، قوالی کی محفل، منعقد کرتے، ارشاد و تلقین کرتے۔ مُرید اور عقیدت مند، جمع ہوتے تھے۔

لکھنؤ کا رسالہ ''**طلسم**'' لکھتا ہے: ''**دوشنبے اور پنج شنبے کو، وہاں، مجمع، کثیر ہوتا ہے۔**

شہر کا برنا و پیر ہوتا ہے۔ مجلس، حال و قال کی ہوتی ہے، لیکن، نئی چال کی ہوتی ہے کہ:

عین جوشِ حال میں فرش پر آگ گراتے ہیں۔

نہ فرش پر دھبّہ لگتا ہے نہ حلق میں چھالے نظر آتے ہیں۔'' (رسالہ ''طلسم''، لکھنؤ۔ ۲۱/ نومبر ۱۸۵۶ء)

خفیہ انقلابی کارکن بھی فقیرانہ لباس میں لکھنؤ میں ہر طرف، سرگرم تھے اور عوام میں بغاوت کی روح پھونک رہے تھے۔ انگریز افسروں کو شبہ ہوا۔ ان فقیروں کو ہٹایا گیا اور پابندیاں لگائی گئیں۔

مگر، یہ اپنے کام سے باز نہ آئے۔ ایک جگہ سے ہٹائے جاتے، تو دوسری جگہ، دُھونی رَما دیتے۔

مولانا احمد اللہ سے بھی باز پُرس ہوئی۔

کوتوال (لکھنؤ) نے آکر، دَھمکانا چاہا۔ (بتاریخ ۲۰/ جنوری ۱۸۵۷ء) مگر، انھوں نے کہا:

''میں، جہاد کو فرض جانتا ہوں۔ بے سروسامانی سے لاچار ہوں۔ اگر، بہم پہنچے، تیار ہوں۔''

ان کی سرگرمیوں پر بھی پہرہ لگا دیا گیا۔ انھوں نے تمام ملک میں خفیہ انقلابی تحریک کا جال بچھا دیا تھا۔ اور یہ سرگرمیاں، کم و بیش، دس (۱۰) سال سے جاری تھیں۔

انھوں نے بغاوت سے تقریباً، دو (۲) سال پہلے

انگریزوں کے خلاف، جہاد کا پرچار، شروع کیا اور دورے کیے۔'' الخ

(ص ۴۲۱۔ **تاریخِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء۔** مؤلّفہ: خورشید مصطفیٰ رضوی۔ مطبوعہ: رضا لائبریری، رام پور۔ یوپی)

لکھنؤ میں حالات، ناموافق و نامُساعِد دیکھ کر مولا مدراسی، فیض آباد (اَوَدھ) پہنچ گئے۔ لکھنؤ کا ایک اخبار ''**سحرِ سامری**'' (شمارہ مارچ ۱۸۵۷ء) فیض آباد کے یہ حالات و واقعات، بیان کرتا ہے:

''ہر گلی کوچے میں مع ہمراہیانِ خاص، ہتھیار باندھے پھرتے تھے کہ:

شہر کے مَردمانِ پولیس، یہ حال دیکھ کر، براہِ تعرض گھیرتے تھے۔

رفتہ رفتہ، خبر ہوئی کہ بَلْوے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

سیاسیانِ سرکار نے تگ و دَو، بے شمار کی۔ ہتھیار لے لینے میں تکرار کی۔

کہا: سب ہتھیار دے دو، اسی وقت اپنا راستہ لو۔

جواب دیا کہ: نہ ہم ہتھیار دیں گے، نہ کسی سے جھگڑا فساد، مول لیں گے۔

الغرض! کوتوال صاحب اور تھامس برن کمشنر نے سنا۔ استفسارِ حال کے واسطے، طلب کیا۔

ان کو اِنکار رہا۔ نہ جانے میں اِصرار رہا۔

آخر، صاحب موصوف (کمشنر) خود تشریف فرما ہوئے۔ بہت فہمائش کی۔ وہ ایک نہ شُنوا ہوئے۔ اخبار ''سحر سامری''، لکھنؤ۔ رجب ۱۲۷۳ھ/ مارچ ۱۸۵۷ء۔ (ص ۴۲۵۔ **تاریخ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء۔** مؤلّفہ: سید خورشید مصطفیٰ رضوی۔ مطبوعہ: رضا لائبریری۔ رام پور۔ یوپی)

ڈپٹی کمشنر فیض آباد کی رپورٹ، محرَّرہ ۱۷ فروری ۱۸۵۷ء کے مطابق ۱۶/ فروری کو

لیفٹیننٹ، تھامس برن نے مع سپاہ کے، فیض آباد کی سَرائے

جہاں، مولانا مدراسی مع ہمراہیان قیام پذیر تھے، پہنچ کر، ان سے کہا کہ: ہتھیار، جمع کر دیں۔

فقیرانہ لباس میں ملبوس مولانا مدراسی نے جواب دیا:

ہم، ہتھیار نہیں دیں گے۔ کیوں کہ یہ ہمیں اپنے پیر سے ملے ہیں۔''

ان سے پھر کہا گیا کہ: ہتھیار جمع کر کے شہر سے باہر جا سکتے ہیں۔

مولانا نے دوٹوک جواب دیا کہ: فقیر، اپنی مرضی سے شہر چھوڑے گا۔

بِالآخر، مزید سپاہ، طلب کر کے آپ پر حملہ کر دیا گیا۔ آپ نے بھی اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مقابلہ کیا اور لیفٹیننٹ، تھامس کو بُری طرح زخمی کر دیا۔ اس حملے میں آپ کے تین ساتھی، شہید ہوئے **اور آپ خود بھی زخمی ہو گئے۔ اس کے بعد آپ کو گرفتار کر کے مقدمہ چلایا گیا اور پھانسی کی سزا ہوئی۔**

جس سے فیض آباد، مشتعل ہو گیا اور ہندوستانی فوج بھی آپ کے ساتھ ہو گئے۔

اور سب نے مل کر جیل خانہ توڑ کر مولانا کو آزاد کیا اور اپنا سردار بنا لیا۔

نیرنگیِ زمانہ دیکھیے کہ مولانا نے آزاد ہوتے ہی حکم دیا کہ:

انگریز افسر اپنی وَردیاں، ہمارے حوالے کر دیں۔
چنانچہ، انھیں ایسا کرنا پڑا۔ پھر، انگریز افسروں کو فیض آباد چھوڑنے کا حکم ہوا۔
ان افسروں نے فوج سے تعمیلِ حکم کے لئے کہا کہ:
وہ ہمارا ساتھ دے کر، اس مصیبت سے نجات دلائیں۔
تو ہندوستانی فوجیوں نے جواب دیا کہ: اب، ہندوستان، آزاد ہے۔
ہم اپنے ملکی افسروں کے ماتحت ہیں اور یہاں، واجد علی شاہ کی حکومت ہے۔''

بہرحال! وسطِ جون ۱۸۵۷ء میں چِنہٹ (لکھنؤ) کے محاذ پر
ہنری لارنس کی فوج اور انقلابیوں کے درمیان، خوں ریز جنگ ہوئی۔
تو مولانا مدراسی بھی اس میں شریک تھے، جنھوں نے آگے بڑھ کر انگریزی توپوں پر قبضہ کرلیا۔
انگریز اب، ریزڈنسی (لکھنؤ) میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ انقلابیوں نے ریزڈنسی کا بھی محاصرہ کرلیا۔ شہر میں بدنظمی روکنے کے لئے مولانا مدراسی نے جا بجا، چوکیاں، قائم کر دیں۔
اور پہرے بٹھا دیے۔ پھر، بارہ دری (لکھنؤ) میں برجیس قدر کی تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی۔
اس کے بعد بھی لکھنؤ کے مختلف محاذوں پر انگریزوں اور انقلابیوں کے درمیان جنگیں ہوئیں جن میں مولانا مدراسی اور ان کے ہمراہیوں نے اپنی شجاعت و بہادری کی جوہر دکھائے۔
لکھنؤ کے بعد مولانا مدراسی نے شاہجہاں پور کا رُخ کیا اور قصبہ محمدی کو مرکزی مقام بنا کر اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ شاہجہاں پور اور اس کے نواح میں انگریزوں سے کئی جنگیں ہوئیں۔
سید خورشید مصطفیٰ رضوی لکھتے ہیں کہ:

''بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۵؍مئی (۱۸۵۸ء) تک
تمام انقلابی لیڈر یعنی بیگم حضرت محل، شہزادہ، فیروز شاہ، مایاں صاحب (محمدی کا راجہ) نانا صاحب، بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں (اکبر آبادی)، مولوی فیض احمد (بدایونی)، عظیم اللہ خاں (کان پوری)، مولوی سرفراز علی، نواب تفضّل حسین، مولوی لیاقت علی بھی یہاں آ پہنچے تھے۔''
(ص ۶۱۷۔ **تاریخِ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء**۔ مطبوعہ: رضا لائبریری، رام پور۔ یوپی)

۲۸؍مئی (۱۸۵۸ء) کو انگریزوں کی طرف سے مولانا احمد اللہ کو گرفتار کرانے والے کے لئے پچاس ہزار روپے انعام کا اعلان کر دیا گیا۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کے درمیان
یہ اشارہ بھی کر دیا تھا کہ: اب ہم نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے۔''
(ص ۶۲۴۔ تاریخِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء۔ مؤلّفہ: سید خورشید مصطفیٰ رضوی)

مولانا مدراسی نے قصبہ محمدی (شاہجہاں پور) میں اپنی ایک نئی حکومت کا اعلان بھی کر دیا۔

اور سِکّہ بھی جاری کر دیا۔ اور یہ انقلاب ۱۸۵۷ء کا
وہ کارنامہ ہے جس میں کوئی دوسرا آپ کا، ہم پلّہ، نظر نہیں آیا۔
راجہ پوایئں، جگن ناتھ سنگھ کے بھائی، راجہ بلدیو سنگھ کی سازش
اور غدّاری کی وجہ سے انگریزوں نے مولانا مدراسی کو دھوکے سے شہید کر دیا۔
یہ حادثہ، بروز منگل ۲؍ذوالقعدہ ۱۲۷۴ھ/۱۵؍جون ۱۸۵۸ء کا ہے۔

سازش اور انگریزوں سے راجہ بلدیو سنگھ کے ساز باز کا راز، شاہجہاں پور کے
مجسٹریٹ، جی، پی، منی کے ایک خط محرّرہ، ۱۷؍جون ۱۸۵۸ء بنام کمشنر روہیل کھنڈ سے بھی ہو جاتا ہے۔
جو، نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی میں اب بھی موجود ہے۔
مولانا مدراسی کی شہادت کی خبر سے برطانیہ جھوم اُٹھا۔ چنانچہ، سید خورشید مصطفیٰ رضوی لکھتے ہیں:

''ہومز، خوشی سے بے تاب ہو کر کہتا ہے:
شمالی ہند میں برطانیہ کا سب سے زیادہ خطرناک دشمن، ختم ہو گیا۔'' HOMES-P.530

وہ یہ بھی اعتراف کرتا ہے کہ: **اس پیمانے سے مناسبت دیکھی جائے**
تو تمام باغیوں میں وہی بادشاہت کے لئے سب سے زیادہ مستحق تھا۔''

ساورکر (ہندو مہا سبھا) بھی، اس اقرار پر مجبور ہے کہ:
مولوی کی زندگی سے عیاں ہوتا ہے کہ اسلام کا سچا پرستار، مادرِ وطن پر زندگی قربان کرنا، فخر سمجھے گا۔''

انگریز مؤرخ، میلسن کا تأثر ہے کہ: مولوی، بڑا عجیب انسان تھا۔
فوجی لیڈر کی حیثیت سے اس کی صلاحیت کے بہت سے ثبوت ملے ہیں۔
کوئی اور شخص یہ ناز نہیں کر سکتا کہ اس نے سر، کالن کیمبل کو، دو مرتبہ، سرِ میدان شکست دی۔
..........اگر ایک انسان کو، جس کے وطن کی آزادی، بے انصافی سے چھین لی گئی ہو۔
اور جو اسے پھر آزاد کرانے کی کوشش کرے اور اس کے لئے جنگ کرے
مُحِبِّ وطن کہا جا سکتا ہے، تو بے شک، مولوی ایک سچا محبّ وطن تھا۔
اس نے کسی بے کس کی موت سے اپنی تلوار کو کلنک نہیں لگایا۔ نہتّے اور بے قصوروں پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اس نے مردانہ وار آن بان کے ساتھ، ڈَٹ کر کھلے میدان میں
اُن غیر ملکیوں کا مقابلہ کیا، جنھوں نے اس کا ملک چھین لیا تھا۔
ہر ملک کے بہادر اور سچے لوگوں کو عزت کے ساتھ، مولوی کو یاد کرنا چاہیے۔''

MALLESON, VO14.P381

ایک اور مؤرخ، ٹامس اسٹین نے لکھا: **وہ بڑی قابلیت رکھتا تھا۔ وہ ایسا شجاع تھا کہ:**

خوف نہیں کھاتا تھا۔اپنے عزم کا پکا اور مستقل مزاج تھا۔باغیوں میں اس سے بہتر کوئی نہیں تھا۔

کہا جاتا ہے کہ اس نے ہی چپاتیاں تقسیم کرائیں۔" تاریخ ہندوستان از ذکاء اللہ، دہلوی جلد۳۔ص ۹۲۔(۶۲۶ و ۶۲۷ **تاریخ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء**۔ مولّفہ: سید خورشید مصطفیٰ رضوی۔ مطبوعہ: رضا لائبریری، رام پور۔ یوپی)

انگریز مورخ، ڈبلیو ڈبلیو، فارسٹر لکھتا ہے:

یہ بتادینا ضروی ہے کہ وہ عالمِ باعمل ہونے کی وجہ سے مولوی تھا۔روحانی طاقت کی وجہ سے صوفی تھا۔اور جنگی مہارت کی وجہ سے سپاہی اور سپہ سالار تھا۔ (ہسٹری، ڈی انڈین میوٹنی)

قائدجنگِ آزادی، علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی (وصال ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء)

جزیرۂ انڈمان/کالاپانی کی اَسیری کے زمانے میں مولانا احمداللہ شاہ، مدراسی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: (آئندہ سُطور میں عامل سے مراد، مولانا احمد اللہ شاہ، مدراسی اور زمیں دار سے مراد، راجہ بلدیو سنگھ (پوائیں۔شاہجہاں پور) ہے۔

جس کی سازش کے نتیجے میں مولانا مدراسی کی ۱۸۵۸ء میں شہادت ہوئی)

(عربی سے ترجمہ) اس موقع پر نصاریٰ سے قتال کے لئے دوسری طرف کا ایک عامل اٹھ کھڑا ہوا۔اس نے نیکی وخیرات وسعادات وحسنات کا، کافی ذخیرہ اپنے اندر جمع کرلیا تھا۔

وہ بڑا پاک طینت، صاف باطن، متقی، پرہیزگار، بہادر اور رسولِ ملاحم ونبیِ مراحم صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ہم نام تھا۔اس نے نصاریٰ کے لشکر پر حملہ کرکے پہلے ہی حملے میں انھیں شکست دے دی۔

اپنی ساری کوشش، ختم کرکے نصاریٰ بھاگے اور قصبہ کے ایک ہندو کے مضبوط ومحفوظ مکان (قلعہ) میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔اور نصرانی سرداروں وامیروں کے پاس، شہر میں پیغام بھیج کر مدد مانگی۔

جنھوں نے بدعہدی کرنے والے منافقوں و دیہاتیوں پر مشتمل
ایک لشکر اپنے محصور نصاریٰ کی مدد کے لئے بھیج دیا۔

ادھر، اس نیک سرِشت عامل سے ایک دیہاتی غیر مسلم زمین دار (راجہ بلدیو سنگھ پوائیں، شاہجہاں پور) نے بڑا داؤ کھیلا۔اس نے قسمیں کھاکر اطمینان دلایا کہ:

جب دونوں جماعتیں، مقابلے پر آجائیں گی
تو چار ہزار بہادروں کا گروہ لے کر میں مدد کے لئے پہنچوں گا۔
جب مقابلہ کی نوبت آئی، تو اس زمیں دار کی قسموں پر بھروسہ کرکے
اس دیانت دار عامل نے اپنے تھوڑے سے بہادروں کے ساتھ، دشمن پر حملہ کردیا۔
نتیجہ یہ نکلا کہ سامنے سے بندوقوں وتوپوں سے چہرہ وسینہ پر نصاریٰ نے گولیاں برسائیں۔

اور پیچھے سے غدّار مکّار زمیں دار کی جماعت نے پُشت وسُرین کو نشانہ بنانا، شروع کیا۔
یہ زمیں دار اور اس کے لوگ، درحقیقت، نصاریٰ کے اَعوان واَنصار اور شیطان کے بھائی بند تھے۔
وہ خداپرست عامل، معرکہ میں گر کر شہید ہوا۔اور اس کی ساری جماعت نے بھی اسی کے نقشِ قدم پر چل کر جامِ شہادت، نوش کیا۔" اَلثَّوْرَۃُ الْھِندِیۃ ۔تالیف (بزبانِ عربی۔علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی۔ اردو ترجمہ، بنام "**باغی ہندوستان**" از محمد عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی۔مطبوعہ: بجنور ولاہور ومبارک پور)

دہلی کے محاذ پر جنگِ آزادی اپنے شباب پر تھی کہ:
۱۸۵۷ء میں جنرل بخت خاں، بریلی سے اپنی چودہ ہزار فوج لے کر
باختلافِ روایات ۲۶/جون یا۔یکم جولائی، یا۔۲/جولائی ۱۸۵۷ء کو دہلی پہنچا۔

اور بہادر شاہ ظفر نے جنرل بخت خاں کو شاہی اَفواج کا کمانڈر اِنْ چیف بنادیا، جس نے بڑی بہادری وبے جگری اور حکمت ومنصوبہ بندی کے ساتھ، مہینوں تک انگریزوں سے جنگ کی۔

جنرل بخت خاں کی آمد اور جنگ میں اس کی شرکت وشجاعت سے انگریزوں میں کھلبلی مچ گئی۔
کیوں کہ انگریز حُکّام، جنرل بخت خاں کی بہادرانہ زندگی اور کارناموں سے بخوبی، واقف تھے۔
وہ اس سے پہلے، چالیس (۴۰) سال تک فوج میں رہ کر، اس کی قیادت وکمان واری کرچکا تھا۔
پنڈت جواہر لال نہرو، سابق وزیر اعظم ہند نے جنرل بخت خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ:
"اگر، دہلی کی ساری جنگ کا تاج، بہادر شاہ ظفر تھا اور ہاتھ پاؤں، ہندو اور مسلمان تھے۔
تو اِس جنگ کا دماغ، بخت خاں تھا۔"

(ص ۱۸۔**تاریخِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء**۔مطبوعہ: رضا لائبریری۔رام پور)

ریاستِ اَلْوَر (میوات، راج پوتانہ) سے علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کی دہلی آمد
اور جنرل بخت خاں سے ملاقات وتبادلۂ خیالات کے بعد، جامع مسجد، دہلی میں عُلما ومعززینِ دہلی کے سامنے، علاّمہ خیرآبادی کی ولولہ انگیز خطابت اور جہاد ۱۸۵۷ء کے فتویٰ کے بارے میں
مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی (متوفی ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء) تحریر کرتے ہیں:

"عمائدِ شہر (دہلی) میں، دو گروہ تھے: ایک، بادشاہ کا ہم نوا اور دوسرا، حکومتِ کمپنی کا بہی خواہ۔
فوجیوں میں طمع اور لالچ نے گھر کرلیا تھا۔دو ایک جماعتیں، مقصدِ اعلیٰ کو سامنے رکھے ہوئے تھیں۔
ایک جماعت، مجاہدین کی تھی۔دوسری، رُوہیلوں کی۔
یہ جنرل بخت خاں کی سرداری میں دادِ شجاعت دے رہی تھی۔
علاّمہ (خیرآبادی) سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے۔مشورہ کے بعد علاّمہ نے آخری تیر تَرکش سے نکالا۔بعد نمازِ جمعہ، جامع مسجد (دہلی) میں عُلما کے سامنے، تقریر کی۔اِستفتا، پیش کیا۔

مفتی صدرالدین خاں، آزردہ، صدرُ الصُّدور دہلی، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا
فیض احمد، بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں، اکبرآبادی، سید مبارک شاہ، رام پوری نے دستخط کردیے۔

اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔

دہلی میں نوے ہزار سپاہ، جمع ہوگئی تھی۔ تاریخِ ذکاءُاللہ، دہلوی۔ مطبوعہ: دہلی۔

(ص ۲۱۵۔ **باغی ہندوستان**۔ طبع چہارم، المجمع الاسلامی مبارک پور اعظم گڑھ، یوپی ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء)

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء اور تحریکِ آزادی ۱۹۴۷ء کے مشہور مؤرخ، رئیس احمد جعفری، ندوی
(۱۹۱۲ء۔۱۹۶۸ء) قائدینِ انقلاب ۱۸۵۷ء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ہم نے غدر کے جن ہیروں کا ذکر کیا ہے، اُن میں صرف، بخت خاں اور مولانا فضلِ حق خیرآبادی، دو ایسی شخصیتیں ہیں، جنھوں نے دہلی کے مُحارَبات میں مرکزنشین ہو کر حصہ لیا ہے۔

بخت خاں اور مولانا فضلِ حق خیرآبادی کے اَحوال وسوانح، واقعات وحادثات کارناموں اور سرگرمیوں کی تفاصیل معلوم کرنا، آسان نہ تھا۔

غدر کے بعد، غدر کا ذکر بھی کتنا روح فرسا تھا، اور ان شخصیتوں کا تذکرہ
جنھوں نے اس انقلابی تحریک میں مردانہ وار حصہ لیا تھا، اپنی جان سے ہاتھ دھونا تھا۔
ان اکابر کا، اول، تو مرتَّب و منضبط صورت میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔
اور اگر کہیں ملتا بھی ہے، تو مخالفانہ اور معاندانہ انداز میں۔ اِن مشکلات کے باوجود
زیادہ سے زیادہ معتبر اور مستند مواد، حاصل کرنے کی ہم نے مقدور بھر کوشش کی ہے''۔

(**بہادرشاہ ظفر اور ان کا عہد**۔ مؤَلّفہ: رئیس احمد، جعفری، ندوی۔ مطبوعہ لاہور۔ ۱۹۵۶ء)

''وہ (مولانا فضلِ حق خیرآبادی) انگریزوں سے نفرت کرتے تھے۔
اور انگریزوں کو نکالنے کے لئے ہر منظَّم اور باقاعدہ تحریک میں حصہ لینے پر دل وجان سے آمادہ رہتے تھے۔ چنانچہ، غدر جب شروع ہوا، تو مولانا، بے تأمُّل اس میں شریک ہوئے۔
وہ بہادرشاہ کے معتمد، مقرَّب اور مشیر تھے۔ ان کے دربار میں شریک ہوا کرتے تھے۔
انھیں، اہم معاملات ومسائل پر مشورے دیتے تھے۔ اور اس بات کے ساعی تھے کہ:
آزادی کی یہ تحریک، کامیاب ہو اور انگریز، اس دیس سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوجائیں۔
مولانا نے غدر میں، دلیری اور جرأت کے ساتھ، علانیہ حصہ لیا۔
انھوں نے متعدد والیانِ ریاست اور اُمَرائے ہند کو اس تحریک میں شامل کرنے کی کوشش کی۔
جس جس والیِ ریاست سے ان کے ذاتی تعلقات ومَراسم تھے، ان کی تائید وحمایت حاصل کی اور امداد کے لئے مجبور کیا''۔ (ص ۸۶۲۔ **بہادرشاہ ظفر اور ان کا عہد**۔ مؤَلّفہ: رئیس احمد، جعفری، ندوی۔ مطبوعہ لاہور)

''مولانا فضلِ حق خیرآبادی ایک یگانۂ روزگار عالم تھے۔ عربی زبان کے مانے ہوئے ادیب اور شاعر تھے۔ علومِ عقلی کے امام اور ایوانِ حکومت میں پہنچ کر، وہ، دوررَس فیصلے کرتے تھے۔
وہ بہادر اور شجاع بھی تھے۔
غدر کے بعد، نہ جانے کتنے سورما اور رزم آرا، اَیسے تھے، جو گوشۂ عافیت کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے، لیکن، مولانا فضلِ حق اُن لوگوں میں تھے، جو اپنے کیے پر نادِم اور پشیماں نہ تھے۔
انھوں نے سوچ سمجھ کر میدان میں قدم رکھا تھا
اور اپنے اِقدام وعمل کے نتائج بھگتنے کے لئے وہ حوصلہ مندی اور دلیری کے ساتھ، تیار تھے۔
سراسیمگی، دہشت اور خوف یہ ایسی چیزیں تھیں، جن سے مولانا، بالکل، ناواقف تھے۔''

(ص ۸۵۴۔ **بہادرشاہ ظفر اور ان کا عہد**۔ مؤَلّفہ: رئیس احمد، جعفری، ندوی۔ مطبوعہ: کتاب منزل، لاہور۔ ۱۹۵۶ء)

نواب، امیر خاں اور انگریزی حکومت کے درمیان ہونے والے معاہدۂ دسمبر ۱۸۱۷ء کے تحت
ریاستِ ٹونک (راج پوتانہ۔ موجودہ صوبہ راجستھان) نواب، امیر خاں کے حوالے کی گئی تھی۔
انھیں نواب، امیر خاں کے فرزند، وزیرُ الدَّولہ، نواب محمد وزیر خاں کی طرف سے
۱۸۵۷ء کے دوران اپنی ریاست کے تحفظ کے لئے فتوائے جہاد کی مخالفت میں
یکم ستمبر ۱۸۵۷ء کو ایک بیان، جاری ہوا، جس کی عبارت، یوں ہے:

''نواب نے (یہاں، عبارت پڑھی نہیں گئی) کہا کہ:
جہاد، انگریزوں پر، درست نہیں ہے۔ بعد اس کے، سب فوج سے کہا کہ:
میں، نمک خوار، انگریزوں کا ہوں۔ میں، نمک حرام نہیں ہوتا۔
اور تم میرے نمک خوار ہو۔ تم کو اختیار ہے کہ چاہو، تو نمک حرام ہوجاؤ۔
چنانچہ، اس بات پر، پانچ سو آدمیوں نے نوکری چھوڑ دی۔''

اس تحریر کے درمیان کچھ دیگر باتوں کے بعد لکھا ہے کہ:

''مولوی فضلِ حق، شریکِ جلسہ (مِٹنگ) ہوتے ہیں۔ اور مشتمل بر بخت خاں کے محمد شفیع رسالدار، مولوی سرفراز علی خاں، اور مولوی امداد علی، ساکن بلَّب گڈھ، رسالدار ہیں۔
اور جو کچھ، بخت خاں کرتا ہے، ابتدا میں ان (مولوی فضل حق) کے مشورے سے ہوتا ہے۔
اور مولوی (فضل حق) کی اِطاعت، ظلِّ شاہ دربارِ خاص میں ضروری سمجھی جاتی ہے۔''

میوٹنی پیپرز، کلکشن ۱۶۔ نمبر: ۱۲۔ یکم ستمبر ۱۸۵۷ء۔ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی۔

(بحوالہ ص ۵۲ و ۵۳۔ **علّامہ فضلِ حق خیرآبادی! چند عنوانات**۔ مؤَلّفہ: خوشتر نورانی۔
مطبوعہ: ادارۂ فکرِ اسلامی، دہلی۔ طبع اول ستمبر ۲۰۱۱ء)

صدر یار جنگ، نواب حبیب الرحمٰن، شیروانی، علی گڑھی (متوفی اگست ۱۹۵۰ء) کے پوتے
ریاض الرحمٰن خاں، شیروانی، علی گڑھی
ایک کتاب (**سنبھل سے ٹونک تک**۔ مُرتّبہ: عبدالمعید خاں) پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
''مُرتّبِ کتاب کا کہنا ہے کہ:
اس موقع (۱۸۵۷ء) پر، تانتیا ٹوپے، علی بہادر اور...... فیروز بخت بن ناظم بخت
نواسۂ فرُّخ سَیر نے راج پوتانہ کا رُخ کیا اور ٹونک تک پہنچے......
انگریزوں کے ساتھ، سیاسی معاہدے کی وجہ سے نواب وزیرُ الدَّولہ نے
فیروز شاہ وغیرہ کا ساتھ نہیں دیا۔ مگر، ریاستی فوج نے ان کا ساتھ دیا۔''
یہ بھی اکثر ہوا ہے۔ اَربابِ اِقتدار کی جو بھی مجبوری رہی ہو، مگر، عوامُ النّاس، بِالعُموم
جذبۂ حُرّیّت سے سرشار رہی ہے، اور وقت آنے پر انھوں نے اس کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔
البتہ، نواب صاحب کی توپوں کی سلامتی میں اضافہ بھی ہوا۔
اور انھیں حُسنِ کارکردگی کی سند بھی ملی۔
انگریز، ایسے ہی کھلونے دے کر بَہلاتا رہتا تھا۔
میرے دادا صاحب، مرحوم، نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی فرماتے تھے کہ:
''مغل سلاطین، جب کسی سے خوش ہوتے تھے، تو جاگیر اور خلعت، عطا کرتے تھے۔
انگریز، چندہ لیتے ہیں اور خطاب دیتے ہیں۔''
نواب محمد وزیر خاں (وزیرُ الدَّولہ) کا انتقال ۱۸۶۴ء میں ہوا۔'' الخ۔
(ص ۲۹۔ ماہنامہ ''**کانفرنس گزٹ**''۔ سلطان جہاں منزل۔ شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔ یو پی۔
بقلم: ریاض الرحمٰن، شیروانی۔ شمارہ اگست ۲۰۱۲ء)
اب تک کے ذِکر شدہ اَحوال و واقعات وحقائق کی روشنی میں
علاَّمہ فضلِ حق خیر آبادی کے بارے میں مندرجہ ذیل اُمور، واضح ہوئے:
(۱) اپنے وقت کے سراجُ الھند، شاہ عبد العزیز، محدّث دہلوی (وصال ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء)
علومِ اسلامیہ، بالخصوص علمِ حدیث میں علاَّمہ خیر آبادی کے استاذ ہیں۔
شاہ عبد العزیز، محدّث دہلوی کے چھوٹے بھائی اور جلیلُ القدر عالم ومحدّث
شاہ عبد القادر، محدّث دہلوی (وصال ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء) بھی آپ کے استاذ ہیں۔
(۲) آپ کے والد ماجد، اِمامُ المعقولات، علاَّمہ فضلِ امام، خیر آبادی (وصال ۱۲۴۴ھ/۲۹۔
۱۸۲۸ء) آپ کے استاذ ہیں۔ (علامہ فضلِ امام خیر آبادی، دہلی کے صدرُ الصّدور بھی تھے

اور ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۷ء میں اس عہدہ سے مُستعفی ہو گئے تھے۔)
(۳) دہلی کے جلیلُ القدر عالم، مفتی صدرُ الدین آزردہ، صدرُ الصّدور دہلی
(وصال ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) علاَّمہ فضلِ حق، خیر آبادی کے ہم سبق ساتھی ہیں۔
(مفتی صدرُ الدین، آزردہ ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۷ء سے ستمبر ۱۸۵۷ء تک
صدرُ الصّدور دہلی کے منصب پر، فائز رہے)
(۴) دہلی کے عظیمُ المرتبت عُلما اور مشاہیر فُضَلا واُدَبا وشُعَرا
علاَّمہ خیر آبادی کے حلقۂ احباب میں شامل ہیں اور آپ کے دولت کدہ کی دینی وعلمی وادبی مجالس
ومحافل میں، ان کی ہمیشہ، آمد ورفت اور شرکت کا سلسلہ، جاری رہتا تھا۔
(۵) مغل بادشاہ، بہادر شاہ ظفر (متوفی ۱۸۶۲ء در رنگون) کے آپ، معتمد رفیق ومُشیر تھے۔
اور آپ کے مشوروں کی بہادر شاہ ظفر کی نظر میں بڑی وقعت واہمیت تھی۔
(۶) شاہی اَفواج کے کمانڈر انِ چیف، جنرل بخت خاں تھی۔
آپ کے مشورے اور ہدایت کے مطابق عمل کرتے تھے۔
(۷) آزادیِ ہند کے اوَّلین منصوبہ ساز اور میدانِ جنگ میں مشہور انگریز کمانڈر
سر، کالن کیمبل کو، دو مرتبہ، سرِ میدان، شکست دینے والے عظیم مجاہد وقائد
دِلاور جنگ، مولانا احمد اللہ شاہ، مدراسی (شہادت ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء در قصبہ محمدی۔ شاہجہاں پور) سے
آپ کے مخلصانہ روابط وتعلقات تھے۔
اور انقلابِ میرٹھ، مؤرخہ ۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے لکھنؤ میں (در ۱۸۵۵ء)
ان دونوں حضرات کے درمیان، مُلکی معاملات اور آزادیِ ہند کی رازدارانہ گفتگو ہو چکی تھی۔
(۸) ہندوستان کے متعدد والیانِ ریاست سے علاَّمہ خیر آبادی نے رابطہ، قائم کر کے
انھیں، مرکزی حکومت (دہلی) کے تعاون اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں
عسکری ومالی شرکت کے لئے آمادہ کرنے کی جدوجہد اور تدبیر کی تھی۔
اب آیئے: قائدِ جنگِ آزادی، علاَّمہ فضلِ حق، خیر آبادی (وصال ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) کی
تاریخِ حیات کے چند اَہم اَبواب کا مطالعہ کریں۔ دینی وعلمی پہلو، اِس تحریر کا موضوع نہیں
اس لئے صرف تاریخی وسیاسی گوشوں پر نہایت اِختصار کے ساتھ کچھ گفتگو کرتے ہوئے
تحقیق کے ساتھ، تحسین وتشکُّر کا فریضہ بھی انجام دیتے چلیں۔
۱۶۰۰ء میں انگریز، تاجر کی حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام
سے اپنی تجارت، شروع کی۔ تجارت کی توسیع واِستحکام کے بعد وہ سازش اور حکمتِ عملی کے ساتھ

مختلف ریاستوں پر قبضہ کرتے ہوئے فاتح کی شکل میں اُبھرے۔

یہاں تک کہ ۱۸۰۳ء میں انگریز کمانڈر، لارڈ لیک نے دہلی پر بھی قبضہ کرلیا اور مغل بادشاہ شاہ عالَم ثانی کو ایک وظیفہ خوار حکمراں بنا کر، انگریز، رفتہ رفتہ، پورے ملک کے غاصب و حاکم بن بیٹھے۔

سراج الھند، شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی (وصال ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء)
اور بیہقیِ وقت، قاضی ثناءُاللہ، مجدّدی، پانی پتی (وصال ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) نے
سُقوطِ دہلی (۱۸۰۳ء) کے چند سال بعد کسی موقع پر ہندوستان کے دارُالحرب ہونے کا فتویٰ دیا۔
یہ فتاویٰ، کس سال، جاری ہوئے؟ اس کا تعین، محققین و مؤرخین اب تک نہیں کر سکے۔
لیکن، اتنی بات، بہر حال، محقق ہے کہ ۱۸۰۳ء کے بعد ہی ہندوستان کو دارُالحرب قرار دیا گیا۔
مسلمانوں نے سُقوطِ دہلی ۱۸۰۳ء۔ بعہدِ شاہ عالَم ثانی۔ کے بعد
انگریزوں سے معاشرتی رَوابط و تعلقات اور انگریزی ملازمت کو سخت ناپسند کرنا، شروع کیا۔
۱۸۰۷ء میں جب حالات کچھ اطمینان بخش ہوئے، نظم و نسق میں اصلاح ہوئی
تو رفتہ رفتہ، مسلمانوں کا نقطۂ نظر، تبدیل ہونے لگا۔
یہاں تک کہ وہ وقت بھی آیا کہ خود شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی (وصال ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) نے
انگریزی ملازمت کے جواز کا فتویٰ دے دیا۔
جوازِ ملازمت کا یہ فتویٰ، کس سال دیا گیا؟ اس کی بھی کہیں کوئی تعیین، نہیں ملتی۔
فتاویٰ عزیزی جلدِ اول (فارسی) مطبوعہ دہلی میں
دارُالحرب اور جوازِ ملازمت کے فتاویٰ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔
شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی (وصال ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) نے
اپنے داماد، مولوی عبدالحیٔ، بڈھانوی (متوفی ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۸ء) کے
مفتیِ عدالتِ میرٹھ ہونے کی اجازت دے دی تھی۔
جس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء) کہتے ہیں:
"دہلی میں جب انگریزی حکومت، قائم ہوئی، تو عُلمائے ثِقات کا عام مسلک یہ رہا کہ:
انگریزی ملازمت سے اِجتناب کیا جائے۔ شاہ (عبدالعزیز) صاحب کا بھی ابتدا میں یہی مسلک تھا۔
جب، ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتہ میں قاضیُ القضاۃ کا عُہدہ، قائم کیا اور اس کے لئے لکھنؤ لکھا۔
تو لکھنؤ سے ایک اِستفتا، شاہ صاحب کے نام گیا تھا۔
شاہ صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ:
مسلمانوں پر، اس سے اِحتراز، واجب ہے۔

.........لیکن، جب انگریزی حکومت پر ایک عرصہ گذر چکا
تو انگریزوں کی کوشش، جو وہ شمالی ہند میں مسلمانوں کی تالیفِ قلب کے لئے برابر کیے جارہے تھے
بہت کامیاب ہونے لگی۔ حتیٰ کہ وہ وقت آگیا کہ:
خود شاہ صاحب، تیار ہوگئے کہ اپنے داماد، مولوی عبدالحیٔ کو میرٹھ کے مفتیِ عدالت ہونے کی اجازت دے دیں۔ اور مدرسہ عزیزیہ (دہلی) کی جانب سے ان کا نام، پیش کریں۔"

(ص ۳۱۳و۳۱۴۔ نقشِ آزاد۔ مطبوعہ: لاہور)

یہاں ایک مسئلہ کی وضاحت ضروری ہے کہ:
کوئی ملک، دارالحرب ہوجائے تو، وہاں، جہاد، یا۔ وہاں سے ہجرت، واجب ہوجاتی ہے۔
لیکن، شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی اور قاضی ثناءاللہ، مجدّدی، پانی پتی نے سنگینیِ حالات کی وجہ سے یہاں کی جہاد، یا ہجرت کا کوئی فتویٰ نہیں دیا۔
مُستند زبانی روایت، یا۔ تحریری سندی نہیں کہ کسی بھی مستند عالم دین نے شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی کے آخری ایام تک جہاد، یا ہجرت کا، مسلمانانِ ہند کو کبھی کوئی حکم، یا۔ مشورہ دیا ہو۔
علّامہ فضلِ حق، خیرآبادی، ۱۸۱۵ء، یا ۱۸۱۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے منسلک ہوئے۔
اس سے پہلے، بعمر تیرہ سال ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں تحصیلِ علوم وفنون سے فارغ ہو چکے تھے۔
ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ ملازمت، بعمر اُنیس (۱۹) سال
سر رشتہ داری عدالتِ دیوانی (دہلی) کی حیثیت سے تھی۔
ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمتِ سر رشتہ داری سے تقریباً ۱۲۴۵ھ/۱۸۳۰ء میں
مستعفی ہونے کے بعد، نواب فیض محمد خاں، والیِ جھجھر (پنجاب۔ موجودہ صوبہ ہریانہ) کی دعوت پر
۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء یا ۱۸۳۲ء میں علّامہ خیرآبادی، جھجھر (پنجاب۔ موجودہ صوبہ ہریانہ) چلے گئے۔
۱۶/۱۷ اکتوبر ۱۸۳۵ء میں نواب فیض محمد خاں کے انتقال کے بعد، ریاستِ اَلْوَرْ (میوات، راج پوتانہ) کے راجہ کی دعوت پر، اَلْوَرْ چلے گئے اور ریاستِ اَلْوَرْ میں ۱۸۳۵ء تا ۱۸۴۰ء ملازمت کی۔
پھر، نواب محمد سعید خاں، والیِ ریاستِ رام پور (روہیل کھنڈ) کی دعوت پر، رام پور تشریف لے گئے اور رام پور میں ۱۸۴۰ء تا ۱۸۴۶ء آپ کا قیام رہا۔ یہاں، ترجمہ وتالیف کی خدمت آپ کو سپرد ہوئی۔
پھر، محکمۂ نظامت اور اس کے بعد، مرافعۂ عدالتین (دیوانی وفوج داری) کے حاکم، مقرر کیے گئے۔
نواب واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے بعد فروری ۱۸۴۷ء میں آپ، نواب کی دعوت پر لکھنؤ پہنچے اور "کچہری حضور تحصیل" کے مہتمم ہوئے۔ پھر صدرُ الصُّدور لکھنؤ، منتخب ہوئے۔
لکھنؤ میں، نو (۹) سال تک قیام رہا۔

اَوَدھ پرفروری ۱۸۵۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ اورنواب واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد دوبارہ، فروری ۱۸۵۶ء میں علاّمہ خیرآبادی، ریاستِ اَلْوَرْ سے وابستہ ہوگئے۔

مئی ۱۸۵۷ء میں ریاست اَلْوَرْ سے دہلی آگئے اور انقلاب کی رہنمائی فرمائی۔

بہادرشاہ ظفراور پھر جنرل بخت خاں سے ملاقات وتبادلۂ خیال کا سلسلہ، شروع کیا۔

انقلاب کی ناکامی اور ۱۹ر ستمبر ۱۸۵۷ء میں دہلی پر انگریزوں کے مکمل قبضہ کے بعد

۲۴ر ستمبر ۵۷ء کو، دہلی سے کسی طرح نکل کر، بدِقّت تمام، علی گڑھ وغیرہ ہوتے ہوئے نومبر ۱۸۵۷ء کے آخر میں اپنے وطن، خیرآباد (اودھ۔ موجودہ ضلع سیتاپور۔ یوپی) پہنچے۔

دہلی کی ملازمتِ سررشتہ داریِ عدالتِ دیوانی (کچہری چیف) کے بارے میں امیر مینائی لکھتے ہیں:

''شاہجہان آباد (دہلی) میں اگرچہ، عدالتین کے سررشتہ دار تھے
مگر، بڑے ذی اقتدار اور صاحبِ اختیار تھے۔''

(ص ۲۹۲۔ **انتخابِ یادگار**۔ مطبوعہ: اترپردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ۔ ۱۹۸۳ء)

مرزا حیرت، دہلوی (متوفی ذوالقعدہ ۱۳۴۶ھ/ مئی ۱۹۲۸ء) لکھتے ہیں:

''اس سررشتہ داری میں انھیں، وہ دبدبہ اور قوت وشوکت، حاصل تھی
جو، اس زمانے میں ڈپٹی کمشنر کو ہے۔ آپ کے مکان پر، اہلِ مقدمہ کا دربار لگا رہتا تھا۔
اور زندگی، نہایت عزت واحترام سے بسر ہوتی تھی۔''

(ص ۱۰۱۔ **حیاتِ طیبہ** از مرزا حیرت دہلوی۔ مکتبہ السّلام، لاہور۔ ۱۹۵۸ء)

ملازمتِ دہلی کے دوران، علاّمہ خیرآبادی کے احساسات وتأثرات
اور سرگرمیوں کے سلسلے میں بہت گراں قدر مَوَاد اپنی تحقیقی کتاب میں
ڈاکٹر سلمہ سیہول، لیکچرار، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان نے جمع کردیا ہے۔
الگ سے کچھ لکھنے سے بہتر، یہ ہے کہ:
انھیں کی تحریر، یہاں کچھ اِختصار اور تلخیص کے ساتھ پیش کردی جائے۔ چنانچہ، وہ رقم طراز ہیں کہ:

''علاّمہ فضل، خیرآبادی، انگریزوں سے متنفِّر اور اُن کے شدید مخالف تھے۔
میدانِ سیاست میں اُن کی آمد کی وجہ، یہی انگریز دشمنی اور ناپسندیدگی تھی۔
جس کے ثبوت اُن کی مختصر سوانحِ حیات میں بہت جگہ ملتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

(۱) ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے اِستعفا کی وجہ، یہی انگریز دشمنی اور نفرت تھی۔
اس ملازمت کے دوران، انھیں، انگریزی تسلُّط اور اس کی نااہلی، ستم شِعاری، مَکّاری، اور ہندوستان اور ہندوستانیوں کے لئے ان کی نفرت وحقارت کے جذبات کے حقیقی تجربے کا موقع ملا۔

اور وہ، ان سے بےزار اور متنفر ہوتے چلے گئے۔ تاآں کہ مستعفی ہوگئے۔

حکیم سید محمود احمد، برکاتی، ٹونکی (کراچی) لکھتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ:

''یہ ملازمت، ناپسند ہونے کے باوجود، والدِ محترم کے حکم اور خواہش کی سعادت مندانہ تعمیل تھی۔ .... اور والد ماجد کی طرف سے تَرکِ ملازمت کی اجازت، نہ ملتی تھی۔

غالبًا، اسی لئے ان کی رحلت ۵/ ذوالقعدہ ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۹ء کے تھوڑے عرصہ بعد
۱۲۴۵ھ/ ۱۸۳۰ء میں مُستعفی ہوگئے۔'' (ص ۲۱۔ **فضلِ حق اور ۱۸۵۷ء**۔
مؤلّفہ: حکیم سید محمود احمد، برکاتی، ٹونکی۔ مطبوعہ: برکات اکیڈمی، کراچی ۱۹۷۵ء)

(۲) آغازِ ملازمت کے تین چار سال بعد (یعنی ۱۲۳۴ھ/ ۱۸۱۸ء) کا تحریر کردہ
علاّمہ خیرآبادی کا اپنے والد (علاّمہ فضلِ امام خیرآبادی) صاحب کے نام ایک خط، دست یاب ہے
جس میں اس ملازمت سے بےزاری کا اظہار، واضح طور پر ملتا ہے۔ علاّمہ فضلِ حق لکھتے ہیں:

.... هٰذا وَالْمَمْلُوک بِفَضلِ رَبِّهٖ فِی رِفَاهِ حالٍ وَفَرَاغِ بالٍ۔
لایَشْتَکِی وَصباً وَلایلتقِی نَصباً۔ غیر مافِی الْخِدمةِ مِن الْمِحْنَةِ وَالْمِهْنَة۔
فَاِنَّهٗ یَظَلُّ وَاقِفاً بَیْنَ یَدَی الْحَاکِم وَیَنْسُخُ اَحکَامُهٗ الَّتی حَقُّها اَن یُنْسَخ فِی رَدِّ النِّظام۔ وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِهٖ لَوْلاخَشْیَةَالْعَارِوَمَظَنَّةَالشَّنارِ
لَارْتَحَلْتُ مِن هٰذهِ الدِّیَارِاِلیٰ غَیرِهَا مِنَ الْاَمْصارِ۔ وَلَا تَّخَذْتُ التَّوکُّلَ مَعَاشاً۔

(ص ۱۲۔ **قلمی بیاض بخطِ علاّمہ خیرآبادی**۔ مملوکہ: حکیم سید محمود احمد، برکاتی، ٹونکی۔ کراچی)

(ترجمہ) **میں، خدا کے فضل وکرم سے خوش حال اور مطمئن ہوں۔**
مگر، ملازمت میں ذِلت وخواری، بہت ہے۔ حاکم کے سامنے، مستقل، حاضر رہنا پڑتا ہے۔
اور اس کے وہ احکام، اِملا کرنے ہوتے ہیں، جو قابلِ قبول نہیں ہوتے۔
قسم خدا کی! اگر، مجھے رُسوائی کی شرم نہ ہوتی
تو کبھی کا، کہیں اور منتقل ہوجاتا اور متوکِّلانہ زندگی بسر کرتا۔''

(۳) مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبرآبادی لکھتے ہیں:
مولانا نے حُکّام کا طریقہ، خلافِ مرضی پایا، مستعفی ہوگئے۔

(ص ۵۴۔ **ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما**۔ مؤلّفہ: انتظام اللہ، شہابی۔ دینی بکڈپو، اردو بازار، دہلی)

(۴) مرزا اسدُ اللہ خاں غالبؔ، جن کے علاّمہ خیرآبادی کے ساتھ گہرے علمی وادبی روابط ہونے کے علاوہ، دوستانہ مَراسم بھی تھے، انھوں نے ۳۱ر جنوری ۱۸۳۲ء کو، مدیر ''**آئینۂ سکندری**'' کلکتہ کے نام ایک مکتوب، اِرسال کیا۔ اور ملازمتِ کمپنی سے علاّمہ خیرآبادی کے اِستعفا کے واقعہ پر

اپنے تأثرات اور جذبات کا کچھ یوں، اظہار کیا:

(فارسی سے ترجمہ) **حُکّامِ فرنگ کی بے تمیزی و ناقدر شناسی نے یہ رنگ دکھایا کہ:**

فاضلِ بے نظیر و اَلمعیِ یگانہ، مولوی حافظ فضلِ حق نے

عدالتِ دہلی کی سررشتہ داری سے اِستعفا دے کر، ننگ و عار سے نجات پائی۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر مولانا (فضلِ حق) کے علم و فضل کے ایک فی صدی کا

عدالتِ دیوانی کی سررشتہ داری سے موازنہ کریں، تو اس عُہدہ کا پلّہ، ہلکا نکلے گا۔''

(ص ۳۵۶۔ **پنج آہنگ** (فارسی)۔ از مرزا غالبؔ۔ مطبوعہ مجلسِ یادگارِ غالبؔ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

مکمل فارسی مکتوب، نقل کرنے کے بعد، اس کا اردو ترجمہ بھی کتاب میں شامل ہے۔

فارسی متن، **پنج آہنگ** از مرزا غالبؔ

یا۔ اِس کتاب (علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی از ڈاکٹر سلمہ سیہول۔ مطبوعہ: لاہور) میں ملاحظہ فرمائیں۔

مرزا غالبؔ، آگے کا حال، اس طرح لکھتے ہیں:

''اس اِستعفا کے بعد، نواب فیض محمد خاں (والیِ جھجھر) نے، ان (مولوی فضل حق) کے خادموں کے مصارف کے لئے پانچ سو روپیہ مشاہرہ، مقرر کر کے انھیں اپنے پاس بلا لیا۔

جس روز، مولوی فضلِ حق، اس شہر (دہلی) سے رخصت ہوئے

شاہِ دہلی کے ولی عہد، صاحبِ عالَم، مرزا ابوالمظفر بہادر (بہادر شاہ ظفر) نے روانگی سے قبل

مولانا کو بلا کر، ملبوسِ خاص دوشالہ، ان کے کندھوں پر ڈالا اور آب دیدہ ہو کر کہا:

''ہر گاہ کہ شَما می گوئید کہ مَن رخصت می شوم، مَرا جُز ایں کہ بہ پذیرم، گریز نیست۔

امّا ایزدِ دانا، داند کہ لفظِ وَداع از دل بہ زباں نمی رسد، اِلّا بَصد جَرِّ ثقیل۔''

(پنج آہنگ از مرزا غالبؔ)

(ترجمہ) **''اگر چہ، آپ، رخصت ہونے کو کہہ رہے ہیں**

اور میرے لئے بھی ماننے کے سِوا، کوئی چارہ نہیں۔ مگر، خدائے علیم جانتا ہے کہ:

وَداع کا لفظ، دِل سے زبان پر نہیں آتا۔ اس کے لئے ہزار جَرِّ ثقیل، درکار ہیں۔''

مرزا غالبؔ نے مذکورہ خط کے آخر میں لکھا ہے کہ:

........اب، غالبِ سرگشتہ و حیراں، آپ (مدیرِ آئینۂ سکندری، کلکتہ) سے، اِستدعا کرتا ہے کہ:

مولوی فضلِ حق کے وَداع پر، ولی عہد کی اندوہ ناکی اور اہلِ شہر (دہلی) کے دلوں کے اِضطراب کا حال

مناسب اور دل آویز پیرایہ میں لکھ کر، آئینۂ سکندری (کلکتہ) میں چھاپ دیجیے۔

مجھ پر منّت ہوگی۔ وَالسّلام۔'' (مرزا غالبؔ کا خط، تمام ہوا۔)

(۵) علاّمہ خیرآبادی کے ایک تلمیذ، مولانا نورالحسن، کاندھلوی

۴؍ جنوری ۱۸۴۶ء کو دیو بند، سہارن پور کے تحصیل دار، مقرر ہوئے۔

دورانِ ملازمت کچھ ناگوارِ طبیعت باتیں دیکھ کر ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔

اس جُرأت مندانہ اِقدام کے بعد اپنے اس شاگرد، مولانا کاندھلوی کے نام

علاّمہ فضلِ حق نے ایک خط، روانہ کیا۔ جس میں دل جوئی و حوصلہ افزائی کے ساتھ

غیرتِ دینی کی بنیاد پر، ترکِ ملازمت پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ:

........بدریافت قطع کردن آں اَعز سلسلۂ روزگار بحمیّتِ دین، بغایت مَسرور شدم۔

بفضلِ رزّاقِ مُطلق، روزی بسیار است۔ اِنْ شاءَ اللّٰہ عن قریب در مظفرنگر وغیرہ اَضلاع

روزگار صورت می بندد۔ نظر بر شانِ رزّاقی، باید داشت۔''

(ص ۱۴۷۔ **تذکرۂ اسلاف۔ حالاتِ مشائخ کاندھلہ۔**

مؤلّفہ: مولانا احتشام الحق، کاندھلوی۔ مطبوعہ: دہلی ۱۳۸۳ھ)

ترجمہ:۔ **دینی غیرت کی بنیاد پر، اس معزّز سلسلۂ روزگار کے ختم کرنے کی اطلاع سے**

میں انتہائی خوش ہوا۔

رزّاقِ مطلق جَلّ شانُہٗ کے فضل سے روزگار، بہت ہے۔

اِنْ شاءَ اللّٰہُ تعالیٰ، عنقریب، مظفرنگر وغیرہ اَضلاع میں روزگار کی کوئی صورت بن جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ رزّاقی پر نظر رکھنی چاہیے۔''

(۶) عشرت رحمانی اپنے دادا، نواب احمد یار خاں، جو سانحۂ ہنومان گڑھی، اجودھیا (۱۸۵۵ء) کے وقت، لکھنؤ کے کوتوال تھے، اُن کے حوالے سے، عشرت رحمانی لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا امیر علی شاہ، امیٹھوی کی شہادت نے علاّمہ فضلِ حق کو بے حد متأثر کیا۔

اور ان کا دل، انگریزی ڈپلومیسی اور جبر و ظلم سے سخت متنفّر ہو گیا۔''

(ص ۱۲۳۔ **جنگِ آزادی کے نامور مجاہدین**۔ مؤلّفہ: عشرت رحمانی۔

مطبوعہ: مقبول اکیڈمی، شاہراہِ قائدِ اعظم، لاہور۔ ۱۹۹۳ء)

(۷) علاّمہ فضلِ حق کی انگریزوں سے نفرت اور ان کے اَحکام و اِقدامات پر تنقید

علمِ معاشیات میں ان کی مہارت، اور دور اندیشی کا اندازہ

ہم، علاّمہ خیرآبادی کی اُس درخواست سے بخوبی کر سکتے ہیں

جو انھوں نے انگریزی تسلُّط کے زمانے میں کمپنی کی ملازمت کے دوران، ساکنانِ دہلی کی طرف سے، انگریز حاکم کے بجائے، معزول بادشاہ، اکبر شاہ ثانی کے نام، جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) سے

کم از کم تیس (۳۰) سال پہلے، ۱۸۲۷ء سے پہلے کسی سال میں لکھی تھی۔

(یہ درخواست، پروفیسر نثار احمد فاروقی کی تلاش وتحقیق کا نتیجہ ہے، جس کی پہلی اشاعت، سہ ماہی **نوائے ادب**، بمبئی۔ جلد ۱۳۔ شمارہ ۳۰/جولائی ۱۹۶۲ء میں ہوئی۔ اس فارسی درخواست کی اردو تلخیص حکیم سید محمود احمد، برکاتی، ٹونکی (کراچی) نے کی ہے۔ یہ درخواست ص ۹۱ تا ۹۴۔ **فضلِ حق اور ۱۸۵۷ء**۔ مطبوعہ: کراچی ۱۹۷۵ء میں بھی شائع ہو چکی ہے)

اکبر شاہ ثانی کے نام، اہلِ دہلی کے نمائندہ کی حیثیت سے علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی کی پیش کردہ یادداشت (میمورنڈم) کے چند نِکات، ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

"یہاں کے باشندے، مسلمان ہوں کہ ہندو، سب کے سب
زراعت، زمینداری، تجارت، ملازمت، حرفت اور دریوزہ گری پر معاش رکھتے ہیں۔
انگریزی حکومت کے قیام کے بعد سے یہ تمام وسائلِ معاش، مَسدود ومفقود ہوتے جارہے ہیں۔
(۱) ملازمت کے دروازے، شہریوں پر، بند ہیں (۲) تجارت پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا ہے۔
کپڑا، سُوت، ظُروف اور گھوڑے وغیرہ تک انگلستان سے منگا کر خود فروخت کرکے نفع کمایا جارہا ہے۔
(۳) معافی داروں کی معافیاں، ضبط کرلی گئی ہیں۔
(۴) کسانوں کو، محاصل (مال گذاری ولگان) کی کثرت نے بدحال کردیا ہے۔
ان چاروں طبقوں کی زبوں حالی کے نتیجے میں
اہلِ حرفہ اور ان سب کے نتیجے میں دریوزہ گر، تنگیِ معاش کے شکار ہیں۔
دہلی کے ہوڈل، وَپلول وغیرہ، بہت سے پرگنے، جاگیر میں شامل تھے۔
اور جاگیرداروں کے یہاں ہزاروں آدمی، فوج، انتظامی اُمور اور شاگرد پیشہ کی خدمت پر، مامور تھے۔
اب یہ پرگنے اور دیہات ومواضعات، انگریزوں نے ضبط کرلیے ہیں۔
اور لاکھوں کسان، بے روزگار ہوگئے ہیں۔
وحالِ تنگیِ معاشِ رعایائے شاہجہان آباد، مُجملاً، ایں است کہ:
درابتدائے عملِ سرکارِ انگریزی، پرگنہ ہوڈل وَپلول وہتین ونجف گڑھ وسائلہ وفیروز آباد وڈیگ
ونُونہانہ وسانگرس وبجنور وسونی پت وگوہانہ وجبر سیٹھ وکھرکھودہ وروہتک وحصار وہانسی ومہم وغیرہ پرگنات
درجاگیر بودند ودر سرکاراتِ جاگیرداران ایں ہمہ پرگنات
ہزارہا کسان، در ہر کار ودر فوج وشاگرد پیشہ ملازم بودند۔
واکثر دیہات ودر بست وآراضیات بحیطۂ ضبطی درآمدند۔
ومعیشتِ لکوک کسان، بالمرۃ، موقوف شد۔

وحالا، در تمام روزگار ہمچوں عنقا، ناپدید است۔ اِلیٰ آخرِہٖ۔"

(ص ۱۰۳۔ باغی ہندوستان۔ مطبوعہ مبارک پور ۱۹۸۵ء۔
طبعِ اول ۱۹۴۷ء بجنور مع مقدمۂ مولانا ابوالکلام آزاد)

بیواؤں کی معاش، چرخہ کاتنے اور چکی پیسنے پر، موقوف تھی۔
اب اس کی تجارت، حکومت (ایسٹ انڈیا کمپنی) نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔
اور ہاتھ کی چکیوں کی جگہ، پَن چکیاں لگ گئی ہیں، تو یہ ذریعۂ معاش بھی جاتا رہا۔
عوام کی اس بے بضاعتی اور بے روزگاری کی وجہ سے
اہلِ حرفہ اور ساہوکار، بے روزگار اور رزق سے محروم ہوگئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

حکیم سید محمود احمد، برکاتی، ٹونکی (کراچی) کا اس درخواست پر، تجزیہ یہ ہے کہ:

اس درخواست کی خاص بات یہ ہے کہ:
دہلی پر ۱۸۰۳ء سے انگریزوں کا تسلُّط ہوچکا تھا اور لال قلعہ، دہلی کے مغل بادشاہ
ایسٹ انڈیا کمپنی کے وظیفہ خوار اور بے اِقتدار تھے۔
مگر، درخواست، کمپنی ریزیڈنٹ کے نام نہیں (جو بااختیار اور عملاً، حاکم تھے)
بلکہ اکبر بادشاہ ثانی کے نام ہے۔
اس میں کئی سیاسی اور نفسیاتی منافع ومصالح تھے۔"

(ص ۷۱۔ **سفر اور تلاش**۔ از حکیم محمود احمد، برکاتی۔ مجلسِ تحقیقات ومطبوعات، کراچی یونیورسٹی، کراچی)

اس درخواست کے ذریعہ، علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی نے
عوام کو، اصل مسلم حکمرانوں کی طرف، متوجہ کرنے کی کوشش کی۔
اور مغل بادشاہ ثانی کو حالات کی سنگینی سے آگاہ کرتے ہوئے انھیں ان کی ذمہ داری کا احساس دلایا۔
اس درخواست میں انگریزوں کے لئے مسلم حکمرانوں اور رعایا کے ساتھ
اپنے رویّے کی اصلاح اور جاری کردہ اَحکام واِقدامات پر نظرِ ثانی کا بھی پیغام تھا" الخ۔

(تلخیص واِقتباس۔ ص ۱۸۳ تا ص ۱۸۹۔ **علاّمہ محمد فضلِ حق خیر آبادی**۔ تحقیق وتحریر: ڈاکٹر سلمہ سیہول۔
مطبوعہ: مکتبہ قادریہ، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور۔ طبعِ اول: محرم الحرام ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء)

باشندگانِ شہر دہلی کے نمائندہ کی حیثیت سے علاّمہ فضل حق خیر آبادی کی طرف سے اکبر شاہ ثانی کی خدمت میں پیش کردہ یادداشت، یادرخواست (در ۱۸۲۶ء) پر بڑا ہی جامع اور فکر انگیز تبصرہ کرتے ہوئے حکیم سید محمود احمد، برکاتی، ٹونکی (کراچی) تحریر فرماتے ہیں:

"اِن حالات میں برصغیر کا ایک عالمِ دین جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ:

وہ سیاست نہیں جانتا ——— عوام کو، دوبارہ، لال قلعہ کے پھاٹک کی طرف لیے جا رہا ہے۔
اوران کی طرف سے درخواست لکھ کراوران کے حالات وخیالات کا ترجمان بن کر
ان کو'' حضور جہاں پناہ'' کے دیوانِ عام میں لا کھڑا کر دیتا ہے۔
اوراس طرح ایک پیچیدہ نفسیاتی تحریک چلاتا ہے۔ جس سے ایک طرف، عوام کو
دوبارہ اپنے جانے پہچانے مرکزِ حکومت سے گرہ کشائی اور حلِّ مشکلات کی توقعات پوری ہوں گی۔
دوسری طرف، خود، اِن '' جہاں پناہ'' کی خودی کے بیدار ہونے کے امکانات اُبھریں گے۔
اوران کی غیرت وحمیَّت بھی ممکن ہے، انگڑائی لے کر جاگ اٹھے۔
تیسری طرف، برطانوی حکومت کے کارکن چونکیں گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟
سَمتِ قبلہ پھر تبدیل ہو رہی ہے۔ اور وہ چونک کر ایک طرف تو ان مشکلات پر توجہ دیں گے۔
دوسری طرف، شاہ کے ساتھ اپنے رویّہ میں نرمی، اختیار کریں گے۔
اوران گستاخیوں اور اہانت کوشیوں کو لگام دیں گے
جن کا سلسلہ انھوں نے کئی سال سے شروع کر رکھا تھا۔''

(ص ۲۷۔ **فضلِ حق اور ۱۸۵۷ء**۔ مؤلّفہ: حکیم محمود احمد، برکاتی، ٹونکی۔
مطبوعہ: برکات اکیڈمی، کراچی۔ ۱۹۷۵ء)

امامُ الحکمۃ والکلام، قائدِ جنگِ آزادی، علاَّمہ فضلِ حق، خیرآبادی کی
دینی وعلمی وادبی وسیاسی خدمات پر مشتمل، اردو کی مطبوعہ کتابوں میں
(۱) **باغی ہندوستان** از مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی (۲) **فضلِ حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء**
از حکیم سید محمود احمد، برکاتی، ٹونکی (۳) **علاَّمہ فضلِ حق خیرآبادی** از ڈاکٹر سلمہ سیہول۔

نیز، عربی زبان کی مطبوعہ کتاب بعنوان اَلْعَلاَّمَہ فضلِ حق اَلْخَیر آبادی، حیاتُہٗ وَمَأثِرُہٗ
مَع تَحقِیقِ کتابِہٖ ''اَلثَّوْرَۃ الْھِنْدِیَّۃ'' از ڈاکٹر قمر النساء بیگم (مقالۂ ڈاکٹریٹ از شعبۂ عربی
عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد، دکن) جیسی وقیع کتابوں کے بعد
۲۰۱۰ء و ۲۰۱۱ء کی یہ تین کتابیں، خصوصیت کے ساتھ، متعدد جدید مواد وتحقیقات پر مشتمل ہیں
جن کا ذکر، یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان میں ایک، عربی اور، دو اردو زبان میں ہیں
اور یہ تینوں کتابیں نہایت محنت کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔

(۱) دِیْوانُ فَضْلِ حق اَلْخَیر آبادی: دِرَاسَۃٌ وَتَحقِیق۔ از ڈاکٹر سلمہ سیہول، غیر مطبوعہ
مقالۂ ڈاکٹریٹ، شعبۂ عربی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور/ ۲۰۱۰ء۔
(۲) **خیرآبادیات** از مولانا اُسید الحق محمد عاصم، قادری، بدایونی۔ مطبوعہ امطبوعہ: تاج الفحول اکیڈمی

بدایوں۔ ۲۰۱ء۔
(۳) **علاَّمہ فضلِ حق خیرآبادی! چند عنوانات** از خوشتر نورانی۔ مطبوعہ: دہلی۔ ۲۰۱۱ء۔

علاوہ ازیں، مولانا محمد احمد مصباحی فیض آبادی کا مطبوعہ مقالۂ ڈاکٹریٹ از کرناٹک یونیورسٹی
میسور (شعبۂ اردو) بعنوان '' **علاَّمہ فضلِ حق خیرآبادی! حیات وخدمات**۔'' مولانا ارشاد احمد، ساحل
شہسرامی مصباحی کا غیر مطبوعہ مقالۂ ڈاکٹریٹ از شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ بعنوان
مُسَاھَمَۃُ الْعلاَّمہ فَضلِ حق اَلْخَیر آبادی فی الدِّرَاسَاتِ الْکَلامِیَّۃِوَ الْفَلْسَفِیَّۃ۔
ڈاکٹر عبدالواحد چشتی کا غیر مطبوعہ مقالۂ ڈاکٹریٹ از شعبۂ عقیدہ وفلسفہ، جامعہ ازہر، قاھرہ، مصر
بعنوان اَلْعَلاَّمۃ فَضْلِ حق اَلْخَیر آبادی وَ آثارُہٗ الْفَلْسَفِیَّۃ۔
ڈاکٹر ممتاز احمد، سدیدی (فرزندِ حضرت مولانا عبدالحکیم شرف قادری) کا
غیر مطبوعہ مقالۂ ڈاکٹریٹ از شعبۂ عربی، جامعہ ازہر، مصر، قابلِ ذکر ہیں۔
ڈاکٹر سلمہ سیہول، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ عربی، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد
(پاکستان) نے، خانقاہِ قادریہ، بدایوں (یوپی۔ انڈیا) سے حاصل شدہ قلمی نسخہ
'' **قصیدۂ رائیہ**'' از علاَّمہ فضلِ حق، خیرآبادی اپنے مرتّبہ '' **دیوانِ فضلِ حق**'' میں شامل کیا ہے
اور یہی '' **قصیدۂ رائیہ**'' **علاَّمہ فضلِ حق خیرآبادی: چند عنوانات**۔ از خوشتر نورانی میں
ص ۱۶۴ تا ص ۱۷۵۔ نیز، اس پر تبصرہ از ص ۱۱۲ تا ص ۱۲۳، اس کتاب میں شامل ہے۔
۲۳۵ عربی اشعار پر مشتمل، قصیدہ رائیہ بعنوان '' ھَجْوُ النَّصارَیٰ وَالْمُتَنَصِّرِیْن ''
خانقاہِ قادریہ، بدایوں کے شعبۂ مخطوطات کی زینت، ایک بیش قیمت امانت
بلکہ قوم وملّت اور ملک ووطن کا بیش بہا سرمایۂ تاریخ ادب وسیاست ہے۔

قصیدۂ رائیہ، علاَّمہ فضلِ حق خیرآبادی نے، اُس وقت، رقم اور نظم کیا تھا
جب آپ، دہلی میں سررشتہ دارِ عدالتِ دیوانی تھے۔
اور بالفاظِ دیگر، ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم تھے۔
ملازمت کے دوران ہی علاَّمہ خیرآبادی نے انگریزوں کے مکر وفریب، ظلم واستحصال وغیرہ پر مشتمل
یہ قصیدہ لکھ کر اپنے دل کا غبار نکالا ہے۔
مختلف جگہوں کے متعدد اشعار، اِس طرح ہیں:

قَوْمٌ یَبُولُوْنَ قَوَّاماً وَاِنْ دَخَلُوْا   فِی غَائِطٍ خَرَجُوْامِنْ غَیرِ تَطْھِیر
یہ وہ لوگ ہیں، جو کھڑے ہو کر پیشاب کرتے ہیں۔
اور بیتُ الخلا جا کر، بغیر، پاکی، حاصل کیے ہوئے باہر نکلتے ہیں۔

فَلَیۡسَ مَقۡصُوۡدُھُم تَروِیجَ مَعرفۃٍ   بَلۡ کُلُّ ذٰلِکَ تَمۡھِیۡدُ لِتَنۡصِیر

ان کامقصود،علم کی ترویج واشاعت نہیں ہے، بلکہ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ لوگوں کوعیسائی بنالیاجائے۔

فی عَھۡدِ ھِمۡ سُدَّ اَبۡوَابُ الصِّدقِ وَانۡفَتَحَتۡ   اَبۡوَابُ کِذۡبٍ وَ بُھۡتَانٍ وَ تَزۡوِیۡر

ان کے عہد میں سچائی کا دروازہ بند ہوگیا اور جھوٹ، بہتان اور دھوکہ بازی کے بہت سے دروازے کھُل گئے۔

فَلَیۡسَ یَظفرُ اِلَّا مُدَّعِی کِذۡبٍ   وَلایُصَدَّقُ اِلَّا شَاھِد الزُّوۡر

جھوٹا مدعی ہی ان کی نام نہاد عدالت میں کامیاب ہوتا ہے۔
اور جھوٹے گواہ ہی کی، اس میں گواہی مانی جاتی ہے۔

قَدۡ اَذۡھَبَتۡ بَرکاتِ الۡاَرۡضِ نِیَّتُھُمۡ   فَلَیۡسَ فِی الۡحَرۡثِ مِنۡ ریعٍ وَتَوفِیر

ان کی بدنیتی نے زمین کی برکتیں چھین لی ہیں۔ اسی لئے کھیتیوں میں شادابی اور فراوانی، اب نہیں پائی جاتی ہے۔

وَنَکَّرُوۡا بَعدَ طُولِ الۡعَھۡدِ اَنۡفُسَھُمۡ   وَبَدَّلُوا کُلَّ تَسۡھِیۡلٍ بِتَوۡعِیۡر

یہ لوگ، طویل مدت کے بعد اپنے عہد سے پھر گئے اور ان کی نرمی، کینہ توزی میں بدل گئی۔

فَاِنَّمَا ظَفَرُوۡا بِالۡھِنۡدِ اِذۡ ظَفَرُوۡا   بِالۡکَیۡدِ وَالزُّوۡرِلَابِالۡاَیۡدِ،وَالزَّور

انھوں نے ہندوستان میں جب جہاں کچھ فتح وکامیابی پائی
تو اپنی طاقت وقوت اور ضبط وتحمل سے نہیں، بلکہ مکروفریب اور صرف جھوٹ سے کامیابی پائی۔

قَد اسۡتَکَانُوۡا قُبَیۡلاً ثُمَّ اِذۡمَلَکُوا   لَمۡ یُلۡفَ فِیۡھِم سِوٰی عاتٍ وتَیۡھُوۡر

کچھ عرصہ پہلے تک تو عجز ومسکنت سے رہے۔
پھر کہیں جب وہ فاتح وکامیاب ہوئے تو، سرکش ومغرور ہوگئے۔

آگے چند متفرق عربی اشعار کا محض اردو ترجمہ اور پھر قصیدۂ رائیہ سے برآمد ہونے والے کچھ نتائج ونِکات، پیش کیے جارہے ہیں:

ترجمہ:۔حَسَب والے شریف لوگ، ان کی نظر میں ذلیل وحقیر ہیں۔
اور ذلیل وحقیر لوگ، ان کی نظر میں عطاوکرم اور توقیر کے حق دار ہیں۔'' (شعر۲۱۴)
ان کے ٹیکس نے کسانوں کو ہلاک کرڈالا اور وہ کٹی ہوئی فصل کی طرح ہوگئے۔
اور سرسبزی وشادابی کے بعد، ان کو، ایذا پہنچائی گئی۔'' (شعر۲۱۵)
ان کی عدالت کا معنیٰ ظلم ہے۔ وہاں، گناہ کی کوئی تعزیر نہیں۔
اور مالِ حرام لینا، وہاں کوئی گناہ نہیں۔'' (شعر۲۱۶)

فقر کے بعد، وہ مال دار ہوگئے اور مکروحیلہ کی طرف، متوجہ ہوئے۔
تاکہ اہلِ حرفت کو محرومی اور تنگیِ رزق میں مبتلا کریں۔'' (شعر۲۱۷)
تو، اَب ایک بوڑھے کے لئے سوت کاتنے میں کوئی نفع نہیں رہ گیا۔
اور نہ ہی کپڑا بُننے والے کے لئے کپڑا بُننے کی کوئی اُجرت۔'' (شعر۲۱۸)
انگریزوں کی چکی، آٹا پیسنے والے کے اوپر چلی۔
تو، اس کی امیدیں، ہلاکت کی چکی میں پس گئیں۔'' (شعر۲۲۹)
انھوں نے ہندوستان کو، سونے اور دینار سے خالی کردیا۔
اور اس کے لئے انھوں نے کسی فقیر اور بوڑھے کو بھی نہیں چھوڑا۔'' (شعر۲۲۰)
یہ تو، ان کے قبضے کا ابتدائی زمانہ ہے۔ ابھی تو، اس کی انتہا اور انجام، باقی ہے۔
اس انجام میں یقیناً، بڑی عظیم مصیبتیں ہیں۔'' (شعر۲۲۷)
میں نے، ان کے کاموں میں سے کچھ ہی ذکر کیے ہیں۔
ان کے ایسے کتنے ہی ''قابلِ فخر کارنامے'' بیان نہیں ہوئے۔'' (شعر۲۲۸)
میں نے ان کے ''حُسن وجمال'' کے بیان میں اِجمال سے کام لیا ہے۔
ان کی خوبیوں کی تفصیل کا اِحاطہ نہیں کیا جاسکتا۔'' (شعر۲۲۹)
ان کی طبیعت اور عادت کے بارے میں، میں نے اپنی اس گفتگو میں کوئی چیز اپنی طرف سے نہیں گڑھی ہے۔ بلکہ میرے خبر دینے کی سچائی، میرے اختیار سے مخلوط نہیں ہے۔'' (شعر۲۳۱)
مجھے (ان باتوں میں) ذرا بھی، شک وتردُّد نہیں ہے۔ میری ان خبروں میں صرف، وہی شخص، شک کرسکتا ہے، جس کو، ان خبروں پر حیرت ہو۔'' (شعر۲۳۲)
لیکن، میں تو، ان کی حالت، بیان کرنے میں اِختصار سے کام لے رہا ہوں۔
اگر، وہ دیکھ لیں، تو میں زیرِ عتاب آجاؤں اور میری معذرت کا دائرہ، تنگ ہوجائے۔(شعر۲۳۳)
وہ مجھے معذور رکھیں۔ اگرچہ، غلطی کرنے والا شخص، معذرت طلب کررہا ہو
تو اسے معاف کرنا، ان کی عادت نہیں ہے۔'' (شعر۲۳۴)
اللہ تبارک وتعالیٰ، ان کے ظلم کی تاریکیوں سے خوش خبری کی کرن پیدا فرمائے۔'' (شعر۲۳۵)

توجہ طلب نِکات: انیسویں صدی عیسوی کے رُبعِ اول میں انگریزوں کی ہجو میں کہا جانے والا یہ طویل قصیدہ، مندرجہ ذیل نِکات کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے:

الف۔علاّمہ خیرآبادی، ابتدا ہی سے انگریزوں کے مخالف اور ان سے بے زار تھے۔

ب۔اپنے والد کے حکم کی تعمیل میں بوجہِ مجبوری

علاّ مہ فضل حق، کمپنی کی سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوئے۔
ج۔ کمپنی سرکار کی ملازمت سے وابستگی کے باوجود
علاّ مہ خیرآبادی، انگریزوں سے متنفّر اوران کے مخالف رہے۔
د۔ اپنی زندگی کی ابتدا سے ہی ہندوستان پرانگریزوں کے قبضہ وتسلُّط کو
وطن اوراہلِ وطن کے لئے بُرا جانا۔'' (ص ۱۲۱ تا ص ۱۲۳۔ **علاّ مہ فضلِ حق خیرآبادی! چند عنوانات۔**
بقلم خوشتر نورانی۔ مطبوعہ: ادارہ فِکرِ اسلامی۔ دہلی۔ ۲۰۱۱ء)

قارئین کو معلوم ہو چکا ہے کہ علاّ مہ فضلِ حق خیرآبادی نے
اپنے والد ماجد، علاّ مہ فضلِ امام خیرآبادی (وصال ۱۲۴۴ھ/ ۲۹۔ ۱۸۲۸ء) کے وصال کے بعد ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے اِستعفا دے دیا اوراس کے بعد، تاحیات کبھی کمپنی کی ملازمت کی نہ ہی اس کی وفاداری وکاسہ لیسی کا کوئی ادنیٰ واقعہ، آپ کی ذات سے منسوب ہے۔
بلکہ کمپنی کی ملازمت کے دَوران ہی اس سے ناراضی اوراس کی پالیسیوں سے بے زاری کی خود، ان کی تحریری شہادت آپ، ملاحظہ فرما چکے ہیں۔
علاّ مہ فضلِ حق، خیرآبادی نے اپنی غیرتِ مِلّی وملکی اورطرزِ فکر وعمل سے
کمپنی کی انگریزی حکومت کو واضح پیغام دے دیا کہ:
یہ وہ شاہین ہے، جو ذہنی وفکری طور پر کبھی ان کے زیرِ دام آنے والا نہیں ہے۔

بروایں دام برمُرغِ دِگرنہ
کہ عنقارا بلندست آشیانہ

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء اورتحریکِ آزادی ۱۹۴۷ء کے مشہور مؤرخ، رئیس احمد جعفری، ندوی (۱۹۱۲ء۔ ۱۹۶۸ء) اس سلسلے میں بڑی وضاحت کے ساتھ اپنے طویل تحقیقی مطالعہ کا خلاصہ
اِس طرح، تحریر کرتے ہیں کہ:
''اس حقیقت سے کوئی انکارنہیں کرسکتا کہ:
۱۸۵۷ء کے غدر میں عُلما نے نمایاں حصہ لیا۔ بقول ایک اہلِ علم اور محقق کے:
مولانا فضلِ امام، صدرُ الصُّد ور دہلی، مفتی صدرُ الدین خاں، آزردہ، صدرُ الصُّد ور، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مُنصِف امین کول وبریلی، مولانا فضلِ رسول، بدایونی، سررشتہ دار کلکٹری صدر دفتر سَہسوان مفتی انعام اللہ، گوپامؤی، قاضیِ دہلی وسرکاری وکیل الٰہ آباد، مولانا مفتی لطف اللہ، علی گڑھی، سررشتہ دار امین بریلی، علاّ مہ فضلِ حق، خیرآبادی، سررشتہ دار ریزیڈنسی دہلی وصدرُ الصُّد ور لکھنؤ ومہتمم ''حضور تحصیل'' اَوَدھ، مولوی غلام قادر، گوپامؤی، ناظر سررشتہ دار عدالتِ دیوانی وتحصیل دارِ گوڑگاؤں (میوات)

مولوی قاضی فیض اللہ، کشمیری، سررشتہ دار صدرُ الصُّد ور دہلی، وغیرہ۔
یہ سب اُس وقت کے بےنظیر وعدیم المثال اکابر عُلما تھے۔ حکومت کی باگ ڈور، انھیں کے ہاتھ میں تھی۔ مسلمانوں کی سلطنت کی بربادی، ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔
موقع کا انتظار تھا۔ ۱۸۵۷ء کا وقت آیا، توسب میں پیش پیش، یہی حضرات تھے۔
والیانِ ریاست اوراراکینِ دولت میں ناقوسِ حُریت پھونکنے والے، یہی تھے۔
عوام کو اُبھارنا اورفتوائے جہاد، جاری کرنا، انھیں کا کام تھا۔
اورانقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد، سب سے زیادہ مصائب اٹھانے والے
اورآتشِ حُریت میں جلنے والے، یہی شمعِ شبستانِ آزادی کے پروانے تھے۔''
(ص ۸۰۰۔ **بہادر شاہ ظفر اوران کا عہد۔** مؤلّفہ: رئیس احمد، جعفری، ندوی۔
طبعِ اول: کتاب منزل، لاہور۔ ۱۹۵۶ء)

عُلمائے انقلاب ۱۸۵۷ء مثلاً: مفتی مظہر کریم، دریابادی، مولانا سید کفایت علی، کافی مرادآبادی مولانا احمد اللہ شاہ، مدراسی، مولانا رحمت اللہ، عثمانی، کیرانوی، مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں، اکبرآبادی، مولانا وہاج الدین، مرادآبادی، وغیرہ کو، جن عُلما ومشائخِ سَلف سے
کسی نہ کسی شکل میں فکری وعملی رہنمائی، حاصل ہوئی، ان میں سے چند اہم نام، درج ذیل ہیں:
(۱) حضرت شاہ ولی اللہ، محدّث دہلوی (وصال ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) (۲) حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں، نقش بندی، مجدّدی، دہلوی (وصال ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء) (۳) حضرت قاضی ثناء اللہ، مجدّدی پانی پتی (وصال ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء) (۴) حضرت شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی (وصال ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) (۵) حضرت مفتی محمد عوض، بدایونی ثم بریلوی (وصال ۱۲۳۶ھ/ ۱۸۲۱ء)
(۶) حضرت مفتی شرفُ الدین، رام پوری (وصال ۱۲۶۸ھ/ ۱۸۵۲ء)
۱۸۵۷ء سے پہلے، ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت، یااس کے بعد کی براہِ راست برطانوی حکومت کے دور میں انگریزی ملازمت سے وابستگی، اختیا کرنے والے، یااس ملازمت سے بےتعلق عُلما وقائدین کے کردار کا تاریخی جائزہ لیا جائے، تواس کی متعدّد صورتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔
جن میں خصوصیت کے ساتھ، یہ صورتیں، زیادہ اہم اورقابلِ توجہ ہیں:
(۱) انگریزی ملازمت کے باوجود، انگریزی حکومت کی ناپسندیدگی کا تسلسل! مثلاً:
علاّ مہ فضلِ حق، خیرآبادی، جن کے تعلق سے کچھ احوال وحقائق آپ نے ملاحظہ کیے۔
اورکچھ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔
علاّ مہ فضلِ رسول، عثمانی، بدایونی (وصال ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) جن کے حقیقی بھانجے، مولانا

فیض احمد، عثمانی، بدایونی، مناظرۂ آگرہ ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء (اہلِ اسلام ونصاریٰ کے درمیان۔ جس میں مناظرِ اسلام، مولانا رحمت اللہ، کیرانوی اور مناظرِ نصرانیت، پادری فنڈر تھے) میں

مجاہدِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء مولانا رحمتُ اللہ، عثمانی، کیرانوی (وصال ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء) کے دستِ راست ومعاون مناظر تھے اور دوسرے معاون مناظر، مجاہدِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء

مولانا ڈاکٹر وزیر خاں، اکبرآبادی (وصال ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۳ء) تھے۔

ڈاکٹر وزیر خاں بھی انگریزی حکومت کی طرف سے کلکتہ اور پھر آگرہ میں اسسٹنٹ سرجن تھے۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد، مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی۔

"سلسلۂ ملازمت میں داخل ہوکر، اس عُہدۂ جلیلہ پر، مامور ہوئے کہ تمام سیاہ وسپید، آپ کے ہاتھ میں تھا۔ اُس وقت، آگرہ، صوبہ کا صدر مقام تھا۔ آپ، لیفٹیننٹ گورنر کے سررشتہ دار تھے۔

ثروت وامارتِ خاندانی کے سِوا، عہدہ کی وجاہت، اس پر طُرّہ، یہ کہ:

سرولیم میور، لیفٹیننٹ گورنر بہادر صوبہ آگرہ واَودھ، آپ کے شاگردِ خاص اور احترام کنندہ۔"

(ص ۶۱۔ **اکملُ التاریخ** (۱۳۳۳ھ) حصہ اول۔ مؤلّفہ: محمد یعقوب ضیا قادری، بدایونی۔

طبع اول: مطبع قادری۔ مولوی محلّہ۔ بدایوں)

مولانا فیض احمد عثمانی، بدایونی کی تعلیم وتربیت، علاّمہ فضلِ رسول، عثمانی، بدایونی نے فرمائی تھی۔

اور آپ کی منشا ومرضی کے مطابق، مولانا فیض احمد، انگریزوں کے خلاف، میدانِ عمل میں سرگرم تھے۔ چنانچہ، مولانا فیض احمد، بدایونی اور ڈاکٹر وزیر خاں، اکبرآبادی

دونوں کی رفاقت اور سیاسی کردار، ہندوستان کی تاریخِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا، ایک روشن باب ہے۔

"آگرہ میں ان دونوں نے قلعہ (آگرہ) کو جائے پناہ قرار دیا۔ ماہ جون (۱۸۵۷ء) میں یہاں بھی واقعات، شروع ہوئے، جولائی میں تیزی آئی۔ مجاہد فوج کی سرپرستی، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد، بدایونی نے کی۔ مگر، جب حالات کا گہرائی سے جائزہ لیا اور دہلی سے طلبی ہوئی

تو کچھ مسلّح سپاہ کے ساتھ، ڈاکٹر وزیر خاں، اکبرآبادی اور مولوی فیض احمد، بدایونی دہلی کے لئے روانہ ہوگئے۔ (ص ۲۱۔ **جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد! مولانا فیض احمد، بدایونی۔**

مؤلّفہ: پروفیسر محمد ایوب قادری، مطبوعہ: ایجوکیشنل پریس، کراچی۔ ۱۹۵۷ء)

انگریز نواز مؤرخ، ذکاءُاللہ دہلوی (متوفی ۱۹۱۰ء) نے لکھا ہے کہ:

"مولوی فیض محمد، آگرہ میں صدر بورڈ کا سررشتہ دار تھا اور باغی ہوکر دہلی آیا تھا۔

اس کو اور مرزا مغل اور مرزا خضر کو عدالت کا، کام، سپرد ہوا۔"

(ص ۶۸۸۔ **تاریخ عروجِ عہدِ سلطنتِ انگلیشیۂ ہند۔**

مؤلّفہ: ذکاءاللہ، دہلوی۔ مطبوعہ: شمس المطابع، دہلی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۳ء)

"اَوَدھ کا صوبہ دار، ڈاکٹر وزیر خاں کو مقرر کیا تھا، جو آگرہ کا، سب اسسٹنٹ سرجن تھا۔

اور باغی ہوکر، دہلی آیا تھا اور بخت خاں کا بڑا دوست تھا۔" الخ (ص ۶۸۹۔ حوالۂ مذکورہ)

"مولوی فیض محمد، ضلع بلند شہر اور ضلع علی گڑھ کی تحصیلِ مال گذاری کے لئے مقرر ہوا۔"

(ص ۶۹۱۔ **تاریخِ عروجِ عہدِ سلطنتِ انگلشیہ** ۔مطبوعہ: دہلی ۱۹۰۳ء)

مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبرآبادی (۱۸۹۲ء۔ ۱۹۶۸ء) لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر وزیر خاں، مردانہ وار نکل آئے۔ آگرہ میں، جو فوج، فدائیوں کی آئی

اس کی سرپرستی، ڈاکٹر صاحب نے کی۔ انگریز، قلعہ بند ہوگئے۔

یہ مولوی فیض احمد، بدایونی کو لے کر، دہلی پہنچے۔

بہادر شاہ کا دربار جَما ہوا تھا۔ بریلی سے جنرل بخت خاں آچکے تھے۔ "وار کونسل" بنی ہوئی تھی۔

............ڈاکٹر صاحب بھی اس میں داخل کر لیے گئے۔

جنرل بخت خاں، لارڈ گورنر تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو ہمراہ لیا۔

مولوی فیض احمد، پیش کار، مقرر ہوئے۔" (ص ۸۷۔ **غدر کے چند علما**۔ مطبوعہ: دہلی)

پروفیسر محمد ایوب قادری (متوفی ۱۹۸۳ء کراچی) لکھتے ہیں:

"جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں عُلماے بدایوں نے نمایاں حصہ لیا۔

ان میں سرِفہرست، مولانا فیض احمد بدایونی کا نام ہے، جو اپنے دور کے نامور عالم تھے۔

سنٹرل بورڈ آف ریونیو (آگرہ) میں ملازم تھے۔ عربی کے بلند پایہ ادیب اور شاعر تھے۔

انھوں نے آگرہ میں قیام کے دوران، مولانا رحمت اللہ، کیرانوی اور پادری فنڈر کے مناظرہ (۱۸۵۴ء) میں حصہ لیا اور مولوی رحمت اللہ، کیرانوی کے مددگار رہے۔

پھر، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار حصہ لیا۔ وہ دہلی بھی گئے۔

آخری معرکہ، ککرالہ (بدایوں) میں ہوا۔ اس میں ڈاکٹر وزیر خاں، شہزادہ فیروز شاہ جیسے بَطلِ حُرِیت بھی موجود تھے۔ انگریزوں کا مشہور جنرل پینی مارا گیا۔"

(ص ۲۶۔ **اِنسائیکلوپیڈیا آف بدایوں**۔ جلد ۲۔ مطبوعہ: کراچی)

اپریل ۱۸۵۸ء کے معرکۂ ککرالہ (بدایوں) میں جنرل بخت خاں بھی شریک تھے۔

مولانا فیض احمد بدایونی، بریلی پہنچ کر، خان بہادر خاں، ولد ذوالفقار خاں، ولد حافظ رحمت خاں کے ساتھ، انگریزوں سے برسرِ پیکار ہوئے۔

لکھنؤ پہنچ کر مولانا احمد اللہ شاہ، مدراسی کے ساتھ بھی انگریزوں سے جنگ کی۔
پھر، شاہجہاں پور پہنچے اور جب مولانا مدراسی نے ''محمدی'' میں حکومت، قائم کی
تو اس کے وزیر، منتخب ہوئے۔
شاہجہاں پور پر، انگریزوں کے قبضہ اور مولانا مدراسی کی شہادت (۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء) کے بعد
آپ، نیپال کی طرف نکل گئے۔ اس کے بعد کے حالات کا کچھ علم نہیں کہ:
مولانا فیض احمد، بدایونی پر کیا گذری؟ اور کہاں؟ کس طرح آپ کا انتقال ہوا؟
خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را۔
مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی، سلسلۂ قادریہ، برکاتیہ سے
اور مولانا ڈاکٹر وزیر خاں، بہاری ثُمَّ اکبرآبادی، سلسلۂ چشتیہ ابوالعلائیہ منعمیہ سے منسلک تھے۔
مولانا فیض احمد اپنے سلسلۂ بیعت و اِرادت کے لحاظ سے
مجیدی برکاتی اور مولانا ڈاکٹر وزیر خاں، چشتی ابوالعُلائی منعمی تھے۔

(۲) انگریزی حکومت کی ملازمت کے دوران، وفاداری، مگر بعد میں انگریزوں کی شدید مخالفت:

مجاہدِ جنگ آزادی، مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی، سررشتہ دار، صدر بورڈ آگرہ تھے۔
مجاہدِ جنگِ آزادی، ڈاکٹر وزیر خاں، اکبرآبادی
۱۸۵۷ء سے پہلے، کلکتہ اور پھر آگرہ میں سرکاری ڈاکٹر تھے۔
جنرل بخت خاں، انگریزی فوج کے ایک افسرِ اعلیٰ تھے۔ جو فوج سے مستعفی ہو کر، انگریزوں سے
نبرد آزما ہوئے اور ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر نے انھیں شاہی فوج کا کمانڈر اِنْ چیف بنایا۔
اسی طرح، اس دور کے بعض دیگر مشاہیر کا بھی معاملہ ہے۔
مگر، یہ حضرات، محض اپنی ملازمت کے فرض شناس اور وفادار تھے۔
انگریزی حکومت کو دل و جان سے ناپسند کرتے تھے اور اس کے زوال و خاتمہ کے متمنی و منتظر تھے۔
بیسویں صدی عیسوی کے رُبعِ اول میں انگریزوں کے خلاف، شروع ہونے والی
تحریکِ آزادی کے ایک نمایاں لیڈر، مولانا شوکت علی (۱۸۷۳ء-۱۹۳۸ء)
محمد علی جوہر (۱۸۷۸ء-۱۹۳۱ء) کے بڑے بھائی ہیں۔
یہ دونوں بھائی، پہلے ''مسٹر'' تھے، مگر حضرت مولانا عبدالباری، فرنگی محلی لکھنوی (وصال ۱۳۴۴ھ/
جنوری ۱۹۲۶ء) کی توجہ و عنایت سے ''مولانا'' کے نام سے پورے ہندوستان میں مشہور ہو گئے۔
یہ شوکت علی، انگریزی حکومت کے محکمۂ افیون کے سترہ (۱۷) سال تک ایک افسرِ اعلیٰ رہے۔
چنانچہ، وہ خود کہتے ہیں:

''(میں نے) سترہ (۱۷) برس تک، دیانت داری، تن دہی اور قابلیت سے اس گورنمنٹ کے
محکمۂ افیون میں اعلیٰ عہدہ دار کی حیثیت سے، ان (انگریزوں، یعنی انگریزی گورنمنٹ) کی خدمت کی۔''
صدارتی خطاب۔ خلافت کانفرنس، منعقدہ ۲۵ دسمبر ۱۹۲۳ء۔
(**انتخابِ خلافت**۔ مرتّبہ: محمود الٰہی۔ اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۸ء)
بیسویں صدی عیسوی کی تحریکِ آزادیِ ہند میں مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ
مولانا شوکت علی کی سرگرمیوں سے سبھی، یا۔ اکثر قارئین، واقف ہوں گے۔
اور انگریزی حکومت کے خلاف، جاری تحریک میں ان کی خدمات، واضح ہیں۔
اس لئے یہاں ان کے تعارف میں کچھ خامہ فرسائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

(۳) ملازمت اور انگریزی حکومت کے ساتھ، از اول تا آخر، وفاداری! مثلاً:

مولانا مملوک علی، نانوتوی و مولانا محمد احسن، نانوتوی، انگریزی حکومت کے
براہِ راست ملازم ہونے کے ساتھ، تا حیات، انگریزوں کے حامی و وفادار رہے۔
مولانا مملوک علی، نانوتوی (متوفی ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) دہلی کالج کے مدرس تھے۔
وفاداری و حُسنِ کارکردگی کی بنیاد پر، مسٹر ٹامسن کی سفارش سے نومبر ۱۸۴۱ء میں
دہلی کالج کے پرنسپل ہوئے۔ کالج کے نصابِ تعلیم کا کام آپ کی نگرانی میں ہوتا۔
۱۸۴۲ء میں آپ، حج پر گئے اور ایک سال کی چھٹی لی، تو چھ ماہ کی پیشگی تنخواہ آپ کو مل گئی۔
گورنر جنرل نے حُسنِ کارکردگی اور وفاداری کے پیشِ نظر آپ کو انعام اور خلعتِ سہ پارچہ سے نوازا۔
(تفصیل کے لئے دیکھیے: کتاب ''مولانا محمد احسن، نانوتوی''۔ مرتّبہ: پروفیسر محمد ایوب قادری، مطبوعہ کراچی۔ ۱۹۶۶ء)
مولانا مناظر احسن، گیلانی (متوفی ۱۳۷۶ھ/جون ۱۹۵۶ء) لکھتے ہیں:
''نانوتہ کے لئے تعلیمی راہ کا دروازہ، مولانا مملوک علی رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے کھل چکا تھا۔
وہ، دہلی میں مقیم تھے۔ اور دہلی کی سب سے بڑی درسگاہ ''دہلی کالج'' کے استاد تھے۔
نہ صرف نانوتہ، بلکہ عثمانی شیوخ کی برادری، اَطراف و جوانب کے جن قصبات میں پھیلی ہوئی تھی
وہاں تک کے بچے، مولانا مملوک علی کے، ان خاص حالات سے کافی اِستفادہ کر رہے تھے۔''
(ص ۲۳۔ **سوانحِ قاسمی، جلدِ اول**۔ دارالعلوم دیوبند)
مولانا محمد اَحسن، نانوتوی (متوفی ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۳ء) اور ان کے دونوں بھائی مولانا محمد مظہر، نانوتوی
و مولانا محمد منیر، نانوتوی، نیز، مولانا محمد یعقوب، نانوتوی و مولانا ذوالفقار علی، دیوبندی، و مولانا فضل الرحمٰن
دیوبندی و مولانا محمد قاسم، نانوتوی و مولانا رشید احمد، گنگوہی نے دہلی کالج میں تعلیم، حاصل کی۔
مؤخرُ الذّکر دونوں حضرات کے علاوہ، سبھی نے انگریزی ملازمت کی۔ مولانا محمد احسن، نانوتوی

مولانا محمد مظہر، نانوتوی اور مولانا محمد منیر، نانوتوی، بنارس کالج، آگرہ کالج اور بریلی کالج کے ملازم ہوئے۔
جب کہ مولانا ذوالفقار علی، دیوبندی و مولانا فضلُ الرحمٰن، دیوبندی
اور مولانا محمد یعقوب، نانوتوی، محکمۂ تعلیم میں انسپکٹر رہے۔
(تفصیل کے لئے دیکھیے۔ **''مولانا محمد احسن، نانوتوی''**۔ مؤلّفہ: پروفیسر محمد ایوب قادری۔ مطبوعہ کراچی۔ ۱۹۶۶ء)

مولانا محمد احسن، نانوتوی، بریلی کالج (قائم شدہ ۱۸۵۰ء) کے صدر شعبۂ عربی و فارسی تھے۔
انھیں کے اِستفسار پر، مولانا محمد قاسم، نانوتوی نے **''تحذیرُ الناس مِنْ اِنکارِ اَثَرِ اِبْنِ عَباس''** لکھی۔
جسے، سب سے پہلے، مولانا محمد احسن، نانوتوی ہی نے اپنے قائم کردہ
مطبعِ صدیقی، بریلی سے شائع کیا۔ ان کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری (کراچی) لکھتے ہیں:
''۲۲؍مئی ۱۸۵۷ء کو نمازِ جمعہ کے بعد مولانا محمد احسن صاحب نے بریلی کی نَومحلّہ مسجد میں مسلمانوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اس میں بتایا کہ: حکومت کے خلاف، بغاوت کرنا، خلافِ قانون ہے۔''
ایک انگریز مؤرخ نے لکھا ہے کہ:
مولانا نے مسجد میں تقریر کی اور اس میں بتایا کہ: حکومت سے بغاوت کرنا، خلافِ شرع ہے۔''
اس تقریر نے بریلی میں آگ لگا دی اور تمام مسلمان، مولانا محمد احسن نانوتوی کے خلاف ہو گئے۔
اگر، کوتوالِ شہر، شیخ بدرُ الدین کی فہمائش پر، مولانا (محمد احسن، نانوتوی) بریلی، نہ چھوڑتے
تو ان کی جان کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

(ص ۵۰ و ۵۱۔ **مولانا محمد احسن، نانوتوی**۔ مرتّبہ: پروفیسر محمد ایوب قادری۔ مطبوعہ کراچی۔ ۱۹۶۶ء)

حاجی سید عابد حسین، قادری، چشتی (متوطن: دیوبند، سہارن پور۔ وصال ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء) نے دیوبند میں ایک مدرسہ، بنام **''مدرسہ عربی و فارسی و ریاضی''** اپنے اَحباب کے تعاون سے ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں قائم کیا تھا، جو آج دارالعلوم دیوبند کے نام سے مشہور ہے۔ کچھ مذہبی اور کچھ سیاسی اسباب و وجوہ کی بنیاد پر حاجی عابد صاحب، چند سالوں بعد یہ کہہ کر، اس مدرسہ سے الگ ہو گئے کہ:

اب لِلّٰھیت نہ رہی اور نفسانیت پیدا ہو گئی ہے، جس سے فقیر کو کیا غرض؟

اس سلسلے میں حاجی سید عابد حسین، قادری، چشتی، محرِّک و بانیِ مدرسہ دیوبند کے خانوادہ کے ایک فرد سید افتخار حسین (دیوبند، سہارنپور) لکھتے ہیں:

''وہ نفسانیت، اس کے سِوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ:

وہ (حاجی عابد صاحب) اس مدرسہ کے ذریعہ، اسلام کی حقانیت و صداقت کی نشر و اشاعت کا اہم فریضہ، انجام دینا چاہتے تھے اور اس ادارہ کے دوسرے اراکین، اس سے متفق نہ تھے؟
ان حضرات کا نقطۂ نظر، بالکل جُدا گانہ تھا۔ وہ اس مدرسہ کو انگریزی حکومت کی رضا و منشا کے مطابق

چلانا چاہتے تھے۔ کیوں کہ مدرسہ کے صدر مدرس، مولوی محمد یعقوب صاحب (مولانا مملوک علی، نانوتوی کے شاگرد) **حکومتِ وقت کے زبردست بہی خواہ تھے۔**
مدرسہ کی صدر مدرِّسی، قبول کرنے سے قبل، وہ کئی شہروں میں انگریزی گورنمنٹ میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول کے فرائض، انجام دے کر اپنے حُسنِ کارکردگی سے انگریزوں کی نظر میں محبوب بن چکے تھے۔
اپنے اس کامیاب تجربے کی روشنی میں، اس مدرسہ (دیوبند) کو
اُسی رَوِش پر لے جانا چاہتے تھے، جو انگریزی حکومت کے عین منشا کے مطابق تھا۔
اس لئے ان کے خیالات کا، حاجی محمد عابد کے خیالات سے متضاد ہونا، ناگزیر تھا۔''
(ص ۶۱۔ **دارالعلوم دیوبند کا بانی کون؟**۔ از سید افتخار حسین۔ دیوبند، سہارن پور)

تقریباً، اسی طرح کی بات، قاری محمد طیب صاحب، سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۹۸۳ء) بھی کہتے ہیں کہ:
مدرسہ (دیوبند) کے مدرسین کی اکثریت ''ایسے بزرگوں کی تھی، جو تارِکِ الدُّنیا و گوشہ نشین حضرات تھے۔ یا۔ ایسے بُزرگوں کی تھی، جو گورنمنٹ کے قدیم ملازم اور حال پنشنر تھے۔
جن کے بارے میں گورنمنٹ کو شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔''
(حاشیہ ۲۴۷۔ **سوانحِ قاسمی، جلدِ دوم**۔ مطبوعہ: دارالعلوم دیوبند)

(۳) انگریزی حکومت کی ملازمت کیے بغیر، مسلسل انگریز حامی روَیَّہ۔

مثلاً: مولانا نذیر حسین، دہلوی و مولانا محمد حسین، بٹالوی۔ یہ دونوں حضرات، انگریزی حکومت کے ملازم نہیں تھے، مگر، ان کی ہم دردی و وفاداری، انگریزی حکومت کے ساتھ تھی۔
اور اس (انگریز نوازی) کے خلاف کوئی تاریخی روایت و شہادت، نہیں ملتی ہے۔
مولانا نذیر حسین، دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) شاہ محمد اسمٰعیل، دہلوی (م ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کے جدید اَفکار و خیالات سے متأثر اور ہندوستانی مسلمانوں کے سَوادِ اعظم کے
بہت سے افکار و خیالات و روایات و معمولات کے مُنکر و مخالف تھے۔
وہ طبقہ، جو ائمّۂ اربعہ رِضْوَانُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ اَجْمَعِيْن کی تقلیدِ فقہی کو شرک اور صوفیہ و مشائخِ اسلام کے تصوفِ اسلامی کو بدعت سمجھنے لگا تھا، اس طبقہ کو ہندوستان کے اندر ایک مستقل فرقہ کی شکل دینے میں ان کا اہم کردار ہے۔ اس سلسلے میں ان کی کتاب **''معیارِ حق''** کو، نمایاں مقام ہے۔
جس کا جواب، حضرت مفتی ارشاد حسین، مجدِّدی، رام پوری (وصال ۱۳۱۱ھ) نے
''انتصارُ الحق'' کے نام سے تحریر فرمایا ہے۔
اس نئے فرقہ کو مسلمانوں کی عام زبان میں غیر مقلِّد کہا جاتا ہے۔ یہ مولانا نذیر حسین، دہلوی

اس فرقہ کے ہندوستان میں سب سے بڑے محدّث ہیں اور ہندو پاک کے تقریباً سبھی غیر مقلد علما کا سلسلۂ تلمّذ، بالخصوص، سلسلۂ علم حدیث انھیں سے منسلک ہے۔

اس طبقہ کی ایک نامور شخصیت، مولانا محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۹۰۵ء) کی تحریری روایت وشہادت، مولانا نذیر حسین، دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) کے سیاسی کردار کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

"چنانچہ، مولوی نذیر حسین، محدّث دہلوی، جو ایک نامی خیر خواہ دولتِ انگلشیہ کے ہیں۔"

(ص ۲۹۔ **تواریخ عجیب/کالا پانی**۔ مؤلّفہ: محمد جعفر تھانیسری۔
مطبوعہ: دینی تعلیمی بورڈ۔ گلی قاسم جان۔ دہلی۔ ۱۹۶۹ء)

مولانا نذیر حسین، دہلوی (متوفی ۱۹۰۲ء) کے ایک معروف ومُعتمد شاگرد اور سوانح نگار، مولانا فضلِ حسین، بہاری (متوفی ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء) لکھتے ہیں:

"زمانۂ غدر ۱۸۵۷ء میں جب دہلی کے بعض مقتدر اور بیشتر معمولی مولویوں نے **انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ دیا، تو میاں صاحب (نذیر حسین دہلوی) نے اس پر دستخط کیا، نہ مہر۔**
بہادر شاہ (ظفر) کو بھی بہت سمجھایا کہ انگریزوں سے لڑنا، مناسب نہیں ہے۔
مگر، وہ باغیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو رہے تھے۔ کرتے تو کیا کرتے؟

(ص ۹۳۔ **الحیاۃ بعد المماۃ**۔ مؤلّفہ: فضل حسین بہاری۔
مطبوعہ: الکتاب انٹرنیشنل۔ بٹلہ ہاؤس۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵)

مولانا نذیر حسین، دہلوی کے ایک اہم اور ان کے خیالات ونظریات کے سرگرم مبلّغ نامور عالم وصحافی، مولانا محمد حسین، بٹالوی (متوفی ۱۹۲۰ء) لکھتے ہیں:

"مفسدۂ ۱۸۵۷ء میں، جو مسلمان، شریک ہوئے تھے، وہ سخت گنہگار اور بحکمِ قرآن، وہ مُفسِد وباغی وبدکردار تھے۔ اکثر، ان میں عوَام کالْاَنعام تھے۔
بعض جو خواص وعُلما کہلاتے تھے، وہ بھی اصل علومِ دین سے بے بہرہ، یا نافہم وبے سمجھ۔
باخبر سمجھ دار عُلما، اس میں ہرگز، شریک نہ ہوئے اور نہ ہی اس فتویٰ پر جو اس غدر کو جہاد بنانے کے لئے مُفسِد لیے پھرتے تھے، انھوں نے خوشی سے دستخط کیے۔"

(ص ۵۰۔ **اَلْاِقتصاد فِی مسائلِ الْجِهاد**۔ مؤلّفہ: محمد حسین، بٹالوی۔ مطبوعہ وکٹوریہ پریس، لاہور)

معروف غیر مقلّد عالم اور عربی ادیب، مولانا مسعود عالم ندوی (یکے از اَحبابِ مولانا ابوالحسن علی ندوی) لکھتے ہیں:

"مولوی محمد حسین، بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ) نے جہاد کی منسوخی پر

ایک رسالہ (اَلْاِقْتِصَاد فِی مَسَائلِ الْجِهَاد) فارسی زبان میں تصنیف فرمایا تھا۔
اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے بھی شائع کرائے تھے۔
معتبر اور ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ:
"اس کے معاوضے میں سرکار انگریزی سے جاگیر بھی ملی تھی۔"

(حاشیہ ص ۲۰۔ **ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک**۔ مؤلّفہ: مسعود عالم ندوی۔
مرکزی مکتبہ اسلامی۔ ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۹۹۹ء)

"**کتابیات**" کے حصے میں ہے:

"۷۔ اَلْاِقْتِصَاد فِی مَسَائلِ الجہاد۔ مصنّفہ: مولوی محمد حسین صاحب، بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ) اس رسالہ میں جہاد کو منسوخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مطبوعہ ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء۔
اردو، انگریزی، عربی میں اس کے ترجمے بھی شائع ہوئے۔
اور انگریزی واردو ترجمے، سر چارج ایچیکسن اور سر جیمس لائل گورنرانِ پنجاب کے نام، معنون کیے گئے ہیں۔
اس کی تالیف ۱۲۹۳ھ میں ہوئی۔ عُلمائے عصر سے رائے لینے کے بعد ۱۲۹۶ھ میں رسالہ اِشاعۃُ السُّنَّۃ (لاہور) میں شائع کیا گیا۔ (جلد ۲۔ ضمیمہ ۱۱)
پھر، مزید مشورہ وتحقیق کے بعد ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۸ء) میں باضابطہ کتابی صورت میں اس کی اِشاعت ہوئی۔ اللہ، مرحوم کی مغفرت کرے۔ اس کتاب پر انعام سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔
جماعتِ اہل حدیث کو، فرقہ کی شکل دینے میں ان کا خاص حصہ ہے۔
اور یہ وہی بزرگ ہیں، جنھوں نے اس سادہ لوح فرقہ میں وفاداری کی خُو بُو پیدا کی۔
نہ صرف یہ بلکہ دوسرے معاصر عُلما کو سرکار کی مخالفت کے طعنے بھی دیے۔"

(ص ۱۵۵ و ۱۵۶۔ **ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک**۔ مؤلّفہ: مسعود عالم ندوی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی۔
ابوالفضل انکلیو۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۱۹۹۹ء)

جو حضرات، علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی کے ناقدین ومعترضین کی تحریروں کا مطالعہ کر چکے ہیں انھیں یہ حصہ اور بعد کی تحریر کے بعض حصے پڑھ کر یہ سمجھنا، بہت ہی آسان ہے کہ؛
یہ حقائق، کیوں اور کن کرم فرما حضرات کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں؟

بہر حال! جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی کی شرکت، ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔
اور شرکت بھی اِس شان کے ساتھ کہ حکومت وفوج کی اعلیٰ قیادت پر آپ کا خاصا اثر تھا۔
اور ایک مفکر ومدبر وقائد کی طرح آپ، ذہن سازی وماحول سازی کا عظیم فریضہ، انجام دے رہے تھے۔

علاّ مہ فضلِ حق خیرآبادی جس وقت ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ کی ''حضور تحصیل'' کے
مہتمم اور پھر، صدرُ الصّدور لکھنؤ، مقرر ہوئے، اُس کے بعد ۱۸۵۵ء کی بات ہے کہ:
مسجد، ہنومان گڈھی، اجودھیا (اَوَدھ) کی، ہندو بیراگیوں نے سخت بے حرمتی کی۔
اور اذان و نماز بند کر کے اسے شہید و بے نام و نشان کرنے کے درپے ہوئے۔
تحفظِ مسجد کے لئے شاہ غلام حسین اور مولوی محمد صالح ۱۳/ذوالقعدہ ۱۲۷۱ھ جولائی ۱۸۵۵ء
میں مسجدِ ہنومان گڈھی، اجودھیا پہنچے۔ ان کے ساتھ، مسلمانوں کی ایک جمعیت تھی۔
بَیراگیوں سے سخت مقابلہ ہوا۔ دو سو اُنہتر (۲۶۹) مسلمان، شہید ہوئے۔
قرآنِ مجید اور مسجد کو، جوتوں سے مَسلا گیا۔ مسجد میں، ناقوس (سَنکھ) بجایا گیا۔
مولانا امیر علی، امیٹھوی، اسلامی حمیّت و غیرت کے جذبات سے مغلوب ہو کر
کچھ مجاہدین کے ساتھ، اجودھیا کے لئے روانہ ہوئے۔
مگر، راستے ہی میں انھیں نوابی فوج اور گوروں کی پلٹن سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور سخت
خوں ریزی ہوئی۔ جس کے نتیجے میں آپ کی شہادت ہوگئی۔ یہ حادثہ ۲۶/صفر ۱۲۷۲ھ/۷/نومبر ۱۸۵۵ء
کا ہے، جس میں چھ سو اٹھارہ (۶۱۸) مسلمانوں نے جامِ شہادت، نوش کیا۔
اس حادثہ سے علاّ مہ فضلِ حق خیرآبادی، سخت دل برداشتہ ہوئے۔
نوابِ اَوَدھ کی طرف سے مصالحتی کوشش کی ناکامی کے بعد حکومتِ اَوَدھ کی طرف سے
مسئلے کا حل ڈھونڈھنے کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی، مگر، اس کی میٹنگ کی نوبت نہ آسکی کہ:
اسی دوران، دِلاور جنگ، مولانا احمد اللہ، مدراسی نے علاّ مہ خیرآبادی سے لکھنؤ میں ملاقات کر کے
مختلف اُمور پر تبادلۂ خیال کیا اور ملکی حالات پر گفتگو کی۔ انگریزوں کی ظالمانہ پالیسی بھی زیرِ بحث آئی
اور نہ جانے کیا اور کیسی باتیں ہوئیں، جنھیں راز و نیاز ہی کہا جا سکتا ہے۔
کچھ دن گذرے تھے کہ لارڈ ڈلہوزی، قہرِ آسمانی کی طرح، سلطنتِ اَوَدھ پر ٹوٹ پڑا۔
اور اس کے جنرلوں نے جَبر و اِکراہ کے ساتھ، ۴/فروری ۱۸۵۶ء کو
ایسٹ انڈیا کمپنی سے، ریاستِ اَوَدھ کے اِلحاق بلکہ اس میں ضَم کرنے کا اعلان کر دیا۔
مسجدِ ہنومان گڈھی، اجودھیا کے سلسلے میں عدمِ وجوبِ جہاد کے ایک فتویٰ کا
کہیں کہیں ذکر ملتا ہے، جس سے علاّ مہ فضلِ حق خیرآبادی کا کوئی تعلق نہیں۔
نہ ہی اسے، مؤرخین، مستند عُلما کا فتویٰ، تسلیم کرتے ہیں۔ مولانا سید محمد میاں، دیوبندی کے بقول
مصدِّقینِ فتویٰ کے ناموں کے ساتھ، علاّ مہ فضلِ حق خیرآبادی کا نام ہی کہیں نہیں ہے۔
چنانچہ، وہ لکھتے ہیں:

**''ان میں مولانا خیرآبادی کا نام، نہ بحیثیت مُجیب ہے، نہ تائید و تصویب کرنے والوں میں آپ کا
نام ہے۔''** (حاشیہ ص ۴۴۶۔ **عُلمائے ہند کا شاندار ماضی**، جلدِ دوم۔ مؤلّفہ: مولانا سید محمد میاں، دیوبندی۔
کتابستان۔ قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶)
جنابِ عشرت رحمانی کے دادا، نواب احمد یار خاں، حادثۂ ہنومان گڑھی، اجودھیا ۱۸۵۵ء کے وقت
لکھنؤ کے کوتوال تھے۔ اپنے دادا کے حوالے سے عشرت رحمانی لکھتے ہیں:
**''حضرت امیرُ المجاہدین، امیر علی شاہ کی شہادت نے علاّ مہ فضلِ حق کو بے حد متاثر کیا۔
اور ان کا دل، انگریزی ڈپلومیسی اور جبر و ظلم سے متنفر ہو گیا۔''**
(ص ۱۲۳۔ **جنگِ آزادی کے نامور مجاہدین**۔ مؤلّفہ: عشرت رحمانی۔ مقبول اکیڈمی، شاہراہِ قائدِ اعظم۔ لاہور۔ ۱۹۹۳ء)
مولانا سید محمد میاں، دیوبندی لکھتے ہیں کہ:
اس حادثہ کے بعد ہی مولانا سید احمد اللہ شاہ، آگرہ سے لکھنؤ پہنچے۔ مولانا فضلِ حق سے ملاقات کی۔''
(ص ۴۴۹۔ **عُلمائے ہند کا شاندار ماضی**۔ جلدِ چہارم۔ مطبوعہ: دہلی)
مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی (متوفی ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء)
سابق لائبریرین، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ لکھتے ہیں:
''ناموسِ اسلام کی بے عزتی اور اسلامی شعائر کی بربادی پر بھی، واجد علی شاہ کو عیش و عشرت کی
پڑی تھی۔ علاّ مہ (فضلِ حق) صدرُ الصّدور (لکھنؤ) تھے۔ ان واقعات سے متاثر ہو کر
لکھنؤ چھوڑ کر، اَلوَر (میوات، راج پوتانہ) چلے گئے۔ مگر، دل، بے چین رہا کہ:
اتنے میں کچھ شورش اُٹھتی نظر آئی۔ دربارِ دہلی سے راجاؤں کے نام، خطوط بھی روانہ ہوئے۔
علاّ مہ نے راجہ اَلوَر سے گفتگو کی۔ وہ، رام نہ ہوا۔ وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔
راہ میں زمینداروں کو تلقین کرتے ہوئے چلے۔ اس سے قبل، مولوی احمد اللہ شاہ، دِلاور جنگ
مدراسی سے سرگوشیاں ہو چکی تھیں۔ دلاور جنگ، فیض آباد چلے گئے تھے۔
اور ہنگامہ ہوتے ہی لکھنؤ آکر اس پر قابض ہو گئے۔
(ص ۲۱۳۔ سوانحِ علاّ مہ فضلِ حق، **باغی ہندوستان**۔ طبع چہارم المجمع الاسلامی، مبارک پور ۱۹۸۵ء۔
طبعِ اول: بجنور ۱۹۴۷ء)
''علاّ مہ، اَلوَر سے نشر و اشاعت کرتے ہوئے مئی ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے۔
میرٹھ اور دوسری چھاؤنیوں میں کارتوسوں کا قضیہ، زور پکڑ چکا تھا۔
گائے اور سُوّر کی چربی کی آمیزش کی خبر سے ہندو مسلمان فوجی بگڑ بیٹھے تھے۔
روٹی کی ٹکیا کی تقسیم، کسی خاص اسکیم کے تحت، گاؤں گاؤں ہو چکی تھی۔

میرٹھ سے دہلی پر ''باغی فوج'' نے ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو حملہ کر دیا۔ قتل و غارت گری کا بازار
گرم ہوا۔ بادشاہِ دہلی، سرگرمیوں کا مرکز بنے۔ علاّمہ بھی شریکِ مشورہ رہے۔''

(ص ۲۱۴۔ **باغی ہندوستان**۔ مطبوعہ: مبارک پور ۱۹۸۵ء)

دہلی میں اپنی تعلیم اور پھر ملازمت کے دوران، عُلما و فُضَلا و اُدَبا و شُعَرا و معزّزینِ دہلی کے علاوہ براہِ راست، بہادر شاہ ظفر سے بھی علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کے خصوصی تعلقات تھے۔

یہی وجہ ہے کہ جب آپ ۱۸۳۱ء میں دہلی کی ملازمت چھوڑ کر، نواب فیض محمد، والیِ جھجھر، پنجاب کی دعوت پر جھجھر (موجودہ صوبہ ہریانہ) کے لئے روانہ ہوئے

تو بہادر شاہ ظفر نے اپنا دوشالہ اُڑھا کر آپ کو، پُرنم آنکھوں کے ساتھ، رخصت کیا۔

علاّمہ خیرآبادی کے عزیز قریب، میر نواب، فرزند سید تفضّل حسین خاں

۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو دہلی میں انقلاب شروع ہوتے ہی اکابرِ شہر دہلی کی لال قلعہ، دہلی کے اندر ہونے والی مِٹنگ کے انتخاب پر، دہلی میں رسد کی فراہمی اور شہر کے انتظام و انصرام کے ذمہ دار بنائے گئے۔

یہ میر نواب، علاّمہ خیرآبادی کی عالمہ فاضلہ صاحبزادی، بی بی سعید النساء حرماں خیرآبادی کے شوہر سید احمد حسین، رسوا خیرآبادی، پسرِ سید تفضّل حسین خاں کے بھائی تھے۔ رسوا خیرآبادی و حرماں خیرآبادی کے دونوں صاحبزادے، منشی افتخار حسین، مضطر خیرآبادی و محمد حسین، بسمل خیرآبادی، اردو کے ممتاز شاعر ہوئے۔

(مضطر خیرآبادی کے لڑکے، قدیم دینی و علمی خانوادوں کی روایت و رَوِش کے برعکس، فلمی دنیا سے وابستہ ہو کر، **جاں نثار اختر** کے نام سے مشہور ہوئے۔ جن کے لڑکے، مشہور فلمی نغمہ نگار، جاوید اختر ہیں)

۱۲ رمئی ۱۸۵۷ء کو، اکابرِ دہلی کی میٹنگ اور میر نواب کے انتخاب کے بارے میں

انگریز نواز مؤرخ، ذکاءُ اللہ، دہلوی (متوفی ۱۹۱۰ء) لکھتے ہیں:

''جس تاریخ (۱۱ رمئی) کو، سپاہ (میرٹھ سے دہلی) آئی، دوسرے روز (۱۲ رمئی) قلعہ میں اکابرِ شہر کی ایک مجلس، مقرر ہوئی کہ شہر کا اور سپاہ کی رسد رسانی کا انتظام کیا جائے۔

اگر، بندوبست نہیں ہوگا، تو وہ (سپاہی) سارے شہر کو لوٹ کر کھا جائیں گے۔

اس کا اہتمام، محبوب علی اور میر نواب، پسرِ تفضّل حسین خاں کے سُپرد ہوا۔''

(ص ۶۷۸۔ **تاریخ عروجِ عہدِ سلطنتِ انگلشیہ ہند**۔ مؤلّفہ: ذکاءاللہ، دہلوی۔
مطبوعہ: شمس المطابع، دہلی۔ ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۳ء)

دہلی میں آغازِ انقلاب کے ساتھ ہی، یا اس سے کچھ قبل، علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی کی ریاستِ الْوَر سے آمد، بہادر شاہ ظفر و اَربابِ حل وعقد سے ملاقاتیں اور انقلاب کی فکری رہنمائی کا

جو، اجمالی ذِکر، تاریخ میں محفوظ ہے، وہی علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی کے

ایک نمایاں قائدِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی حیثیت، ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

یہاں ایک اہم حقیقت، واضح رہے کہ:

کسی تحریک، مُہم، انقلاب، جنگ میں انتظامی و عملی شرکت سے زیادہ اہمیت فکری رہنمائی اور منصوبہ بندی کی ہوتی ہے۔ ذہن سازی و ماحول سازی کر کے ملک و ملّت کے دل و دماغ کو اِقدام و عمل کے لئے آمادہ کرنا، لائحۂ عمل اور نقشۂ جنگ، مرتّب کرنا زیادہ قابلِ قدر اور قیمتی و اہم ہوتا ہے۔ اور یہی کردار، علاّمہ خیرآبادی کا ہے۔

جو انھیں، دیگر نمایاں عُلما و قائدین سے ممتاز و منفرد حیثیت و مقام، عطا کرتا ہے۔

کسی بھی شخصیت، یا تحریک و انقلاب کی عظمت اور اس کی صحیح تاریخ کو جاننے کا اصل پیمانہ یہ ہے کہ اس نے اور اس سے وابستہ ذِمّہ دار اَفراد نے، یا اَحباب و تلامذہ و خُلَفا نے، یا معاصر اہلِ علم و اصحابِ تحقیق نے، اس کے بارے میں کیا کہا اور کیا لکھا ہے؟

اوّلین مراجع و مآخذ کے بیانات کیا ہیں؟

بعد کی کہی اور لکھی ہوئی بے سند و بے حوالہ باتیں، جو اوّلین بیانات و توجیہات سے متصادم ہوں ان کا اعتبار نہیں کیا جاتا، نہ ان کی کوئی تاریخی حیثیت ہوتی ہے۔

اس نقطۂ نظر سے تاریخ کو دیکھا جائے اور اسے جانچا پرکھا جائے

تو، یہ حقائق، سامنے آتے ہیں:

تحریکِ بالاکوٹ (۱۸۲۶ء تا ۱۸۳۱ء) زیرِ قیادت، سید احمد، رائے بریلوی (متوفی ۱۸۳۱ء) و شاہ محمد اسمٰعیل، دہلوی (متوفی ۱۸۳۱ء) کے چند ابتدائی مآخذ و مَراجع، مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) **مخزنِ احمدی**، مؤلّفہ: سید محمد علی، خواہر زادۂ سید احمد، رائے بریلوی۔
محرّرہ ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء۔ مطبع: مفیدِ عام۔ آگرہ۔

(۲) **تواریخِ احمدی**، موسوم بہ **سوانحِ احمدی**۔ مؤلّفہ: محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۹۰۵ء)
محرّرہ ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء۔ مطبع مجتبائی، دہلی۔ ۱۸۹۵ء۔

(۳) **تواریخِ عجیب (کالا پانی)** امؤلّفہ: محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۹۰۵ء)
محرّرہ ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء۔

(۴) **حیاتِ طیبہ**۔ مؤلّفہ: مرزا حیرت دہلوی۔ مطبع فاروقی، دہلی۔

سید احمد، رائے بریلوی صاحب و شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی صاحب کی

تحریکِ بالاکوٹ (۱۸۲۶ء تا ۱۸۳۱ء) سے تقریباً، دس (۱۰) سال پہلے کی بات ہے۔

جب کہ سید احمد رائے بریلوی صاحب، ریاستِ ٹونک سے وابستہ تھے۔

اس وقت کی ایک بے نظیر کارگزاری کا ذکر کرتے ہوئے، مرزا حیرت، دہلوی لکھتے ہیں:

''لارڈ ہسٹنگ'' سید احمد کی بے نظیر کارگزاریوں سے، بہت خوش تھا۔
دونوں لشکروں کے بیچ میں ایک خیمہ کھڑا کیا گیا۔ اس میں تین آدمیوں کا، باہم معاہدہ ہوا۔
امیر خاں، لارڈ ہسٹنگ اور سید احمد صاحب۔
سید صاحب نے امیر خاں کو بڑی مشکل سے شیشے میں اُتارا تھا۔''

(ص ۲۹۴۔ حیاتِ طیبہ، مطبوعہ: دہلی)

یہ امیر خاں، ہی ریاستِ ٹونک کے بانی اور حاکم و امیر تھے۔

محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۹۰۵ء) سید احمد، رائے بریلوی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس سوانح اور مکتوباتِ منسلکہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ:
سید صاحب کا، سرکار انگریزی سے جہاد کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔
وہ اس آزاد عمل داری کو اپنی ہی عمل داری سمجھتے تھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ:
اگر، سرکار انگریزی، اس وقت، سید صاحب کے خلاف ہوتی
تو ہندوستان سے سید صاحب کو کچھ بھی مدد نہ پہنچتی۔
مگر، سرکار انگریزی، اس وقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔''

(ص ۱۳۹۔ سوانحِ احمدی۔ مطبوعہ: اسٹیم پریس، لاہور)

''آپ کے سوانحِ عمری اور مکاتیب میں، بیس (۲۰) سے زیادہ
ایسے مقامات پائے گئے ہیں، جہاں، کھلے کھلے اور اعلانیہ طور پر
سید صاحب نے بدلائلِ شرعی اپنے پَیرو لوگوں کو سرکار انگریزی کی مخالفت سے منع کیا ہے۔''

(ص ۲۶۶۔ سوانحِ احمدی۔ مطبوعہ: لاہور)

''اثنائے قیامِ کلکتہ میں جب ایک روز، مولانا محمد اسمٰعیل شہید، وعظ فرما رہے تھے
ایک شخص نے مولانا سے یہ فتویٰ پوچھا کہ: سرکار انگریزی پر جہاد کرنا، درست ہے، یا نہیں؟
اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ:

ایسی بے رو رِیا اور غیر متعصب سرکار پر کسی طرح بھی جہاد کرنا، درست نہیں ہے۔
اس وقت، پنجاب کے سکھوں کا ظلم اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ ان پر جہاد کیا جائے۔''

(ص ۵۷۔ سوانحِ احمدی۔ مطبوعہ: لاہور)

کلکتہ کے اسی وعظ کے بارے میں مرزا حیرت، دہلوی لکھتے ہیں:

''کلکتہ میں جب مولانا اسمٰعیل نے جہاد کا وعظ فرمانا شروع کیا اور سکھوں کے مظالم کی کیفیت

پیش کی تو ایک شخص نے دریافت کیا: آپ، انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ، کیوں نہیں دیتے؟

آپ نے جواب دیا: ان پر جہاد کسی طرح، واجب نہیں۔
ایک تو، ان کی رعیت ہیں۔ دوسرے، ہمارے مذہبی ارکان ادا کرنے میں
وہ ذرا بھی دست اندازی نہیں کرتے۔ ہمیں ان کی حکومت میں ہر طرح آزادی ہے۔
بلکہ اگر ان پر کوئی حملہ آور ہو، تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ:
وہ اس سے لڑیں۔ اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں۔'' (حیاتِ طیبہ۔ مطبع فاروقی۔ دہلی)

سر سید احمد خاں (متوفی ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۸ء) اپنے رسالہ
''**اسبابِ بغاوتِ ہند**'' مطبوعہ ۱۸۵۸ء میں لکھتے ہیں:

''بیس تیس برس پیشتر ایک بہت بڑے نامی مولوی محمد اسمٰعیل نے
ہندوستان میں جہاد کا وعظ کہا اور آدمیوں کو جہاد کی ترغیب دی۔ اُس وقت انھوں نے صاف، بیان کیا کہ:

ہندوستان کے رہنے والے، جو سرکار انگریزی کے امن میں رہتے ہیں
ہندوستان میں جہاد، نہیں کر سکتے۔'' (ص ۸۱۰۔ حیاتِ جاوید۔ از خواجہ الطاف حسین حالی۔
مطبوعہ: قومی کونسل برائے فروغِ اردو۔ نئی دہلی۔ طبع پنجم ۲۰۰۴ء)

سید احمد رائے، بریلوی صاحب کے خیالات وعزائم، بیان کرتے ہوئے
محمد جعفر، تھانیسری (متوفی ۱۹۰۵ء) لکھتے ہیں:

''اور سرکار انگریزی، گو، کافر تھی، مگر، اس کی مسلمان رعایا کی آزادی
اور سرکار انگریزی کی بے رو رِیائی اور بوجہ موجودگی ان حالات کے
ہماری شریعت کے شرائط، سرکار انگریزی سے جہاد کو مانع تھیں۔ اس واسطے آپ کو منظور ہوا کہ:
اَقوامِ سکھ، پنجاب پر جو نہایت ظالم اور احکاماتِ شریعت کے حارج اور مانع تھے، جہاد کیا جائے۔
مگر، جہاد کا کام ایسا نہیں ہے کہ جھٹ پٹ، انجام کو پہنچ جائے اور اس سے فارغ ہو کر گھر کو لوٹ آئے
لٰھذا، آپ نے چاہا کہ جہاد کرنے سے پہلے، حج، فرض کو ادا کر لیں اور بعد ادا
اِس فرض کے، سکھوں سے جہاد، شروع کریں۔'' (ص ۴۵۔ سوانحِ احمدی۔ مؤلّفہ: محمد جعفر تھانیسری)

''ہم، سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں؟
اور خلافِ اصولِ مذہب، طرفین کا خون گرائیں؟'' (ص ۷۱۔ سوانحِ احمدی۔ مطبوعہ: لاہور)

''صرف سکھوں سے جہاد'' کی صراحت
سید احمد، رائے بریلوی صاحب کے الفاظ میں اس طرح کی گئی ہے:

''نہ با کسے از اُمَرَائے مسلمین، منازعت داریم، نہ با کسے از رؤسائے مؤمنین، مخالفت

نہ با کفّارِ لِئام، مقابلہ داریم، نہ بامدّعیانِ اسلام۔
صرف بادرازمویاں، مقاتلہ، نہ باکلمہ گویاں واسلام جویاں۔
نہ باسرکارانگریزی مخاصمت داریم ونہ ہیچ راہِ منازعت کہ رعایائے اُو ہستیم۔"
(**سوانح احمدی**۔ مؤلّفہ: محمد جعفر تھانیسری۔ مطبوعہ: لاہور)

ترجمہ:۔ **نہ مسلمان رئیسوں سے ہمارا جھگڑا ہے، نہ اہلِ ایمان اُمَرَ او حُکّام سے کوئی مخالفت۔**
نہ کفارِ لئیم سے ہمارا مقابلہ ہے، نہ مدعیانِ اسلام سے۔
ہماری لڑائی، صرف لمبے بال والے سکھوں سے ہے۔
سرکارانگریزی سے ہماری کوئی عداوت ومخالفت نہیں ہے۔ کیوں کہ ہم ان کی رعایا ہیں۔"

مشہور غیر مقلد عالم ومؤرخ، غلام رسول مہؔر (متوفی ۱۹۷۱ء) نے
سابقہ روایات وتحریرات متعلقہ تحریک بالاکوٹ میں علانیہ "اصلاحات" کی ہیں۔
اصلاح کا ایک نمونہ، یہ عبارت بھی ہے، جو بعد کے دور میں اس طرح، منقول ہوئی:
نہ با کسے از اُمَرَ اے مسلمین، منازعت داریم، نہ با کسے از رؤسائے مؤمنین، مخالفت۔
با کفّارِ لِئام مقاتلہ داریم، نہ بامدّعیانِ اسلام، و بادراز مویاں۔
بلکہ باسائرِ کفر جویاں، مقابلہ خواہیم، نہ باکلمہ گویاں واسلام جویاں۔
(ص ۲۰۸۔ **سیرتِ سید احمد شہید**۔ حصہ اول۔ مؤلّفہ: مولانا ابوالحسن علی ندوی۔
مجلسِ تحقیقات ونشریاتِ اسلام، ندوہ، لکھنؤ۔ طبع ہشتم ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۴ء)

"**سکھوں سے جہاد**" کی نیت سے اپنے وطن، رائے بریلی (موجودہ یوپی) سے
روانگی کے وقت (۱۸۲۶ء) اپنی بہن کو نصیحت کرتے اور انھیں یقین دلاتے ہوئے
سید احمد، رائے بریلوی صاحب (متوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) نے کہا تھا کہ:
"میری بہن! میں نے تم کو خدا کے سپرد کیا۔ اور یہ یاد رکھنا کہ:
جب تک، ہند کا شرک، ایران کا رفض، اور افغانستان کا نفاق، میرے ہاتھ سے محو ہو کر
ہر مُردہ سُنّت، زندہ نہ ہولے گی، اللہ ربُّ العزت مجھ کو، نہ اٹھائے گا۔
اگر قبل از اظہار، ان واقعات کے، کوئی شخص میری موت کی خبر تم کو دے
اور تصدیقِ خبر پر حلف بھی کرے کہ سید احمد میرے روبرو مر گیا، یا۔ مارا گیا۔
تو تم اس کے قول پر، ہرگز، اعتبار نہ کرنا۔ کیوں کہ میرے رب نے مجھ سے وعدۂ واثق کیا ہے کہ:
ان چیزوں کو میرے ہاتھ پر، پورا کر کے مجھ کو مارے گا۔" (ص ۲۷۔ **سوانح احمدی**۔ مطبوعہ: لاہور)

مقالاتِ سرسید میں معرکۂ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) کا انجام، اس طرح، مذکور ہے:

"وہابیوں نے پہاڑوں پر جا کر قیام کیا اور انھوں نے اس بات کا قصد کیا کہ:
سکھوں پر، ہم جہاد کریں اور شہید ہوں۔
لیکن، چوں کہ پہاڑی قومیں، ان (وہابیوں) کے عقائد کی مخالف تھیں، اس لئے وہ وہابی
ان پہاڑیوں کو، ہرگز اس بات پر راضی نہ کر سکے کہ وہ ان کے مسائل کو بھی اچھا سمجھتے۔
مگر، چوں کہ وہ سکھوں کے جَور وستم سے نہایت تنگ تھے، اس سبب سے وہابیوں کے اس منصوبے
میں شریک ہو گئے کہ سکھوں پر حملہ کیا جاوے اور آخر کار، وہابیوں اور پہاڑیوں نے مل کر حملہ بھی کیا۔
لیکن، چوں کہ یہ قوم، مذہبی مخالفت میں نہایت سخت ہے، اس سبب سے اس نے اخیر میں دغا کر کے
سکھوں سے اتفاق کر لیا۔ **اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب وسید احمد صاحب کو شہید کر دیا۔"**
(۱۳۹ و ۱۴۰۔ **مقالاتِ سرسید**، حصہ نہم۔ مطبوعہ: مجلس ترقیِ ادب، لاہور)

"**اختتامِ جہادِ بالاکوٹ**" (۱۸۳۱ء) کا نقد فائدہ، یہ ہوا کہ:
۱۸۴۵ء میں انگریزوں نے سکھوں سے جنگ کر کے
انھیں مغلوب اور پھر اپنی مرضی کے مطابق ایک معاہدہ پر مجبور کر دیا۔
اس طرح "**جماعتِ مجاہدین**" کی شورش وجنگ سے پورا پنجاب، اس جماعت کی "**عادِل سرکار**"
کے قبضے میں آ گیا، جو اس "**عادِل سرکار**" کا اصل مطلوب ومقصود تھا۔
چنانچہ، اس جماعت کی سرگرم شخصیت، محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۹۰۵ء) نے
ظہارِ مسرت کرتے ہوئے ۱۸۸۹ء میں تحریر کیا کہ:
"اور آخر کار ۱۸۴۵ء میں معرکۂ بالاکوٹ کے پندرہ برس بعد
کُل سلطنتِ پنجاب، سکھوں کے ہاتھ سے نکل کر، ہماری "عادِل سرکار" کے قبضے میں آ گئی۔"
(ص ۱۳۸۔ **سوانح احمدی**۔ مؤلّفہ: محمد جعفر تھانیسری۔ مطبوعہ: لاہور)

۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء میں یہی محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۹۰۵ء) یہ بھی تحریر فرما چکے ہیں کہ:
"ابتدائے عمل داریِ سرکار سے، وہابیوں سے قتلِ انگریز، تو درکنار
کبھی خلافِ تہذیب بھی (کوئی حرکت) سرزد نہیں ہوئی۔
عین بغاوتِ ۱۸۵۷ء کے عام فتنہ کے وقت، بجائے بغاوت اور فساد کے
وہابیوں نے انگریزوں کی میم اور بچوں کو باغیوں کے ہاتھ سے بچا کر اپنے گھروں میں چھپا رکھا تھا۔"
(ص ۸۳ و ۸۴۔ **تواریخِ عجیب (کالا پانی)** مؤلّفہ: محمد جعفر تھانیسری۔ مطبوعہ دہلی)

غیر مقلّدین ہند کے سب سے بڑے محدّث، مولانا نذیر حسین، دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء)
کے بارے میں اُن کے شاگرد، مولانا فضلِ حسین، بہاری (متوفی ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء) لکھتے ہیں کہ:

''زمانۂ غدر ۱۸۵۷ء میں جب دہلی کے بعض مقتدر اور بیشتر معمولی مولویوں نے
انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ دیا، تو میاں (نذیر حسین دہلوی) صاحب نے، نہ اس پر دستخط کیا نہ مہر۔
وہ خود فرماتے تھے کہ:
میاں! وہ ہلّڑ تھا، بہادر شاہی نہ تھی۔ بے چارہ بوڑھا بہادر شاہ کیا کرتا؟
حشرات الارض خانہ بَراندازوں نے تمام دہلی کو خراب، ویران، تباہ اور برباد کر دیا۔
شرائطِ امارت و جہاد بالکل مفقود تھے۔ ہم نے تو اس فتویٰ پر دستخط نہیں کیا۔
مہر کیا کرتے اور کیا لکھتے؟ مفتی صدر الدین خاں صاحب چکر میں آ گئے۔''
بہادر شاہ کو بھی، بہت سمجھایا کہ: انگریزوں سے لڑنا، مناسب نہیں۔
مگر، وہ باغیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو رہے تھے۔ کرتے تو کیا کرتے؟''
(ص ۹۳۔ **الحیاۃ بعد المماۃ**۔ مؤلّفہ: مولانا فضلِ حسین، بہاری۔
مطبوعہ: الکتاب انٹرنیشنل۔ بٹلہ ہاؤس۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵)

غیر مقلّدینِ ہند کی صفِ اول کے عالم، نواب صدیق حسن، بھوپالی (متوفی ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء)
اپنی جماعت کے سرگرم وکیل و صحافی، مولانا محمد حسین، بٹالوی (متوفی ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء)
شاگردِ مولانا نذیر حسین، دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) کے بارے میں لکھتے ہیں:
''۱۸۵۷ء میں مولوی محمد حسین، سرگروہِ موحّدینِ لاہور، بجواب و سوال و مسئلہ اور اس فتویٰ کے کہ
آیا، بمقابلہ گورنمنٹ ہند، مسلمانانِ ہند کو جہاد کرنا اور اپنی مذہبی تقلید میں ہاتھ اٹھانا چاہیے، یا نہیں؟
یہ جواب دیا ہے اور بیان کیا ہے کہ:
جہادِ مذہبی بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند، یا بمقابلہ اُس حاکم کے
جس نے آزادیٔ مذہبی دے رکھی ہے، از روئے شریعتِ اسلام، عموماً، خلاف و ممنوع ہے۔
اور وہ لوگ جو بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند، یا۔ کسی اُس بادشاہ کے کہ:
جس نے آزادیٔ مذہب دی ہے، ہتھیار اٹھاتے ہیں اور مذہبی جہاد کرنا چاہتے ہیں
کُل ایسے لوگ، باغی ہیں اور مستحق، سزا کے مثل باغیوں کے شمار ہوتے ہیں۔''
(ملخصاً ص ۱۲۰۔ ترجمانِ وہابیہ۔ مؤلّفہ: نواب صدیق حسن بھوپالی۔ مطبوعہ: امرتسر، پنجاب)

مولانا محمد حسین، بٹالوی (متوفی ۱۹۲۰ء) نے اپنے رسالہ اِشاعۃُ السُّنّۃ لاہور کی جلد ۸۔ شمارہ ۹
کے اندر ایک جماعتی تحریر، شائع کی ہے۔ اس جماعتی تحریر کو پروفیسر محمد ایوب قادری (کراچی) نے
حیاتِ سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی کے مقدمہ میں اس طرح نقل کیا ہے:
''اس گروہِ اہلِ حدیث کے خیر خواہ و وفادارِ رعایائے برٹش گورنمنٹ ہونے پر

ایک روشن اور قوی دلیل یہ ہے کہ:
یہ لوگ، برٹش حکومت کے زیرِ حمایت رہنے کو، اسلامی سلطنتوں کے ماتحت رہنے سے بہتر سمجھتے
ہیں۔ اور اس امر کو اپنے قومی وکیل، اِشاعۃُ السُّنّۃ، لاہور کے ذریعہ، جس کے نمبر ۱۰ جلد ۶ میں
اس امر کا بیان ہوا ہے (اور وہ نمبر، ہر ایک لوکل گورنمنٹ اور گورنمنٹ آف انڈیا میں پہنچ چکا ہے)
گورنمنٹ پر بخوبی، ظاہر اور مدلّل کر چکے ہیں۔
جو آج تک کسی اسلامی فرقہ، رعایائے گورنمنٹ نے، ظاہر نہیں کیا۔
اور نہ آئندہ کسی سے ظاہر ہونے کی امید ہو سکتی ہے۔''
(ص ۲۷۔ مقدمۂ حیاتِ سید احمد شہید۔ مطبوعہ: کراچی)

چند سُطور کے بعد، پروفیسر محمد ایوب قادری (کراچی) اپنی تحقیق، اس طرح، پیش کرتے ہیں:
مولوی محمد حسین بٹالوی کی پوری پالیسی میں شمس العلماء شیخُ الکل میاں نذیر حسین دہلوی
مُمِد و مُعاوِن بلکہ سرپرست و دخیل رہے۔ اور صادق پور کے بجائے مرکزِ قیادت، دہلی اور لاہور، منتقل ہو گیا۔
پھر، بیسویں صدی عیسوی کے آغاز پر دسمبر ۱۹۰۶ء میں بمقام آرہ (بہار) آل انڈیا اہلِ حدیث
کانفرنس، وجود میں آئی، جس کے سب سے فعّال کارکن، مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے۔
اہلِ حدیث کانفرنس کی پالیسی بھی کم و بیش، مولوی حسین بٹالوی کے انداز پر رہی۔''
(ص ۲۸۔ مقدمہ حیاتِ سید احمد شہید۔ مطبوعہ: کراچی)

یہی وہ حقائق ہیں، جن کا اعتراف و اظہار، مندرجہ ذیل تحریر میں کیا گیا ہے کہ:
''ہنگامۂ ۱۸۵۷ء میں پورے جوش کے ساتھ، انگریزوں کے خلاف، جنگ میں حصہ لینے والے
وہ سب کے سب عُلمائے کرام، شامل تھے
جو عقیدۃً، حضرت سید احمد اور حضرت شاہ اسمٰعیل کے شدید ترین دشمن ہیں۔
اور جنھوں نے حضرت شاہ اسمٰعیل کے رد میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں اور اپنے شاگردوں کو لکھنے
کی وصیت کی ہے۔'' (حاشیہ ص ۲۵۲۔ مقالاتِ سرسید۔ حصہ شانزدہم۔ مطبوعہ: مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور)

جنگِ شاملی ۱۸۵۷ء (شاملی، موجودہ ضلع مظفر نگر، یوپی) میں بعض اکابرِ عُلمائے سہارن پور مثلاً
مولانا محمد قاسم، نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) و مولانا رشید احمد گنگوہی (متوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء)
کو بعض عُلما و حامیانِ دیوبند، بڑی گھن گرج کے ساتھ، تقریراً و تحریراً، پیش کرتے رہتے ہیں۔
جب کہ اس جنگ کے اصل حقائق، مولانا رشید احمد، گنگوہی کے اوّلین سوانح نگار، مولانا عاشق الٰہی
میرٹھی (متوفی ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) نے ''**تذکرۃُ الرشید**'' حصہ اول میں تفصیل کے ساتھ، پیش کر دیے ہیں۔
تذکرۃُ الرشید، حصہ دوم کے آخر میں ص ۳۴۴ پر، اس کی بھی صراحت ہے کہ:

مولانا خلیل احمد، انبیٹھوی، سہارن پوری (متوفی ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۸ء) نے
اس کا از اول تا آخر، مطالعہ کرلیا ہے۔"
اسی طرح، مولانا مناظر احسن، گیلانی (متوفی ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء) نے
سوانحِ قاسمی، مطبوعہ: دارالعلوم دیوبند میں لکھا ہے کہ:
ذمہ دار عُلمائے دیوبند نے اس کا مطالعہ کرکے قبلِ طباعت اس کی تصدیق وتوثیق کردی تھی۔"

تذکرۃُ الرشید کا بنیادی ماخذ "**سوانح عمری مولانا محمد قاسم**" مؤلّفہ: مولانا محمد یعقوب، نانوتوی (۱۸۳۳ء۔۱۹۰۱ء) ہے۔ بائیس (۲۲) صفحات کا یہ رسالہ ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء میں، شائع ہو چکا تھا۔
جماعتِ دیوبند کے ایک مؤرخ، مولانا ابوسلمان، شاہجہاں پوری
تذکرۃُ الرشید کی تالیف کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:
"۹/اگست ۱۹۰۵ء بروز منگل، حضرت گنگوہی نے انتقال فرمایا تھا۔
اس سے اگلے ہی سال ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے اس کی تالیف کا آغاز کردیا تھا اور تقریباً، دو برس کی محنت کے بعد ۳۰/ذوالحجہ ۱۳۲۶ھ/مطابق ۵/فروری ۱۹۰۸ء بروز چہارشنبہ اس تذکرہ کی تالیف سے فارغ ہوگئے تھے۔" (ص ۱۹۔ **بزرگانِ دارالعلوم دیوبند**۔
مؤلّفہ: ابوسلمان، شاہجہاں پوری۔ مطبوعہ: فرید بک ڈپو، مٹیا محل، دہلی۔ ۲۰۰۶ء)
مولانا مناظر احسن، گیلانی (متوفی ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء) لکھتے ہیں:
"بہر حال! مصنفِ امام کی کتاب اور مولانا گنگوہی کی سوانح عمری، تذکرۃُ الرشید جسے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے مرتّب فرما کر جماعتِ دیوبند کے ذِمّہ دار بزرگوں کی خدمت میں پیش کی اور کافی تنقیح وتحقیق کے بعد یہ کتاب، شائع ہوئی۔
اس وقت کسی قسم کی تنقید، اس کتاب پر جہاں تک میں جانتا ہوں نہیں کی گئی ہے۔"
(**سوانحِ قاسمی**، جلدِ دوم۔ مؤلّفہ: مولانا مناظر احسن گیلانی۔ مطبوعہ: دارالعلوم دیوبند، سہارن پور)
اب عُلمائے سہارن پور کی مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ تاریخ اور جنگِ شاملی ۱۸۵۷ء کی حقیقت
اور اس جنگ میں ان کا کردار، ملاحظہ فرمائیں:
"**اِلزامِ بغاوت اور اس کی کیفیات**" کے عنوان سے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی
تذکرۃُ الرشید، جلدِ اول (مکتبۂ خلیلیہ، مُتصل مدرسہ مظاہرِ عُلوم، سہارن پور۔ یو پی) میں لکھتے ہیں:
"شروع ۱۲۷۶ ہجری نبوی ۱۸۵۹ء، وہ سال تھا جس میں حضرت امامِ رَبّانی (مولانا رشید احمد گنگوہی) قدس سرُّہٗ پر، اپنی سرکار سے باغی ہونے کا اِلزام لگایا گیا۔
اور مفسدوں میں شریک رہنے کی تہمت باندھی گئی۔

.... رمضان ۱۲۷۳ھ یعنی مئی ۱۸۵۷ء کا وہ طوفان، جس کے تصور سے رونگٹا کھڑا ہوتا ہے، ہندوستان کیا، بلکہ دنیا بھر میں ایسا مشہور ومعروف ہے کہ شاید دوسرا نہ ہو۔
سلطنتِ مغلیہ کا آخری دور اور لبریز ہوجانے والے پیمانۂ شاہی کا پہلا منظر یعنی بدنصیب خانماں برباد، بہادر شاہ ظفر، بادشاہِ دہلی کا وہ بلا خیز سماں تھا جس میں کارتوسوں پر چربی لپیٹے جانے کی جھوٹی اَفواہ اُڑی اور غدر برپا کرنے کے چھپے کھُلے، مجمعوں میں چرچے، شروع ہوئے تھے۔
تباہ ہونے والی رعایا کی نحوستِ تقدیر نے ان کو جو کچھ بھی سُجھایا
اس کا انھوں نے نتیجہ دیکھا اور ان کی نسل دیکھ رہی ہے۔
جن کے سَروں پر موت کھیل رہی تھی، انھوں نے کمپنی کے امن وعافیت کا زمانہ قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا اور اپنی رحم دل گورنمنٹ کے سامنے، بغاوت کا عَلَم، قائم کیا۔
فوجیں، باغی ہوئیں۔ حاکم کی نافرمان بنیں۔ قتل وقتال کا بند بازار کھولا۔
اور جواں مَردی کے غرّے میں اپنے پیروں پر کلھاڑیاں ماریں۔" (ص ۷۳۔ **تذکرۃُ الرشید**، جلدِ اول)
"اسی بلا خیز قصہ میں، تھانہ بھون کا وہ فساد، واقع ہوا جس میں قاضی محبوب علی خاں کی مُخبری سے حضرت مولانا (رشید احمد گنگوہی) پر مقدمہ، قائم ہوا۔" (ص ۷۳۔ **تذکرۃُ الرشید**، جلدِ اول)
مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (متوفی ۱۹۴۱ء) بیان کرتے ہیں کہ:
گورنمنٹ نے بذریعۂ اشتہار اپنا امن اٹھالیا تھا، اس لئے لوگوں کی درخواست پر حضرت حاجی امداد اُللہ، مہاجرِ مکی، مسلمانوں کے شرعی معاملات ومقدمات، حل کرنے کے لئے آمادہ ہوئے اور ان کے معاون، مولانا محمد قاسم، نانوتوی ومولانا رشید احمد، گنگوہی تھے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:
"اسی قصہ نے مفسدوں میں شریک ہونے کی راہ چلائی۔
اور مُخبروں کو جھوٹی سچی مُخبری کا موقع دیا۔" (ص ۷۴۔ **تذکرۃُ الرشید**، جلدِ اول)
"ان ایام میں آپ کو، ان مُفسِدوں سے بھی مقابلہ کرنا پڑا، جو غول کے غول پھرتے تھے۔
حفاظتِ جان کے لئے تلوار، البتہ اپنے پاس رکھتے تھے۔
اور گولیوں کی بوچھار میں شیر کی طرح چلے آتے تھے۔" (ص ۷۴۔ **تذکرۃُ الرشید**، جلدِ اول)
پھر، ایک واقعہ، بیان کرتے ہیں کہ چند حضرات کے ساتھ آپ کہیں جارہے تھے کہ:
"بندوقچیوں سے مقابلہ ہوگیا۔ یہ نبرد آزما جتّھہ اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے والا نہ تھا، اس لئے اٹل پہاڑ کی طرح، پَرا جما کر ڈٹ گیا۔
اور سرکار پر، جاں نثاری کے لئے طیّار ہوگیا۔" (ص ۷۵۔ **تذکرۃُ الرشید**، جلدِ اول)
"جب بغاوت کا قصہ، فرو ہوا۔ اور رحم دل گورنمنٹ نے دوبارہ غلبہ پاکر

باغیوں کی سرکوبی شروع کی، تو جن بُزدل مُفسِدوں کو سوائے اس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ:
جھوٹی سچی تہمتوں اور مُخبِری کے پیشہ سے سرکاری خیر خواہ اپنے کو ظاہر کریں
انھوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات پر بھی بغاوت کا الزام لگایا۔ اور یہ مُخبِری کی کہ:
تھانہ کے فساد میں اصلُ الاصول یہی لوگ تھے۔ اور شاملی کی تحصیل پر حملہ کرنے والا یہی گروہ تھا۔"

(ص ٧٦۔ تذکرۃُ الرشید، جلدِ اول)

"حالاں کہ یہ کمل پوش، فاقہ کش، نفس کش حضرات، فساد سے کوسوں دور تھے۔
ملک و مال کے جھگڑے، اگر سَر رکھتے، تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی؟
کوئی، کہیں کا ڈپٹی ہوتا اور کوئی، کسی جگہ کا صدرُ الصُّدور۔"

(ص ٧٦۔ تذکرۃ الرشید، جلد اول۔ مطبع خلیلیہ۔ متصل: مدرسہ مظاہر عُلوم۔ سہارن پور۔ یو پی)

"غول کے غول پھرنے والے" نہ انگریز کی حمایت، نہ ہی مخالفت کے لئے نکلا کرتے تھے۔
ان کا کام، بدامنی سے فائدہ اٹھا کر محض لوٹ مار کرنا تھا۔
چنانچہ، شیخ محمد اِکرام (متولد ١٩٠٨ء۔ متوفی ١٩٧٣ء) لکھتے ہیں کہ:

"جب تھانہ بھون میں بے انتظامی، عام ہوئی
تو حاجی (امدادُ اللہ) صاحب نے قصبے کا انتظام اپنے ہاتھ لیا اور دیوانی و فوج داری کے
جملہ مقدمات، شرعی فیصلہ کے مطابق چند روز تک قاضیِ شرع بن کر فیصل فرمائے۔
ان کوششوں میں مولانا رشید احمد، گنگوہی اور مولانا محمد قاسم، نانوتوی آپ کے ساتھ تھے۔
اور ایک ہنگامہ میں ان حضرات کا، اُن مُفسِدوں سے، جو عام بدانتظامی کا فائدہ اٹھانے کے لئے
"غول کے غول" پھرتے تھے، مقابلہ بھی ہوا۔ اور مولانا محمد قاسم ایک گولی سے زخمی ہوئے۔
جب ہنگامۂ مذکورہ، فرو ہوا۔ اور انگریزی نظم و نسق، دوبارہ قائم ہوا
تو مُخبِروں نے حاجی صاحب اور ان کے رُفَقا کے خلاف، رپورٹ دی۔
اور پولیس ان کی گرفتاری کے درپے ہوئی۔"

(ص ١٩٥ و ١٩٦۔ مَوجِ کوثر۔ مؤلّفہ: شیخ محمد اِکرام۔ مطبوعہ: ادبی دنیا۔ مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی ٦)

"غول کے غول پھرنے والے" جن کے ہاتھوں، حافظ ضامن کی شہادت
اور مولانا محمد قاسم، نانوتوی کے زخمی ہونے کی تاریخ، بیان کی جاتی ہے
اس کے بارے میں اسی طبقے کے نامور مؤرخ، ابوسلمان، شاہجہاں پوری کے بارے میں

ریاض الرحمٰن خاں، شیروانی، علی گڑھی، ان کی ایک کتاب، مطبوعہ کراچی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ابوسلمان، شاہجہاں پوری (اصلی نام، تصدق حسین خاں)
دینی اور سیاسی، دونوں مسالِک کے اعتبار سے دیوبندی ہیں۔
ابھی کم عمر ہی تھے کہ ١٩٥٠ء میں بزرگوں کے ساتھ، کراچی (پاکستان) منتقل ہو گئے۔"

(ص ٣١۔ ماہنامہ "کانفرنس گزٹ" سلطان خاں منزل۔ شمشاد مارکیٹ۔
علی گڑھ۔ یو پی۔ شمارہ اگست ٢٠١٣ء)

ابوسلمان، شاہجہاں پوری، تحریر کرتے ہیں کہ:

"دفعہ سوم سے پتہ چلتا ہے کہ:
کچھ غیر ذِمّہ دار (خواہ، ہندو ہوں، خواہ مسلمان) اہلِ وطن نے حالات کی خرابی
اور نظامِ حکومت کی اَبتری سے فائدہ اٹھا کر
اپنے ہی ہم وطنوں کی لوٹ کو اپنا شِعار بنا لیا تھا۔ یہ فساد تھا اور اس کے پھیلانے والے، مُفسِد تھے۔
حضرت امامِ ربّانی (مولانا رشید احمد، گنگوہی) اور آپ کے رُفَقائے محترم نے
ان فسادیوں سے سختی سے نمٹا تھا اور نہایت بہادری کا ثبوت دیا تھا۔ صاحبِ تذکرۃ الرشید کے الفاظ ہیں:
"ان ایام میں آپ کو، اُن مُفسِدوں سے مقابلہ بھی کرنا پڑا، جو، غول کے غول پھرتے تھے"
اس کا سیاق و سباق، اس بات کا غمّاز ہے کہ:
ایک بار سے زیادہ، اس قسم کا واقعہ پیش آیا تھا۔ نیز، یہ کہ "غول کے غول"
انگریزی حکومت کے وفادار نہیں تھے۔ بلکہ صاف اشارہ، اہلِ ملک فسادیوں کی طرف ہے۔
جنھوں نے حضرت حاجی (امدادُ اللہ) صاحب کے نظامِ امامت، یا حکومت کو بھی قبول نہیں کیا تھا۔
اس وقت، انگریزی نظامِ حکومت اپنی ذِمّہ داریوں کے ساتھ، موجود بھی نہ تھا۔
اگر، اعلیٰ حضرت، حاجی صاحب ان فسادیوں سے تعرض نہ کرتے۔
اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیتے، تو فرائضِ امامت/امارت میں کوتاہی ہوتی۔"

(ص ٤٠۔ بزرگانِ دارالعلوم دیوبند۔ مؤلّفہ: ڈاکٹر ابوسلمان، شاہجہاں پوری۔
مطبوعہ: فرید بکڈپو۔ مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی۔ ٢٠٠٦ء)

دارالعلوم، دیوبند کے معروف اور صفِ اول کے عالم، مولانا مناظر احسن، گیلانی
جنگِ آزادی ١٨٥٧ء میں عُلمائے سہارن پور کی کسی بھی شرکت سے انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اس قسم کا خیال ''**مالیخولیا**'' اور ''**بدخواہی**'' کے سِوا، کچھ نہیں ہے۔
اور اصل حقیقت، وہی ہے جو امام ربّانی (مولانا رشید احمد، گنگوہی) کے مصنّف
مولانا عاشق الٰہی، میرٹھی نے
تذکرۃ الرشید میں بیان کر دی ہے کہ: **مولانا محمد قاسم نانوتوی و مولانا رشید احمد گنگوہی**
''فساد سے کوسوں دور تھے۔''
مولانا مناظر احسن، گیلانی کا خیال ہے کہ:
یہ حضرات اور ان کے رُفقا، کسی سابقہ تیاری کے بغیر
اس طرح کی کسی مُہم اور جنگ میں شامل ہی نہیں ہوسکتے۔ یہ ان کے مقام و منصب کے خلاف ہے۔
اگر، وہ شریک ہوتے، تو اس کی تیاری، پہلے ہی کر لیتے۔
جب کہ واضح ہے کہ کوئی سابقہ تیاری ان حضرات نے کی ہی نہیں تھی۔
چنانچہ، مولانا مناظر احسن گیلانی (متوفی ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء) کے الفاظ میں
یقینی بات اور اصل حقیقت یہ ہے کہ:
''مقابلہ اور مقاتلہ میں عملی شرکت کا فیصلہ، اگر سیدُنا الامام الکبیر (مولانا محمد قاسم، نانوتوی)
پہلے سے کیے ہوئے ہوتے، تو اس زمانے تک آپ کا، جنگی حالات
کم از کم، بندوق کے استعمال سے اس درجہ بیگانہ رہ جانا، کیا ممکن تھا؟
کچھ بھی ہو۔ اتنی بات، بہرحال، یقینی ہے اور ان ناقابلِ انکار چشم دید گواہیوں کا کھلا اِقتضا ہے کہ:
''**مالیخولیا**'' **سے زیادہ، اس قسم کی افواہوں کی کوئی قیمت نہیں ہے کہ:**
ہنگامہ کے برپا کرنے میں دوسروں کے ساتھ، سیدُنا الامام الکبیر (مولانا محمد قاسم، نانوتوی)
اور ان کے دینی و علمی رُفقا کے بھی ہاتھ تھے۔ بلکہ واقعہ، وہی ہے، جو مصنّفِ امام نے لکھا ہے کہ:
مولانا، فساد سے کوسوں دور تھے۔''
آخر، حسبِ روایتِ مولانا محمد طیب صاحب:
جب، سنبھالنے والے، حضرت (مولانا، نانوتوی) کو، نظر نہیں آرہے تھے
تو ''تعمیر'' سے پہلے ''تخریب'' کا، یا ''خروج'' سے پہلے ''ولوج'' کا خیال، ممکن ہے
عامیوں کے نزدیک، ضروری ہو، لیکن، سیدُنا الامام الکبیر (مولانا محمد قاسم، نانوتوی) جیسے، دین کی
مثالی شخصیتوں سے متعلق، اس قسم کے خودتراشیدہ اوہام، ''بدخواہیوں'' کے سِوا، بھی کچھ ہوسکتے ہیں؟

(ص ۱۰۹۔ **سوانح قاسمی**، جلدِ دوم۔ مؤلّفہ: مولانا مناظر احسن گیلانی۔ دارالعلوم دیوبند)
مولانا عاشق الٰہی، میرٹھی (متوفی ۱۹۴۱ء) مزید تحریر کرتے ہیں:
''ہرچند کہ یہ حضرات، حقیقۃً، بے گناہ تھے
مگر، دشمنوں کی یاوہ گوئی نے، ان کو باغی و مُفسِد اور مُجرم و سرکاری خطاوار ٹھہرا رکھا تھا۔
اِس لئے گرفتاری کی تلاش تھی۔ مگر، حق تعالیٰ کی حفاظت، بر سر تھی، اس لئے کوئی آنچ، نہ آئی۔
اور جیسا کہ آپ حضرات اپنی مہربان سرکار کے دلی خیر خواہ تھے
تازیست، خیرخواہ ہی ثابت رہے۔'' (ص ۹۷۔ **تذکرۃ الرشید**، جلدِ اول۔ مطبوعہ میرٹھ)
''حضرت امام، ربّانی، قطب الارشاد، مولانا رشید احمد صاحب قدس سرُّہ کو
اس سلسلے میں امتحان کا بڑا مرحلہ طے کرنا تھا، اس لئے گرفتار ہوئے اور چھ مہینے، حوالات میں بھی رہے۔
آخر، جب تحقیقات اور پوری تفتیش و چھان بین سے کالشَّمسِ فی نِصفِ النَّھار، ثابت ہوگیا کہ
آپ پر، جماعتِ مُفسِدین کی شرکت کا محض الزام ہی الزام اور بہتان ہی بہتان ہے
اُس وقت، رہا کیے گئے۔ اور آپ، بخیر و عافیت، وطنِ مالوف کو واپس آئے۔''
(۹۷۔ **تذکرۃ الرشید**، جلد اول)
''گرفتاری و حوالات اور رہائی و برأت'' کے عنوان سے
مولانا عاشق الٰہی، میرٹھی (متوفی ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) لکھتے ہیں:
''حضرت مولانا کو، یہ بات، معلوم ہوچکی تھی کہ:
آپ کا نام بھی مشتبہ اور قابلِ اَخذ مجرموں کی فہرست میں درج ہو چکا ہے۔
اور آپ کی گرفتاری و تلاش میں دَوِش آیا چاہتی ہے۔
مگر، آپ، کوہِ استقلال بنے ہوئے، خدا کے حکم پر راضی تھے اور سمجھے ہوئے تھے کہ:
''میں جب حقیقت میں سرکار کا فرماں بردار رہا ہوں
تو جھوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ اور اگر، مارا بھی گیا، تو سرکار مالک ہے۔
اسے اختیار ہے۔ جو چاہے کرے۔'' (ص ۸۰۔ **تذکرۃ الرشید**، جلد اول۔ مطبوعہ میرٹھ)
مولانا رشید احمد گنگوہی کی گرفتاری اور عدالتی سوال و جواب کا ذکر کرتے ہوئے
مولانا عاشق الٰہی میرٹھی لکھتے ہیں:
''غرض، حاکم نے، ہرچند تحقیق کیا اور تجسُّس و تحقیق میں پوری کوشش، صَرف کردی

مگر، کچھ، ثابت نہ ہوا۔اور ہر بات کا معقول جواب پایا۔

بالآخر، بری کیے گئے اور فیصلہ سنادیا گیا کہ: رشید احمد رہا کیے گئے۔‘‘

(ص ۸۵۔**تذکرۃ الرشید**، جلدِ اول۔مؤلّفہ: مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔
مکتبہ خلیلیہ، متصل: مدرسہ مظاہر علوم، سہارن پور۔یو پی۔انڈیا)

مولانا محمد قاسم نانوتوی، گرفتاری وارنٹ کے باوجود، آزاد
اور اپنے انتقال ۱۸۸۰ء تک کسی انکوائری و گرفتاری سے محفوظ رہے۔
اور مولانا رشید احمد گنگوہی اپنی رہائی کے بعد
اپنے انتقال ۱۹۰۵ء تک کسی طرح کی تفتیش و نگرانی سے مامون رہے۔

یہ کوئی راز اور معمّہ نہیں۔گورنمنٹ اور پولیس کا، ان کے ساتھ یہ رویّہ اور انداز، صاف بتا رہا ہے کہ:
جو کچھ ہُوا وہ بھی محض مُخبِروں کی کارِستانی ہے، جو کسی مخاصمت، یا۔کسی انتقامی جذبہ، یا افسرانِ بالا کی خوشنودی، حاصل کرنے اور اپنی کارکردگی دکھانے کی نیت سے روبہ عمل ہو کر ’’**رفت و گذشت**‘‘ کے ساتھ اختتام پذیر ہو گیا اور بعد کے عقیدت مند، یا فریب خوردہ عُلَما و مؤرخین نے اتنا طومار باندھنے کی کوشش کی کہ:

ان کے اس منصوبہ بند عمل نے گویا، اس شعر کا قالب ڈھال لیا کہ:

ذرا سی بات تھی، اندیشۂ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے، فقط زیبِ داستاں کے لئے

اور یہ ’’**ذرا سی بات**‘‘ بھی ’’**غول کے غول پھرنے والے**‘‘
اور لوٹ مار کرنے والوں سے ایک مُڈبھیڑ اور جھوٹی سچی مُخبِری کے سوا اور کیا ہے؟

بہر حال! بات یہ چل رہی ہے کہ کسی بھی شخصیت و جماعت کے تعلق سے
معاصر اور اولین روایات و بیانات کی اصل اہمیت ہوتی ہے اور انھیں ہی مستند تاریخ سمجھا جاتا ہے۔
جس کے نمونے، مذکورہ صفحات میں پیش کیے جا چکے ہیں۔

اب دوسری طرف چلیے اور دیکھیے کہ اوّلین بیانات اور معاصر تاریخ کا
قائدِ جنگِ آزادی، علاّمہ فضلِ حق، خیر آبادی کے بارے میں کیا بیان اور کیا فیصلہ ہے؟
انقلابِ ۱۸۵۷ء سے اٹھائیس انتیس سال پیشتر، جب کہ علاّمہ فضلِ حق، خیر آبادی
دہلی میں ریزیڈنسی کے ملازم تھے، اُس وقت، بہادر شاہ ظفر اور دہلی کے مشاہیر عُلَما و فُضَلا
و معزّزین کے ساتھ، علاّمہ خیر آبادی کے رَوابط و تعلقات

ممتاز و مرکزی حیثیت، عظمت و منزلت اور اثر و نفوذ، سب کچھ، واضح ہے۔

یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ دہلی میں ۱۱ر مئی کو انقلاب کی دھمک اور جنگِ آزادی کا آغاز ہوتے ہی لال قلعہ کی اہم نشست کے فیصلے کے مطابق، علاّمہ فضلِ حق، خیر آبادی کے داماد، سید احمد حسین رسؔوا کے بھائی، میر نواب کو، دہلی کے اندر، رَسد وغیرہ کا انتظام و انصرام سنبھالنے کا ذمہ دار و نگراں و مہتمم بنا دیا گیا تھا۔

لیکن، آغازِ انقلاب کے فوراً بعد، ریاستِ اَلْوَر (میوات، راج پوتانہ، موجودہ راجستھان) سے چل کر علاّمہ خیر آبادی، کس تاریخ کو دہلی پہنچے؟ یا پہلے ہی سے دہلی میں موجود تھے؟
اور کسی مقصد و منصوبہ کے تحت، ریاستِ اَلْوَر سے دہلی آئے ہوئے تھے؟

اس کی کوئی متعین تاریخ، مؤرخین نے درج نہیں کی ہے۔البتّہ، حالات و قرائن سے اتنا واضح ہے کہ آغازِ انقلاب کے وقت، یا وسطِ مئی ۱۸۵۷ء میں علاّمہ خیر آبادی، دہلی کے اندر، موجود تھے۔

مُخبِروں نے بہادر شاہ ظفر سے ملاقات و تبادلۂ خیال کی جو تاریخیں اپنی یادداشتوں اور رپورٹوں میں لکھی ہیں، ان میں بیشتر، وہ حضرات ہیں، جو دہلی کے اندر، برسہا برس سے موجود تھے۔
بعض وہ ہیں، جو انقلاب کے بعد، باہر سے دہلی پہنچے۔لیکن، ہر ملاقات کا نہیں، بلکہ انھیں ملاقاتوں کا مُخبِروں نے ذکر کیا ہے، جن میں بہادر شاہ ظفر سے کسی اہم مسئلہ میں کوئی بات ہوئی اور کوئی اہم فیصلہ ہوا۔ یا۔جسے لکھنا، ضروری اور کسی حیثیت سے مفید سمجھا، اسے لکھا اور جسے چاہا، نظر انداز کر دیا۔

انگریزی جاسوس و مُخبِر منشی جیون لال نے بہادر شاہ ظفر اور علاّمہ فضلِ حق، خیر آبادی کی ایک ملاقات، مؤرخہ ۱۶ر اگست ۱۸۵۷ء کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

۱۶ر اگست ۱۸۵۷ء:۔مولوی فضلِ حق، شریکِ دربار ہوئے۔انھوں نے اشرفی، نذر پیش کی اور صورتِ حال کے متعلق، بادشاہ سے گفتگو کی۔‘‘

(ص ۲۱۷۔**روزنامچہ منشی جیون لال**۔و ص ۲۲۲۔**غدر کی صبح و شام**۔مطبوعہ دہلی ۱۹۲۶ء)

اس ملاقات اور علاّمہ خیر آبادی کی دہلی آمد کے تعلق سے سلسلۂ خیر آباد کے معروف عالم حکیم سید محمود احمد، برکاتی، ٹونکی (کراچی۔شہادت: ۱۴۱۴ھ/۲۰۱۳ء) بن حکیم سید محمد احمد، ٹونکی (متوفی ۱۳۵۲ھ/۱۹۲۸ء) بن حکیم سید برکات احمد، ٹونکی (متوفی ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء) تحریر فرماتے ہیں:

’’مولانا فضلِ حق خیر آبادی، آغازِ جہاد یعنی مئی ۱۸۵۷ء ہی سے دہلی میں تھے۔
دہلی ان کا وطن و مسکن تھا۔ان کے غالبؔ، ان کے آزردہؔ اور ان کے اہل و عیال بھی یہیں (دہلی) تھے۔
پھر، غدر کا آغاز ’’رمضان‘‘ میں ہوا تھا۔اور رمضان، عموماً، ہر روزہ دار اپنے اہل و عیال میں

گذارتا ہے۔ ۲۵ مئی کو عید الفطر تھی۔ عید پر، مسافر، ضرور، اہل و عیال سے آملتا ہے۔

مختصراً، یہ کہ عقلاً، ان (مولانا فضلِ حق) کا، اس زمانے میں دہلی میں ہونا، مستبعد اور خلافِ قیاس نہیں، قرینِ قیاس ہے۔ منشی جیون لال کے یہ لکھ دینے سے کہ وہ ۱۶ر اگست کو بادشاہ سے ملے تھے۔

یہ کب، لازم آتا ہے کہ وہ اس تاریخ سے پہلے، دہلی میں نہیں تھے؟

اور یہ کیا ضروری ہے کہ مولانا، جب بھی دربار میں آئے ہوں، جیون لال، ضرور لکھے؟

مثلاً: ۱۹ر اگست کو بھی عبد اللّطیف (مُخبر) کے بیان کے مطابق

مولانا (فضلِ حق) بادشاہ سے ملے تھے۔ (**غدر کا تاریخی روزنامچہ۔ مرتّب**: ہ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ علی گڑھ)) مگر، جیون لال کا روزنامچہ، اس کے ذکر سے خالی ہے۔

اگر، جیون لال کے ان الفاظ سے کہ ''مولوی فضلِ حق، شریکِ دربار ہوئے اور انھوں نے ایک اشرفی، نذر پیش کی'' یہ اِستدلال کیا جاسکتا ہے کہ یہ پہلی بار، شریکِ دربار ہونے کا ثبوت ہے۔

تو جیون لال نے ۱۰ر اگست کے روزنامچہ میں، جو یہ لکھا ہے کہ:

حکیم احسنُ اللہ (شاہی طبیب) شریکِ دربار ہوئے اور ایک اشرفی، نذر پیش کی۔''

(ص ۲۱۳۔ **غدر کا تاریخی روزنامچہ**۔ مرتّبہ: پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ علی گڑھ)

تو کیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ حکیم صاحب بھی

پہلی مرتبہ ۱۰ر اگست ۱۸۵۷ء کو، دہلی آئے تھے اور پہلی بار، شریکِ دربار ہوئے تھے؟

حکیم احسنُ اللہ خاں (شاہی طبیب و برطانوی آلۂ کار) نے اپنے روزنامچہ میں لکھا ہے کہ:

مولانا (فضلِ حق) نے، بادشاہ سے کہا کہ: مجاہدین کی مالی اِعانت کیجیے۔

بادشاہ نے خزانہ، خالی ہونے اور مال گذاری، وصول، نہ ہونے کا عذر کیا۔

تو مولوی (فضلِ حق) صاحب نے جواب دیا کہ:

''آپ کے تمام ملازمین، نااہل ہیں.......... کسی ہوشیار آدمی کو، رسد کی فراہمی پر مامور کیجیے۔

میرے لڑکے (عبد الحق خیرآبادی) اور دوسرے اعِزّہ، تحصیل داری کا کام انجام دیں گے۔

اور رسد بھی فراہم کریں گے۔ (یادداشت حکیم احسنُ اللہ خاں۔ مطبوعہ کراچی)

''مولوی ذکاءُ اللہ، دہلوی (متوفی ۱۹۱۰ء) لکھتے ہیں:

''جس تاریخ (۱۱ر مئی) کو سپاہ آئی، دوسرے روز (۱۲ر مئی) قلعے میں اکابرِ شہر کی ایک مجلس مقرر ہوئی کہ شہر کا اور سپاہ کی رسد رسانی کا انتظام کیا جائے۔

اگر، بندوبست نہیں ہوگا، تو وہ (سپاہی) سارے شہر کو لوٹ کر کھا جائیں گے۔

اس کا اہتمام، محبوب علی صاحب اور میر نواب پسر تفضّل حسین خاں وکیل کے سُپرد ہوا۔''

(ص ۶۷۹۔ **تاریخ عروجِ عہدِ سلطنتِ انگلشیۂ ہند**۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۰۳ء)

حکیم احسنُ اللہ نے مولانا (فضلِ حق) اور بہادر شاہ کی گفتگو کی تاریخ نہیں لکھی ہے۔

مولوی ذکاءُ اللہ، دہلوی نے تاریخ، متعین کردی ہے۔ مولانا (فضلِ حق) کے مشورے کی بِنا پر ان کے ایک عزیز، میر نواب کو، رسد رسانی کی ذمہ دار سب کمیٹی کا رُکن بنادیا گیا۔

میر نواب، مولانا (فضلِ حق) کے داماد، سید احمد حسین، رسوا خیرآبادی کے حقیقی بھائی تھے۔

احمد حسین اور میر نواب، دونوں، سید تفضّل حسین خاں کے بیٹے تھے۔

.... بہرحال! میر نواب، مولانا فضلِ حق کے قریبی عزیز اور مُعتمد تھے۔

اور ان کا، دُورُکنی سَب کمیٹی میں ۱۲ر مئی ۱۸۵۷ء کا انتخاب

مولانا فضلِ حق کی، بہادر شاہ ظفر سے ۱۱ر مئی کی گفتگو کے نتیجے میں ہوا تھا۔

مولوی ذکاءُ اللہ، دہلوی (متوفی ۱۹۱۰ء) لکھتے ہیں:

انھوں (مولانا فضلِ حق) نے، بادشاہ کے لئے ایک دستورُ العمل لکھا تھا۔''

(ص ۶۸۷۔ **تاریخ عروجِ سلطنتِ انگلشیۂ ہند**۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۰۳ء)

مولوی ذکاءاللہ، دہلوی کا ہی بیان ہے کہ:

۹ر جولائی ۱۸۵۷ء کو، اول حکم، بادشاہ کا جو صادر ہوا، وہ یہ تھا کہ گائے کہیں، ذبح نہیں کی جائے گی۔''

(ص ۶۶۰۔ **تاریخ عروجِ عہدِ سلطنتِ انگلشیہ**۔ نیز ص ۱۶۳۔ **غدر کی صبح و شام**۔ منشی جیون لال)

ظاہر ہے کہ ۹ر جولائی کو جس دستور کی پہلی دفعہ، باقاعدہ، نشر اور نافذ کردی گئی تھی

وہ دستور، اسی دن، تو بہادر شاہ کو، پیش نہیں ہوا ہوگا؟

(ذبیحۂ گاؤ کی ممانعت کے تعلق سے، اس شاہی فرمان کے اِجرا کی وجہ، غالبًا یہ تھی کہ:

انگریز اپنی سازش کو جلد از جلد، بروئے کار لانا چاہتے تھے کہ ہندوؤں کو گائے کے ذبیحہ پر مشتعل کر کے انھیں مسلمانوں سے متصادم کر دیا جائے اور اس کے ذریعہ، ہندو مسلم منافرت کا ماحول پیدا کر کے انقلاب اور جنگِ آزادی کو ناکام بنادیا جائے۔ اس سازش کو ناکام بنانے کے لئے ہی شاہی فرمان جاری ہوا تھا۔ اختر مصباحی)

بہادر شاہ کے مطالعہ، نقد و نظر، ردّ و کد، تذبذب، تأمّل اور اس کے مُشیروں کے

مشوروں کی ہفت خواں طے ہونے کے بعد، اس کی بعض دفعات کے نشر و نفاذ کا فیصلہ ہوا ہوگا۔
اور یہ بات، تو بہادر شاہ سے متعلق تھی۔
جس شخص (مولانا فضلِ حق، خیرآبادی) نے اسے، مرتّب کیا تھا
تو یہ سلطنت کا دستور تھا، خطوطِ غالبؔ نہیں تھے کہ بیٹھے اور لکھ مارا۔
مطالعہ، فکر و مشورت کی، جانے کن کن جاں کاہیوں کے بعد، یہ تسوید و تبیض کی منزل سے گذرا ہوگا۔
بہرحال! مولوی ذکاءاللہ کے دونوں مندرجہ بالا اقتباسات سے
مولانا فضلِ حق کا، جولائی سے بہت پہلے، دہلی میں ہونا، ثابت ہوتا ہے۔
اور حکیم، احسنُ اللہ خاں اور مولوی ذکاءُاللہ کے سابقہ اِقتباسات سے
مولانا (فضلِ حق) کا ۱۱رمئی ۱۸۵۷ء کو، دہلی میں ہونا، متعین ہو جاتا ہے۔
ڈاکٹر مہدی حسین (کراچی) نے بھی ذکاءُاللہ کے اس اِقتباس سے یہ نتیجہ، اَخذ کیا ہے کہ
مولانا، آغازِ غدر کے فوراً بعد (**شارٹ لی آفٹر دی آؤٹ بریک آف میوٹنی**) دہلی آ گئے تھے۔ (ص۳۸۹)
مولانا (فضلِ حق) نے ۲۶ رجولائی کو فارسی میں ایک خط بنام مرزا مغل لکھا ہے۔
جس میں مطالبہ کیا ہے کہ:
ان (مرزا مغل، فرزندِ بہادر شاہ ظفر) کی، جنرل بخت خاں سے ملاقات میں جو گفتگو ہوئی ہے
اس کی تفصیل سے مجھے (فضلِ حق) آگاہ کریں۔ میوٹنی پیپرس بکس ۱۰۰۔ نمبر ۹۶۔ ۲۶ رجولائی۔
ڈاکٹر مہدی حسین۔ ۳۹۱۔ (ص۵۷ تا ۵۹۔ **فضلِ حق اور ۱۸۵۷ء**۔
مؤلّفہ: حکیم سید محمود احمد، برکاتی، ٹونکی۔ مطبوعہ: برکات اکیڈمی، کراچی۔ ۱۹۷۵ء)
مندرجہ ذیل معاصر شہادتیں، حکیم سید محمود احمد، برکاتی، ٹونکی (کراچی) کے اس خیال و نظریہ کی مکمل
تائید کرتی ہیں کہ علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی، دہلی کے اندر شروع ہونے والے انقلاب
مورخہ ۱۱رمئی سے پہلے، یا۔ معاً بعد، دہلی میں صرف موجود نہیں، بلکہ سرگرمِ عمل بھی تھے۔
(۱) تعیُّنِ تاریخ کے بغیر، انگریزوں کا گماشتہ جاسوس، عبداللّطیف لکھتا ہے کہ:
''جب، ہنگامہ (مئی ۱۸۵۷ء) برپا ہوا، تو مولوی فضلِ حق آئے۔ دربار میں حاضر ہوئے۔
نذر، پیش کی۔ روپے، صدقے اتارے۔ انھیں انتظام سنبھالنے کی خواہش تھی۔''
(ص۹۶۔ ۱۸۵۷ء کا روزنامچہ۔ مرتّبہ: پروفیسر خلیق احمد، نظامی۔ مطبوعہ: دہلی)
(۲) ۱۸ راگست ۱۸۵۷ء کی رپورٹ میں انگریزی جاسوس، منشی جیون لال لکھتا ہے:

''شاہِ دہلی، سلیم گڑھ تشریف لے گئے اور بعد ملاحظہ کرنے مقامِ مذکور کے
دیوانِ عام میں داخل ہوئے۔ تمام سرداران و امیران نے مُجرا کیا۔ جنرل بخت خاں نے عرض کیا:
میری فوج اور بریلی کی فوج، کل، علی پور کو، واسطے حملہ کرنے فوجِ انگریزی پر، روانہ ہوگی۔
........مولوی فضل حق نے بیان کیا ہے کہ:
انگریزوں نے اخبار میں چھاپا ہے کہ: جس وقت، دہلی فتح ہوگی، شہر میں قتلِ عام کیا جائے گا
اور شہر، خوب غارت ہوگا، اور بادشاہی خاندان میں سے کوئی نام لینے والا اور پانی دینے والا، نہ رہے گا۔
اور کمالِ تأسُّف کی بات یہ ہے کہ:
سپاہیوں نے لڑائی کے قواعد چھوڑ دیے ہیں۔ لٰھذا، کوئی صورت، انگریزوں پر فتح کی، معلوم نہیں ہوتی۔
اس پر، بادشاہ (بہادر شاہ ظفر) نے فرمایا کہ:
تم، فوج میں اپنا بندوبست کرو اور آپ ان کو خود لڑانے لے جایا کرو۔
اس کے جواب میں، اس (فضلِ حق) نے کہا کہ:
فوج، بھوکوں مرتی ہے اور جب تک اس کو خرچ نہیں دیا جائے گا
یہ ہرگز، کسی سردار کا کہنا نہیں مانے گی۔
اس پر (شاہی) حکم ہوا کہ:
تم اپنے ساتھ، فوج لو اور خود، مال گذاری کی تحصیل کرو۔''
(**غدر کی صبح و شام**۔ مطبوعہ: دہلی ۱۹۲۶ء۔ شائع کردہ، خواجہ حسن نظامی دہلوی (مشمولہ ص۲۱۲۔
سرگذشتِ دہلی۔ مرتّبہ: ڈاکٹر درخشاں تاجور۔ مطبوعہ: رضا لائبریری، رام پور۔ یوپی)
بہادر شاہ ظفر کا پرائیوٹ سکریٹری، مُکند لال
۱۸ راگست ۱۸۵۷ء کی ایک اہم کارروائی کے بارے میں لکھتا ہے کہ:
''بہادر شاہ ظفر کے دربارِ عام سے اپنے کمرۂ خاص میں چلے جانے کے بعد
مولانا (فضلِ حق) نے حسب ذیل افراد کے نام، پروانے جاری کرنے کا حکم دیا:
(۱) بنام حسن بخش، عرض بیگی۔ ضلع علی گڑھ کی آمدنی، وصول کرنے کے لئے۔
(۲) بنام فیض محمد۔ اسے ضلع بلند شہر، علی گڑھ کی آمدنی، وصول کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔
(۳) بنام مولوی عبدالحق، ضلع گوڑ گانوہ کی مال گذاری، وصول کرنے کا انتظام کیا جائے۔
(ص۱۲۹۔ **غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط**۔ مطبوعہ: لاہور)

یہ رپورٹ، دو دو چار کی طرح، واضح کر رہی ہے کہ:
علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی، بہت پہلے، دہلی آ چکے تھے۔ اور بہادر شاہ ظفر سے ملاقات
و تبادلۂ خیال کر رہے تھے اور دہلی آمد کے بعد جنرل بخت خاں، کمانڈر انِ چیف شاہی افواج کو
براہِ راست، جنگی اُمور و معاملات میں نہایت اہم مشورے دے رہے تھے۔

صرف شرکتِ جنگ نہیں بلکہ فکری قیادتِ جنگ

اس رپورٹ اور بعد کی معاصر رپورٹوں سے آفتابِ نیم روز کی طرح، واضح ہے۔
اور آفتاب کی ضیاباری سے کسی اندھے کا اِنکارِ مسلسل و متواتر بھی ہوتا رہے
تو اس سے آفتاب کے وجود اور اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔
نہ ہی اس کی ضیاباری میں کوئی نقص اور کسی طرح کا عیب ہوا کرتا ہے۔

(۳) منشی جیون لال اپنی رپورٹ، محرّرہ ۱۹ راگست میں لکھتا ہے:
''۱۹ راگست ۱۸۵۷ء:۔ مولوی عبدالحق، خلفِ مولوی فضلِ حق
اور مولوی فیض محمد، لگان، وصول کرنے کی غرض سے گوڑگانوں گئے۔
(ص ۲۲۲۔ غدر کی صبح و شام۔ مطبوعہ: دہلی ۱۹۲۶ء۔ شائع کردہ: خواجہ حسن نظامی، دہلوی)

(۴) مولوی ذکاءُاللہ، دہلوی (متوفی ۱۹۱۰ء) نے لکھا ہے کہ:
''مولوی فیض محمد، ضلع بلند شہر اور ضلع علی گڑھ کی تحصیلِ زرِ مال گذاری کے لئے مقرّر رہوا۔
اور حسن بخش، عرض بیگی بھی ضلع علی گڑھ کی مال گذاری کے لئے مقرّر رہوا۔
ولی داد خاں کے نام، حکم بھیجا گیا کہ وہ ان دونوں کے کام میں مدد کرے۔
راؤ گلاب سنگھ، رئیس کچیر کے نام، حکم تھا کہ وہ، بارہ ہزار روپیہ جمع سرکاری کر کے حسن بخش
اور فیض محمد کو ادا کرے۔ ظہور علی خاں، رئیسِ دھرم پور، محمد داؤد خاں، رئیسِ بھیکم پور و راجہ رمن سنگھ کے نام
احکام تھے کہ وہ، زرِ مال گذاری، فیض محمد و حسن بخش کو ادا کریں۔''
(ص ۶۹۱۔ تاریخِ عروجِ عہدِ سلطنتِ انگلشیۂ ہند۔
مؤلّفہ: ذکاءُاللہ، دہلوی۔ مطبوعہ: شمس المطابع، دہلی۔ ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۳ء)

اس سے پہلے، ذکاءُاللہ، دہلوی لکھ چکے ہیں کہ:
''ضلع گوڑگانوہ کے زمین داروں کی طرف سے درخواست آئی کہ:
سارے ضلع میں بدنظمی ہے۔ کوئی حاکم، انتظام کے لئے بادشاہ کے پاس بھیجا جائے۔

بادشاہ نے، یہ کام، مولوی فضل حق کے سُپرد کیا۔
مولوی (فضل حق) صاحب، عالمِ متبحر مشہور تھے۔ وہ، اُلْوَرْ سے تَرکِ ملازمت کر کے
آئے تھے۔ انھوں نے بادشاہ کے لئے ایک دستورُالعمل لکھا تھا۔''
(۶۸۷۔ تاریخِ عروجِ عہدِ سلطنتِ انگلشیہ۔ مطبوعہ: دہلی۔ ۱۹۰۳ء)

حُکّام کی تقرری کے بارے میں ذکاءُاللہ، دہلوی (متوفی ۱۹۱۰ء) مزید لکھتے ہیں کہ:
''مولوی عبدالحق کے نام حکم تھا کہ وہ تحصیلِ زرِ مال گذاری کا انتظام کرے۔''
(ص ۶۹۱۔ تاریخ عروج سلطنت انگلشیۂ ہند، مطبوعہ: دہلی۔ ۱۹۰۳ء)

ضلع بلند شہر کے حاکم، مولوی فیض محمد
اور ضلع گوڑگانوہ (میوات) کے حاکم، مولوی عبدالحق، مقرر کیے گئے تھے۔
یہ دونوں ''مولوی'' اپنے وقت کے عظیم المرتبت عُلما ہیں۔ مولانا فیض احمد، بدایونی
آگرہ، دہلی بدایوں، شاہجہاں پور، وغیرہ کے معرکوں اور جنگِ آزادی میں براہِ راست، شامل تھے۔
اسی طرح، مولانا احمد اللہ شاہ، مدراسی کی قائم کردہ حکومت، در قصبہ محمدی، شاہجہاں پور کے وزیر
بنائے گئے تھے۔

اختتامِ حکومت و شکست و شہادتِ مولانا مدراسی کے بعد، مولانا فیض احمد، بدایونی
کب کہاں کیسے گئے؟ اور کس طرح کس جگہ ان کا انتقال ہوا؟ اس حادثے کا آج تک کسی کو علم نہ ہو سکا۔
مولانا فیض احمد، بدایونی، حضرت علاّمہ فضلِ رسول، بدایونی کے سگے بھانجے تھے۔
جنھیں، علاّمہ فضلِ رسول، بدایونی نے تحصیلِ علوم و فنون کے لئے
علاّمہ خیر آبادی کے سپرد کر دیا تھا۔ اور فکری و سیاسی طور پر بھی فضلِ حق کے ساتھ، وابستہ کر دیا تھا کہ:
وہ انقلاب ۱۸۵۷ء کو صحیح سَمت دینے اور مجاہدین و مرکزی حکومت کو کامیاب بنانے میں
علاّمہ فضلِ حق، خیر آبادی کی مُہم کا بھرپور تعاون کریں۔

اور حاکمِ ضلع گوڑگانواں، مولوی عبدالحق، خود حضرت علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی کے فرزند تھے
جن کا وصال ۱۸۹۸ء میں ہوا۔ مولانا عبدالحق، خیر آبادی کی ایک وصیت، تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔
مولانا عبدالحق، خیر آبادی، فرزند علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی کے بارے میں
مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھ (سابق لائبریرین مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ۔ متوفی ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء)) لکھتے ہیں:

''مولانا (عبدالحق) نے آخر وقت، یہ وصیت بھی فرمائی کہ:
جب انگریز، ہندوستان سے چلے جائیں، تو میری قبر پر خبر کردی جائے۔
چنانچہ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو، رفیقِ محترم، مولوی سید نجم الحسن صاحب رضوی خیرآبادی نے
مولانا (عبدالحق خیرآبادی) کے مدفن (درگاہِ مخدومیہ، خیرآباد۔اَوَدھ) پر
ایک جمِ غفیر کے ساتھ، حاضر ہوکر میلاد شریف کے بعد قبر پر فاتحہ خوانی کی۔
اور اس طرح، پورے پچاس سال بعد (از ۱۸۹۸ء تا ۱۹۴۷ء)
انگریزی سلطنت کے خاتمہ کی خبر سنا کر وصیت پوری کی۔ فَجَزاهُ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَاء۔
(ص۱۲۔ مقدمۂ **زبدۃ الحکمۃ**۔ از عبدالشاہد، شیروانی۔ مطبوعہ: علی گڑھ۔ ۱۹۴۹ء)
انھیں مولانا عبدالحق، خیرآبادی، فرزندِ علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کے بارے میں
ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے کہ:
''موجودہ ہیڈ مولوی، اُس عالمِ دین کے صاحب زادے ہیں، جن کو ۱۸۵۷ء کے غدر نے
نمایاں کردیا تھا۔ اور جنھوں نے اپنے جُرموں کا خمیازہ، اِس طرح بھگتا تھا کہ:
بحرِ ہند کے ایک جزیرہ میں تمام عمر کے لئے جلاوطن کردیے جائیں۔
اس غدّار عالمِ دین کا کتب خانہ، جس کو حکومتِ ہند نے ضبط کرلیا تھا
اب، کلکتہ کالج میں موجود ہے۔''
(ص۲۰۲ و ۲۰۳۔ **ہمارے ہندوستانی مسلمان**۔ مؤلّفہ: ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر۔
مطبوعہ: اَلکتاب انٹرنیشنل۔ بٹلہ ہاؤس۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵)
علاّمہ خیرآبادی کی قطعی اور حتمی رائے یہی تھی کہ:
موجودہ حالات میں انگریزوں سے گھمسان کی جنگ کے علاوہ، کوئی چارہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ:
بہادر شاہ ظفر و جنرل بخت خاں و دیگر اَربابِ اقتدار و حکومت و علما و خواص و معززینِ دہلی
ہر ایک کے سامنے آپ نے اس آخری حل کی فیصلہ کن رائے، صراحت و وضاحت کے ساتھ
ظاہر کردی تھی۔ چنانچہ، خود اس سلسلے میں اپنے قصیدۂ نونیہ کے شعر نمبر ۲۱۸ میں فرماتے ہیں:

وَقُلْتُ اِنَّ الْعِدیٰ لَنْ يَصْفَحُوا اَبَداً
فَمَا مِنَ الْحَرْبِ مِن بُدٍّ وَحَتْنَانٍ

''میں نے کہا کہ دشمن (انگریز) کبھی، نظر انداز و درگذر نہیں کریں گے۔

اس لئے اب اُن سے جنگ و جدال کے سوا، کوئی چارہ نہیں۔''
قائدِ جنگِ آزادی، علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کی فکر و تدبیر اور قیادتِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء سے
متعلق، مزید معاصر بیانات اور شہادتیں، ملاحظہ فرمائیں:
(۱) بہادر شاہ ظفر کے طبیبِ خاص (اور برطانوی آلۂ کار) حکیم احسن اللہ خاں کا
ایک نہایت اہم اور جامع بیان، یہ ہے کہ:
''دوسرے روز، مولوی فضلِ حق آئے اور نذر، پیش کی۔
وہ، باغی فوج کی بڑے زور و شور سے تعریف کررہے تھے۔
انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ اب وقت کا تقاضا ہے کہ:
باغیوں کو رقم اور سامانِ رسد کی مدد پہنچائی جائے، تاکہ انھیں کچھ سہارا ہو۔
بادشاہ نے کہا: رقم، کہاں ہے؟ رہا، رسد کا (معاملہ) تو وہ پہنچی تھی، مگر، ناکافی تھی۔
اور اس کی وجہ، ان باغیوں کا، عوام کے ساتھ، غلط رَوِیَّہ ہے۔
مولوی (فضلِ حق) صاحب نے کہا: حضور کے تمام ملازمین، نااہل ہیں۔
دور اور نزدیک کے تمام حکمرانوں سے رقم کا مطالبہ کرنے کی اجازت دیجیے۔
میرا لڑکا (عبدالحق) اور اَعِزَّہ، تحصیل کا کام، انجام دیں گے اور رسد بھی فراہم کریں گے۔
بادشاہ نے جواب دیا: آپ تو یہیں ہیں۔ آپ انتظام سنبھالیے۔
مولوی (فضلِ حق) صاحب نے جواب دیا:
میرے لڑکے اور دوسروں کو، گوڑگانوں کی تحصیل داری اور کلکٹری کا
پروانۂ تقرر، جاری کیا جائے۔ وہ سب انتظام کرلیں گے۔
اور اَلوَر، جھجھر، بلّب گڑھ اور پٹیالہ کے راجاؤں کے نام (رقم کے انتظام کے لئے)
پَروانے، جاری کیجیے۔ پٹیالہ کا راجہ، اگرچہ، انگریزوں سے ملا ہوا ہے
لیکن، اگر، دوستانہ مُراسلت کی جائے، تو وہ ساتھ آجائے گا۔
بادشاہ نے بتایا کہ: پیرزادہ، عبدالسّلام کی درخواست پر بخت خاں نے
راجہ پٹیالہ کو ایک پروانہ بھیج دیا ہے، مگر، ابھی تک اس کا جواب نہیں آیا۔
مولوی صاحب نے کہا: میں اپنے بھائی (فضلِ عظیم) کو
جو راجہ کے یہاں، ملازم ہیں، لکھوں گا کہ وہ جلد جواب بھجوائیں۔

مولوی (فضلِ حق) صاحب، جب بھی بادشاہ کے پاس آتے، بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ:
جہاد کی مہم میں اپنی رعایا کی ہمت افزائی کریں اور ان کے ساتھ
باہر (میدانِ جنگ میں) بھی نکلیں۔ فوجی دَستوں کو، جس حد تک ممکن ہو، بہتر معاوضہ دیں۔
ورنہ، اگر، انگریز جیت گئے تو نہ صرف خاندانِ تیمور، بلکہ تمام مسلمان، نیست و نابود
ہوجائیں گے۔" (ص ۲۳۔ یادداشت حکیم احسن اللہ خاں۔ مرتّبہ: ڈاکٹر سید معین الحق۔ مطبوعہ کراچی)

بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ میں حکیم احسنُ اللہ خاں نے شہادت دیتے ہوئے کہا تھا کہ:
"مولوی فضلِ حق نے بھی کئی تحصیل داروں کو ضلع داری کی نیابت میں مقرّر کیا تھا۔"
(ص ۲۵۶۔ بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ۔ (ص ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ باغی ہندوستان)

انگریزوں کے جاسوس، گوری شنکر نے ۲۸ / اگست ۱۸۵۷ء کی رپورٹ میں لکھا تھا کہ:
"مولوی فضلِ حق، جب سے دہلی آیا ہے، شہریوں اور فوج کو
انگریزوں کے خلاف اُکسانے میں مصروف ہے۔ وہ کہتا پھرتا ہے کہ:
اس نے آگرہ گزٹ میں برطانوی پارلیمنٹ کا ایک اعلان پڑھا ہے۔
جس میں انگریزی فوج کو، دہلی کے تمام باشندوں کو قتل کردینے
اور پورے شہر کو مسمار کردینے کے لئے کہا گیا ہے۔
آنے والی نسل کو یہ بتانے کے لئے کہ:
یہاں، دہلی شہر آباد تھا، شاہی مسجد کا ایک مینار، باقی چھوڑا جائے گا۔"

INDIA OFFICE LONDON MUTINY COLLECTION NO.170-PP443

(ص ۱۴۔ پیشِ لفظ، بقلم: وقار الحسن صدیقی، ڈائرکٹر رضا لائبریری، رام پور۔
سابق ڈائرکٹر آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا۔ درکتاب "تاریخِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء"
مؤلّفہ: سید خورشید مصطفیٰ رضوی۔ مطبوعہ رضا لائبریری، رام پور۔ یوپی)

انگریز مُخبر، تراب علی، ۲۸ / اگست کی اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے:
"مولوی فضلِ حق، جب سے دہلی آیا ہے، شہریوں اور فوج کو انگریزوں کے خلاف اُکسانے میں
مصروف ہے .... مولوی فضل حق کے کہنے پر شاہزادے، اب حملہ کرنے والی فوج کے ساتھ
محاذ پر جاتے ہیں اور عموماً، سبزی منڈی (دہلی) کے پُل پر لڑتے ہیں۔"
(ص ۱۵۹۔ "۱۸۵۷ء کے غداروں کے خطوط"۔ مؤلّفہ: سید عاشور کاظمی۔

مطبوعہ: انجمن ترقی اردو ہند، دہلی)

منشی جیون لال نے اپنے روزنامچہ میں بہادر شاہ ظفر اور مولانا فضلِ حق کی، یہ گفتگو، نقل کی ہے:
"بہادر شاہ نے، جب مولوی (فضلِ حق) صاحب کو حکم دیا کہ:
تم اپنی اَفواج کو لڑانے کے لئے لے جاؤ اور انگریزوں کے خلاف لڑاؤ۔
تو انھوں نے کہا: افسوس تو اسی بات کا ہے کہ سپاہی، ان کا کہا نہیں مانتے
جو اُن کی تنخواہ دینے کے ذِمّہ دار نہیں۔" ص ۲۲۰۔ غدر کی صبح و شام۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۲۶ء
(ص ۳۵۔ درمقدمہ "۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ"۔ مؤلّفہ: پروفیسر خلیق احمد نظامی۔
مکتبہ: ندوۃُ المصنّفین۔ اردو بازار، دہلی۔ ۱۹۷۱ء)

چُنّی لال اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے:
مولوی فضلِ حق اپنے مواعظ سے عوام کو مسلسل بھڑکا رہے ہیں۔"
(رپورٹ از چنی لال۔ اخبار دہلی۔ فائل ۱۲۷)

سید مبارک شاہ، کوتوالِ دہلی، بزمانۂ انقلاب ۱۸۵۷ء کا بیان ہے کہ:
بہادر شاہ نے جنرل بخت خاں، مولوی سرفراز علی اور مولوی فضلِ حق پر مشتمل
ایک "کِنگ کونسل" بنائی تھی۔ مبارک شاہ ہی نے اسے ایک جگہ "پریوی کونسل" لکھا ہے۔

THE GREAT REVOLUTUTION OF 1857,P182,183-

S,MOEENUL HAOUE,KARACHI-1968

(ص ۱۸۲ و ۱۸۳۔ عظیم انقلاب ۱۸۵۷ء۔ مؤلّفہ: سید معین الحق۔ کراچی ۱۹۶۸ء)

۱۸۵۷ء میں علاّمہ فضل حق خیرآبادی کے بنائے ہوئے دستورُ العمل کے نفاذ کے لئے
چھ فوجی اور چار شہری نمائندوں پر مشتمل، جو مجلسِ انتظامی بنائی گئی
اس کے بارے میں انگریزی حُکّام کو دی گئی اپنی رپورٹ میں، مُخبر تُراب علی نے لکھا کہ:
اس کے ممبران میں "مولوی فضل حق بھی شامل ہیں۔" (ص ۱۵۹۔ ۱۸۵۷ء کے غداروں کے خطوط)

محقق و مؤرخ، مہدی حسین نے لکھا ہے کہ:
مجلس انتظامی کے ڈائرکٹر، مولانا فضل حق خیرآبادی بنائے گئے۔"
(ص ۱۸۲۔ بہادر شاہ، دوم۔ مطبوعہ: کراچی)

جیون لال نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ:

فوجیوں کو تنخواہ دینے کے سلسلے میں بہادر شاہ ظفر نے جن چار اُمَرا و معززین سے مشورہ کیا
ان میں ایک مولوی فضلِ حق ہیں۔ (ص ۲۴۵۔ سرگذشتِ دہلی۔ مطبوعہ: رضا لائبریری۔ رام پور۔ یوپی)
مولوی فضلِ حق بھی اس کے ایک ممبر ہیں۔
میوٹنی اَریکارڈ کرسپنڈنس۔ لاہور ۱۹۱۱ء۔ مراسلہ ۲۷۹۔ از جی سی بارنس کمشنر کلکٹر سیس ستلج
بنام سکریٹری چیف کمشنر پنجاب۔ مؤرخہ ۳ر ستمبر ۱۸۵۷ء۔
(ص ۶۱۔ **فضلِ حق اور ۱۸۵۷ء**۔ مؤلفہ: حکیم سید محمود احمد، برکاتی، ٹونکی۔ مطبوعہ: برکات اکیڈمی، کراچی ۱۹۷۵ء)
اب یہاں، دوبارہ، اس دستاویز کا مطالعہ کر لیا جائے
جسے، نواب وزیرُ الدّولہ (ریاست ٹونک، راج پوتانہ) نے یکم ستمبر ۱۸۵۷ء کو ریاستِ ٹونک
کی طرف سے جاری کیا تھا اور انگریزی حکومت کے خلاف، جہاد کے فتوٰی کی مخالفت کی تھی۔
''نواب نے (یہاں عبارت پڑھی نہیں گئی) کہا کہ:
جہاد، انگریزوں پر، درست نہیں ہے۔ بعد اس کے سب فوج سے کہا کہ:
میں، نمک خوار انگریزوں کا ہوں، میں، نمک حرام نہیں ہوتا۔
اور تم میرے نمک خوار ہو، تم کو اختیار ہے کہ چاہو، نمک حرام ہو جاؤ۔
چنانچہ، اس بات پر، پانچ سو آدمیوں نے نوکری چھوڑ دی۔''
اس تحریر کے بعد، درمیان میں کچھ دیگر باتوں کے بعد لکھا ہے:
''مولوی فضلِ حق، شریکِ جلسہ (میٹنگ) ہوتے ہیں اور مشتمل بر بخت خاں کے
محمد شفیع رسالدار، مولوی سرفراز علی خاں اور مولوی امداد علی، ساکن بلّب گڑھ، رسالدار ہیں۔
اور جو کچھ، بخت خاں کرتا ہے، ابتدا میں، ان (مولوی فضلِ حق) کے مشورے سے ہوتا ہے۔
اور مولوی (فضلِ حق) کی اِطاعت، ظِلِّ شاہ دربارِ خاص میں ضروری سمجھی جاتی ہے۔''
میوٹنی پیپرز، کلکشن: ۱۶۔ نومبر: ۱۲۔ یکم ستمبر ۱۸۵۷ء۔ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا۔
(ص ۵۲ و ۵۳۔ **علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی! چند عنوانات**۔ بقلم: خوشتر نورانی۔
مطبوعہ: ادارہ فکرِ اسلامی، دہلی۔ ۲۰۱۱ء)
برٹش فوج کا ایک جواں مَرد افسرِ اعلیٰ، جنرل محمد بخت خاں تھا
جو ۱۸۵۷ء میں انگریزی فوج سے مستعفی ہو کر بریلی آیا۔
اور بمشورۂ خان بہادر خاں، نبیرۂ حافظ رحمت خاں روہیلہ

جنگِ آزادی میں اس نے گراں قدر سرفروشانہ خدمت انجام دیتے ہوئے
دہلی واَوَدھ کے مختلف محاذوں پہ دادِ شجاعت دی۔
دہلی میں بہادر شاہ ظفر نے جنرل بخت خاں کو شاہی افواج کا کمانڈر انِ چیف بنایا۔
اور بقول چارلس بال:
''جنرل بخت خاں کی کمان میں ہندوستانیوں نے بڑے استقلال کے ساتھ
ایک ایک انچ کے لئے جنگ کر کے ہر مقام پر قبضہ کیا۔''
جنرل بخت خاں، چودہ ہزار فوج کے ساتھ، بریلی سے دہلی پہنچا تھا۔
انگریز مؤرخ، میلسن کے بیان کے مطابق، یکم جولائی ۱۸۵۷ء، ظہیر دہلوی کے بیان کے مطابق
۲ر جولائی اور عبداللّطیف (مُخبِر) کے بیان کے مطابق، ۲۶ر جون ۱۸۵۷ء کو جنرل بخت خاں، دہلی پہنچا تھا۔
مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی (متوفی ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء علی گڑھ) کی یہ تحریر آپ پڑھ چکے ہیں کہ:
''علاّمہ (فضلِ حق خیر آبادی) سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے۔ مشورہ کے بعد علاّمہ نے
آخری تیر، ترکش سے نکالا۔ بعد نمازِ جمعہ، جامع مسجد میں عُلما کے سامنے تقریر کی۔ استفتا، پیش کیا۔
مفتی صدرالدین خاں، آزردہ، صدرُ الصُّدور دہلی، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ، دہلوی
مولانا فیض احمد، بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں، اکبر آبادی، سید مبارک شاہ، رام پوری نے دستخط کر دیے۔
اس فتوٰی کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔
دہلی میں نوے ہزار سپاہ، جمع ہو گئی تھی۔'' تاریخ ذکاءاللہ، دہلوی۔ (ص ۲۱۵۔ باغی ہندوستان)
علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی کا انگریزی حکومت کے خلاف، جہاد کا مرتّبہ و جاری کردہ فتوٰی مخطوطہ
یا مطبوعہ شکل میں دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے بعض حلقے، اس کے وجود پر سوالیہ نشان لگاتے اور شک و شبہ کا اظہار
بلکہ علاّمہ خیر آبادی کی شرکتِ انقلاب ۱۸۵۷ء کی مسلّمہ حقیقت کا بھی اِنکار کرتے رہتے ہیں۔
قارئین! یہاں اس تاریخی حقیقت کو، ذہن نشین رکھیں کہ:
ذکاءاللہ دہلوی و سرسید احمد خاں، وغیرہ کے بیان کے مطابق ۱۸۵۷ء میں جہاد کے متعدّد فتاوٰی
جاری ہوئے تھے۔ اسی طرح، وعظ و بیان میں بھی بعض عُلما و ائمۂ مساجد، جہاد کی ترغیب دیا کرتے تھے۔
مشہور مؤرخ، نجم الغنی خاں، رام پوری لکھتے ہیں:
''مراد آباد میں رعایا کی یہ حالت تھی کہ:
ہر جمعہ کو مسجدوں میں جہاد کے واسطے، وعظ کہا جاتا تھا، جس سے باغیوں کی زیادہ تر ہمت بندھتی تھی۔''

(ص ۵۸۔ اخبارُ الصَّنادید، جلدِ دوم ۔ مؤلّفہ: نجم الغنی، رام پوری۔ مطبوعہ: رضا لائبریری، رام پور۔ یوپی۔ انڈیا)

مفتی مظہر کریم، دریابادی (متوفی اکتوبر ۱۸۷۳ء) جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے ایک ممتاز قائد تھے۔ مولانا عبدالماجد، دریابادی اور ڈاکٹر محمد ہاشم، قدوائی، آپ ہی کے پوتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی اپنے دادا، مفتی مظہر کریم، دریابادی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

مفتی صاحب نے انگریزوں کے خلاف، جہاد کا فتویٰ دیا۔"

(انقلاب ۱۸۵۷ء نمبر۔ ماہنامہ، نیادور، لکھنؤ۔ شمارہ اپریل؍مئی ۲۰۰۷ء)

ایک انگریز، ٹی، ایف، فینتھم کی رپورٹ، متعلقہ واقعاتِ ۱۸۵۷ء در شاہجہاں پور کے حوالے سے ڈاکٹر ہاشم قدوائی نے لکھا ہے کہ اس رپورٹ میں

اس نے **"مفتی (مظہر کریم، دریابادی) صاحب کو (شاہجہاں پور کی) بغاوت کا سرغنہ ٹھہرایا۔**

اور اس نے مفتی صاحب کے اثر واقتدار کو ہر جگہ تسلیم کیا۔

انگریزی تسلُّط کے بعد مفتی صاحب کو گرفتار کیا گیا۔ اس نے ان پر الزام لگایا کہ:

انگریزی حکومت کے خلاف، جہاد کے فتویٰ پر، ان کے دستخط تھے۔

مفتی صاحب کو بغاوت کے الزام میں چودہ (۱۴) سال کی سزا بہ عبور دریائے شور دی گئی۔

یعنی انھیں انڈمان بھیج دیا گیا، جہاں ان کا ساتھ، مولانا فضلِ حق خیرآبادی اور مفتی عنایت احمد، کاکوروی جیسے سالاروں کا رہا۔" (انقلاب ۱۸۵۷ء نمبر۔ ماہنامہ، نیادور، لکھنؤ۔ شمارہ اپریل؍مئی ۲۰۰۷ء)

مفتی عنایت احمد، کاکوروی (متوفی اپریل ۱۸۶۳ء) نے بھی

بریلی، روہیل کھنڈ میں خان بہادر خاں، روہیلہ کی انقلابی حکومت کی تائید وحمایت

اور انگریزوں کی غاصبانہ وظالمانہ حکومت کے خلاف، جہاد کا فتویٰ دیا تھا۔

"مفتی (عنایت احمد، کاکوروی) صاحب، بریلی میں صدر امین تھے۔

ان کے، حافظُ الملک حافظ رحمت خاں کے خاندان سے بھی روابط تھے۔

چنانچہ، نئی انقلابی حکومت کی ہر طرح اِمداد و اِعانت کرنے کا فتویٰ، مفتی صاحب نے ہی دیا تھا۔"

(ص ۴۰۔ نواب خان بہادر خاں شہید۔ مؤلّفہ: سید الطاف علی، بریلوی، مدیر العلم، کراچی۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۶ء)

"مفتی عنایت احمد، کاکوروی، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں شریک تھے۔

پہلی مرتبہ، جہاد کے وجوب کا فتویٰ، جن لوگوں نے دیا

ان میں مفتی عنایت احمد، کاکوروی بھی شامل ہیں اور جہاد کے تاریخی فتویٰ پر، ان کے بھی دستخط ہیں۔

انھوں نے فتویٰ بھی دیا۔ رائے عامّہ کو بھی ہموار کیا۔ اور عملاً، جہاد میں بھی حصہ لیا۔"

(ص ۶۲۱۔ محاضراتِ سیرت۔ از ڈاکٹر محمود احمد غازی۔
مطبوعہ: اریب پبلیشر، پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ نئی دہلی)

پروفیسر محمد ایوب قادری (کراچی) لکھتے ہیں کہ مراد آباد وآنولہ و بریلی وغیرہ میں مولانا سید کفایت علی، کافؔی مراد آبادی نے جہاد کا فتویٰ دیا تھا۔ چنانچہ، وہ رقم طراز ہیں:

"جب مراد آباد میں انگریز حامی نواب رام پور کی بالادستی، قائم ہوئی

تو مولانا سید کفایت علی، کافؔی مراد آبادی نے انگریزوں کے خلاف، فتوائے جہاد، جاری کیا۔

اور اس کی نقلیں، دوسرے مقامات پر بھجوائیں۔ اور بعض جگہوں پر آپ خود تشریف لے گئے۔

آنولہ ضلع بریلی میں خاص اسی مقصد سے ایک ہفتہ سے زیادہ قیام فرمایا۔

حکیم سعدُ اللہ، ولد حکیم عظیم اللہ آپ کے ہم سبق ساتھی تھے، ان کے یہاں، قیام کیا۔

آنولہ سے مولانا کافؔی بریلی پہنچے اور نواب، خان بہادر خاں روہیلہ، نبیرۂ حافظ رحمت خاں روہیلہ ومولوی سرفراز علی سے مشورہ وتبادلۂ خیال کیا۔

پھر، بریلی سے، دہلی کے لئے جانے والی وہ فوج، جو جنرل بخت خاں روہیلہ کی ماتحتی میں برسرِ پیکار تھی، اس کے ساتھ آپ، مراد آباد واپس آئے۔"

(ملخص۔ جنگِ آزادی نمبر۔ مجلّہ "العلم" کراچی۔ شمارہ اپریل تا جون ۱۹۵۷ء۔ بقلم: پروفیسر محمد ایوب قادری)

علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی کے فتویٰ ۱۸۵۷ء کا دستاویزی ثبوت

مندرجہ ذیل تحریر سے بھی ملتا ہے:

..........جناب مالک رام نے مولانا عبدالماجد، دریابادی کی خودنوشت

اور پھوکن لال کی تالیف "تاریخِ دریاباد" نیز، دوسرے معتبر حوالوں سے لکھا ہے کہ:

مولانا عبدالماجد، دریابادی کے دادا، مفتی مظہر کریم

1857ء کے زمانہ میں حضرت علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی کے ساتھی تھے۔

جنھوں نے دہلی کی جامع مسجد میں تین سو (۳۰۰) سے زائد عُلمائے کرام کے اِجتماع میں

انگریزوں کے خلاف، جہاد کا تاریخ ساز فتویٰ، جاری کیا تھا۔

جنگِ آزادی میں ہندوستانی مجاہدین کی ناکامی کے بعد گرفتار ہوکر

انڈمان میں قید کیے جانے والوں میں علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کے ساتھ، مفتی مظہر کریم، دریابادی

بھی تھے۔زمانۂ قیدِ فرنگ میں ہر قیدی سے اس کی اِستعداد کے مطابق، مشقّت لی جاتی تھی۔

مفتی مظہر کریم کو لکھنے پڑھنے کے کام پر لگایا گیا۔اسی دوران انھوں نے علمِ جغرافیہ کی مشہور عربی کتاب ''مَــــرَاصِــدُ الْاِطِّلَاع'' کا اردو ترجمہ، مکمل کیا۔ان کی لیاقت اور علمی مرتبے کو دیکھتے ہوئے انگریزوں نے انھیں پونے سات سال کی قید کے بعد 1865ء میں رہا کر دیا۔

ان کا انتقال 1873ء میں دریاباد(اَوَدھ) میں ہوا۔''

(ص۱۱۔روز نامہ، راشٹریہ سہارا۔نئی دہلی۔شمارہ ۱۷ر فروری ۲۰۱۲ء۔بروز جمعہ)

ان تمام تحریری وزبانی فتاویٰ میں، صرف ایک مطبوعہ فتویٰ (اخبار الظّفر۔دہلی اردو اخبار ۲۶ر جولائی ۱۸۵۷ء۔وصادق الاخبار، دہلی۔۲۷ر جولائی ۱۸۵۷ء) دستیاب ہے۔

جس کے مُجیب، نور جمال صاحب ہیں۔اور اس فتویٰ کے مرتّب، یا مصدِّق یا مُجیب کی حیثیت سے علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی کا نام نہ ہونے کی وجہ سے واویلا مچایا جاتا ہے کہ: انھوں نے جہاد کا فتویٰ دیا ہوتا، تو اس پر، ان کے بھی دستخط ہوتے۔

سبحٰن، تیری قدرت! ایسا سوچنا تو اُس وقت، درست ہوتا، جب کہ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے سارے فتاویٰ، دست یاب ہوجاتے اور ان میں سے کسی بھی فتویٰ پر علاّمہ خیرآبادی کے دستخط نہ ہوتے۔

یا۔ان کی ایسی دینی وعلمی حیثیت نہ ہوتی کہ وہ کسی فتویٰ کے مرتّب، یا مصدِّق ہوتے؟

جب، علاّمہ خیرآبادی کی حیات وخدمات وافکار وخیالات کا گوشہ گوشہ، روشن ومنور ہے۔

اور آثار وقرائن ہی نہیں، بلکہ واقعات وحقائق بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ:

وہ ایسا فتویٰ دے سکتے ہیں، تو پھر، اسے مان لینے میں ''**یارانِ نکتہ آفریں**'' کے نزدیک معلوم نہیں کون سی شرعی، علمی، اَخلاقی، سیاسی، صحافتی قباحت، لازم آتی ہے؟

یا۔ان کے ''**شکستہ خوردہ دل ودماغ**'' پہ قیامت ٹوٹ پڑتی ہے؟

نہ جانے کتنی معلومات ودستاویزات، گردشِ زمانہ نے ہم سے چھین لیں۔

اور نہ جانے کتنی اہم چیزیں، ہندو پاک کے نیشنل آرکائیوز اور برٹش میوزیم لندن وانڈیا آفس لندن وغیرہ میں ہماری دسترس سے دور، بلکہ ہماری توجہ سے محروم ہیں۔

پھر، قرینِ قیاس چیزوں کا انکار، کون سی عقل مندی، یا کس طرح کا عِناد ہے؟

بالخصوص، ایسی صورت میں جب کہ کسی مشہور ومعروف واقعہ کا عُلما ومؤرّخین نے بھی، جابہ جا، ذکر کیا ہو؟

چنانچہ (۱) ''**باغی ہندوستان**'' میں مولانا عبدالشاہد، شیروانی (۲) ''**نقشِ حیات**'' میں مولانا

حسین احمد مدنی (۳) ''**ہندوستان کی شرعی حیثیت**'' میں مولانا سعید احمد، اکبرآبادی (۴) الف۔ ''**ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی عُلما۔**'' ب ''**مولانا فضلِ حق خیرآبادی اور پہلی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء**'' میں مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبرآبادی (۵) ''**۱۸۵۷ء کے مجاہد**'' میں مولانا غلام رسول، مہر (۶) ''**مولانا فیض احمد بدایونی**'' میں پروفیسر محمد ایوب قادری (۷) ''**حُکَمائے اسلام**'' جلد دوم میں مولانا عبدالسلام ندوی (۸) **ماہنامہ معارف اعظم گڈھ** (شمارہ اکتوبر ۱۹۴۷ء) میں مولانا ریاست علی ندوی، وغیرہ نے علاّمہ خیرآبادی کے فتوائے جہاد ۱۸۵۷ء کا ذِکر، تحسین وتائید کے ساتھ کیا ہے۔

اسی طرح اپنی مختلف تحریرات ومضامین میں محمد اسمٰعیل، پانی پتی وڈاکٹر سید عبداللہ وڈاکٹر ابواللّیث صدیقی وناصر کاظمی وغیرہ نے بھی اس فتویٰ کا ذِکر، تاریخی روایت کے طور پر کیا ہے۔

بہر حال! ۱۹ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو، ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج، دہلی پر غالب اور قابض ہوگئی۔

بہادر شاہ ظفر، مقبرۂ ہمایوں (نزدِ درگاہِ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیا، عَلَیْــہِ الرَّحْـمَةُ وَالرِّضْوَان) میں پناہ گزیں ہوئے۔جنرل بخت خاں نے مقبرۂ ہمایوں جاکر بہادر شاہ ظفر سے التماس کی کہ: **آپ، میرے ساتھ، یہاں سے نکل چلیں۔**

میں چھاپہ مار جنگ کر کے ان انگریزوں کو عاجز اور ہندوستان سے نکلنے پر مجبور کر دوں گا۔''

مگر اپنے بڑھاپے کا بہانہ کر کے، یا اپنے فریب خوردہ مُشیروں کے جال میں پھنس کر وہ اس کے لئے راضی نہ ہوسکے۔

کاش کہ بہادر شاہ ظفر، جنرل بخت خاں کی پیشکش، قبول کر لیتے

تو غالباً، ہندوستان کی سیاسی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔

یا۔خود، بہادر شاہ ظفر، دہلی کے کسی محاذِ جنگ پر شہید ہوجاتے، تو ان کی عظمت میں چار چاند لگ جاتے۔

مگر، جزیرۂ رنگون میں قید ومحبوسی، ان کا مقدّر بن گئی اور بروز جمعہ ۱۴ر جمادی الاولیٰ ۱۲۷۹ھ ۷ر نومبر ۱۸۶۲ء ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ ظفر، رنگون میں بحالتِ اسیری وکس مپرسی وبےبسی قیدِ فرنگ وقیدِ جسم، دونوں سے بیک وقت رہا اور آزاد ہوسکے۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

۱۹ر ستمبر ۱۸۵۷ء میں سقوطِ دہلی کے بعد، علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی، پانچ دن تک بھوکے پیاسے اپنے مکان (دہلی) میں بند رہے۔پھر ۲۴ر ستمبر کو کچھ ضروری سامان اور اہل وعیال کو لے کر پانچویں روز بوقتِ شب، دہلی سے نکلے اور بہزار دِقّت ومصیبت کسی طرح نومبر ۱۸۵۷ء کے آخر میں اپنے وطنِ مالوف، خیرآباد، اَوَدھ پہنچ سکے۔

مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی (متوفی بروز شنبہ ۱۴ر جمادیٰ الاولیٰ ۱۴۰۴ھ/ ۱۸ر فروری ۱۹۸۴ء) سابق لائبریرین، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، یوپی

اپنے ہم وطن، صدر یار جنگ، نواب حبیب الرحمٰن خاں، شیروانی علی گڑھی (بھیکن پور۔علی گڑھ) سابق صدرُ الصُّدور وامورِ مذہبی ریاستِ حیدرآباد، دکن (متولد ۱۸۶۶ء۔ متوفی ۲۶ر شوال ۱۳۶۹ھ/ ۱۱ر اگست ۱۹۵۰ء بروزِ جمعہ، بعمر چھیاسی (۸۶) سال) کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ:

صدر یار جنگ، نواب محمد حبیب الرحمٰن خاں، شیروانی کا بیان ہے کہ:

''علاّمہ خیرآبادی مع متعلقین، بھیکن پور ضلع علی گڑھ آ کر، اٹھارہ روز، مقیم رہے۔

صاحب زادہ، مولانا عبدالحق (خیرآبادی) بھی ساتھ تھے۔

اٹھارہ روز کے بعد، عمِّ محترم، نواب عبدالشکور خاں، رئیسِ بھیکن پور نے سانکرہ کے گھاٹ سے جو بھیکن پور سے آٹھ (۸) میل دور اور موصوف کے عزیزوں کی عمل داری میں واقع تھا اپنے انتظام سے بدایوں اور بریلی کی طرف اُتروایا تھا۔

نواب صدر یار جنگ بہادر نے مجھے وہ کمرہ بھی بتایا تھا
جس میں علاّمہ خیرآبادی، فروکش ہوئے تھے۔'' الخ

(حاشیہ ص ۲۱۶۔ سوانحِ علاّمہ فضلِ حق۔ در ''**باغی ہندوستان**'')

۱۹ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر غلبہ و قبضہ کے بعد ۱۴ر مارچ ۱۸۵۸ء کو انگریز، لکھنؤ کے محاذ پر بھی غالب و قابض و فاتح ہو گئے۔

نومبر ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ (انگلینڈ) نے عام معافی کا حکم نامہ، جاری کرتے ہوئے اعلان کیا کہ:

''جس شخص نے، دورانِ ہنگامہ کسی کو قتل نہیں کیا اور اب اپنی باغیانہ سرگرمی سے باز آ گیا ہے
اسے نہ گرفتار کیا جائے گا، نہ کوئی سزا دی جائے گی۔
یہ رعایت و مہلت ۳۰ر دسمبر ۱۸۵۸ء تک، خود سپردگی کے لئے ہے۔''

علاّمہ فضلِ حق کچھ دن اپنے وطن، خیرآباد اور کچھ دن، آس پاس کے علاقوں میں رہے۔

اس اعلان کے بعد، وسطِ دسمبر میں خیرآباد پہنچ کر ۲۶ر دسمبر ۱۸۵۸ء کو انگریز افسر، کرنل کلارک سے ملے۔ پھر ۳۰ر دسمبر ۱۸۵۸ء کو ڈپٹی کمشنر سے مِل کر اپنی مرضی و مصلحت کے تحت، خانہ قید ہو گئے۔

مگر، انگریزوں نے اپنی روایتی دغابازی کا ثبوت دیا۔
اور ۳۰ر جنوری ۱۸۵۹ء کو علاّمہ خیرآبادی گرفتار کر کے لکھنؤ بھیج دیے گئے۔

لکھنؤ میں آپ کے خلاف، ۲۱ر فروری ۱۸۵۹ء کو، کیپٹن، ایف، اے، وی، تھربرن کی کورٹ میں مقدمہ، شروع ہوا، جسے ۲۸ر فروری کو مع فردِ جُرم، جوڈیشیل کمشنر کورٹ میں منتقل کر دیا گیا۔

مسٹر، جارج کیمبل، جوڈیشیل کمشنر اور میجر بارو، قائم مقام کمشنر خیرآباد ڈویزن کے مشترکہ فیصلہ مؤرخہ ۴ر مارچ ۱۸۵۹ء کے مطابق، علاّمہ خیرآبادی، باغی قرار دیے گئے۔

اور ضبطیِ جائداد و حبسِ دَوام عبور بہ دریائے شور کی سزا سنائی گئی۔

یعنی آپ، جزیرۂ انڈمان نکوبار / کالا پانی کی سزا کے مُجرم قرار دیے گئے۔

مئی ۱۸۵۹ء میں علاّمہ خیرآبادی کو لکھنؤ سے علی پور جیل، کلکتہ اور پھر ۱۸ر اکتوبر ۱۸۵۹ء کو کلکتہ سے بذریعہ بحری جہاز ''فائر کوئین'' پورٹ بلیر (جزیرۂ انڈمان / کالا پانی) بھیج دیا گیا۔

اسی ''دارُ المِحَن'' اور ''بے نشاں جزیرے'' میں ۱۲ر صفر ۱۲۷۸ھ / ۲۰ر اگست ۱۸۶۱ء کو امامُ الحکمۃ، والکلام، قائدِ جنگِ آزادی، علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی، وصال فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

بعدِ وفات، تربتِ ما، درزمیں مجوے
درسینہ ہائے مَردمِ عارِف، مزارِما

لکھنؤ کورٹ نے علاّمہ فضل حق خیرآبادی کے سلسلے میں جو فیصلہ سُنایا، وہ خصوصیت کے ساتھ اَوَدھ کی سرگرمیوں پر مرکوز ہے۔ دہلی کے کسی ''متعیَّن جُرم'' پر، نہ بحث ہوئی، نہ کوئی نشان دہی کی گئی۔

جس کی وجہ، یہ ہے کہ کورٹ میں کسی نے دہلی کے تعلق سے کوئی گواہی نہ دی۔

جو گواہیاں، کورٹ کے سامنے گذریں، وہ اَوَدھ سے متعلق ہیں۔

علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کے خلاف، دائر مقدمہ کی مِسل نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی میں موجود ہے جسے ڈاکٹر اطہر عباس رضوی، سابق لکچرار شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ جو بعد میں آسٹریلیا کی کسی یونیورسٹی کے پروفیسر اور وہیں کے باشندے ہو گئے انھوں نے اپنی تحقیقی و تاریخی کتاب ''**سوتنتر بھارت**'' میں جمع کر دیا ہے۔

مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی کی گذارش پر، ڈاکٹر اطہر عباس رضوی نے مِسل کا اردو ترجمہ کر کے مولانا شیروانی کو دیا تھا۔ مولانا شیروانی نے ''**مقدمہ اور اس کے متعلقات**'' کے عنوان سے اپنی کتاب (ص ۲۴۸ تا ص ۲۸۱۔ **باغی ہندوستان**) میں فردِ جرم، تشریح، گواہی علاّمہ فضلِ حق کا کورٹ میں دیا گیا بیان، فیصلہ، سب کچھ، جمع کر دیا ہے۔

تفصیل کے لئے مطالعہ کیا جائے: **باغی ہندوستان** ۔طبعِ چہارم، المجمع الاسلامی، مبارک پور

اعظم گڑھ۔ یوپی، ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء۔

فردِ جُرم میں متعیَّن جُرم، جس کی گواہی، کورٹ میں گذری، صرف، دو ہیں:

(۱) عبدالحکیم، سرکاری ملازمِ انگریزی حکومت
اور مرتضیٰ حسین (جو سرکاری ملازم، نہیں تھا) کے قتل کی ترغیب۔

(۲) ممُّو خاں (وزیرِ حکومتِ اودھ) باغیِ سرکار کا مُشیرِ خاص۔

علاَّمہ فضلِ حق، خیرآبادی نے، ان دونوں اِلزامات کی تردید کی۔

یہاں یہ حقیقت، واضح رہے کہ علاَّمہ خیرآبادی، عالمِ دین ہونے کے ساتھ، ماہر قانون داں بھی تھے۔

علاَّمہ، بحیثیت ''ماہر قانون داں'' کے عنوان سے ڈاکٹر سلمہ سیہول، رقم طراز ہیں:

''علاَّمہ فضلِ حق خیرآبادی، ماہرِ قانون تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ، عدالتوں سے وابستگی اور ان میں اعلیٰ مناصب پر تقرُّری میں گذرا۔ تفصیل، درج ذیل ہے:

دارالحکومت دہلی میں انیس (۱۹) سال کی عمر میں، سررشتہ دار عدالتِ دیوانی (فوج داری) مقرر ہوئے۔ اور سولہ (۱۶) سال تک، اس سے وابستہ رہے۔

ریاستِ رام پور میں تینتالیس (۴۳) سال کی عمر میں حاکمِ محکمۂ نظامت اور حاکمِ مرافعۂ عدالتین (دیوانی و فوج داری) مقرر ہوئے۔ اور آٹھ (۸) سال تک، اس منصب پر، فائز رہے۔

دارالسَّلطنت لکھنؤ میں اکاون (۵۱) برس کی عمر میں ''کچہری حضور تحصیل'' کے مہتمم اور ''صدرالصُّدور'' مقرر ہوئے اور آٹھ (۸) سال تک، اس عہدے پر کام کرتے رہے۔

باقی ریاستوں میں ان کے قیام و ملازمت کی تفاصیل سے تاریخ، خاموش ہے۔

صرف مذکورہ بالا کے مطابق، بتّیس (۳۲) سال تک، علاَّمہ نے بحیثیت ''قانون داں'' ملازمت کی۔

علاَّمہ کی شخصیت کا یہ پہلو، ہمیں، غالبؔ کے مقدمۂ جائیداد میں ان کی رہنمائی و مدد میں بھی نظر آتا ہے۔ (یہ واقعہ ۱۸۲۸ء کا ہے) اور اس سے بھی عیاں تر صورت میں

(جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں) ان پر قائم ہونے والے مقدمۂ بغاوت میں نظر آتا ہے۔

علاَّمہ کے علم و فضل کا ٹھیک اندازہ، ہمیں علاَّمہ کے بنائے ہوئے اُس آئین سے ہوتا ہے
جو دنیا کا ''***مختصر ترین اور مثالی آئین***'' ہے۔ اور جو، بلالحاظِ خِطَّہ و قوم اور زمانہ کے، نافذ کیا جاسکتا ہے۔''

(ص ۹۶ و ۹۷۔ **علاَّمہ محمد فضلِ حق خیرآبادی** ۔ مؤلِّفہ: ڈاکٹر سلمہ سیہول۔
مکتبہ قادریہ، جامعہ نظامیہ، لاہور۔ طبعِ اول: ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء)

یہاں یہ حقیقت، واضح رہے کہ:

اس زمانے میں کورٹ کا نظام آج جیسا نہیں تھا۔

قانونی اعتبار سے کوئی صحیح نظام ہو، جب بھی حاکم کی مرضی، قانون سے بالاتر تھی۔

پھر، ایسی صورت میں اور بھی سنگین معاملہ ہو جاتا ہے کہ ملزم پر ''بغاوت'' کا اِلزام ہو۔

علاَّمہ خیرآبادی، لکھنؤ کورٹ میں ''**بغاوت کے مُلزم**'' بھی تھے اور ''**وکیلِ دفاع**'' بھی۔

اور دوسری طرف ''**وہی قاتل، وہی شاہد، وہی منصف ٹھہرا**''۔ جیسا معاملہ تھا۔

علاَّمہ خیرآبادی کے خلاف لگائے گئے دونوں الزامات، غلط تھے۔

اس لئے آپ نے، ان کا اِنکار کیا۔ اب اسے، ثابت کرنا، مدّعی کا کام تھا۔

قانونی نِکات اور پیچیدگیاں، علاَّمہ کے سامنے تھیں۔ یہ جنگ، قانونی تھی
اس لئے علاَّمہ نے بھی ماہرِ قانون کی حیثیت سے اس قانونی جنگ میں قانونی مہارت کا ثبوت دیا۔

لیکن ''**حکمِ حاکم مَرگِ مفاجات**'' کا مرحلہ، درپیش ہو، تو اس کا دفاع، کس طرح کیا جاسکتا ہے؟

مقدمہ کی کارروائی پڑھنے سے صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ:

علاَّمہ خیرآبادی کا موقِف، بالکل صحیح اور قانونِ انصاف کے عین مطابق ہے۔

پہلا الزام کہ انھوں نے عبدالحکیم اور مرتضیٰ حسین کے قتل کا فتویٰ، یا۔ حکم دیا تھا۔

یہ بے ثبوت، الزام تھا اور اس بے ثبوت الزام سے علاَّمہ کا اِنکار اور اظہارِ برأت
سب کچھ بالکل صحیح اور مطابقِ واقعہ تھا۔ اس الزام کو لکھنؤ کورٹ میں کوئی بھی، ثابت نہ کرسکا۔

اس طرح، پہلے الزام کا اِنکار، حق بجانب ٹھہرا۔

لکھنؤ کورٹ نے علاَّمہ کے خلاف ۴/ مارچ ۱۸۵۹ء کو، جو فیصلہ دیا
اس میں اُسے لکھنا پڑا کہ وہ دونوں افراد، جن کے قتل کا الزام ہے، وہ واقعی، ابھی، زندہ ہیں۔

لیکن، سزا کسی نہ کسی طرح دینا، ایک طے شدہ امر تھا، اس لئے اس کی بھی راہ نکال لی گئی کہ:

ملزم نے ''**ایسے اصول کی اشاعت کی، جن سے قتل کے اِمکانات پیدا ہوئے۔**''

کورٹ کے فیصلے کا یہ ابتدائی حصہ، اسی حقیقت کا غمّاز ہے، جو کورٹ کے عزائم کو آشکارا کر رہا ہے:

(انگریزی سے ترجمہ) پہلے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ:

''عدالت کے لئے مُلزِم کو، قتل کے لئے اُکسانے کے الزام پر سزا دینا، ممکن نہ ہوگا۔
کیوں کہ جن لوگوں کے لئے کہا جاتا تھا کہ ملزم نے انھیں قتل کرانے کی کوشش کی تھی

وہ، واقعۃً قتل نہیں کیے گئے۔ اور یہ بات بھی بالکل، واضح نہ ہوئی تھی کہ:
ملزم نے انھیں کچھ شرائط پر چھوڑ دیا ہو۔
مگر، پھر بھی عدالت کا خیال ہے کہ یہ بات، پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ:
ملزم نے اس موقع پر، بالکل صریحاً اور اپنی سرکاری حیثیت میں
کچھ ایسے اصول کی اشاعت کی جن سے لوگ، قتل کے لئے آمادہ ہوئے۔'' الخ۔
عبدالحکیم و مرتضیٰ حسین، دونوں، شیعہ تھے اور انگریزوں کے وفادار۔
جن سے ایک موقع پر علاّمہ خیرآبادی کی کچھ بحث ہوگئی تھی۔

اس بحث ومباحثہ کے انتقام میں انھوں نے علاّمہ خیرآبادی کے خلاف، مُخبری وشکایت والزام تراشی کا مذموم کردار ادا کرتے ہوئے کورٹ تک، علاّمہ کا معاملہ پہنچایا۔ چنانچہ، خود، ان کی حقیقت
علاّمہ خیرآبادی نے اپنے رسالہ ''اَلثَّوْرَۃُ الْھِنْدِیۃ'' میں، اس طرح، ظاہر کردی ہے:
''تھوڑے دن کے بعد، ایک حاکم نصرانی نے مجھے مکان سے بلا کر قید کردیا۔
اور رنج ومحن میں مبتلا کرکے، دارُ السَّلطنت (لکھنؤ) جو دراصل، خانۂ ہلاکت تھا، بھیج دیا۔
میرا معاملہ ایسے ظالم حاکم کے سپرد کردیا، جو مظلوم پر رحم کرنا، جانتا ہی نہ تھا۔
اور میری چغلی ایسے دو مرتد، جھگڑالو، تند خُو افراد نے کھائی، جو مجھ سے قرآنِ حکیم کی محکم آیت میں مجادلہ کرتے تھے۔ جس کا حکم یہ تھا کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے۔
وہ دونوں، نصاریٰ کی محبت ومودّت پر، مُصِر تھے۔ انھوں نے مُرتد ہوکر، کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا۔
اس ظالم حاکم نے میری جلاوطنی اور عمر قید کا فیصلہ، صادر کردیا۔'' الخ
(ص ۷۵۔ **باغی ہندوستان**۔ مطبوعہ: مبارک پور)

علاّمہ خیرآبادی کے خلاف، دوسرا الزام کہ:
بونڈی (علاقۂ بہرائچ) میں قیام کے دَوران، حکومتِ اودھ کے وزیر، مَمُّو خاں کے مشیرِ خاص تھے۔
اِس الزام کو بھی علاّمہ خیرآبادی نے مسترد کیا۔
کیوں کہ یہ الزام بھی غلط اور خلافِ واقعہ ہے۔ اور اس کا کوئی ثبوت، کورٹ میں پیش نہ کیا جاسکا۔
لیکن ''**بغاوت پر مشتمل اصولوں کی اشاعت**'' کا کورٹ نے یہاں بھی سہارا لیا۔
معاملہ، چوں کہ کورٹ اور قانونی داؤپیچ کا ہے، اس لئے ثبوت، پیش کرنا، مدّعی کی ذمہ داری ہے۔
مُدَّعیٰ عَلَیْہ (علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی) نہ باغی تھے، نہ بغاوت کی تھی، نہ باغیوں کے ساتھ تھے۔

بغاوت، تو انگریزوں نے، اَوَدھ سے دہلی تک کے ہندوستانی بادشاہ ونواب وراجہ
اور باشندگانِ ہند کے خلاف کی تھی، اس لئے انگریز، باغی تھے۔
اس نکتہ پر، اہلِ علم وفکر، غور کریں اور علاّمہ خیرآبادی کی قانونی مہارت اور بیانِ صداقت کی داد دیں۔
مَمُّو خاں جیسے کم ظرف ونااہل وناتجربہ کار شخص کا مُشیر بننا، علاّمہ کیوں گوارا کرتے؟
جس کی حقیقت، علاّمہ خیرآبادی کی نظر میں یہ تھی:
(اَلثَّوْرَۃُ الْھِنْدِیۃ از علاّمہ خیرآبادی کی مندرجہ ذیل تحریر میں عامل سے مراد، مَمُّو خاں ہے)
(عربی سے ترجمہ) ''یہ تمام اُمورِ مہمّہ اور ان کا اہتمام وانصرام، ایسے ذلیل، غافل، اور متحیر عامل کو سونپا گیا تھا، جو کسی طرح، اس کا اہل نہ تھا۔ وہ صحیح مشورہ سے گریزاں اور جُہل سے ہم کنار تھا۔
آسان باتوں کو سخت اور دشوار کو آسان سمجھتا۔ وہ، ذلیل، احمق اور بُزدل تھا۔
اس نے مکالمت ومشاورت اور مجالست ومناومت کے لئے احمق، جاہل، اور ذلیل طبقہ کو چُن رکھا تھا۔ وہ نَخوت وغرور کی بِنا پر، شریف سرداروں اور عقل مند رہنماؤں سے بچتا۔
اور اپنے ہی اہلِ خاندان اور اَعِزَّہ میں سے، اس نے جاہلوں اور احمقوں کو، مُصاحِب وحاکم بنایا۔
چنانچہ، اس ناتجربہ کار نے لشکروں پر، کمین، بزدل، ذلیل اور رذیل لوگوں کو سردار بنادیا جو بڑے ہی لالچی تھے۔'' (ص ۲۵۸ و ۲۵۹۔ **باغی ہندوستان**۔ مطبوعہ: المجمع الاسلامی، مبارک پور)

علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کے خلاف، کورٹ میں متعیَّن الزامات، تو صرف، دو تھے۔
اور وہ بھی بے بنیاد، جن کا ذکر گذر چکا۔ مجموعی اِجمالی الزامات، تین تھے:
(مولانا امتیاز علی، عرشی کی تحقیق کے مطابق) جو، یہ ہیں:
(۱) نواب، خان بہادر خاں، نبیرۂ حافظ رحمت خاں، روہیلہ نے
جب انگریزوں کے خلاف، بریلی میں بغاوت کی
تو مولانا (فضلِ حق) نے، ان کا ساتھ دیا اور ان کی طرف سے نظامتِ پیلی بھیت کا کام، انجام دیا۔
(۲) جب، انگریزوں نے (پانچ مئی ۱۸۵۸ء کو) بریلی پر، قبضہ کرلیا
تو خان بہادر خاں، وہاں سے بھاگ گیا اور مولانا (فضلِ حق) بھی وہاں سے بھاگ کر، اَوَدھ پہنچے
اور خان علی خاں کی طرف سے، ریاستِ محمدی کے چکلہ دار (نائب ناظم) مقرّر ہوئے۔
(۳) مولانا (فضلِ حق) نے، اس کے بعد ایک باغی لشکر کی کمان، ہاتھ میں لی۔''
قارئین، اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں کہ جنگِ شاملی ۱۸۵۷ء، یا ''غدر'' و ''بغاوت'' سے دور کا بھی

کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود، مولانا رشید احمد، گنگوہی (متوفی ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) کی گرفتاری ''محض جھوٹی مُخبری'' کا نتیجہ تھی۔اور جب حاکم نے آپ سے پوچھ تاچھ کی
توانھوں نے کوئی اِلزام، قبول نہ کرتے ہوئے ہر اِلزام سے اپنے آپ کو، بریُ الذّمہ، ثابت کیا۔
مولانا گنگوہی کے سوانح نگار، مولانا عاشق الٰہی، میرٹھی (متوفی ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) لکھتے ہیں:

''کبھی آپ سے سوال ہوا کہ: رشید احمد! تم نے مُفسدوں کا ساتھ دیا اور فساد کیا؟
آپ، جواب دیتے: ہمارا کام، فساد کا نہیں، نہ ہم، مُفسدوں کے ساتھی ہیں۔''
کبھی، دریافت ہوتا کہ: تم نے سرکار کے مقابلے میں ہتھیار اٹھائے؟
آپ اپنی تسبیح کی طرف، اشارہ فرماتے کہ: ''ہمارا ہتھیار، تو یہ ہے۔''
کبھی، حاکم دھمکاتا کہ: تم کو پوری سزا دیں گے۔
آپ فرماتے کہ: کیا مضائقہ ہے، مگر، تحقیق کر کے۔''
ایک مرتبہ، حاکم نے پوچھا کہ: تمہارا پیشہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''کچھ بھی نہیں، مگر، زمینداری۔''
غرض، حاکم نے، ہر چند تحقیق کیا اور تجسُّس و تحقیق میں پوری کوشش، صَرف کر دی۔
مگر کچھ، ثابت نہ ہوا۔اور ہر بات کا معقول جواب پایا۔
بِالآخر، بری کے گئے اور فیصلہ سنا دیا گیا کہ: رشید احمد، رہا کیے گئے۔ (ص ۸۵۔تذکرۃ الرشید
جلدِ اول۔مؤلّفہ: مولانا عاشق الٰہی، میرٹھی۔مکتبہ خلیلیہ، متصل مدرسہ مظاہر علوم، سہارن پور۔یو پی۔انڈیا)

آگے کی کچھ باتیں، عرض کرنے سے پیشتر، ضروری ہے کہ:
قارئین کو تاریخی طور پر، اس کا علم ہو جائے کہ:
انقلاب ۱۸۵۷ء کے دوران، ایک اور فضلِ حق، انگریزوں کے خلاف، عملی طور پر برسرِ پیکار تھے
اور میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دے رہے تھے۔
وہ، شاہجہاں پور (روہیل کھنڈ) کے ایک سید زادے تھے۔
بریلی، پیلی بھیت اور علاقۂ جھانسی (بندیل کھنڈ) ان کا میدانِ عمل تھا۔
کونچ (جالون) خطۂ جھانسی میں بتاریخ ۸/ستمبر ۱۸۵۸ء سید فضلِ حق، شاہجہاں پوری کی شہادت ہوئی۔
انھیں سید فضلِ حق، شاہجہاں پوری کے بارے میں سید خورشید مصطفیٰ رضوی لکھتے ہیں:
''مولوی فضلِ حق (ساکن شاہجہاں پور) پہلے، بدایوں کے ضلع میں تحصیل دار، پھر، بغاوت
(۱۸۵۷ء) کی ابتدا میں پیلی بھیت کا ناظم بنا۔نومبر ۱۸۵۸ء تک، سرگرم۔آخر تک بڑی فوج، ہمراہ تھی۔

FREEDOM STRUGGLE U.P. VOL,5 PP 327,621,622
(ص ۵۷۵۔**تاریخ جنگِ آزادیِ ہند**۔مؤلّفہ: سید خورشید مصطفیٰ رضوی۔
مطبوعہ: رضا لائبریری، رام پور۔یو پی انڈیا)
۲۴/مارچ ۱۸۵۸ء کی ایک رپورٹ، اس طرح، نقل کی گئی ہے:
........شاہجہاں پور میں اسمٰعیل خاں، مع فوج (دس ہزار) کے، موجود تھا۔
ہلدوانی (نینی تال) پر، فضلِ حق کی فوجیں تھیں۔اور راجہ کاشی پور بھی شریک ہو گیا تھا۔''
(ص ۶۰۷۔**تاریخ جنگِ آزادیِ ہند**۔مؤلّفہ: سید خورشید مصطفیٰ رضوی۔مطبوعہ رضا لائبریری، رام پور)
''سید فضلِ حق، تحصیل دار، بہیڑی (بریلی) اس سے پہلے، رام پور میں نائب سررشتہ دار
پھر، بریلی کمشنری کے سررشتہ دار ہو گئے۔فیروز شاہ کے ساتھ بھی شرکت کی۔''
(ص ۶۰۶۔**تاریخ جنگِ آزادیِ ہند**۔مؤلّفہ: سید خورشید مصطفیٰ رضوی)
''مصطفیٰ علی، بریلوی نے اپنی کتاب ''**خان بہادر خاں شہید**'' میں لکھا ہے کہ:
''نوابِ رام پور نے (سید فضل حق، شاہجہاں پوری کو) ہر چند بلایا، مگر، جواب دیا کہ:
''اب تو تمنائے شہادت ہے۔''
رانی جھانسی کی طرف سے جنگ کرتے ہوئے، کام آئے۔
سرکاری رپورٹ کے بموجب ۸/ستمبر ۱۸۵۸ء کو بمقام ''کونچ'' کے قریب، جنگ میں مارے گئے۔
بحوالہ ''فریڈم اِسٹگل، یو پی۔جلد ۳۔ص ۶۵۸۔۶۴۹۔
(حاشیہ ص ۶۰۶۔**تاریخ جنگِ آزادیِ ہند**۔مؤلّفہ: سید خورشید مصطفیٰ رضوی۔
مطبوعہ رضا لائبریری، رام پور۔یو پی۔انڈیا)
مؤرخ، احمد علی خاں شوقؔ اپنی تاریخی کتاب ''**تذکرۂ کاملانِ رام پور**'' میں
سید فضلِ حق، شاہجہاں پوری (متوفی ستمبر ۱۸۵۸ء) کا تعارف، اس طرح تحریر کرتے ہیں:
''ولد سید عبد اللہ، عُرف ننھے میاں از اولادِ سید عبد الرزاق
خَلَفِ اکبر حضرت شیخ عبد القادر جیلانی عَلَیْہِ الرَّحْمَۃ۔
رام پور میں جناب سید احمد علی خاں صاحب بہادر کے عہد میں پیدا ہوئے۔کتبِ عربی و فارسی
آپ نے مولوی عبد اللہ و مولوی عبد الرحمٰن، اولادِ مولانا مدن وسدن، شاہجہان پوری سے پڑھیں۔
سید شاہ سیادت علی صاحب، نبیرۂ سید عبد الرزّاق، بانسوی (قادری) سے بیعت تھے۔

بڑے پرہیز گار اور برگزیدہ تھے۔ تمام عمر کسی نے ان کے جسم کو، برہنہ نہیں دیکھا۔
نواب جنت آگاہ (رام پور) کے عہد میں نائب سررشتہ دار محکمہ صدر تھے۔
پھر، بریلی کی کمشنری کے سررشتہ دار ہو گئے۔
ایامِ غدر (۱۸۵۷ء) میں پیلی بھیت، یا۔ بہیڑی میں تحصیل دار تھے۔
اسی زمانے میں بہ نیتِ جہاد، مرزا فیروز شاہ کے شریک ہو گئے۔ نواب فردوس مکان (رام پور)
نے ہر چند چاہا کہ رام پور چلے آئیں۔ آپ نے عرض کیا کہ: اب تو تمنائے شہادت ہے۔
چنانچہ، جھانسی میں شہید ہوئے۔ کوئی اولادِ ذکور، نہ تھی۔"

(ص ۳۲۰ و ۳۲۱۔ **تذکرۂ کاملانِ رام پور**۔ مرتّبہ: احمد علی خاں شوق۔ مطبوعہ: خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۱۹۸۶ء)

علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی (متوفی اگست ۱۸۶۱ء) اور سید فضلِ حق شاہجہاں پوری (متوفی ستمبر ۱۸۵۸ء) کے درمیان، فرق و امتیاز اور دونوں کے میدانِ عمل کی بحث، شروع ہونے سے پہلے
قارئین کے علم میں یہ بات رہنی چاہیے کہ:
(۱) مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے "مولانا فضلِ حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتوائے جہاد" کے عنوان سے ماہنامہ "تحریک"، دہلی۔ شمارہ اگست ۱۹۵۷ء میں ایک مضمون لکھا تھا۔
جس میں انھوں نے ۱۸۵۷ء کے فتوائے جہاد سے علاّمہ خیرآبادی کی لاتعلقی کا خیال، ظاہر کیا تھا۔
(۲) مالک رام نے "مولانا فضلِ حق خیرآبادی" کے عنوان سے
ماہنامہ "تحریک"، دہلی۔ شمارہ جون ۱۹۶۰ء میں ایک مضمون لکھ کر، یہ خیال، ظاہر کیا کہ:
مولانا فضلِ حق خیرآبادی، علمی و عملی کسی پہلو سے جنگِ آزادی ۵۷ء میں شریک نہیں تھے۔
ان دونوں "محققین" و "ماہرینِ غالبیات" کے تعلق سے
یہاں اتنی ہی بات لکھی جاسکتی ہے کہ اگر، یہ دونوں، یا ان میں سے کوئی ایک بھی
اِس وقت، بقیدِ حیات ہوتا، تو اسے اپنی غیر علمی و غیر تحقیقی رائے
اور اپنی تحریر سے "رُجوع" اور اپنی "غلطی کے اعتراف" کے سوا، کوئی چارہ نہ ہوتا۔
اور اسے لکھنا پڑتا کہ "محسنِ غالب" علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی نے
جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں شرکت بھی کی تھی اور جہاد کا فتویٰ بھی دیا تھا۔
یہ علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی، وہی "محسنِ غالب" ہیں، جنھوں نے غالب کی "مشکل پسندی" کو
ٹھکانے لگایا اور غالب نے علاّمہ خیرآبادی کی خدمت میں

"دیوانِ غالب" اِس درخواست کے ساتھ پیش کیا کہ وہ اشعارِ غالب کا انتخاب کر کے
جنھیں، باقی رکھنا چاہیں، باقی رکھیں اور جنھیں، حذف کرنا چاہیں، انھیں، حذف کر دیں۔
چنانچہ، ایسا ہی ہوا۔
موجودہ "دیوانِ غالب" علاّمہ خیرآبادی کا انتخاب ہے، جو غالب کی شاعرانہ عظمت کی بنیاد ہے۔
دیکھیے "**آبِ حیات**" از محمد حسین آزاد۔ و "**یادگارِ غالب**" از خواجہ الطاف حسین حالی و "**سرگذشتِ غالب**"
از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ، و "**غالب نامہ**" از شیخ محمد اکرام و دیگر کتب و رسائلِ اردو ادب۔
غالب جیسے خود سر و خودنگر شاعر کو، قابو میں لانا
علاّمہ خیرآبادی کا وہ کارنامہ ہے، جس کا اردو شاعری پر عظیم احسان ہے۔
اور "غالب شناسوں" کو، کم از کم، اب سے "احسان ناشناسی" کی رَوِش سے باز آ جانا چاہیے۔
مرزا اسدُ اللہ خاں غالب، آسمان سے زمین پر اُتر کر
علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کی بارگاہ میں یوں، خراجِ تحسین، پیش کر رہے ہیں:
"چوں مَن صد و چوں عرفی صد ہزار رَا بہ سخن پرورش تواند کرد۔"
(ص ۳۰۰ و ۳۰۱۔ **پنج آہنگ**۔ از مرزا غالب۔ مطبوعہ مجلسِ یادگارِ غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور)
(ترجمہ) **مولانا فضلِ حق، مجھ جیسے سیکڑوں اور عرفی شیرازی جیسے ہزاروں کی**
شاعرانہ تربیت کر سکتے ہیں۔"
ڈاکٹر سلمہ سیہول، رقم طراز ہیں:
"علاّمہ کے مقدمہ کی فائل بھی، میر فضلِ حق، شاہجہاں پوری کے بارے میں
کچھ معلومات، فراہم کرتی ہے۔ مثلاً: گواہِ استغاثہ، تجمل حسین، بیان کرتا ہے:
ایک اور فضلِ حق بھی ہیں۔ میں جس زمانے میں بونڈی کے باغی کیمپ میں تھا
وہ بھی، دو دن کے لئے وہاں آیا تھا، اور اس کے بعد، خان علی خاں، ناظمِ شاہجہاں پور کے پاس
واپس چلا گیا۔ (ص ۱۰۔ ماہنامہ، تحریک، دہلی)
گواہِ صفائی، قادر بخش نے اپنے بیان میں کہا:
میں نہیں جانتا کہ مولوی فضلِ حق، بیگم (حضرت محل لکھنؤ) کے ملازم تھے۔
ایک اور فضلِ حق، شاہجہاں پور کا تھا۔ وہ "محمدی" کا چکلہ دار تھا اور میں نے سنا ہے کہ:
وہ فیروز شاہ کے ساتھ چلا گیا تھا۔ میں نے نہیں سنا کہ ان مولوی فضلِ حق نے

کسی شخص کو گمراہ کر کے، اسے بغاوت پر آمادہ کیا ہو۔ (ص ۱۳ تا ۱۴۔ ماہنامہ تحریک۔ دہلی)

دوسرے گواہِ صفائی، نبی بخش خیر آبادی نے بیان دیا:

میں نے نہیں سنا کہ: یہ بریلی کے نواب (خان بہادر خاں)

یا۔ بیگم (حضرت محل، لکھنؤ) کے ملازم رہے۔.........

میں نے نہیں سنا کہ:

مولوی فضلِ حق نے کسی کو گمراہ کر کے، اسے باغی بنایا ہو۔

یا۔ خود انھوں نے، خان بہادر خاں کی ملازمت، اختیار کی ہو۔

ہاں! میں نے سنا ہے کہ ایک اور فضلِ حق، شاہجہاں پور کا رہنے والا تھا۔

وہ، خان بہادر خاں کا ملازم تھا۔ اور فیروز شاہ کے ساتھ بھی گیا تھا۔ ص ۱۴۔ ماہنامہ تحریک، دہلی۔

(ص ۳۴۰ و ۳۴۱۔ **علاّمہ محمد فضلِ حق خیر آبادی**۔ مؤلفہ: ڈاکٹر سلمہ سیہول۔

مطبوعہ: مکتبہ قادریہ، جامعہ نظامیہ، لاہور۔ طبع اول ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء)

سماعتِ مقدمہ کے دَوران، علاّمہ خیر آبادی کے خلاف لگائے گئے تینوں الزامات قطعاً، بے بنیاد ہیں اور ان میں سے کسی ایک کا بھی علاّمہ کی شخصیت اور آپ کے ذاتی عمل سے کوئی تعلق نہیں۔

پھر، آپ ان تینوں الزامات کو، کیوں قبول کریں اور کیوں، انکار نہ کریں؟

یہ ''قانونی جنگ'' تھی اور علاّمہ خیر آبادی ''ماہرِ قانون'' تھے۔

قانون کی نوک پلک سے واقف تھے۔ وہ، ہر الزام و بیان وجواب و دِفاع کی

قانونی پیچیدگی، اس کے حل، اور نتیجہ وانجام سے بخوبی، واقف تھے۔

مندرجہ ذیل نِکات پر غور کر کے علاّمہ خیر آبادی کے موقف، طرزِ عمل اور بیانِ دِفاع کی صحت وواقعیت کی تائید وتحسین کی جانی چاہیے کہ:

شرعی، قانونی، اخلاقی، ہر لحاظ سے، آپ، صدفی صد حق بجانب تھے۔

(۱) کورٹ کے سامنے، یا اس سے باہر، کسی دوسرے کے عمل کو

بلا ضرورت و مصلحتِ شرعی وقانونی اپنی جانب، منسوب کرنا

یا دیدہ ودانستہ اسے منسوب ہونے کا موقع دینے کا

کون سا جواز؟ اور کون سی عقل مندی ہے؟

(۲) کورٹ میں، جو الزام آپ پر لگایا نہیں گیا، اس کا ذکر، خود اپنی جانب سے کیوں کریں؟

اگر چہ اپنے بعض سابقہ بیانات و اِقدامات، اس اِلزام کے دائرے میں آتے ہوں؟

(۳) اپنی جان و مال کا تحفظ ودفاع، ہر شخص کا مذہبی وقانونی واخلاقی حق بلکہ فریضہ ہے۔

پھر، باوجود قدرت واستطاعت کے اپنے اس فریضہ کی ادائیگی سے غفلت وکوتاہی کیوں برتی جائے؟

(۴) ذرا سی لغزش، غیر محتاط بیان، قبولِ الزام کی گنجائش سے گولی، پھانسی، کالا پانی

اور ضبطیِ جائداد، وغیرہ کی سزا، یقینی ہے۔ اور ایسی سزا سے، تاحدِّ امکان بچنا، ضروری ہے۔

کیوں کہ اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنے کی سبیل پیدا کرنا

یا۔ باوصفِ قدرت واستطاعتِ ممانعت، کوئی تباہ کن سبیل پیدا ہونے دینا، شرعاً ممنوع وناجائز ہے۔

(۵) بعض وہ الزامات، جو غلط طور پر آپ کے خلاف، کورٹ میں عائد کیے گئے

ان میں سے کسی بھی الزام کو قبول کرنا، یا اس الزام کے مساوی اپنے کسی سابقہ بیان و عمل کا

از خود، ذکر کر کے، قانوناً مستحقِ سزا ہونے کی راہ، ہموار کرنے میں، کون سا دینی، ملّی، قومی، وطنی فائدہ تھا؟

جس کا لحاظ ورعایت کر کے آپ اپنی ہلاکت کو دعوت دی جائے؟

(۶) کورٹ اگر چہ اپنے ظالمانہ و جابرانہ طے شدہ فیصلے کے مطابق، وہی سزا دیتی

جو اس نے دیا، مگر، اس سے بچنے کی تدبیر کرنا، ہر حال میں آپ کی شرعی واخلاقی ذمہ داری تھی۔

اور یہی سیاسی وقانونی حکم بھی ہے، جس کی آپ نے بھرپور پاس داری کی۔

اور آپ کو ایسا کرنا ہی چاہیے تھا۔

۳۰ رجنوری ۱۸۵۹ء کو، علاّمہ خیر آبادی کو اپنے وطنِ مالوف

خیر آباد (اَوَدھ۔ موجودہ ضلع سیتاپور۔ یوپی) سے گرفتار کر کے لکھنؤ لایا گیا۔

اور ۲۱ رفروری ۱۸۵۹ء کو لکھنؤ کورٹ میں آپ کے خلاف، مقدمہ، شروع ہوا۔

بعض الزامات، مثلاً: خان بہادر خاں روہیلہ کے ساتھ رہ کر، ان کی طرف سے نظامتِ پیلی بھیت کی خدمت انجام دینا، خان علی خاں کی طرف سے ریاستِ ''محمدی'' (شاہجہاں پور) کا چکلہ دار (نائب ناظم) ہونا، باغی لشکر کی کمان، ہاتھ میں لینا۔

ان تینوں الزامات کا تعلق، علاّمہ خیر آبادی سے نہیں، بلکہ سید فضل حق، شاہجہاں پوری سے تھا جو ستمبر ۱۸۵۸ء میں جھانسی کے علاقۂ کونچ میں شہید ہو چکے تھے۔

علاّمہ خیر آبادی کی کسی سیاسی سرگرمی کا تعلق، بریلی و پیلی بھیت و شاہجہاں پور و جھانسی سے کبھی رہا ہی نہیں۔

ان علاقوں میں سید فضل حق، شاہجہاں پوری، انگریزوں کے خلاف، مصروفِ جنگ تھے۔

اوران کا ہی فیروز شاہ وخان بہادر خاں سے براہِ راست تعلق تھا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ علاّمہ خیرآبادی اگرچہ، دہلی سے اَوَدھ تک کے اعلیٰ حلقۂ عُلما وفُضَلا
وطبقۂ اُمَرَا وحُکّام اور عامۂ مسلمین کی فکری قیادت اور ذہنی تربیت فرمارہے تھے
مگر، کورٹ میں قانونی گرفت کے لئے مخالفین کے پاس، ثبوت وشواہد نہیں تھے۔
اس لئے کھینچ تان کر کے آپ کے خلاف، بعض الزامات ایسے گڑھے گئے
جن کا تعلق، سید فضلِ حق، شاہجہاں پوری سے تھا۔
اس لئے ان الزامات کا انکار، علاّمہ خیرآبادی کا ایک نہایت اہم فریضہ تھا۔
اوراس کے نتیجے میں آپ، قانونی حد تک بحُسن وخوبی، کامیاب وکامراں ہوئے۔
اب رہ گیا مسئلہ، کورٹ کی نیت کا، تو اسے جو فیصلہ کرنا تھا، وہ اس نے کیا۔
فیصلہ تو خیر، اس کا طے شدہ فیصلہ تھا ہی، مگر، الزامات کو ہی بنگاہِ غور دیکھا جائے
تو کورٹ کی بدنیتی، واضح اور عُریاں ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ:
اس نے سید فضل حق، شاہجہاں پوری کی ان جنگی وانتظامی سرگرمیوں کو بطورِ الزام اپنایا
تاکہ علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کے خلاف، کچھ متعین فردِ جرم بنا کر انھیں متعین سزا دی جاسکے۔
یہ کام، اس نے محض بدنیتی کے ساتھ شروع کیا۔ ورنہ ایسا کچھ بھی نہیں کہ:
وہ اوراس کا محکمۂ جاسوسی، فضلِ حق، خیرآبادی اور فضلِ حق شاہجہاں پوری کا فرق
اوردونوں کے حُدودِ عمل کو، نہ سمجھ سکے۔
فضلِ حق، خیرآبادی، کوئی غریب وبے چارہ ومسکین شخص، نہیں تھا کہ:
محکمۂ جاسوسی وسرکاری انتظامیہ، اس کی شخصیت وحیثیت سے ناواقف ہو۔
وہ خود، عُلما وفُضَلاے دہلی کے درمیان، ممتاز، اس کے روابط وتعلقات، بہادر شاہ ظفر سے واضح
اس کے والدِ محترم، علاّمہ فضلِ امام خیرآبادی، برسہا برس تک، دہلی کے صدرُ الصُّدور۔
پھر، اسے بدنیتی کے سوا، کچھ اور کہا ہی نہیں جاسکتا کہ:
ان کے خلاف، وہ الزامات، عائد اور مسلّط کیے جائیں، جن کا تعلق، کسی دوسرے شخص سے ہو۔
ان الزامات اور فیصلہ کے بارے میں اگر کچھ کہا جاسکتا ہے، تو صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ:

بگڑتی ہے جس وقت، ظالم کی نیت
نہیں کام آتی، دلیل اور حُجت

اب قارئین، اس نکتہ پر اپنی توجہ، مبذول فرمائیں کہ:
مقدمہ کی سماعت اور بحث کے دَوران، سید فضلِ حق، شاہجہاں پوری کا نام، تو ضرور آیا
اور مُدَّعیٰ علیہ، فضلِ حق، خیرآبادی نے بھی کورٹ میں دیے گئے اپنے تحریری بیان میں اس کا ذکر کیا ہے۔
مگر، سزا کا غیر منصفانہ فیصلہ، اُن الزامات کی بنیاد پر کورٹ نے دیا
جن کا تعلق، اس کے الزام کے مطابق، علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی سے ہے۔
مقدمہ کے دَوران، بحث ومباحثہ میں کسی شخص کا ذکر آجانا، الگ بات ہے۔
اور کسی سے متعلق، کوئی فیصلہ، صادر ہونا، یہ الگ بات ہے۔
مقدمہ کی سماعت اور بحث وجرح وشہادت وغیرہ کے بعد، جو فیصلہ، کورٹ میں دیا جاتا ہے
اسی پر عمل ہوتا ہے اور بحث، بہت پیچھے چلی جاتی ہے، جسے تاریخ میں عموماً محفوظ نہیں رکھا جاتا۔
بہرحال! بحث وشہادت وغیرہ کے بعد کورٹ نے حَبسِ دوام بعبور دریائے شور یعنی کالا پانی بھیجنے کا
جو فیصلہ ۴/مارچ ۱۸۵۹ء کو دیا، اس میں صراحۃً، فضلِ حق، ولد فضلِ امام، مذکور ومسطور ہے۔
علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کے مِسلِ مقدمہ میں نقلِ فیصلہ کے یہ اِقتباسات
فضلِ حق بن فضلِ امام کو دی جانے والی سزا کی توثیقِ مزید کے لئے کافی ہیں:

"دہلی سے اس کے پرانے تعلقات کے باعث، وہاں کے حُکّام سے بھی
اس سے متعلق، اِستصواب کیا گیا
تو کمشنر دہلی نے، اس کے جو حالات، تحریر کیے، ان سے معلوم ہوا کہ:
۱۸۵۷ء میں دہلی میں بھی اس کی سرگرمیاں، اسی قسم کی (باغیانہ) تھیں۔"

"بغاوت، شروع ہونے کے وقت، وہ اَلوَر میں ملازم تھا۔ یہاں سے وہ دیدہ ودانستہ، دہلی آیا
اور اس کے بعد، وہ، باغیوں اور بغاوت کے قدم بہ قدم چلتا رہا۔"
"وہ، انگریزی ملازمت، تَرک کر کے اَوَدھ، رام پور، اَلوَر وغیرہ، متعدد دیسی ریاستوں میں
معقول عُہدوں پر ممتاز رہا۔ اس کی ہمیشہ، شہرت رہی ہے۔
جن گواہوں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، وہ بھی، مولوی فضلِ حق کا نام، اکثر سنتے آئے تھے۔
"ملزم، کبھی، صاحبِ سیف رہا ہی نہیں ہے۔
بلکہ اس کی ہمیشہ، صاحبِ رائے ومشورہ کی حیثیت سے شہرت رہی ہے۔"
(اقتباساتِ فیصلہ از مِسلِ مقدمہ مولانا فضلِ حق، خیرآبادی)

اسی لئے حقیقت پسند مؤرخین نے بھی اپنا فیصلہ یہی سنایا کہ:

''اِلتباسِ اسمی'' اور ''ہم نامی'' کی شوشہ بازی، بالکل غلط ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ:

مولانا فضلِ حق کے ''باغی و مُجرِم'' ہونے کا فیصلہ

مولانا فضلِ حق، خیرآبادی، فرزندِ فضلِ امام خیرآبادی سمجھ کر ہی کورٹ نے سنایا ہے۔

چنانچہ، جناب، وقارُالحسن، صدیقی، سابق دائریکٹر آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا
وسابق او ایس ڈی، رضا لائبریری، رام پور، یوپی، انڈیا لکھتے ہیں کہ:
''مولانا فضلِ حق خیرآبادی کے بارے میں یہ غلط، مشہور ہوگیا ہے کہ:
وہ کسی دوسرے فضلِ حق سے ''اِلتباسِ اِسمی'' کی بناپر گرفتار کرلیے گئے تھے۔
.........انگریزوں کے مُخبِر، تُراب علی کی رپورٹ، مُحرَّرہ ۲۸؍اگست (۱۸۵۷ء) سے
معلوم ہوتا ہے کہ وہ قلعہ کی **''جنگی مشاورتی کونسل''** کے ممبر بھی بن گئے تھے۔
انگریزوں کے جاسوس، گوری شنکر نے ۲۸؍اگست ۱۸۵۷ء کی رپورٹ میں لکھا تھا کہ:
''مولوی فضلِ حق، جب سے دہلی آیا ہے
شہریوں اور فوج کو انگریزوں کے خلاف اُکسانے میں مصروف ہے۔ وہ کہتا پھرتا ہے کہ:
اس نے آگرہ گزٹ میں برطانوی پارلیمنٹ کا ایک اعلان پڑھا ہے جس میں انگریزی فوج کو
دہلی کے تمام باشندوں کو قتل کردینے اور پورے شہر کو مسمار کردینے کے لئے کہا گیا ہے۔
آنے والی نسلوں کو یہ بتانے کے لئے کہ یہاں، دہلی شہر، آباد تھا
شاہی مسجد کا صرف ایک مینار، باقی چھوڑا جائے گا۔

INDIAN OFFICE LONDON MUTINY COLLECTION NO, 170-PP.442.443

(ص ۱۴۔ پیش لفظ۔ **تاریخِ جنگِ آزادیِ ہند ۱۸۵۷ء**۔ مؤلّفہ: سید خورشید مصطفیٰ رضوی۔
مطبوعہ: رضا لائبریری، رام پور۔ یوپی۔ انڈیا)

لکھنؤ کورٹ کا فیصلہ برائے حبسِ دوام ہونے کے بعد، اس پر عمل درآمد کا

یہ حکم نامہ، اس سلسلے میں حرفِ آخر سمجھنا چاہیے:

وارنٹ نمبر ۱۴ ڈپٹی کمشنر، لکھنؤ

''فضلِ حق ولد فضلِ امام، مُجرِم گردانا گیا۔ بوجہ اُکسانے بغاوت کے۔
اور بوجہ اشاعت ایسے اصولوں کے، جن سے قتل کے حالات پیدا ہوتے تھے۔

اور بوجہ، باغیوں کی کونسل میں حصہ لینے کے، اسے، عمر قید بعبور دریائے شور بغیر مشقّت کی سزا دی گئی۔
لھذا، یہ حکم دیا جاتا ہے کہ مندرجہ بالا سزا کو فضلِ حق ولد فضلِ امام پر عمل میں لایا جائے۔''

الیٰ آخِرِہٖ۔ (مِسل مقدمہٗ مولانا فضل حق، خیرآبادی)

اپنی گرفتاری، قید، رنج وتکلیف اور آلام ومصائب کا، علّامہ خیرآبادی نے
اَلثَّورَۃُ الْھِندِیۃ (باغی ہندوستان) اور مختلف عربی قصائد میں بڑے دل گداز انداز میں ذکر کیا ہے۔

چنانچہ، قصیدہ ھمزیہ (مشمولہ: **باغی ہندوستان**۔ مطبوعہ: بجنور ولاہور ومبارک پور) میں
فرماتے ہیں (ترجمۂ عربی اشعار)
''جب میں قیدی بن کر بھی، ان (نصاریٰ) کا اِطاعت گذار نہ بنا
تو ان کی طرف سے رنج وتکلیف میں اور بھی زیادتی کردی گئی۔ (شعر نمبر ۱۵)
''انھوں نے مجھ پر عرصۂ حیات، تنگ کردیا۔ میں اس زندگی سے دل برداشتہ ہوگیا۔
اور اُس پُرمسرت زندگی کو بھول گیا، جس میں آسانی تھی۔ (شعر ۱۷)
''میرے رات دن، سخت گرمی اور اندھیرے میں گذرتے ہیں۔
گویا کہ سخت موسمِ گرما کے دن اور آخرِ ماہ کی اندھیری راتیں ہیں۔ (شعر نمبر ۱۸)
''تو، رات، دَوَامی شکل، اختیار کرچکی ہے، جس کی صبح نہیں ہے۔
اور نہ دن کے لئے شام اور رات ہی ہے۔ (شعر نمبر ۲۰)
''مجھے، سب تصرُّفات سے روک کر ایک کوٹھری میں ٹھہرا دیا۔
جس میں زہریلی ہوا کے سِوا، اور کسی قسم کی ہَوا، نہ پہنچ سکے۔ (شعر نمبر ۲۱)
''کیسی مصیبت ہے کہ اس کوٹھری کی دیواریں، انسانی اَعضا کو بھونتی ہیں۔
اور اس کی مٹی، تپتی ہوئی زمین ہے۔ (شعر نمبر ۲۲)
وہ (نصاریٰ) سیاہ جگر، سفید فام، نرم جِلد، اور سخت قلب، واقع ہوئے ہیں۔ (شعر نمبر ۳۵)
''وہ، بدبخت وبےشرم ہیں۔ انھیں، نہ ننگ وعار ہے، نہ غیرت وحِلم وحَیا
ان کے پاس ہوکر گذری ہے۔ (شعر نمبر ۳۶)
''بڑے جھگڑالو اور سخت دل ہیں۔ ان میں نرمی اور مادۂ حمایت وحمیت، نام کو نہیں۔ (شعر نمبر ۳۷)
''سارے عُیوب، ان میں موجود ہیں۔
مَردوں میں سرکشی اور عورتوں میں حرام کاری پائی جاتی ہے۔ (شعر نمبر ۳۸)

”مجھے، ظُلماً، اہلِ وطن سے اچانک، دور کر دیا گیا۔
اور مجھے اپنی کمزور و ناتواں ذُرِّیت (اولاد) کو بھی چھوڑنا پڑا۔ (شعر نمبر ۷۰)
”مجھے، وحشیوں میں بسا دیا گیا۔ اس قید خانہ (جزیرۂ انڈمان) میں
دو قسم کے وحشیوں، کوؤں اور اَجنبیوں کے سِوا، کوئی، نظر نہیں آتا۔ (شعر نمبر ۷۹)
”اس (جزیرہ) کی آب و ہوا، ناموافق اور وَبائی ہے۔
نہ تو اس کے کھانے میں شکم سیری ہے، نہ پانی میں سیرابی۔ (شعر نمبر ۸۰)

○○○

قصیدۂ دالیہ (مشمولہ **باغی ہندوستان**، مطبوعہ بجنور، لاہور و مبارک پور)
میں علاّمہ خیر آبادی فرماتے ہیں:
”میرے قلب، روح، جسم اور بدن کو، جو مصیبتیں پہنچیں
ان کی وجہ سے مجھ میں کوئی قوت، باقی نہیں رہی۔ (شعر نمبر ۱۳)
”سخت مصیبت کی وجہ سے میں ہلاکت کو پہنچ گیا۔
روحانی اور جسمانی اذیتوں سے گِھر کر، میں شیخِ فانی بن گیا۔ (شعر نمبر ۱۴)
”اس مصیبت نے مجھے کمزور و ناتواں بنا دیا اور شریر و بدخصلت لوگوں کے مکر نے
میری زیرکی و دانائی کو، زائل کر دیا۔ (شعر نمبر ۱۶)
”میرا دن، رات کی طرح ہے اور میری رات کو، دَوام ہے۔
آسمان پر ستارے ایسے رُکے ہوئے ہیں، جیسے میخوں میں انھیں باندھ دیا گیا ہو۔ (شعر نمبر ۵۹)
”مجھے تکلیف پہنچانے کے لئے نصاریٰ نے ایسے زِندیقوں کو آمادہ کیا
جو، اُن کے مقرّب ہیں اور وہ بھی، جن سے ان کے اِلحاد کی وجہ سے محبت کرتے ہیں۔ (شعر نمبر ۶۳)
”وہ، غصے میں آپے سے باہر ہو گئے اور میری اذیت رسانی میں ہر ممکن جد و جہد سے کام لیا۔
پوری پوری دُشمنی بَرتی اور بُغض و عِناد کا، کھلا مظاہرہ کیا۔“ (شعر نمبر ۶۴)

○○○

مقدمہ کے سلسلے میں ایک بات، یہ بھی کہی جاتی ہے کہ:
مولانا فضلِ حق، خیر آبادی نے، نوابِ رام پور کے نام، تین خطوط لکھے تھے۔
جن میں سے ایک خط، اب بھی، رضا لائبریری، رام پور (یوپی، انڈیا) میں محفوظ ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی نے نواب یوسف علی خاں ناظم، نوابِ رام پور کے نام تین خطوط لکھے تھے۔ یہ نواب صاحب، انگریز حامی تھے۔

”ان میں سے دو، ناپید ہیں اور ایک خط ۱۸ر فروری کا (حسبِ بیانِ امتیاز علی عرشی) تحریر کردہ رضا لائبریری، رام پور میں محفوظ ہے۔ اس خط میں انھوں نے نواب صاحب سے درخواست کی ہے کہ وہ، رئیسِ مالا گڑھ، نواب اسمٰعیل خاں، جو کہ ہر دو فضلِ حق اور ان کی سرگرمیوں اور ان کے فرق سے بخوبی، آگاہ ہیں، ان سے کہیں کہ وہ کمان افسر، ٹروپ صاحب کے نام، محکمہ اسپیشل کمشنری لکھنؤ میں دوسرے شخص اور میری ان جرائم سے برأت کا حال، تفصیل کے ساتھ اپنی درخواست کے ہمراہ بھیجیں۔“

(ص ۳۳۹۔ **علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی**۔ مؤلّفہ: ڈاکٹر سلمہ سیہول، مکتبہ قادریہ، جامعہ نظامیہ، لاہور۔ طبع اول: محرم ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء)

اس خط کے سلسلے میں، یہ چند باتیں، سوچی اور کہی جا سکتی ہیں:
۱۸ر فروری ۱۸۵۹ء کی تاریخ و سال ہونے کا واضح مطلب یہ ہے کہ:
گرفتاری کے بعد، مقدمہ کی سماعت کے دوران، یہ خط لکھا گیا ہے۔
ایسے پریشان کُن، پیچیدہ اور مَحبوس و مُقید حالات میں ضرورت تو یقیناً محسوس کی جا سکتی ہے کہ:
کوئی مؤثر صورت اپنا کر اور حکومتِ وقت کی نظر میں اس کی کسی وفادار و مقتدر شخصیت کا سہارا لے کر خود ساختہ الزامات سے اپنی برأت کی مناسب و باوقار سبیل اپنائی جائے۔
اس کے لئے موزوں اور مناسب شخصیت، اس وقت، نوابِ رام پور ہی کی ہو سکتی تھی۔
کیوں کہ وہ ایک قدیم ریاست کے خاندانی وجاہت کے مالک اور انگریزی حُکّام کے یہاں مقرّب تھے اور انقلابِ ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے، علاّمہ خیر آبادی
ریاستِ رام پور سے وابستہ رہ کر ترجمہ و تصنیف کی خدمت، انجام دے چکے تھے۔
تاہم، خط کے اصلی ہونے کے لئے ضروری ہے کہ:
وہ، علاّمہ خیر آبادی کے دستخط و رسم الخط کے عین مطابق ہو۔ بصورتِ دیگر، یہی سمجھا جائے گا کہ:
(۱) یہ خط، علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی کا لکھا ہوا نہیں ہے۔
(۲) یہ علاّمہ خیر آبادی کے کسی حامی و ہمدرد کا ہو سکتا ہے کہ:
اس نے اپنے طور پر یہ سوچ کر لکھ دیا ہو کہ:
نواب کی وساطت سے بطریقِ اَحسن، اس کورٹ سے الزامات کی برأت ہو سکتی ہے۔

کیوں کہ نوابِ رام پور، علاّمہ خیرآبادی کے دینی و علمی مقام و حیثیت سے
بخوبی، واقف ہونے کے ساتھ، انگریزی دربار کے مقرّب نواب ہیں۔
لیکن، اس خیال کی صحت کے لئے کوئی تاریخی سند، درکار ہے۔
(۳) اس خط کے ناقابلِ توجہ اور غیر مؤثر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نوابِ رام پور نے
اس خط کو اصلی نہ سمجھ کر، اس کے مطابق، کوئی اقدام و عمل کرنے سے گریز و پہلو تہی کیا۔
یا۔ یہ خط، نوابِ رام پور تک نہ پہنچ سکا کہ وہ اس کے مطابق کچھ عمل کرتے۔
(۴) علاّمہ خیرآبادی کی برأت کے لئے علاّمہ کے کسی بااثر و حُکّام رَس حامی و ہمدرد کی
نواب سے کسی ملاقات و گفتگو، جو ایک آسان صورت تھی
اس صورت کے اپنائے جانے سے اس محفوظ خط، یا۔ مذکورہ دونوں خطوط کی تائید ہوسکتی تھی
مگر، ایسی کسی ملاقات و گفتگو کی، نہ کوئی تاریخی سند ہے، نہ ہی کہیں کوئی ذکر ہے۔
اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ خط، فرضی ہے۔
(۵) اس خط پر، نہ علاّمہ خیرآبادی کا دستخط ہے، نہ ان کے رسمِ خط کے مطابق ہے۔
اس لئے قطعی اور آخری بات یہ ہے کہ یہ خط، علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کا لکھا ہوا نہیں ہے۔
(۶) تقاضا و اِصرار کے باوجود، اس خط کا اب تک کوئی عکس، منظرِ عام پر نہ لائے جانے کا مطلب ہے کہ:
''دال میں کچھ کالا ہے، بلکہ پوری دال کالی ہے۔''
یہی وجہ ہے کہ سلسلۂ خیرآباد کے دو مقتدر عُلما، حکیم محمود احمد، برکاتی، ٹونکی (شہادت ۱۴۳۴ھ /۲۰۱۳ء۔ کراچی) اور مولانا عبدالشاہد، شیروانی (وفات ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء۔ علی گڑھ)
اس خط کے اصلی ہونے کا، بشدّت، انکار کرتے ہیں۔
دیکھیے ''**فضلِ حق اور ۱۸۵۷ء**''۔ مؤلّفہ: حکیم محمود احمد، برکاتی، ٹونکی۔
اور ''**باغی ہندوستان**'' مرتّبہ: مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی۔
مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی، اس عرضی کے بارے میں لکھتے ہیں:
''یہ عرضی، علاّمہ خیرآبادی کی مہر سے مزیّن ہے اور ۱۸؍فروری ۱۸۵۹ء کی مَرقومہ ہے۔
اس عرضی کی بنا پر، محترم عرشی صاحب تحریر فرماتے ہیں:
''مولانا (فضلِ حق) پر، تین الزام، عائد کیے گئے تھے:
(الف) نواب، خان بہادر خاں، نبیرۂ حافظ رحمت خاں نے جب انگریزوں کے خلاف

بریلی میں بغاوت کی، تو مولانا نے ان کا ساتھ دیا اور ان کی طرف سے نظامتِ پیلی بھیت کا کام، انجام دیا۔
(ب) جب انگریزوں نے بریلی، فتح کر لی، تو مولانا، یہاں سے بھاگ کر، اَوَدھ پہنچے۔
اور خان علی خاں کی طرف سے، ریاستِ ''محمدی'' کے چکلہ دار، مقرر ہوئے۔
(ج) مولانا نے اس کے بعد، ایک باغی لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لی'۔
مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی ان الزامات کی تردید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:
علاّمہ خیرآبادی ۳۰؍جنوری ۱۸۵۹ء کو گرفتار کر لیے گئے۔ بغاوت کے قیدی مجرم تھے۔''
اَلثَّوْرَۃُ الْھِنْدِیَّۃ ''میں فرماتے ہیں:
(عربی سے ترجمہ) میرا جوتا اور لباس، اُتار کر، موٹے اور سخت کپڑے پہنا دیے۔
نرم بستر چھین کر، خراب، سخت اور تکلیف دِہ بچھونا حوالے کر دیا، گویا، اس پر کانٹے بچھا دیے گئے ہوں۔
یا۔ دہکتی ہوئی چنگاری ڈال دی گئی ہو۔ میرے پاس، لوٹا، پیالہ اور کوئی برتن تک نہ چھوڑا۔'' (اَلثَّوْرَۃُ الْھِنْدِیَّۃ)
انصاف کیجیے! ایسی حالت میں مہر رکھنے کی اجازت دے دی گئی ہوگی؟
یا۔ کاغذ اور قلم دوات، مہیا کر دیا گیا ہوگا کہ علاّمہ، عرضی لکھ کر مہر لگا کر نواب رام پور کو بھیج دیں؟
اور وہ بھی، جب کہ دو دن بعد ہی ۲۱؍فروری کو مقدمہ، شروع ہوا ہو؟
پھر لکھنؤ سے رام پور تک، عرضی پہنچنے میں اس زمانے میں کتنی مدت لگی ہوگی؟
یہ عرضی، رضا لائبریری، رام پور میں موجود ہے۔ میری دیکھی ہوئی ہے۔
نہ علاّمہ کا رسم الخط ہے، نہ طرزِ بیان اور نہ ہی، اس پر دستخط ہیں۔ آخر، دستخط کرنے میں کیا چیز، مانع تھی؟
اصل چیز، دستخط ہے، مہر تو اس کی تائید میں ہوتی ہے۔
پھر، یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اُٹھارہ (۱۸) دن میں، علاّمہ خیرآبادی نے تابڑ توڑ تین عرضیاں
روانہ کیں، جن میں سے، دو بقول عرشی صاحب، ضائع ہوگئیں۔ یہ تیسری اور آخری عرضی ہاتھ لگی۔
ریاستی محافظ خانہ کو داد دیجیے کہ اس نے ایک عرضی، جناب عرشی صاحب کی تعمیرِ عمارت کے لئے
سنگِ بنیاد بنا کر محفوظ رکھی۔ اس عرضی پر بنیاد قائم کر لینا، عرشی صاحب جیسے محقق سے، باعثِ تعجب ہے۔
پھر، ستم بالائے ستم، یہ کیا گیا کہ دونوں بزرگوں
(محترم، عرشی صاحب اور محترم، مالک رام صاحب) نے، جہادِ آزادی میں شرکت سے ہی انکار کر دیا۔
انھیں کو آج، میرا ذِکر، سن کر طیش آتا ہے   ہمیشہ، جن کی خاطر کیں، چمن آرائیاں میں نے
قدیم و جدید مؤرخین کے اقتباسات، پیش کیے جاتے ہیں۔ فیصلہ، اربابِ نظر، خود فرما لیں گے۔

غمِ زندگی کی حکایتیں بھی شریکِ جُرم وخطانہ ہوں
میں سناؤں قصۂ دردِ دل، اگر آپ سُن کے خفانہ ہوں

(ص ۲۶۶ و ۲۶۷۔ باغی ہندوستان۔ مؤلّفہ: محمد عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی۔
طبعِ چہارم: المجمع الاسلامی، مبارک پور اعظم گڑھ۔ یوپی۔ انڈیا۔ ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء)

سماعتِ مقدمہ کے دَوران، عائدشدہ الزامات کا، اس مکتوب، محرّرہ ۱۸؍فروری ۱۸۵۹ء میں بھی
ذکر آنا، ایک الگ بات ہے اور بعد کے اس ''دریافت شدہ خط'' کا اصلی ہونا
ایک بالکل، دوسری بات ہے۔ جس کا کوئی ثبوت اور کوئی سند نہیں۔
کیوں کہ اس پر، نہ علاّمہ خیرآبادی کا دستخط ہے اور نہ ہی ان کا رسم الخط ہے۔
اس لئے انصاف ودیانت کا تقاضا اور حق وصداقت کا فیصلہ یہی ہوگا کہ:
یہ خط اور یہ عرضی، بالکل غیر مستند اور قطعاً، فرضی ہے۔ اور اس کی صحت وسقم کی شناخت کا
اِس زمانے میں آسان طریقہ یہی ہوسکتا ہے کہ کتب ورسائل میں
علاّمہ خیرآبادی کے تحریری مَواد کی مطبوعہ عکسی تحریرات سے اس کا تقابل کرلیا جائے۔
اس طرح ''حقیقت'' اور ''اِختراع'' کا فرق وامتیاز، روزِ روشن کی طرح، واضح ہوجائے گا۔
''ناقدین ومُعترضین'' کی ''شبِ دیجور'' کے جھلملاتے ہوئے تارے
اِنْ شَاءَ اللّٰہ ''طلوعِ خورشیدِ خاور'' کے ساتھ ہی منہ چھپا کر، راہِ فرار، اختیار کرلیں گے
اور ''حقیقت کا جگمگاتا ہوا آفتاب'' دل ودماغ کو، دفعۃً، روشن ومنور کردے گا۔

رات کے ماتھے پہ، آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف ''خورشیدِ درخشاں'' کے نکلنے تک ہے

علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی، امامُ الحکمۃ والکلام تھے، ماہرِ قانون تھے۔
بیدار مغز اور عالی دماغ تھے۔ جرأت مند اور بہادر تھے۔ ان سے بحث ومباحثہ، کون کرسکتا تھا؟
اور ان کے ایرادات ودلائل کے مقابلے کی تاب، کون لاسکتا تھا؟
انھوں نے گواہوں کے ہوش اُڑادیے، گواہیوں کے پرخچے اُڑادیے، اور مخالفانہ دلائل کی
دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ مگر، فیصلے کا اختیار ''کورٹ'' کو تھا۔
اور اس نے اپنے اس اختیار کا استعمال اس طرح کیا، جیسے لارڈ ڈلہوزی نے سلطنتِ اَوَدھ کی منسوخی
اور اسے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ضم کرکے کمپنی کی حکومت کا حصہ بنانے کا فیصلہ ۱۸۵۶ء میں کیا تھا۔

علاّمہ خیرآبادی کے تیور، ان کے دلائل، ان کی حکیمانہ قانونی مہارت
اور قوتِ بیان وطرزِ استدلال کے سامنے، سب، عاجز وساکت تھے۔
مگر، کورٹ نے وہ فیصلہ کیا، جو اُس کا ''طے شدہ فیصلہ'' تھا۔
فیصلہ سنائے جانے سے پہلے، اَعِزَّہ واَقارِب، خوش تھے کہ علاّمہ خیرآبادی، یقیناً بری ہوجائیں گے
کیوں کہ ان کے خلاف لگائے جانے والے الزامات اور عائد کیے جانے والے اِتہامات، بے بنیاد ہیں۔
چنانچہ، اس اطمینان ومسرت کا اظہار، اُس خط سے ہوتا ہے جسے ۱۷؍رجب ۱۲۷۵ھ/۲۰؍فروری ۱۸۵۹ء کو
علاّمہ کے مقدمہ کے پیروکار، منشی کرم احمد، خیرآبادی نے بنام سید اعظم علی، خیرآبادی، تحریر کیا ہے:
............از تحریراتِ آں جا، ہرروزہ، منکشف می شود کہ:
امروز فردا بِفَضْلِہٖ تَعَالیٰ رہائی خواہد شد۔'' الخ (ص ۲۲۴۔ باغی ہندوستان۔ مطبوعہ: مبارک پور)
وہاں (لکھنؤ کورٹ) اپنے متعلقین کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ:
اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے آج کل میں رہائی ہوجائے گی۔''
علاّمہ خیرآبادی، یقیناً، بے قصور اور مظلوم تھے۔ بے قصور، یوں تھے کہ:
انھوں نے دین ومِلّت اور قوم ووطن کے خلاف کوئی جُرم وقصور نہیں کیا تھا۔
اور مظلوم، یوں تھے کہ انھیں، دھوکہ سے گرفتار کرکے
اور ان کے خلاف، بے جا الزامات، عائد کرکے، انگریزوں نے ان پر ظلم کیا تھا۔
اپنی اسی بے گناہی اور مظلومیت کو ثابت کرنا، علاّمہ کا مقصود تھا۔
اور اپنے اس مقصود ومطلوب میں آپ، صدفی صد کامیاب تھے۔
مگر، ان پر ظلم کرکے، انگریزوں نے، جو گناہ کیا
اس نے ان بدنیت حُکّام کو قانون وانصاف کی عدالت میں خود ہی، گنہگار، ظالم اور مُجرم بنادیا۔
علاّمہ خیرآبادی نے کوئی بغاوت کی تھی نہ ہی وہ باغی تھے۔
بلکہ درحقیقت، انگریز، باغی تھے اور انھوں نے ہی ہندوستان سے بغاوت کی تھی۔
یہ ہے عدالت اور تاریخ کا اصل فیصلہ، جو لوحِ قلب وضمیر پہ، مُرتسم ہوچکا ہے۔
اپنی بے گناہی ومظلومیت ثابت کرنا، علاّمہ خیرآبادی اور ان کے اَعِزَّہ واَقارِب واَحباب
ومتعلقین کا حق، بلکہ فریضہ تھا، جسے انھوں نے حَسبِ موقع ومصلحت، استعمال کیا۔
خواہ، وہ کورٹ کے اندر رہو، یا کورٹ سے باہر۔ خواہ، وہ علاّمہ خیرآبادی کی جانب سے

مارچ، اپریل ۱۸۵۹ء میں گورنر جنرل کے نام، سزا کے خلاف، دائر کی گئی اپیل ہو۔
یا۔ مولانا فضل الرحمٰن، قاضی القضاۃ، کلکتہ و دیگر علما و معززینِ کلکتہ کی جانب سے
مئی، جون ۱۸۵۹ء میں ڈیڑھ سو ممتاز مسلمانوں کے دستخط کے ساتھ، حکومت سے کی گئی اپیل۔
یا۔ جزیرۂ انڈمان سے ۹؍جنوری ۱۸۶۰ء کو علاّمہ خیرآبادی کی جانب سے وزیرِ ہند کو بھیجی گئی اپیل۔
ان اپیلوں کو مسترد کر دینا، انگریزی حُکّام کا ظلم اور ان کا گناہ ہے، جس کا ارتکاب اس طرح ہوتا رہا کہ
وزیرِ ہند کے نام، علاّمہ خیرآبادی کی بھیجی ہوئی اپیل، خیرآباد ڈویژن ہوتے ہوئے
چیف کمشنر اَوَدھ کے پاس پہنچ کر، مسترد ہوگئی اور چیف کمشنر اودھ نے رہائی کی شدید مخالفت کی۔
ہاں! علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کے صاحبزادگان، مولانا عبدالحق خیرآبادی و مولانا شمس الحق نے
علاّمہ خیرآبادی کے قریبی عزیز، خان بہادر، مفتی انعام اللہ، شہابی، گوپاموی کے داماد
خواجہ، غلام غوث بےخبر، میر منشی لیفٹیننٹ گورنر مغربی و شمالی کے توسّط سے رہائی کی سرگرم کوشش کی۔
اور یہ کوشش، کامیابی سے ہم کنار ہوگئی۔ جس کے، دو اسباب سمجھ میں آتے ہیں:
(۱) آخر میں شاید، انگریز حُکّام کو یہ خیال آیا کہ:
اب مولانا فضلِ حق خیرآبادی کی اس دنیا سے ہی رہائی ہونے والی ہے۔
(۲) جزیرۂ انڈمان کے ایک انگریز افسر نے
علاّمہ خیرآبادی کی علمی قابلیت دیکھ کر، ان کی رہائی کی سفارش کی تھی۔
نتیجہ و انجام کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبدالشاہد، شیروانی علی گڑھی لکھتے ہیں:
''سپرنٹنڈنٹ، ایک شریف انگریز تھا۔ مشرقی علوم سے واقف اور فنِ ہیئت کا بڑا ماہر تھا۔
اس کی پیشی میں ایک سزایافتہ مولوی تھے۔ اپنی ایک فارسی کی کتابِ ہیئت، ان کو دی کہ:
اس کی عبارت صحیح اور درست کر دیں۔''
مولوی صاحب سے تو کام نہ چلا۔ علاّمہ، نئے نئے گئے تھے۔ ایک ہی سال گذرا تھا۔
ان کی خدمت میں وہ کتاب پیش کر کے تصحیح کی گذارش کی۔
علاّمہ نے، نہ صرف عبارت، درست کی، بلکہ مباحث میں بہت کچھ اضافہ کر کے
حاشیہ پر بہت سی کتب کے حوالے لکھ دیے۔
جب یہ کتاب، وہ مولوی صاحب، سپرنٹنڈنٹ کے پاس لے گئے
تو وہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔ کہنے لگا: مولوی صاحب!

تم، بڑا لائق آدمی ہے، مگر، جن کتابوں کے حوالے دیے ہیں
اور ان کی عبارتیں نقل کی ہیں، یہاں، کہاں ہیں؟
مولوی صاحب مسکرائے اور اصل واقعہ، علاّمہ کا کہہ سنایا۔ وہ اسی وقت، مولوی صاحب کو لے کر
بیرک میں آیا۔ علاّمہ، موجود نہ تھے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد دیکھا کہ خستہ حالت میں چلے آ رہے ہیں۔
وہ یہ ہیئت دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ معذرت کے بعد، کلرکی میں لیا۔
اور گورنمنٹ میں سفارش بھی کی۔
ادھر، علاّمہ کے صاحبزادے، مولوی شمس الحق اور خواجہ، غلام غوث بےخبر، میر منشی لفٹنٹ مغربی و شمالی
صوبہ اَوَدھ، سرگرمِ سعی تھے۔ مولوی شمس الحق، جزیرۂ انڈمان، روانہ ہوگئے۔
وہاں (بحری) جہاز سے اُتر کے شہر میں گئے
تو ایک جنازہ پر نظر پڑی۔ اس کے ساتھ، بڑی تعداد میں لوگ تھے۔
عاشق کا جنازہ ہے، ذرا دھوم سے نکلے
دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل ۱۲؍صفر ۱۲۷۸ھ/مطابق ۱۸۶۱ء کو
علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کا انتقال ہوگیا ہے۔ یہ بھی بصد حسرت و یاس، شریکِ دفن ہوئے۔
اور بے نَیلِ مَرام، واپس ہوئے۔

قسمت کی بدنصیبی کہاں ٹوٹی ہے کمند
درچار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

افسوس! ہمیشہ کے لئے یہ آفتابِ علم و عمل، دیارِ غربت میں غروب ہوگیا۔
اب تک، مَرقدِ فضلِ حق، زیارت گاہ خاص و عام ہے۔
اور آج بھی آپ کی قبر و مزارِ پُرانوار سے بزبانِ حال، یہ آواز آ رہی ہے کہ:

تِلْكَ آثَارُنَا تَدُلُّ عَلَيْنَا
فَانْظُرُوا بَعْدَنَا إِلَى الْآثَارِ

(ص ۲۲۷ و ۲۲۸۔ **باغی ہندوستان**۔ طبعِ چہارم: المجمع الاسلامی، مبارک پور ضلع اعظم گڑھ۔
یوپی۔ ۱۹۸۵ء۔ طبعِ اول: مدینہ پریس، بجنور ۱۹۴۷ء۔ مع مقدمۂ مولانا ابوالکلام آزاد)
علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی کا، پروانۂ رہائی، اُس وقت، جزیرۂ انڈمان/کالا پانی پہنچا
جب کہ آپ، قیدِ فرنگ و قیدِ جسم، دونوں سے بیک وقت رہائی پا کر

اپنے ربِّ کریم وغفور ورحیم کی بارگاہ میں حاضر ہو چکے تھے۔

لیکن، جزیرۂ انڈمان میں آپ کے دو اصحابِ علم وفضل اسیرانِ ہند

مفتی مظہر کریم، دریابادی (متوفی اکتوبر ۱۸۷۳ء مدفون: آبائی قبرستان، دریاباد، اَوَدھ)

اور مفتی عنایت احمد، کاکوروی (متوفی ۱۴؍شوال ۱۲۷۹ھ/۱۷؍اپریل ۱۸۶۳ء۔ کاکوری)

خوش قسمتی سے کالا پانی کے آفت رَسیدہ جزیرہ سے رہائی پاکر اپنے اپنے وطن تشریف لائے۔

مفتی مظہر کریم، دریابادی (متوفی اکتوبر ۱۸۷۳ء) معروف اُردو ادیب وصحافی، مولانا عبد الماجد دریابادی (متوفی ۱۹۷۷ء) اور ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی (سرسید نگر، علی گڑھ۔ یوپی) کے حقیقی دادا تھے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی اپنے دادا کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ایک انگریز، ٹی، ایف، فینتھم نے ۱۸۵۸ء میں بنارس کے ایک پریس سے شاہجہاں پور میں انگریزی حکومت کے تسلُّط کے بعد، شاہجہاں پور میں ۱۸۵۷ء میں ہونے والے واقعات کی **ایک طویل داستان، انگریزی میں شائع کی اور اس میں مفتی صاحب کو بغاوت کا سرغنہ ٹھہرایا۔**

اور اسی کے ساتھ، مفتی صاحب کے اثر واقتدار کو، ہر جگہ تسلیم کیا۔

انگریزی تسلُّط کے بعد، مفتی صاحب کو گرفتار کیا گیا۔ اس نے ان پر، یہ الزام لگایا کہ:

انگریزی حکومت کے خلاف، جہاد کے فتویٰ پر مفتی صاحب کے دستخط ہیں۔

مفتی صاحب کو بغاوت کے الزام میں چودہ (۱۴) سال کی سزا، بہ عبور دریائے شور دی گئی۔

یعنی انھیں انڈمان بھیج دیا گیا۔ جہاں، ان کا ساتھ، مولانا فضلِ حق خیرآبادی اور مفتی عنایت احمد کاکوروی جیسے سالاروں کا دہا۔ اسیری کے دوران، مفتی صاحب نے علمی مشغلہ، جاری رکھا۔

اپریل ۱۸۵۹ء میں گورنمنٹ کی طرف سے یہ اِشتہار، شائع کیا گیا کہ:

مُفیدِ عام کتابوں کے ترجمے پر، اہلِ علم کو بشرطِ پسندِ حکومت، معقول انعام، نقد عطا ہوگا۔

مفتی عنایت احمد، کاکوروی صاحب نے تَقویمُ البُلدان کو لیا اور مفتی (مظہر کریم) صاحب نے مَراصِدُ الاِطّلاعِ فِی اسمَاءِ الاَمکِنۃِ وَالبِقاع (مصنّفہ: صفی عبدالمومن) کا اردو ترجمہ کیا۔

.....جب انعام کا وقت آیا، تو بجائے نقد رقم کے، رہائی کو پیش کیا گیا۔

چنانچہ، بقیہ میعادِ اسیری، معاف کردی گئی اور اپنے وطن، دریاباد (اَوَدھ) واپس آ گئے۔

اور خانہ نشین ہوگئے اور خاموشی کے ساتھ انھیں خدمات میں لگے رہے۔

انھوں نے ۱۴؍اکتوبر ۱۸۷۳ء کو، داعیِ اجل کو لبیک کہا اور آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

(ص ۹۶ و ۹۷۔ **انقلاب ۱۸۵۷ء نمبر**۔ ماہنامہ، نیا دور، لکھنؤ۔ شمارہ اپریل/مئی ۲۰۰۷ء)

سید خورشید مصطفیٰ رضوی لکھتے ہیں:

.........یکم مئی ۱۸۵۷ء کو مولوی مظہر کریم کے گھر (شاہجہاں پور) ایک خفیہ میٹنگ میں بتایا جاتا ہے کہ ہماری تحریک، ملک میں پھیلتی جا رہی ہے۔'' الخ

(ص ۴۶۔ **تاریخ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء**۔ مؤلّفہ: سید خورشید مصطفیٰ رضوی۔

مطبوعہ: رضا لائبریری، رام پور۔ یوپی۔ انڈیا)

''ان (مولوی سرفراز علی) کی اور مفتی مظہر کریم کی سربراہی میں عیدگاہ پر ایک بھاری اجتماع ہوا، جس میں انگریزی راج کے خاتمہ کی دُعا کی گئی۔''

(ص ۵۷۷۔ **تاریخ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء**۔ مؤلّفہ: سید خورشید مصطفیٰ رضوی)

مفتی عنایت احمد کاکوروی، تلمیذِ رشید، مولانا بزرگ علی، مارہروی (وصال ۱۲۶۲ھ/۱۸۵۴ء) شیخُ الحدیث، مدرسۂ جامع مسجد، علی گڑھ اور استاذِ شفیق، مولانا محمد لطفُ اللہ، علی گڑھی (وصال ۱۳۳۴ھ/ 1915ء) و مولانا سید حسین شاہ بخاری کے تھے۔

ان کے بارے میں ڈاکٹر مسعود انور، علوی، کاکوروی (شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) لکھتے ہیں:

''مفتی (عنایت احمد، کاکوروی) صاحب ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء کو

آگرہ کے صدرُ الصُّدور مقرر ہوئے۔ تقرُّری کا حکم نامہ بھی آ گیا۔

مگر، اسی اَثنا میں، غدر (۱۸۵۷ء) کا ہنگامہ شروع ہو گیا اور آپ، آگرہ نہ جا سکے۔

...بریلی (روہیل کھنڈ) میں بھی دیگر مقامات کی طرح، انگریزی حکومت کے خلاف علَمِ جہاد، بلند ہو گیا، جس کے سرکردہ رکن، نواب خان بہادر خاں تھے۔

جہاد کی موافقت میں فتوے دیے گئے۔

نواب موصوف کی حکومت کی مالی امداد کے لئے مفتی صاحب نے بھی فتویٰ دیا۔

جب، غدر (۱۸۵۷ء) کا ہنگامہ، فرو ہوا اور انگریزوں کا تسلُّط، قائم ہوا تو کاغذات میں مفتی صاحب کا فتویٰ، برآمد ہوا۔

اور اس جُرم میں آپ پر بھی بغاوت کا الزام لگا کر، حَبسِ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔''

(ص ۱۳۷۔ **۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور روہیل کھنڈ**۔ ماہنامہ، ضیاءِ وجیہ، رام پور۔ یوپی۔ انڈیا۔

شمارۂ خاص، جنوری وفروری ۲۰۱۱ء)

ڈاکٹر مسعود انور، علوی، کاکوروی، مزید لکھتے ہیں:

’تَقْوِیمُ الْبُلْدان‘ کے ترجمہ کے سلسلے میں خود فرماتے تھے کہ:

ایک روز، ہم چند لوگ (عُلما) بیٹھے ہوئے تھے کہ:

انگریز حاکم آیا اور ’’**تقویم البُلدان**‘‘ کے اردو ترجمہ کی فرمائش کی۔

مگر، ہر ایک نے بغیر کسی لُغت کی موجودگی کے، اس ترجمہ سے معذوری، ظاہر کی۔

میں نے بِسمِ اللہ پڑھ کر اس کو لے لیا اور ترجمہ، شروع کیا، جو بِحَمدِاللہ، دو سال میں مکمل ہوا۔

پوری کتاب میں صرف دو الفاظ ایسے ملے، جن کے معانی، مجھے معلوم نہ تھے۔‘‘ الخ (ص ۱۳۸۔ حوالۂ مذکورہ)

’’علاَّمہ فضلِ حق خیر آبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) کی دونوں تصانیف ’’اَلثَّورَۃ الہِندیۃ‘‘ اور ’’قَصائد فتنۃالہند‘‘ حضرت مفتی (عنایت احمد کاکوروی) صاحب کے ہی ذریعہ، علاَّمہ فضلِ حق خیر آبادی کے خلفُ الصدق، مولانا عبدالحق خیر آبادی (متوفی ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء) تک پہنچی تھیں۔‘‘

(ص ۱۳۸۔ حوالۂ مذکورہ)

’’ترجمۂ تقویم البلدان: اس کتاب کا سلیس اردو ترجمہ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ذکر گذر ہو چکا ہے، مفتی صاحب نے ترجمہ فرمایا **اور یہی ترجمہ، بظاہر آپ کی رہائی کا سبب بنا۔**

(ص ۱۴۰۔ **۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور رُوہیل کھنڈ**۔ ماہنامہ ضیاءِ وجیہ۔ رام پور، یو پی، انڈیا۔ شمارۂ خاص: جنوری و فروری ۲۰۱۱ء)

علاَّمہ فضلِ حق خیر آبادی کی علمی حیثیت کو دیکھتے ہوئے، یہ سمجھنا، بہت آسان ہے کہ:

مفتی عنایت احمد، کاکوروی و مفتی مظہر کریم، دریابادی کی طرح

کوئی علمی خدمت، آپ بھی اپنے ذِمَّہ لیتے اور مستحقِ انعام ہوتے۔

اور ممکن تھا کہ مفتی مظہر کریم، دریابادی اور مفتی عنایت احمد، کاکوروی کی طرح

جزیرۂ انڈمان سے رہائی پا کر اپنے وطن، واپس آجاتے۔

مگر، ایسا کیوں اور کس مصلحت، یا معذوری کے سبب نہ ہو سکا؟ اس کا علم، اللہ ہی کو ہے۔

رہائی کا اگرچہ، انگریز حاکم کی طرف سے اعلان نہیں تھا، مگر، انعام کا اعلان ہی آمادگی کے لئے کافی تھا

جو نعمتِ غیر مترقَّبہ کی شکل میں رہائی کا سبب بن کر سامنے آیا۔

یہاں، سِوا، اِس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے، جس ذریعہ سے جس کی رہائی، اللہ نے مقدَّر کی اس کے لئے وہی تدبیر اور وہی ذریعہ، مفید ہو کر ظہور پذیر ہوا۔

بیسویں صدی عیسوی کے رُبعِ اول میں جب کہ جنگِ عظیم اول (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) میں برطانیہ کو شکست ہوگئی اور اس کا آفتابِ اقبال، غروب ہونے لگا

تو برطانوی مقبوضہ ممالک میں برطانیہ مخالف تحریکات کی لہر اٹھنے لگی۔

ہمارے ہندوستان میں انگریزی سامراج کے قدم لڑکھڑانے لگے۔

مکر و فریب اور وعدہ خلافی و ظلم واستحصال کی جڑیں ہلنے اور اُکھڑنے لگیں۔

اس عہد وعصر میں بھی قبولِ الزام و انکارِ الزام کے متعدد معاملات و واقعات، پیش آئے۔ مثلاً:

مولانا معین الدین، اجمیری (وصال محرم ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء)

یگانۂ روزگار معقولی عالم، حکیم سید برکات احمد، ٹونکی (وصال ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء)

شاگردِ مولانا عبدالحق، خیر آبادی (وصال ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء)

فرزند علاَّمہ فضلِ حق، خیر آبادی (وصال ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) کے شاگردِ رشید تھے۔

تحریکِ آزادیِ ہند (از ۱۹۲۰ء تا ۱۹۴۷ء) کے دَوران، مولانا معین الدین، اجمیری (وصال ۱۹۴۰ء) کی ایک حکومت مخالف تقریر، در ۱۹۲۰ء کے خلاف، کورٹ میں مقدمہ، قائم ہوگیا۔

ساعتِ مقدمہ کے وقت آپ نے اپنے خلاف، عائد الزام کو قبول کرلیا۔

کیوں کہ وہ الزام محض الزام نہ تھا۔ اور مولانا اجمیری نے جرأت کے ساتھ

حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے، اپنے قول، یا فعل کا صراحۃً، اعتراف کرلیا۔

یہ الگ مسئلہ ہے کہ جنگِ آزادیِ ہند ۱۸۵۷ء اور تحریکِ آزادیِ ہند ۱۹۲۰ء تا ۱۹۴۷ء کے حالات میں زمین، آسمان کا فرق تھا۔ اب گولی، پھانسی، کالا پانی، وغیرہ کا دور گذر چکا تھا۔

انگریزی حکومت اپنی مخالفت و مزاحمت کے خلاف قدم اٹھاتے ہوئے

اپنے کسی مخالف ہندوستانی زَعیم و لیڈر کو، صرف اور صرف، چند ماہ، یا چند سال کی سزا دے سکتی تھی۔

گولی، پھانسی اور کالا پانی کا خطرہ، کوسوں دور ہو چکا تھا۔

ایسے حالات میں کوئی ’’سیاسی جُرم‘‘ کر کے کورٹ کے سامنے اس کا اعتراف کرلینا

ایک جُرأت مندانہ عمل، ضرور ہے

مگر، اس کا تقابل، ۱۸۵۷ء کے حالات و معاملات سے ہرگز نہیں کیا جاسکتا۔

علاوہ، ازیں، کوئی جُرم ہو، تو اس کے قبول واعتراف کی بات ہو سکتی ہے۔

اور جب عائد شدہ الزام، بے بنیاد ہو، تو ہر شخص، اس کا انکار کرے گا۔ نتیجہ، خواہ کچھ بھی ہو۔

اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا رُخ بھی ہے، جس کا ذکر
مولانا حسین احمد مدنی (متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) نے، مولانا محمود حسن، دیوبندی
معروف بہ ''شیخُ الھند'' (متوفی ۱۳۳۹ھ/نومبر ۱۹۲۰ء) کے سلسلے میں کیا ہے۔
پروفیسر محمد مسعود احمد، مجدّدی، مظہری (کراچی) فرزندِ مولانا مفتی مظہر اللہ، دہلوی
خطیب وامام شاہی مسجد، فتح پوری، دہلی نے، اس کا خلاصہ، اس طرح تحریر کیا ہے:

''مولوی محمود حسن، دیوبندی کو، جب حجاز سے گرفتار کر کے مصر لایا گیا
تو تفتیش کرنے والے ایک انگریز کے سوالات کے
جو جوابات آپ نے دیے اور جو مولوی حسین احمد نے نقل کیے ہیں، ان کا خلاصہ، یہ ہے:
(۱) ریشمی خطوط کے بارے میں مولانا (محمود حسن، دیوبندی) کو کچھ علم نہ تھا۔
(۲) حکومتِ برطانیہ کے خلاف، کسی سازش میں ملوّث نہ تھے۔
(۳) جمعیۃُ الانصار محض، مدرسہ دیوبند کے مقاصد کے لئے قائم کی گئی تھی۔
(۴) یہ الزام، بے بنیاد ہے کہ:
آپ، تُرکی، ایران، افغانستان کو متحد کر کے، ہندوستان پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔
اور اس طرح، اسلامی حکومت، قائم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔''
ص ۷۳ تا ۷۵۔ **سفر نامۂ شیخُ الھند**، از حسین احمد، مدنی، مطبوعہ: لاہور ۱۹۷۴ء۔
(ص ۱۴۰۔ **تحریکِ آزادیِ ہند اور اَلسَّوَادُالْاَعظم**۔
مؤلّفہ: پروفیسر محمد مسعود احمد، مجدّدی، مظہری (کراچی)۔ مطبوعہ: لاہور۔ فروری ۱۹۷۹ء)

مندرجہ بالا دونوں بیانات واعترافات اور گذشتہ صفحات میں مذکور و مسطور قدیم وجدید حقائق وحوالہ جات سے تاریخ کی گرد، صاف ہو چکی ہے۔ صداقت کا چہرہ نکھر چکا ہے۔ کھرے کھوٹے کا امتیاز واضح ہو گیا ہے۔ آئینۂ تاریخ میں علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی کا رُخِ روشن، آفتاب کی طرح جگمگا رہا ہے۔
اور ستاروں کی طرح آپ کی فکری قیادت اور آپ کے قائدانہ کردار کی عظمت و جمال کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ جن پر، ملک و ملّت کی روح، جذباتِ فراواں سے سرشار ہو کر
سلامِ عقیدت پیش کرتے ہوئے، زبانِ حال سے دعا گو ہے کہ:

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اور روحِ علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی و دیگر مجاہدین وقائدینِ جنگِ آزادی سے پیہم صدا آ رہی ہے کہ:

تِـلْكَ آثَارُنَا تَدُلُّ عَلَيْنَا
فَانْظُرُوْا بَعْدَ نَا اِلَى الْآثَارِ

''اے لوگو! یہ ہیں ہمارے نُقوشِ فکر و عمل، جن کی حفاظت کرنا، ہمارے بعد
تمہارا ہی فریضہ ہے۔ اس فریضہ کی نِگہ داشت میں کوئی کوتاہی، نہ کرنا۔''

ان عُلَما وقائدینِ دین و مِلّت و جاں نثارانِ ملک و وطن وشہیدانِ حریت و آزادی کے
نقوشِ فکر و عمل اور ان کا پیغامِ حرکت وانقلاب، ہماری حیاتِ قومی و ملّی کی
وہ متاعِ عزیز، ہمارے ماضی کا وہ قیمتی سرمایہ اور سُراغِ جادہ و منزل ہے
جس کی طرف، والہانہ پیش قدمی، جس کے تصور سے تازگی و توانائی، جس کے آثار و باقیات کا تحفظ
جس کا انفرادی و اجتماعی ذکر و بیان اور جس پر اعتماد وافتخار، ہمارا مشترکہ فریضہ ہے۔
اور اپنے اِن اکابر و اسلاف کے بارے میں ہم، بجا طور پر، یہ کہہ سکتے ہیں کہ:

اِن کا سایہ اک تجلّی، اِن کا نقشِ پا چراغ
یہ جدھر گذرے، اُدھر ہی روشنی ہوتی گئی

اس موضوع پر، مزید تفصیل وتحقیق کے لئے راقمِ سطور (یٰسین اختر مصباحی) کی مندرجہ ذیل کتابیں، ملاحظہ فرمائیں، جو دارُالقلم، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی کے علاوہ اردو مارکیٹ، مٹیا محل، دہلی کے سُنّی کتب خانوں سے حاصل کی جاسکتی ہیں:
(۱) **علاّمہ فضلِ حق، خیر آبادی اور انقلاب ۱۸۵۷ء** (۲) **قائدِ انقلاب ۱۸۵۷ء**۔
(۳) **۱۸۵۷ء! پس منظر و پیش منظر**۔ (۴) **انگریز نوازی کی حقیقت**۔
(۵) **عُلمائے اہلِ سنّت کی بصیرت وقیادت**۔

○○○

ہندوستان کی ڈیڑھ سو سالہ غلامی و آزادی کی یادگار

۱۸۵۷ء سے ۲۰۰۷ء تک

اپنی ترکیب وتدبیر، مکروحیلہ، سازش وکوشش، جنگ وجِدال، شَقاوت وقَساوت
خرید وفروخت اور غدر و بدعہدی کے ذریعہ
انگریز جب رفتہ رفتہ، متحدہ ہندوستان کی ساری ریاستوں پر قابض ومتصرِّف ہوگئے
اور عہدِ مغلیہ وحکومتِ آلِ تیمور کی آخری نشانی اور راجدھانی
سرزمینِ دہلی بھی پورے طور پر ان کے نرغے میں آگئی۔
اور حال یہ ہوگیا کہ ''سلطنتِ شاہِ عالم از دہلی تا پالَم'' کا ایک چھوٹا سا نمونہ، باقی رہ گیا
جس کے بعد، سمٹ سمٹا کر لال قلعہ تک، ساری مغل حکومت، محدود ہوگئی۔
تو ایک دن (۱۰ر مئی ۱۸۵۷ء) ناگاہ، میرٹھ سے ہندوستانی فوجیوں نے
عَلَمِ بغاوت، بلند کیا اور انگریزوں کی عافیت، تنگ کردی۔
مئی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف، ہندوستانی فوجیوں کے عَلَمِ بغاوت بلند کرنے
کے فوری سبب کی نشان دہی کرتے ہوئے، امامُ الحکمۃِ والکلام، قائدِ جنگِ آزادی
علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی (وصال ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء۔ در جزیرۂ انڈمان) تحریر فرماتے ہیں:
(عربی سے ترجمہ) '' انہوں نے ہندو لشکریوں کو، جو تعداد میں زیادہ تھے
گائے کی چربی اور مسلم سپاہیوں کو، جو تھوڑی تعداد میں تھے، سُور کی چربی چکھانے پر زور ڈالا۔
یہ شرمناک رَوِش دیکھ کر، ہندو مسلمانوں کے درمیان، اضطراب پیدا ہوگیا۔
اور اپنے اپنے مذہب واعتقاد کی حفاظت کی خاطر، ان کی اطاعت واِنقیاد سے منہ موڑ لیا۔

ان کے اس اضطراب نے خرمنِ امن پر چنگاری کا کام کیا۔
گروہِ نصاریٰ کا قتل، ڈاکہ زنی، ان کے سرداروں وسپہ سالاروں پر حملے، شروع ہوگئے۔
بعض ہندوستانی لشکری، حد سے تجاوز کر گئے۔ انہوں نے سنگ دلی اور شوریدہ سری کا
انتہائی مظاہرہ کیا۔ بچوں اور عورتوں کے قتل سے بھی دریغ، نہ کیا۔'' الخ۔
(ص ۳۳۔ ترجمہ **اَلثَّوْرَۃُ الْھِنْدِیَّۃ** ۔ مؤلّفہ: علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی (**باغی ہندوستان**۔
مترجم: مولانا عبدالشاہد، شیروانی۔ مطبوعہ: المجمع الاسلامی، مبارک پور ضلع، اعظم گڑھ، یوپی۔ انڈیا۔ ۱۹۸۵ء)
۱۸۵۷ء میں دہلی سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے دہلی تک، سیاسی انقلاب اور عسکری نقل وحرکت
وفوجی تصادم میں ہندوستانیوں نے اپنی زبردست توانائی جھونک دی تھی۔
یہ ایک عجیب ہنگامہ خیز اور خوں آشام دَور تھا۔ نصاریٰ یعنی انگریزوں اور ہندوستانیوں
کے درمیان، دہلی سے روہیل کھنڈ واَودھ و بہار تک، بِالخصوص، دہلی واطرافِ دہلی میں
ہونے والے خونیں معرکوں کا ذِکر اور ان کے انجام کی یاد دِلاتے ہوئے
قائدِ جنگِ آزادی، علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی لکھتے ہیں:
(عربی سے ترجمہ) ''پھر، نصاریٰ نے شہر (دہلی) کے گرد ونواح کے
رئیسوں اور سرداروں کو قتل کرنا اور ان کی جائداد، عمارتیں، مویشی، مال ومتاع
ہاتھی، گھوڑے، اونٹ اور ہتھیار، وغیرہ لوٹنا، شروع کیا۔
اسی پر، اِکتفا، نہ کیا، بلکہ ان کے اہل وعیال کو بھی قتل کرڈالا۔
حالاں کہ یہ سب، رعایا بن چکے تھے اور ڈر، یا لالچ سے فرماں بردار، بن ہی جاتے۔
ان نصاریٰ نے تمام راستوں پر چوکیاں بٹھادیں، تاکہ بھاگنے والوں کو پکڑ پکڑ کر
لایا جائے۔ ہزاروں بھاگنے والوں میں تھوڑے ہی بچ پائے، باقی سب پکڑے گئے۔
ان کے پاس، جو بھی سونا چاندی نکلتا، پہلے تو وہ چھین لیتے، پھر، چادر، تہبند، قمیص، پاجامہ
جو کچھ ہاتھ لگتا، اسے نہ چھوڑتے۔ اس کے بعد انھیں افسروں کے پاس پہنچادیتے۔
جو، اُن کے لئے قتل، یا پھانسی کی سزا کا فیصلہ کرتے۔
جوان، بوڑھے، شریف، رَذیل، سب کے ساتھ، یہی سلوک ہوتا رہا۔

اِس طرح، پھانسی پانے والے اور قتل ہونے والے ہندوستانیوں کی تعداد، کئی ہزار تک پہنچ گئی۔
ظالموں کے ظلم کا شکار، اکثر و بیشتر، مسلمان ہوئے۔

ہندوؤں میں سے، صرف، وہ مارے گئے، جن کے متعلق، دشمن و مُعانِد ہونے کا یقین تھا۔
اور مسلمانوں میں، صرف، وہ بچ سکے، جو کسی نہ کسی طرح اپنے گھر سے کوچ کر گئے۔
یا۔ وہ، جو نصاریٰ کے ناصِر اور اپنے دین میں کمزور
یا۔ جو، اُن کے جاسوس اور رحمتِ الٰہی سے مایوس ہو چکے تھے۔"

(ص۵۱۔ ترجمہ اَلثَّوْرَۃُ الْھِنْدِیۃ۔ بنام "**باغی ہندوستان**"۔ مطبوعہ: مبارک پور۔ ضلع اعظم گڑھ۔ یو پی)

دہلی اور مشرقی شہروں، دیہاتوں کی عام تباہی و بربادی کا ذکر کرتے ہوئے
علاّمہ فضلِ حق، خیر آبادی، اِس طرح، تحریر فرماتے ہیں:

(عربی سے ترجمہ)" ہزاروں عورتیں اپنے سرپرستوں، شوہروں، باپوں، بیٹوں اور بھائیوں سے جُدا کر دی گئیں۔
یہ ایسی مصیبت کا زمانہ تھا، جو اُس قیامت کا منظر پیش کر رہا تھا، جس دن، انسان اپنے بھائی، ماں، باپ، بیوی، اولاد، اہلِ خاندان سے دور بھاگتا نظر آئے گا۔
بہت سی سہاگن عورتیں، صبح سے شام ہوتے ہوتے، بیوہ بن گئیں۔
اور شب کو آغوشِ پدر میں سونے والے بچے، صبح کو یتیم ہو کر اُٹھے۔
بیشمار عورتیں اپنی اولاد، وغیرہ کے غم میں گریہ وزاری کرتی تھیں۔
اور مردوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا، جاری تھا۔
شہر، چٹیل میدان اور بے آب و گیاہ جنگل، بن گیا تھا۔
اور شہری، تباہ و برباد اور منتشر ہو گئے تھے۔
اس کے بعد، نصاریٰ کی توجہ، مشرقی شہروں اور دیہاتوں کی طرف، مبذول ہوئی۔
جہاں انھوں نے کافی ہنگامہ و فساد مچایا۔ قتل و غارت گری اور پھانسی کا بازار، گرم کر دیا۔
بے شمار مرد اور پردہ نشیں عورتیں، موت کے منہ میں چلی گئیں۔
اور سیکڑوں ہزاروں آدمی، موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔"

(ص۵۳۔ ترجمہ **اَلثَّوْرَۃُ الْھِنْدِیۃ۔ (باغی ہندوستان)** مؤلّفہ: علاّمہ خیر آبادی)

لکھنؤ اور اس کے اَطراف و جوانب میں نصاریٰ کے قتل و غارت گری کا ذکر کرتے ہوئے، علاّمہ خیر آبادی، رقم طراز ہیں:

(عربی سے ترجمہ)" یہ ایسی مُہلِک مصیبت، نازل ہوئی، جس نے شہروں کو میدان آزادوں کو غلام، مال داروں کو فقیر و مسکین اور شریفوں کو ذلیل و خوار کر دیا۔
وہ اپنے اہل و عیال میں آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہے تھے۔
خوش حال اور فارغُ البال تھے کہ انھیں مجبور ہو کر نکلنا پڑا۔
فقیری، تنگ دستی نے ہم عصروں کی مجالست، اور اضطراب و اضطرار نے برابر والوں کی رفاقت سے دور کر دیا۔ رونے والے، آہ و زاری، بیمار، فریاد و شیون کرتے۔
آرزومند، چلاّتے اور حسرت کشیدہ "اِنّا لِلّٰہ" پڑھتے۔
بچے، اپنی ماؤں کے سینے سے قبل از وقت، جدا کر دیے گئے۔ بوڑھے اور جوان حاجتوں کی تکمیل سے نا امید تھے۔ ان کا کوئی ٹھکانہ تھا، نہ ان کی بیماری کی کوئی دوا تھی۔"
الخ۔ (ص۶۳۔ ترجمہ **اَلثَّوْرَۃُ الْھِنْدِیۃ**)

(عربی سے ترجمہ) نصاریٰ، دارُ السَّلطنت (لکھنؤ) پر قبضہ کرنے کے بعد وہیں ڈٹے رہے۔ اَطراف و جوانب کی جانب، نہ نکلے۔
انہوں نے گرد و نواح کے غیر مسلموں، دیہاتیوں، کاشت کاروں کی تالیفِ قلب شروع کر دی۔ ان کی خطاؤں کو در گذر، ان کے خراج میں تخفیف اور تاوانوں میں کمی کی۔
اس مہربانی پر، وہ، مطیع و فرماں بردار اور معاون و مددگار بن گئے۔
ادھر سے مطمئن ہو کر، اَطرافِ ملک کے شہر و دیہات پر قبضہ کرنے کے لئے نصاریٰ، نکل کھڑے ہوئے۔" (ص۶۵۔ ترجمہ **اَلثَّوْرَۃُ الْھِنْدِیۃ**)

مجاہدِ حریت، مولانا سید شاہ احمد اللہ، مدراسی کو، راجہ جگن ناتھ کے بھائی، راجہ بلدیو سنگھ (پوائیں، شاہجہاں پور) نے کس طرح، فریب و دغا کر کے شہید کرایا؟
اس کا ذکر کرتے ہوئے علاّمہ خیر آبادی لکھتے ہیں: (آئندہ سطور میں عامل سے مراد

مولانا سید شاہ احمد اللہ، مدراسی اور زمیندار سے مراد، راجہ بلدیو سنگھ ہے۔)

(عربی سے ترجمہ) ''اس موقع پر نصاریٰ سے قتال کے لئے دوسری طرف کا ایک عامل اُٹھ کھڑا ہوا۔اس نے نیکی و خیرات و سعادت و حسنات کا کافی ذخیرہ اپنے اندر جمع کر لیا تھا۔
وہ بڑا ہی پاک طینت، صاف باطن، متقی، پرہیزگار، بہادر اور رسولِ ملاحم و نبیِ مَرا حم ﷺ کا ہم نام تھا۔اس نے نصاریٰ کے لشکر پر حملہ کر کے پہلے ہی حملے میں انہیں شکست دے دی۔
اپنی ساری کوشش، ختم کر کے نصاریٰ بھاگے۔اور قصبہ کے ایک ہندو کے مضبوط و محفوظ مکان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔اور نصرانی سرداروں و امیروں کے پاس، شہر میں پیغام بھیج کر مدد مانگی۔جنہوں نے بدعہدی کرنے والے منافقوں و دیہاتیوں پر مشتمل ایک لشکر اپنے محصور نصاریٰ کی مدد کے لئے بھیج دیا۔
ادھر، اِس نیک سرِشت بہادر عامل سے ایک دیہاتی غیر مسلم زمیندار نے بڑا داؤ کھیلا۔
اس نے قسمیں کھا کر اطمینان دلایا کہ جب دونوں جماعتیں، مقابلہ پر آجائیں گی
تو چار ہزار بہادروں کا گروہ لے کر میں مدد کے لئے پہنچوں گا۔
جب، مقابلہ کی نوبت آئی، تو اس زمیندار کی قسموں پر بھروسہ کر کے
اس دیانت دار عامل نے اپنے تھوڑے سے بہادروں کے ساتھ، دشمن پر حملہ کر دیا۔
نتیجہ یہ نکلا کہ سامنے سے بندوقوں و توپوں سے چہرہ و سینہ پر
نصاریٰ نے گولیاں برسائیں اور پیچھے سے اس غدّار مکّار زمیندار کی
جماعت نے پشت و سُرین کو نشانہ بنانا، شروع کیا۔
یہ زمیندار اور اس کے لوگ، درحقیقت، نصاریٰ کے اَعوان و اَنصار
اور شیطان کے بھائی بند تھے۔
وہ خدا پرست عامل، معرکہ میں گر کر شہید ہوا اور اس کی ساری جماعت نے بھی اسی کے نقشِ قدم پر چل کر، جامِ شہادت، نوش کیا۔'' (ص ۶۹۔ترجمہ **اَلثَّوْرَةُ الْهِنْدِيَة**)

اپنی گرفتاری و قید و بند اور حبسِ دَوام کے بارے میں علاّمہ خیرآبادی لکھتے ہیں:

(عربی سے ترجمہ) ''تھوڑے دن کے بعد، ایک حاکم نصرانی نے مجھے گھر سے بلا کر

قید کر دیا اور رنج و غم میں مبتلا و مقیّد کر کے دارُ السَّلطنت (لکھنؤ)
جو، دراصل، خانۂ ہلاکت تھا، وہاں بھیج دیا۔
میرا معاملہ، ایسے ظالم حاکم کے سپرد کر دیا، جو مظلوم پر رحم کرنا، جانتا ہی نہ تھا۔
اور میری چغلی، ایسے دو مرتد، جھگڑالو، تند خُو افراد نے کھائی، جو مجھ سے قرآنِ حکیم کی محکم آیت میں مجادلہ کر چکے تھے۔جس کا حکم، یہ تھا کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے۔
وہ دونوں، نصاریٰ کی مَوَدّت و محبت پر مُصِر تھے۔
انہوں نے مُرتد ہو کر، ایمان کو، کفر سے بدل دیا تھا۔
اس ظالم حاکم نے میری جلاوطنی اور عمر قید کا فیصلہ، صادر کر دیا اور میری کتابیں جائداد، مال و متاع، اہل و عیال کے رہنے کا مکان، غرض، ہر چیز پر، غاصبانہ قبضہ کر لیا۔''

(ص ۷۵۔ترجمہ **اَلثَّوْرَةُ الْهِنْدِيَة (باغی ہندوستان)** مطبوعہ: مبارک پور ۱۹۸۵ء)

(عربی سے ترجمہ) ''مکر و تلبیس سے نصاریٰ نے جب مجھے قید کر لیا
تو ایک قید خانہ سے دوسرے قید خانہ اور ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین میں منتقل کرنا، شروع کیا۔مصیبت پر مصیبت اور غم پر غم پہنچایا۔
میرا جوتا اور لباس تک اُتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنا دیے۔
نرم و بہتر بستر چھین کر، خراب، سخت اور تکلیف دِہ بچھونا، حوالہ کر دیا۔
گویا، اس پر کانٹے بچھا دیے گئے تھے۔یا۔دہکتی ہوئی چنگاریاں، ڈال دی گئی تھیں۔
میرے پاس، لوٹا، پیالہ اور کوئی برتن تک نہ چھوڑا۔بخل سے کام لے کر
ماش کی دال کھلائی اور گرم پانی پلایا۔ (ص ۷۷۔ترجمہ **اَلثَّوْرَةُ الْهِنْدِيَة**)

(عربی سے ترجمہ) ''پھر، تُرش رُو دشمن کے ظلم نے مجھے دریائے شور کے کنارے ایک بلند و مضبوط، ناموافق آب و ہوا والے پہاڑ (جزیرۂ انڈمان۔کالا پانی) پر پہنچا دیا جہاں، سورج، ہمیشہ، سر پر رہتا تھا۔اس میں دشوار گذار گھاٹیاں اور راہیں تھیں۔
جنھیں، دریائے شور (جزیرۂ انڈمان) کی موجیں، ڈھانپ لیتی تھیں۔''

(ص ۷۷۔ترجمہ **اَلثَّوْرَةُ الْهِنْدِيَة**)

(عربی سے ترجمہ) ''جب کوئی، ان (قیدیوں) میں سے مرجاتا ہے
تو نجس وناپاک خاک روب، جو درحقیقت، شیطانِ خنّاس، یا۔ دیو ہوتا ہے
اُس مُردہ کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا ہوا، غسل وکفن کے بغیر
اُس کے کپڑے اُتار کر، ریت کے تودے میں دبا دیتا ہے۔
اس کی قبر کھودی جاتی ہے نہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے۔
یہ کیسی عبرت ناک اور الَم انگیز کہانی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ:
اگر میت کے ساتھ، یہ برتاؤ نہ ہوتا، تو اِس جزیرہ (انڈمان) میں مرجانا
سب سے بڑی آرزو ہوتی اور اچانک موت، سب سے تسلی بخش چیز ہوتی۔
اور اگر، مسلمان کے نزدیک، خودکشی، مذہباً، ممنوع اور قیامت کے دن، عذاب وعقاب کا باعث، نہ ہوتی، تو کوئی مسلمان، یہاں مقید ومجبور بنا کر، ناقابلِ برداشت تکالیف، نہ دیا جاتا۔ اور ایسی مصیبتوں سے نجات پانا، اس کے لئے بڑا آسان ہوتا۔''

(ص ۹۷۔ ترجمہ **اَلثَّوْرَۃُ الْھِنْدِیۃ** مؤلّفہ: علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی۔ **باغی ہندوستان**۔
اردو ترجمہ از مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی۔ مطبوعہ: المجمع الاسلامی، مبارک پور ۱۹۸۵ء)

ہندوستانیوں کو، ان کے مذہب وتہذیب وتعلیم سے دور کر کے انھیں نصرانی اور ان کی زراعت وتجارت پر قبضہ جما کر اپنا مستقل محکوم و غلام بنانے کی انگریزوں نے جو حکمتِ عملی اپنائی، اس کے بارے میں علاّمہ خیرآبادی، اِس طرح اظہارِ خیال فرماتے ہیں:

(عربی سے ترجمہ) ''وہ برطانوی نصاریٰ، جن کے دل، ممالکِ ہند کے دیہات وبلاد پر قبضہ اور اس کے اَطراف واَکناف اور سرحدوں پر تسلُّط کے بعد
عداوت وکینہ سے بھر گئے تھے اور تمام معزّز سرداروں کو ذلیل وخوار کر کے
ان میں سے ایک کو بھی، اِس قابل نہ چھوڑا تھا کہ وہ سرتابی کی ہمت کر سکے۔
انہوں نے تمام باشندگانِ ہند کو، کیا امیر کیا غریب، چھوٹے بڑے، مقیم ومسافر شہری ودیہاتی، سب کو، نصرانی بنانے کی اسکیم بنائی۔
ان کا خیال تھا کہ ان ہندوستانیوں کو، نہ تو کوئی معاون ومددگار مل سکے گا

نہ اِنقیاد واِطاعت کے سوا، انہیں کسی سرتابی کی جرأت ہو سکے گی۔
یہ سب کچھ اِس لئے تھا کہ سب لوگ، انہیں کی طرح، ملحد وبے دین ہو کر
ایک ہی مِلّت (نصرانیت) پر جمع ہو جائیں۔
اور کوئی بھی ایک دوسرے سے ممتاز فرقہ نہ رہ سکے۔
انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ:
مذہبی بنیاد پر، حکمرانوں (نصاریٰ) سے ہندوستانی باشندوں کا اختلاف
قبضہ وتسلُّط کی راہ میں سنگِ گراں، ثابت ہوگا اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا۔
اس لئے پوری جاں فشانی اور تن دہی کے ساتھ، ہر ہندوستانی مذہب ومِلّت کو مٹانے کے لئے طرح طرح کے مکر وحیلہ سے کام لینا، شروع کیا۔
ان برطانوی نصاریٰ نے بچوں اور ناخواندہ ونافہم باشندوں کی تعلیم اور اپنی زبان ومذہب کو فروغ دینے کے لئے شہروں اور دیہاتوں میں اسکول، قائم کیے۔
اور پرانے علوم ومعارف اور مدارس ومکاتب کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی۔
دوسری ترکیب، یہ سوچی کہ مختلف طبقوں پر، اِس طرح، قابو پایا جائے کہ:
سرزمینِ ہند کے غلّہ کی پیداوار، کاشت کاروں سے لے کر، نقد دام، ادا کیے جائیں
اور ان کاشت کاروں کے لئے خرید وفروخت کا کوئی اختیار اور حق، نہ چھوڑا جائے۔
اِس طرح، بھاؤ کے گھٹانے بڑھانے اور منڈیوں تک
اَجناس، پہنچانے اور نہ پہنچانے کے، یہ برطانوی نصاریٰ، خود ہی ذِمّہ دار بن بیٹھیں۔
اس کا مقصد، اِس کے سِوا کچھ، نہ تھا کہ:
خَلقِ خدا، مجبور ومعذور ہو کر، ان کے قدموں میں آپڑے اور غلّہ وخوراک، نہ ملنے پر
ان نصاریٰ اور ان کے اَعوان واَنصار کے ہر حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے۔
ان ترکیبوں کے علاوہ، ان نصاریٰ کے دل میں اور بھی بہت سے فاسد عزائم چھپے ہوئے تھے۔ مثلاً: مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنا، شریف وپردہ نشین خواتین کا پردہ ختم کرانا نیز، دوسرے اَحکامِ دینِ مبین کو مٹانا۔ وَغَیر ذالک۔ (ص ۳۱۔ ترجمہ **اَلثَّوْرَۃُ الْھِنْدِیۃ**)

اَلثَّوْرَۃُ الْھِنْدِیۃ اور قصائد فتنۃ الْھِند کے مترجم اور **باغی ہندوستان**

(طبع اول مدینہ پریس، بجنور ۱۹۴۷ء) کے مؤلّف

مولانا عبدالشاہد، شیروانی علی گڑھی (وفات ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء) اِس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''عیسائی مشنریاں، مدارس، اسپتال اور دوسرے پبلک اداروں سے
مذہبی اشاعت، اپنا فرضِ منصبی سمجھ رہی تھیں۔

مذہبِ اسلام پر خصوصیت سے نظرِ توجہ تھی۔ پادری فنڈر اور مولانا رحمت اللہ، کیرانوی وڈاکٹر وزیر خاں، اکبر آبادی، وغیرھُم کے مناظروں سے ہلچل مچی ہوئی تھی۔

عوام کو خیال ہونے لگا تھا کہ حکومت تو گئی ہے، اب مذہب پر بھی ہاتھ، صاف کیا جارہا ہے۔

ہندوستانیوں کی اصل متاع، مذہب ہی ہے۔

یہ تمام نقصان اور مصیبتیں، برداشت کر سکتے ہیں، لیکن، مذہب پر آنچ نہیں آنے دیتے۔

سر سید احمد خاں (متوفی مارچ ۱۸۹۸ء) ''**اسبابِ بغاوتِ ہند**'' میں لکھتے ہیں:

۱۸۵۴ء میں کلکتہ سے پادری صاحب، ای ایڈمنڈ نے
تمام سرکاری ہندوستانی عہدہ داروں کے نام، گشتی چٹھی بھیجی تھی کہ:

برٹش راج میں تمام ہندوستان میں ایک عمل داری ہوگئی ہے۔ تار برقی سے سب جگہ ایک خبر ہوگئی۔ ریلوے، سڑک سے، سب جگہ، آمد ورفت ایک ہوگئی۔

مذہب بھی ایک چاہیے۔ اِس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی، ایک مذہب ہوجاؤ۔''

(ص ۲۱۲، ۲۱۳۔ باغی ہندوستان۔ مطبوعہ: المجمع الاسلامی مبارک پور)

مولانا عبدالشاہد، شیروانی نے علاّمہ خیر آبادی کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میرٹھ سے دہلی پر ''**باغی فوج**'' نے ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو حملہ کر دیا۔ قتل وغارت گری کا بازار، گرم ہوا۔ بادشاہِ دہلی، سرگرمی کا مرکز بنے۔ علاّمہ خیر آبادی، شریکِ مشورہ رہے۔

منشی جیون لال اپنے روز نامچہ میں لکھتے ہیں:

۱۶ر اگست ۱۸۵۷ء: مولوی فضلِ حق، شریکِ دربار ہوئے۔

انہوں نے اشرفی، نذر پیش کی اور صورتِ حال سے متعلق، بادشاہ سے گفتگو کی۔

۲ر ستمبر ۱۸۵۷ء: بادشاہ، دربارِ عام میں تشریف فرما ہوئے۔

مرزا الٰہی بخش، مولوی فضلِ حق، میر سعید علی خاں اور حکیم عبدالحق، آداب بجالائے۔

۶ر ستمبر ۱۸۵۷ء: مولوی فضلِ حق نے اطلاع دی کہ:

متھرا کی فوج، آگرہ چلی گئی ہے اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد، شہر پر حملہ کر رہی ہے۔

۷ر ستمبر ۱۸۵۷ء: بادشاہ، دربارِ خاص میں رہے۔ حکیم عبدالحق، میر سعید علی خاں مولوی فضلِ حق، بدرالدین خاں اور دیگر تمام اُمَرَ اور رُؤسا، شریکِ دربار رہے۔

(''**غدر کی صبح وشام**''۔ روز نامچہ منشی جیون لال۔ ص ۲۱۴۔ باغی ہندوستان۔ مطبوعہ مبارک پور)

''علاّمہ (فضلِ حق) سے، جنرل بخت خاں ملنے پہنچے۔ مشورہ کے بعد، علاّمہ نے آخری تیر، ترکش سے نکالا۔ بعد نمازِ جمعہ، جامع مسجد (دہلی) میں عُلما کے سامنے، تقریر کی۔

اِستفتا، پیش کیا۔ مفتی صدرُالدین، آزردہ، صدر الصُّدور دہلی، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد، بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں، اکبر آبادی، سید مبارک شاہ رام پوری نے دستخط کیے۔ اِس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی ملک میں شورش بڑھ گئی۔

دہلی میں نوے ہزار سپاہ، جمع ہوگئی۔''

(**تاریخ ذکاءاللہ**۔ بحوالہ ص ۲۱۵۔ **باغی ہندوستان**۔ مطبوعہ: مبارک پور)

''مولوی فضلِ حق کی اِشتعال انگیزیوں سے متأثر ہوکر
شہزادے بھی میدان میں نکل آئے ہیں۔'' (**اخبار دہلی**۔ رپورٹ تُراب علی)

''مولوی فضلِ حق اپنے مواعظ سے عوام کو مسلسل بھڑکا رہے ہیں۔

(**اخبار دہلی**۔ ص ۲۷۳۔ فائل ۱۲۷۔ رپورٹ چنی لال)

''بادشاہ نے، جنرل بخت خاں، مولوی سرفراز علی اور مولوی فضلِ حق پر مشتمل ''**کِنگ کونسل**'' بنائی۔'' (دی گریٹ ریولیوشن آف ۱۸۵۷ء۔ ص ۱۸۲۔ ۱۸۱۔ وص ۱۸۳)

حکیم احسنُ اللہ خاں اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

''دوسرے روز، مولوی فضلِ حق آئے اور نذر، پیش کی۔

وہ، باغی فوج کی بڑے زور وشور سے تعریف کر رہے تھے۔

انہوں نے بادشاہ سے کہا کہ اب، وقت کا تقاضا ہے کہ:
باغیوں کو رقم اور سامانِ رسد کی مدد پہنچائی جائے، تا کہ انہیں کچھ سہارا ہو۔
(ص ۲۲۔ **یادداشت حکیم احسن اللہ خاں**۔ مرتّبہ: سید معین الحق۔ مطبوعہ کراچی)

مدرسہ عالیہ، کلکتہ کے صدر مدرس، مولانا عبدالحق خیر آبادی (وفات ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء)
فرزندِ علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی کے متعلق، مشہور انگریز مصنف، ڈاکٹر ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر
اپنی کتاب ''**ہمارے ہندوستانی مسلمان**'' میں لکھتا ہے:
''موجودہ ہیڈ مولوی، اُس عالمِ دین کے لڑکے ہیں، جن کو ۱۸۵۷ء کے غدر نے
نمایاں کر دیا تھا اور جنھوں نے اپنے جُرموں کا خمیازہ، اِس طرح بھگتا تھا کہ:
بحرِ ہند کے ایک جزیرے میں تمام عمر کے لئے جلاوطن کر دیے گئے۔
اس غدّار عالمِ دین کا کتب خانہ، جس کو حکومت نے ضبط کر لیا تھا
اب، کلکتہ کالج میں موجود ہے۔''
(ص ۲۰۲ و ۲۰۳۔ ''**ہمارے ہندوستانی مسلمان**'' از ڈاکٹر ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر۔
مطبوعہ: اَلکتاب انٹرنیشنل، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵)

علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی کو، اُن کی انقلابی سرگرمیوں کی پاداش میں ۳۰؍ جنوری ۱۸۵۹ء
گرفتار کر کے لکھنؤ میں قید کیا گیا۔
۲۱؍ فروری ۱۸۵۹ء میں کیپٹن ایف اے وی تھربرن کے کورٹ میں مقدمہ، شروع ہوا۔
جسے بعد میں جوڈیشیل کمشنر اَوَدھ، مسٹر جارج کیمبل کی کورٹ میں منتقل کر دیا گیا۔
۴؍ مارچ ۱۸۵۹ء کو، کورٹ نے علاّمہ خیر آبادی کو مجرم قرار دیتے ہوئے
جو فیصلہ سنایا، اُس کا خلاصہ یہ ہے:
(۱) ۱۸۵۷ء و ۱۸۵۸ء میں بغاوت کی سازش کی۔
اور ایسے اصولوں کی اشاعت کی، جن سے قتل کے امکانات پیدا ہوئے۔
۴؍ مارچ کو مجرم کو عمر قید بعبورِ دریائے شور، بحیثیت قیدی سرکارِ انگلشیہ
اور ضبطیِ جائداد کی سزا دی گئی۔ لکھنؤ۔ ۴؍ مارچ ۱۸۵۹ء۔

جن حالات اور جن مصائب و نتائج سے علاّمہ خیر آبادی، دو چار رہوئے
وہ اُس عہدِ خوں چکاں کے عُلما و اکابر کے لئے عام تھے اور بے شمار عُلما و اُمرا و رؤسا کو
برطانوی سامراج کی لرزہ خیز چیرہ دستیوں اور انسانیت سوز مظالم کا شکار ہونا پڑا۔
مولانا عبدالشاہد، شیروانی، علی گڑھی لکھتے ہیں:
''مولانا فضلِ امام خیر آبادی، صدرُ الصُّدور دہلی، مفتی صدرُ الدین، آزردہ، صدرُ الصُّدور
دہلی، مفتی عنایت احمد، کاکوروی، منصف و صدر امین کول و بریلی، مولانا فضلِ رسول، بدایونی
سرشتہ دار کلکٹری صدر دفتر سہسوان، مفتی انعام اللہ، گوپامئوی، قاضی دہلی و سرکاری وکیل الہ آباد
مولانا مفتی لطف اللہ، علی گڑھی، سرشتہ دار صدر امین بریلی
علاّمہ فضلِ حق، خیر آبادی، سرشتہ دار ریزیڈنسی دہلی و صدرُ الصُّدور لکھنؤ و مہتمم حضور تحصیل اَوَدھ
مولانا غلام قادر، گوپامئوی، ناظرِ سرشتہ دار عدالتِ دیوانی و تحصیل دارِ گوڑگاواں
قاضی فیض اللہ، کشمیری، سررِشتہ دار صدرُ الصُّدور، دہلی۔ وغیرھُم۔
یہ سب اپنے وقت کے بے نظیر و عدیم المثال اکابر عُلما تھے۔
حکومت کی باگ ڈور، انہیں کے ہاتھ میں تھی۔
مسلمانوں کی سلطنت کی بربادی، ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔
موقع کا انتظار تھا۔ ۱۸۵۷ء کا وقت آیا، تو سب میں پیش پیش، یہی حضرات تھے۔
والیانِ ریاست وَ اراکینِ دولت میں ناقوسِ حریت پھونکنے والے، یہی تھے۔
عوام کو ابھارنا اور فتوائے جہاد، جاری کرنا، انہیں کا، کام تھا۔
انقلابِ ۱۸۵۷ء کے بعد، سب سے زیادہ مصائب اٹھانے والے
اور آتشِ حریت میں جلنے والے، یہی شمعِ شبستانِ آزادی کے پروانے تھے۔
انگریز نے، ان کو جانا پہچانا، ایک ایک کر کے تمام عہدوں سے
اس طبقہ کو، سبک دوش اور اس گروہ کے خلاف، پورا محاذ، قائم کیا۔
(ص ۲۳۶۔ **باغی ہندوستان**۔ مطبوعہ: المجمع الاسلامی مبارک پور)

برطانوی ظالموں نے انقلابِ ۱۸۵۷ء کے بعد، شہزادہ فیروز شاہ، قاضی فیض اللہ، کشمیری

سرشتہ دار صدر الصُّدور دہلی، امام بخش صہبائی، میر پنجہ کش، خوش نویس، نواب مظفر الدّولہ
نواب عبد الرحمٰن خاں، والیِ جھجر، نواب اکبر خاں بن فیض اللہ خاں بنگش
جیسے، نہ جانے کتنے معزّز عُلما واُمرَا کو تختۂ دار پر لٹکا دیا۔ یا۔ انہیں گولیوں سے بھون ڈالا۔
نہ جانے کتنے اَعیان واُمرَا، دہلی چھوڑ کر، دربدر، ٹھوکریں کھاتے رہے۔
سید اسمٰعیل حسین، منیرؔ شکوہ آبادی، مولانا مفتی عنایت احمد، کاکوروی، مفتی مظہر کریم، دریابادی
جیسے مشہور عُلما کو بغاوت کے جرم میں جزیرۂ انڈمان (کالا پانی) کے حبسِ دَوام کی سزا ہوئی۔
مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی، مفتی صدرُ الدین، آزردہ، دہلوی، مولانا سید کفایت علی
کافیؔ، مرادآبادی، مولانا رحمت اللہ، کیرانوی، مولانا وزیر خاں، اکبرآبادی، سید احمد اللہ شاہ
مدراسی، جنرل بخت خاں، منشی رسول بخش، کاکوروی، مفتی عنایت احمد، کاکوروی، مولانا وہاج الدین
مرادآبادی، مولانا امام بخش، صہبائی، دہلوی، وغیرھُم کی سرگرمیاں وجاں فشانیاں
اوران کی قربانیاں، دہلی سے لکھنؤ اور جزیرۂ انڈمان تک پھیلی ہوئی ہیں۔

۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے تقریباً، بائیس ہزار علما کو شہید کیا گیا۔
اور صرف ایک ہفتہ کے اندر، دہلی میں ستائیس ہزار مسلمان، شہید کیے گئے۔

حضرت علاّمہ فضلِ رسول، عثمانی، بدایونی کے حقیقی بھانجے، حضرت مولانا فیض احمد
بدایونی (ولادت ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء۔ وفات نامعلوم) کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے بارے میں
مشہور مصنف ومؤرخ، مولانا سید محمد میاں، دیوبندی لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر وزیر خاں، جنرل بخت خاں کے مُشیرِ خاص کی حیثیت سے کام کرنے لگے
اور مولانا فیض احمد صاحب، مرزا مغل کے پیش کار، مقرر ہوئے۔
مختلف معرکوں میں آپ نے شرکت فرمائی۔
۱۹؍ستمبر ۱۸۵۷ء کو، جب، جنرل بخت خاں نے دہلی سے کوچ کیا
تو مولانا فیض احمد صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں، جنرل بخت خاں کے ساتھ تھے۔
اس وقت، لکھنؤ میں معرکۂ کارزار، گرم تھا۔ مولانا شاہ احمدُ اللہ صاحب
دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ یہ مولانا فیض احمد صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں، لکھنؤ پہنچے۔

اور تمام اہم معرکوں میں احمد اللہ شاہ صاحب کے ساتھ رہے۔
سقوطِ لکھنؤ کے بعد، سب کا اجتماع، شاہجہاں پور میں ہوا۔
اور یہاں چند ماہ تک، سخت معرکے ہوتے رہے۔
اسی اثنا میں مولانا فیض احمد صاحب، بدایوں پہنچے۔ ڈاکٹر وزیر خاں آپ کے ساتھ تھے
اور شہزادہ، فیروز شاہ بھی بدایوں پہنچ چکے تھے۔
بدایوں کے معرکہ میں ان مجاہدین نے حصہ لیا۔ ککرالہ (بدایوں) کے معرکہ میں
قیادت کا فریضہ، انجام دیا۔ پھر، جب، یہاں بھی ناکامی ہوئی
تو، قصبہ محمدی (شاہجہاں پور) پہنچے، جہاں، مولانا شاہ احمد اللہ صاحب نے حکومت، قائم کی تھی۔
یہ دونوں بزرگ (مولانا فیض احمد ومولانا احمد اللہ شاہ) مولانا کی وزارت میں شامل ہوئے۔
مولانا شاہ احمدُ اللہ کی شہادت کے بعد، (مولانا فیض احمد، بدایونی) ایسے روپوش ہوئے
کہ آپ کے ماموں، مولانا فضلِ رسول نے آپ کی تلاش میں قسطنطنیہ تک سفر کیا۔
مگر، کہیں، سُراغ نہ لگ سکا۔ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔
(ص ۳۶۲۔ جلدِ چہارم۔ **عُلمائے ہند کا شاندار ماضی**۔ مؤلّفہ: سید محمد میاں، دیوبندی۔
مطبوعہ: کتابستان، گلی قاسم جان، دہلی ۶)

انقلابِ ۱۸۵۷ء میں عام طور سے ہندو عوام وخواص کے اندر، انگریز مخالف جذبہ، کم تھا
اور مسلمانوں جیسا جوش وخروش، ان کے اندر، نہیں تھا۔
تاہم، سبھی ہندو، اِس انقلاب سے بالکل بے تعلق، نہیں رہے۔
نانا راؤ پیشوا، جھانسی کی رانی لکشمی بائی، راجہ ناہر سنگھ، رام کنور سنگھ، راؤ تلا رام، منگل پانڈے
تانتیا ٹوپے، جیسے بہادروں اور جیالوں کا نام، تاریخِ انقلاب کے صفحات پہ درج اور ثبت ہے۔
اختلافِ مذہب کے باوجود، ہندوستان سبھی ہندوستانی ہندوؤں اور مسلمانوں کا
مشترکہ وطن ہے اور ملکی مفادات اور وطن دوستی کے تعلق سے
ان کے جذبات، عموماً، ہم آہنگ اور ایک جیسے ہیں۔ اپنے ملک ووطن کی تشکیل وتعمیر
تحفظ ودفاع، ترقی واستحکام، شہرت ونیک نامی، سارے اہلِ وطن کا مطمحِ نظر ہوا کرتا ہے۔

مفاہمت ومصالحت، اتحاد واتفاق، اِدغام واِنضمام کے مسائل ومَراحل
البتہ، مشکل اور سنگین نوعیت کے ہوتے ہیں۔ مفاہمتی طرز وطریق میں اپنے تشخُّص
وشناخت کے ساتھ، احتیاط واِعتدال اور حکمت وبصیرت کی سخت ضرورت، پیش آتی ہے۔
اختلاف، یا۔ ہم آہنگی کے سلسلے میں بہت سے سوالات، ماضی میں بار بار اٹھتے رہے ہیں
اور اب بھی ان کا سلسلہ، جاری ہے۔ لوگ، عموماً، اِفراط وتفریط کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔
اس لئے سلسلۂ خیرآباد کے استاذُ الاساتذہ، حضرت مولانا ہدایت اللہ، جون پوری
(وصال رمضان ۱۳۲۶ھ/ستمبر ۱۹۰۸ء) شاگردِ علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی کے خصوصی
اور عزیز شاگرد، حضرت مولانا سید سلیمان اشرف، صدر شعبۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ (وصال ربیع الاول ۱۳۵۸ھ/اپریل ۱۹۳۹ء) کا ایک بہت ہی جامع ومانع ہدایت نامہ
یہاں، درج کردینا ضروری سمجھتا ہوں، جو آپ کی کتاب ''**اَلرَّشاد**'' مطبوعہ ۱۳۳۹ھ/
۱۹۲۰ء۔ مطبع انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ میں
''**اَنواعِ اتحاد واختلاف**'' کے ذیلی عنوان کے تحت، اِس طرح، مرقوم ہے:
''اِتحاد واتفاق، یا عناد واختلاف کی دو قسمیں ہیں: ایک: عرضی اور دوسری: ذاتی۔
یعنی، ایک شے، جب دوسری شے کی مخالف ہوگی
تو اس کی عِلّت، یا کوئی امرِ خارجی ہوگا، یا ذاتی۔ اب جس جگہ، دونوں کی حقیقت
اور قوام ذات میں اتفاق ہو، اور پھر، دونوں میں اختلاف پایا جائے
تو، منشأ اختلاف کوئی ایسا امر ہوگا
جو حقیقتِ ذات سے خارج ہے اور اسے عارض ہے۔ اسی کو اختلافِ عرضی کہتے ہیں۔
ایسے دو مختلف فیہ موجود میں اتفاق کی صورت، یہ ہے کہ:
وہ امرِ خارج، جو اسے عارض ہے، زائل ہو جائے، یا۔ زائل کردیا جائے۔
جوں ہی امرِ خارج کا اِندفاع ہوگا، ذاتی اتفاق، ایک دوسرے کو متحد بنالے گا۔
لیکن، اگر، دو چیزوں میں اختلاف، باعتبارِ ذات اور قوامِ حقیقت پایا جاتا ہے
تو جب تک، ان دونوں کی ذات، قائم ہے، اس اختلاف کا مٹنا، ناممکن ہے۔

دو متغایر فی الذات، کبھی اپنی حقیقت اور لوازِم میں متحد ومتفق نہیں ہو سکتے۔
تضاد وتغایُر ذاتی کا یہی اِقتضا ہے۔
ہاں! ان دونوں کا اتحاد، اگر ہوگا بھی، تو منشا اس کا، ذات نہ ہوگی، بلکہ کوئی امر خارج از ذات
ہوگا۔ جب تک، وہ امرِ خارج، ان دونوں میں موجود ہے، دونوں، متحد ومتفق ہیں۔
اور جہاں، وہ خارج، زائل ہوا، یا۔ زائل کیا گیا
پھر، ذات اپنی مقتضیات ولوازِم کی طرف، رجوع کرجائے گی۔
غرض، اِختلافِ عرضی میں اس امرِ خارج اور عارض کا زوال، اتفاق کا موجب ہے۔
اور اختلافِ ذاتی میں اس امرِ خارج اور عارض کا بقا، اتفاق کا موجب ہے۔
روزمرّہ کے معمولات اور عادتوں میں اگر لحاظ کیا جائے
تو، اس اصول کی ہمہ گیری اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔''
(ص ۶ تا ۸۔ اَلرَّشاد۔ از مولانا سید سلیمان اشرف۔
طبع دوم ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء۔ لاہور۔ عکسِ طبع اول۔ علی گڑھ۔ ۱۹۲۰ء)
''غرض، لُحُوقِ عوارض کے وقت
ذات اور لوازمِ ذات کے مُقتضیات سے اِعراض وچشم پوشی، نہ چاہیے۔
جو حالت، کسی عارض کے سبب سے پیدا ہو جائے
اس پر اعتماد واطمینان، یا۔ یاس وناامیدی، سزاوار نہیں۔'' (ص ۷۔ **اَلرَّشاد**)
''اگرچہ، مسلمان اور ہندو میں مذہبی تغایُر وتبایُن سہی
لیکن، خارجی اُمور یعنی حالاتِ مُلکی میں اتحاد، ممکن ومفید۔
مُلکی وتمدنی معاملات میں اتفاق، نہ گناہ، نہ اس میں کوئی حرج۔'' (ص ۷۔ **اَلرَّشاد**)
''اتحاد، امرِ خارج میں ہونا چاہیے۔ ذاتیات میں نہ اتحاد ہو سکتا ہے نہ ہونا چاہیے۔
اور نہ ایسا اتحاد، مفید ہے۔ مَابِہِ الْاِشْتِرَاك اور مَابِہِ الْاِمْتِیَاز کا
فرق اٹھا دینا، اپنی ہستی پر اپنے ہاتھوں، تیر چلانا ہے۔
اگر، اس شعبہ میں، جس کا نفع ونقصان، دونوں قوموں کے حق میں مساوی ہے۔

اور جسے، مَابِہٖ الْاِشْتِرَاک سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، متفق نہ ہونا
کوئی غلطی ہے تو اس حصہ میں، جو ایک قوم کو قوم بناتی ہے
اتحاد کی کوشش، قومیت کا نیست و نابود کرنا ہے۔
اِشتراک و اِمتیاز کی سرحدوں کو نمایاں رکھنا، اپنی قومی ہستی کو قائم و باقی رکھنا ہے۔
نیز، اس امتیاز کا، کافی اور کامل لحاظ رکھتے ہوئے، جو بنیاد، اتفاق کی ڈالی جائے گی
وہ بہت زیادہ مستحکم واُستوار ہوگی، اُس بنیاد سے
جس میں امتیاز واشتراک کی باہم آمیزش کردی گئی ہو۔
فرض کیجیے کہ ایک مکان ہے، جس کے دو حقیقی بھائی، وارث ہیں۔ انہیں کی ملکیت ہے۔
انہیں کا اس میں رہنا بسنا ہے۔ ایک بھائی، طبیب ہے اور دوسرا وکیل۔
ہر روز، جب صبح ہوتی ہے، طبیب اپنے مَطب میں بیٹھ کر مریضوں کو دیکھتا ہے
امراض کے نسخے لکھتا ہے اور دوا اور پرہیز کی ہدایتیں دیتا ہے۔
دوسرا بھائی، اسی مکان کے دوسرے حصے میں بیٹھا ہوا
اپنے فن کی خدمت میں مصروفِ عمل ہے۔ متخاصمین (فریقین) کے کاغذات دیکھتا ہے
دعویٰ اور ثبوت میں نظر کرتا ہے اور قانون کے دفعات کی تطبیق کرتا ہے۔
اگرچہ، علم وفن اور طریقِ کسب، دونوں کے غیر ہیں۔
لیکن، اَدائے حقوقِ برادرانہ میں کوئی فروگذاشت نہیں ہونے پاتی۔
اب، بھائیوں میں مشورہ ہوتا ہے کہ:
جب، ماں باپ، ہم دونوں کے ایک، ہم دونوں کا خاندان اور سلسلۂ نسب ونسل ایک
ہم دونوں کی سکونت کا مکان ایک، آسایش کی جگہ، ایک
باوجود اِس قدر اُمورِ مشترکہ اور متفقہ، پھر، یہ اختلافِ پیشہ کیسا؟
ایک کے شغل وفن سے دوسرا بے نیاز اور بے تعلق کیوں ہو؟
اِس سے بوئے بیگانگی آتی ہے اور تخالُف کی بھنک پائی جاتی ہے۔
آیندہ سے ہم دونوں، بلا تخصیص، ایک دوسرے کے خصوصی پیشہ میں شریک رہیں۔

اِس قرارداد کے بعد، مریضوں کا نسخہ، وکیل صاحب، تحریر فرماتے ہیں۔
اور اہلِ مقدمہ کے مرافعے کی خبرگیری وپیشی، حکیم صاحب کرتے ہیں۔
بھائیوں کے اِس اتحاد واتفاق سے
جو حالت، اُس مریض کی ہوگی اور جو نتیجہ، اُس مقدمہ کا ہوگا، وہ ظاہر ہے۔
کیا، یہ قرارداد ومفاہمہ، ان کے اتحاد کو مضبوط بنائے گا؟
یا۔ اتفاق واتحاد کی بنیاد، متزلزل کردے گا؟
عقل کا اِقتضا، یہ ہے کہ:
شکست وریخت کی نگرانی، مکان کا استحکام، اس کی وُسعت، اس کی آرائش
اس میں دونوں بھائیوں کو شریک رہنا چاہیے۔
ورنہ مکان، تباہ ہوجائے گا، اس پر، ویرانی چھا جائے گی۔
یا۔ اگر کوئی دوسرا، اُس پر دعویٰ کرے، یا قبضہ کرنا چاہے
تو انہیں، قوتِ متفقہ سے مدافعت کرنا، ضرور ہے، ورنہ دونوں کی ملکیت جاتی رہے گی۔
لیکن، جب، ان کے خصوصی عمل کا وقت آئے
تو اس میں اگر ایک دوسرے کا مُشیر ہوا، یا شریک بنا، تو پھر، یہ بھی تباہی ہے۔
یہی حال، ملکِ ہندوستان اور تمام قومِ ہنود اور قومِ مسلم کا ہے۔
ہندوستان، ایک ایسا ملک ہے، جس میں ہندو اور مسلم، دونوں، برابر کے شریک ہیں۔
ایسے سارے معاملات، جن کا ہندوستان کی صلاح وفلاح سے تعلق ہے
اس میں دونوں کو، متفق اللّسان وَ ہم زبان، ہونا چاہیے۔
مدافعتِ آفات میں دونوں قوموں کے بازُو
بلا امتیازِ قومیت، ہمدردانہ ومساویانہ معاضدت سے ساعی ہوں۔
لیکن، خصوصیاتِ مذہبی میں، ایک کا، دوسرے سے بالکل علاحدہ اور بے تعلق رہنماہی، اولیٰ ہے۔"
(ص ۸ تا ص ۱۰۔ **الرَّشاد**۔ مؤلّفہ: مولانا سید سلیمان اشرف۔ مطبوعہ: علی گڑھ۔ ۱۹۲۰ء)
بہرحال! ہندوستان، چوں کہ ہندو ومسلمان، دونوں قوموں کا وطن اور ان کا اپنا ملک ہے۔

جس کے موجودہ دستور وآئین (بعد آزادیِ ہند۔ اگست ۱۹۴۷ء) کے مطابق بھی
دونوں کو، یکساں شہری حقوق، حاصل ہیں۔
اور تاریخِ ماضی کا یہ مسلّمہ ہندوستانی موقف رہا ہے کہ:
انگریزوں نے مکروفریب اور پھر قوت وجارحیت کے ساتھ، ہندوستان پر قبضہ کر کے
دونوں قوموں کو، نہ صرف یہ کہ غلام بنایا بلکہ ہندوستانی دولت وثروت کے ذخائر کھینچ کر
انگلستان، منتقل کرتے ہوئے انہوں نے ہندوستانیوں کو محکوم ومجبور بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔
اِس لئے وہ ہندو مسلمان، دونوں قوموں کے یکساں مخالف اور ان کے حق میں ظالم وجابر حکمراں
ثابت ہوئے۔ اور ۱۷۵۷ء میں نواب، سراجُ الدّولہ، ۱۷۷۴ء میں حافظ رحمت خاں، روہیلہ
۱۷۹۹ء میں شیرِ میسور، سلطان ٹیپو، اور ۱۸۵۷ء میں آخری مغل تاجدار، بہادر شاہ ظفر کی
کمان میں ہندوستانیوں نے انگریزوں سے سخت معرکہ آرائی اور خوں ریز جنگ کی۔
لیکن، عہد بہ عہد، ہندوستانی عوام، کمزور اور برطانوی نصاریٰ، طاقتور ہوتے چلے گئے۔
۱۸۰۱ء ہی میں انگریز، لکھنؤ وروہیل کھنڈ اور ۱۸۰۳ء ہی میں وہ دہلی پر بھی قابض ہوگئے۔
مگر، مصلحتاً، نوابِ اودھ اور شاہِ عالَم، مغل حکمراں کو، انہوں نے باقی رکھا اور انھیں بے دست وپا
کر کے ہندوستان بھر میں اپنی حکومت وتجارت اور اقتدار واختیار کی جڑیں، مضبوط کرتے رہے۔
۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے نتیجے میں دہلی پر
براہِ راست، برطانیہ کی باضابطہ حکومت ہوگئی اور پھر اگست ۱۹۴۷ء سے، دوتین دہائی پیشتر تک
بلا کسی شرکت ومزاحمت اور بلا کسی خوف وخطر کے، وہ اپنی حکمرانی کا جشن مناتے رہے۔
آج جب کہ انقلاب ۱۸۵۷ء تا ۲۰۰۷ء کو ڈیڑھ سو سال پورے ہورہے ہیں۔
ہم ہندوستانیوں کا قومی وملکی فریضہ ہے کہ:
ان کی قربانیوں کو یاد کریں اور انھیں، ہمیشہ یاد رکھیں
جنھوں نے قومی وملکی مفادات اور آنے والی نسل کے تحفظ کے لئے
اپنی عزت وآبرو اور جان ومال کو داؤ پر لگایا۔
اپنا سب کچھ لُٹا کر بھی اپنے جذبۂ حُریت کی قیمت پر کسی قسم کی کمزوری وناتوانی
اور گریز وفرار کو گوارا کرنے کے لئے وہ کسی قیمت پر، تیار نہیں ہوئے۔

باشعور وبیدار مغز خواص وعوام، تنظیموں، انجمنوں اور خود حکومتِ وقت کا فرض بنتا ہے کہ
وہ قائدینِ انقلاب ۱۸۵۷ء کی ڈیڑھ سو سالہ یادگاری تقریبات، شایانِ شان طور سے منائے۔
دہلی وبمبئی وکلکتہ ولکھنؤ وپٹنہ، غیرہ میں خصوصی تقریبات کا اہتمام کرے۔
ان کے نام سے یونیورسٹی، کالج، لائبریری، شفاخانے، وغیرہ، قائم کرے۔
اور ان کے انقلاب کا پیغام، تازہ کرنے اور ان کی یاد کو، زندہ وتابندہ رکھنے کے لئے
جو بھی مناسب اور رائج الوقت طریقے ہیں، وہ سب اپنائے جائیں۔
عزتِ نفس اور حُریتِ فکر کے ساتھ، زمامِ اختیار واقتدار، حاصل کر لینا
کسی قوم کے لئے بڑی گراں قدر دولت ہے اور اس دولت کو، جن ہاتھوں کے ذریعہ
آزاد نسل تک منتقل کیا گیا ہے، وہ بھی تاریخی عظمت واہمیت کے حامل ہیں۔
اِس لئے ان سب کی حفاظت کرنا، انہیں یاد رکھنا، ان کے اصل مقصد کے مطابق
وطن کو ایک آزاد فلاحی ریاست اور منصفانہ حکومت کی شکل دینا
ظلم واستحصال سے عوام کو محفوظ رکھنا، تعلیم وتجارت وصنعت وزراعت کو ترقی دینا
اور ملک ووطن کے اِس سرے سے اُس سرے تک، سکون وطمانیت وخوش حالی کا
ماحول پیدا کرنا ہی وطن کی بڑی خدمت اور اس کے ساتھ، سچی وفاداری ہے۔
جو قائدینِ انقلاب ۱۸۵۷ء کا اوّلین مطمحِ نظر تھا۔"

(اداریہ: **ماہنامہ کنزالایمان، دہلی**۔ شمارہ نومبر ۲۰۰۶ء۔ بقلم: یٰسٓ اختر مصباحی، مع نظرِ ثانی واضافہ)

○○○

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی مروّجہ تاریخ

ایک تجزیہ واِحتساب

جنگِ آزادیِ ہند ۱۸۵۷ء کی تاریخ لکھنے اور بیان کرنے کے مندرجہ ذیل نمونے اور مظاہر ہمارے وطنِ عزیز میں بے حد نمایاں ہیں۔ جن پر غور وخوض کرنے اور اِصلاح طلب مواقع ومقامات کی اصلاح کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

تاریخ، اپنی خواہشات ومَرضیات کے تابع نہیں، بلکہ وہ ہوتی ہے، جو وقوع پذیر ہوئی ہو۔ اسے پیش آمدہ شکل میں بیان کرنا، تاریخ ہے۔ اور اس کی صورت، مَسخ کر کے اسے اپنے بیان وتحریر کے ذریعہ، خلافِ واقع کوئی نیا لبادہ پہنا دینا تاریخ کے ساتھ، بے رحمانہ سلوک اور اس کا سنگین مذاق ہے۔

یہاں، چند نمونوں کی سلسلہ وَار، مختصراً، نشان دِہی کی جاتی ہے:

(۱) منظّم اور منصوبہ بند طریقے سے مسلم فاتحین وسلاطین، بِالخصوص، مغل حکمرانوں کی کردارکشی کے لئے فرضی تاریخ کا سہارا لے کر، اُن سے ہندوستانیوں، بِالخصوص ہندوؤں کو بدظن اور متنفّر کرنے کی شعوری اور مسلسل کوشش کی گئی ہے۔

اس نفرت انگیز تاریخ سازی وتاریخ گری کا مقصد، ملکی سطح پر
ایک طرف، ہندو مسلم منافرت وتصادم کا ماحول پیدا کرنا ہے۔
اور دوسری طرف، اس کی پیش بندی کرنی ہے کہ:
اب کسی سابق حکمراں اور سابق دَورِ حکومت کو، نہ کوئی اچھی نظر سے دیکھے۔
نہ ہی اسے تعریف وتحسین کے ساتھ، یاد کرے۔

انگریزی دَورِ حکومت کو ہی غنیمت، بلکہ بہتر سمجھتے ہوئے
اسی پر صبر وقناعت کر کے، اسے، برضا ورغبت، قبول کرلے۔

انگریز مؤرخین نے اپنے عزائم کے مطابق اپنی کامیاب حکمتِ عملی کے ساتھ یہ تاریخ، مرتّب کی اور اپنی کسی پیش رَو حکومت کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کے امکانات واسباب پر، انہوں نے بھرپور قدغن لگائی اور اپنی دانست میں ہَوا، اور روشنی کے سارے جھروکے اور خطرات کے سارے دروازے، بند کردیے تھے۔

(۲) کچھ ایسا ہی سلوک، خود جنگِ آزادیِ ہند ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد انگریز مؤرخوں اور حکمرانوں نے یہ کیا کہ:

اِستخلاصِ وطن کی راہ میں ہندوستانیوں کی طرف سے کی جانے والی سرگرمیوں اور معرکہ آرائیوں کو، انہوں نے ایک طرف، نہایت خوف ناک شکل میں پیش کیا۔

تو دوسری طرف، ہندوستان بھر میں اپنے ظلم وغارت گری کا وہ بازار اور قید وبند وتخویف وتحقیر کا وہ سلسلہ، شروع کیا اور سارے ہندوستانیوں کو، ایسا خائف ودہشت زدہ بنا دیا کہ:

اس جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے اَحوال وواقعات اور تحریرات ودستاویزات کو محفوظ رکھنا ہی مشکل، بلکہ عملاً، کسی آفت ومصیبت کو دعوت دینے کے مترادف ہوگیا۔

(۳) بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دَہائی کے آغاز (۱۹۲۱ء) میں تحریکِ آزادی کے باضابطہ، شروع ہونے کے بعد، زَرّیں موقع تھا کہ:

خود، ہندوستانی مؤرخین، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی مستند ومفصّل تاریخ، مرتّب ومدوَّن کر کے اسے قوم وملک کے سامنے پیش کرتے اور اپنے اسلاف واکابر کی تاریخِ آزادی کے اَحوال وخدمات کو، مُستند تاریخِ ہند کا ایک ناقابلِ فراموش باب بنا دیتے۔

لیکن، اہلِ وطن، جب خود ہی غفلت وبے حسی کا شکار ہو کر اپنے مُحسِنوں اور اپنے تاریخی فرائض کو فراموش کر بیٹھے، تو غاصب وقابض وظالم انگریزوں سے کیا شکوہ ہے؟ اور کیسی شکایت؟

(۴) جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی قیادت، عُلماے کرام اور مسلم قائدین نے مجموعی طور پر کی اور ہر مقام ومحاذ پر مسلمان، پیش پیش رہے۔ باوجودے کہ بعض ریاستوں کے ہندو راجہ اور بعض مقامات کے ہندو عوام بھی شریکِ جنگ تھے۔

مگر، مجموعی طور پر، اس جنگ کی کمان، مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں تھی۔
اور دہلی و روہیل کھنڈ و اَوَدھ، جو، اِس جنگ کا اصل میدان ہے
اس میں ہر طرف، مسلمانوں ہی کا غلغلہ، انہیں کا دَبدَبہ اور بیشتر قربانیاں، انہیں کی ہیں۔
ایسی صورت میں خود، عُلمائے کرام وقائدینِ ہند اور مسلم مؤرخین کی ذِمّہ داری تھی کہ:
وہ بیسویں صدی عیسوی کی دوسری دَہائی اور اس کے بعد کے اَدوار و حالات میں
اس جنگ ومقاماتِ جنگ ومجاہدینِ جنگ ۱۸۵۷ء کے احوال وآثار کی تحقیق وتفتیش کر کے
اور جنگ کا سارا ریکارڈ، کھنگال کر کے، جامع ومکمل ومستند تاریخِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء لکھتے
اور اپنا سرمایۂ تاریخ، محفوظ کرنے کے ساتھ، آنے والی نسل پر احسان کرتے۔
مگر، افسوس کہ اپنے اسلاف اور مُحسنوں کے ساتھ
صرف عام مؤرخین نے نہیں، بلکہ، خود مسلمانوں نے بھی اجتماعی غفلت وکوتاہی کا مظاہرہ کیا۔
اور ستم بالائے ستم، یہ ہے کہ:
آزادیِ ہند (۱۹۴۷ء) کے بعد بھی، ہند و پاک کے نیشنل آرکائیوز (قومی محافِظ خانہ) کے
کم از کم ایک لاکھ، دستاویزی اوراق وصفحات ایسے ہیں
جنہیں، تقریباً، ڈیڑھ سو سال کی مدت میں گویا، کسی محقق ومؤرخ نے ابھی ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔
(۵) رائجُ الوقت تاریخ کا تجزیہ واِحتساب کیا جائے، تو نتیجہ، یہ نکلے گا کہ:
آزادی کی لڑائی کی تاریخ، ۱۹۴۷ء سے قبل، بیس پچیس سال کے دائرے میں
سمیٹ کر رکھ دی گئی ہے اور عام ہندوستانیوں کو، اصل جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء سے غافل
اور بے نیاز کر دیا گیا ہے۔
بے توفیق اور کوتاہ نظر مؤرخین کے ساتھ، سیاسی پارٹیوں اور صوبائی ومرکزی حکومتوں کے
اِس دانستہ عمل کے پسِ پردہ بھی وہی ذہنیت کارفرما ہے، جو شاطر دماغ انگریزوں کی تھی۔
(۶) یہ احسان بھی اہلِ سیاست وصحافت، بلکہ اہلِ علم واصحابِ تاریخ نے مدِّ نظر نہیں رکھا کہ:
۱۹۴۷ء سے پہلے کی تحریکِ آزادی کو، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے ہی غذا وتحریک ملی ہے
اور تحریکِ آزادی وجنگِ آزادی کا مطالعہ وتذکرہ کرتے وقت، یہ نکتہ بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا کہ:
تقریر وتحریر واحتجاج ومظاہرہ اور چند ماہ، یا چند سال کی جیل کی سزا کے بِالمقابل

شمشیر وسنان وبندوق وتوپ اور ضبطیِ جائداد واملاک وگولی وپھانسی وکالا پانی کی سزا کے درمیان
کتنا واضح اور نمایاں فرق وتفاوت ہے؟
جو، جنگِ آزادی کو تحریکِ آزادی سے ممتاز کر کے، اسے بدرجہا فائق وبلند اور عظیم تر بنا دیتا ہے۔
تحریک کو جنگ پر ترجیح دینا، بلکہ تحریک کے شور وغوغا میں جنگ کو فراموش کر دینا
ملک ووطن کی کوئی خدمت نہیں، بلکہ خونِ شہیداں کے ساتھ
بے وفائی اور قابلِ صد ہزار مذمّت، احسان فراموشی ہے۔
اِس لحاظ سے اور مذکورہ حقائق کے پیشِ نظر، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی تاریخ پر
زیادہ اور بھرپور توجہ دینی چاہیے تھی، مگر، کچھ ایسا لگتا ہے کہ:
مغل دَورِ حکومت، بالخصوص، سلطان محی الدین اورنگ زیب عالم گیر کے عہدِ حکومت کو
بدنام کر کے، انگریزی دَورِ حکومت میں جو مقصد ومفاد، حاصل کرنے کی کوشش ہوئی تھی
وہی مقصد ومفاد، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کو، نظر انداز اور گم نام کر کے
آزادیِ ہند (۱۹۴۷ء) کے بعد، حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔
اور سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ:
ان دونوں مراحل میں مسلم مؤرخین بھی اِدراکِ حقیقت میں ناکام اور اپنے فرض کی ادائیگی
سے بڑی حد تک غافل، بلکہ شاطر دماغ عناصر کی سازشوں کے شکار بھی ہوتے رہے ہیں۔
اِس لئے اگر کسی کو شکوہ کرنا ہی ہے، تو اسے غیروں سے کم اور اپنوں سے زیادہ ہونا چاہیے۔
اور اِس سے بھی ہزار درجہ بہتر بات یہ ہوگی کہ:
تلافیِ مافات کی عملی کوشش کی جائے اور اپنی تاریخ، خود اپنے ہاتھوں سے رقم کی جائے۔
ہندوستان کے اندر، ۱۶۰۰ء میں انگریز، تاجر وسوداگر کی حیثیت سے باضابطہ، داخل ہوئے
اور اپنی تدبیر وحکمت، سازش وفتنہ انگیزی اور قتل وغارت گری کے ذریعہ
۱۸۵۷ء میں مکمل طور سے متحدہ ہندوستان پر قابض ہو کر، اس کے حکمراں بن بیٹھے۔
انگریزوں نے متحدہ ہندوستان کا
جس طرح، مذہبی، علمی، تہذیبی، معاشرتی، تجارتی، صنعتی، زراعتی اِستحصال کیا۔
اِہانت وتحقیر، ظلم وجبر، قتل وخوں ریزی کا بازار، جس طرح اپنی سازش وعیّاری

اورخودغرضی وسنگ دِلی کے ساتھ گرم کیا، اُس کی تپش سے آج بھی

تاریخِ ہند کا بابِ انقلاب، لرزاں وتپاں ہے اوراس حقیقت کی عملی گواہی دے رہا ہے کہ:

اپنے آپ کو ''مہذَّب ومتمدَّن قوم'' کہنے اور کہلانے والے انگریز

متحدہ ہندوستان کے اندر، بدترین وحشی اور جنگلی، ثابت ہوئے۔

اورانہوں نے جامۂ انسانیت، تارتار کر کے برسرِ عام انسانیت کو رُسوا اور ذلیل وخوار کیا۔

متحدہ ہندوستان کا سرمایہ، انگلستان، منتقل کرنے کا ذکر کرتے ہوئے چیئرمین بورڈ آف ریونیو، مدراس، سَر، جان سلیور نے دریائے گنگا (ہند) اور دریائے ٹیمز (انگلینڈ) کا اِس طرح، تمثیلی سہارا لیتے ہوئے، زراندوزی وزرکشی کی بھرپور عکّاسی کی ہے:

''ہمارا طرزِ حکومت ''اسپنج'' سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔

وہ ''گنگا'' کے دھارے سے تمام نعمتیں، چوس لیتا ہے اور ''ٹیمز'' کے کنارے، نچوڑ دیتا ہے۔''

(ص:۲۶۔ **حکومتِ خوداختیاری**۔ مطبوعہ: نظامی پریس، بدایوں)

سر، جان شور کہتا ہے:

''ہر، وہ عہدہ، عزت اور منصب، جس کو قبول کرنے کے لئے ادنیٰ سے ادنیٰ انگریز کو آمادہ کیا جاسکتا ہے، ہندوستانیوں کے لئے بند کر دیا گیا ہے۔'' (ص:۲۷۔ **حکومتِ خوداختیاری**)

سر، میلکم لوئس، جج مدراس ہائی کورٹ وممبر کونسل لکھتا ہے:

''ہم نے ہندوستانیوں کی ذاتوں کو ذلیل کیا، ان کے قانونِ وراثت کو منسوخ کیا، بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا، مذہبی رسم ورواج کی توہین کی، عبادت خانوں کی جاگیریں، ضبط کر لیں، سرکاری کاغذات میں انہیں کافر لکھا، اُمَرا کی ریاستیں، ضبط کر لیں، لوٹ کھسوٹ سے ملک کو تباہ کیا، انہیں تکلیف دے کر، مال گزاری، وصول کی، اونچے خاندانوں کو برباد کر کے انہیں آوارہ بنادینے والے بندوبست، قائم کیے۔'' (ص:۳۰۔ **ہندوستان کی سیاسی ترقی**)

ہندوستانیوں کو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے، ان پر اپنی حکومت، قائم ومسلّط رکھنے کے لئے انگریزوں نے ''**لڑاؤ اور حکومت کرو**'' کی رومن پالیسی کو اپنا شِعار بنایا۔

چنانچہ، سر، جان میلکم لکھتا ہے:

''اِس قدر وسیع ملک میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت

اِس امر پر منحصر ہے کہ: ہماری عمل داری میں، جو بڑی جماعتیں ہیں، ان کی عام تقسیم ہو۔

اور پھر، ہر جماعت کے ٹکڑے، مختلف ذاتوں اور فرقوں اور قوموں میں ہوں۔

جب تک، یہ لوگ، اِس طریقے سے جُدا رہیں گے

اُس وقت تک، غالباً، کوئی بغاوت اٹھ کر ہماری قوم کے اِستحکام کو متزلزل نہ کر سکے گی۔''

ہندوستان میں عرصہ سے مقیم ایک سینیئر انگریز حاکم نے معروف جریدہ ''**معاملاتِ خارجیہ، لندن**'' (فارَن اَفیرس، لندن) میں لکھا تھا کہ:

''ہندوستان میں خانہ جنگی کی طرف، رُجحان، موجود ہے۔

جس کا ایک نمونہ ''ہندو مسلم عِناد'' ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ:

اگر، یہ، رُجحان نہ ہوتا، تو ہماری حکومت، قائم نہ ہوسکتی، نہ برقرار رہ سکتی۔

یہ بھی صحیح ہے کہ ہندو مسلمانوں میں عام مخالفت، برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی۔''

(ص: ۴۰۸۔ **اِن ہپّی انڈیا**۔ مؤلّفہ: لالہ لاجپت رائے۔

بحوالہ ص: ۲۷۸۔ **روشن مستقبل**۔ از طفیل احمد، منگلوری۔ مطبوعہ بمبئی۔ ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء)

مسٹر، کارنٹِکس، رسالہ ''**ایشیاٹک جرنل ۱۸۲۱ء**'' میں لکھتا ہے:

''لڑاؤ اور حکومت کرو'' رومن مقولہ، ہماری ہندوستانی حکومت کا اصل اصول ہونا چاہیے۔

عام اِس سے کہ وہ سیاست، یا تمدن، یا فوج کشی کے متعلق ہو۔'' (ص:۵۲۔ **حکومتِ خوداختیاری**)

لارڈ اِلفنسٹن، گورنر بمبئی اپنی ایک یادداشت، مؤرخہ ۱۴ رمئی ۱۸۵۹ء میں لکھتا ہے:

''نفاق، ڈال کر حکومت کرنا، رومیوں کا اصول تھا۔ اور یہی اصول، ہمارا بھی ہونا چاہیے۔''

(ص:۵۵۔ **حکومتِ خوداختیاری**)

انگریزوں کے اِن خیالات واِقدامات کا ہندوستانیوں پر، جو اثر اور رَدِّعمل ہونا چاہیے تھا وہ ہوا۔ اور بڑے پیمانے پر ہوا، جس کی تفصیل، تاریخی کتابوں میں مذکور ومسطور ہے۔

متحدہ ہندوستان کے مختلف خِطّوں اور علاقوں میں استحصال اور ظلم وجبر کے مسلسل عمل نے انگریزوں کے خلاف، ہندوستانیوں کے غم وغصہ اور نفرت کے جذبات، مشتعل کر دیے تھے۔

لیکن، وہ کوئی منظّم اور مسلّح جنگ، نہیں کر سکے۔

البتّہ، نوابوں اور راجاؤں کو انگریزوں نے تنگ کرنے، ان کے حقوق، غصب کرنے

اورانہیں ایک دوسرے سےلڑانے کا سلسلہ،شروع کیا۔

تو،ان کے صبر وضبط کا پیمانہ،لبریز ہوگیا۔اوروہ،اپنی ریاست وحکومت کے تحفظ ودفاع کے لئے میدانِ جنگ میں آنے پر مجبور ہوگئے۔ جھڑپوں اور چھوٹی موٹی لڑائیوں کے علاوہ چندلڑائیاں،خصوصیت کے ساتھ اہم اورقابلِ ذکر ہیں۔مثلاً:

(۱)جنگِ پلاسی،۱۷۵۷ء۔نواب سراج الدّولہ اورانگریزوں کے درمیان۔

(۲)جنگِ بکسر،۱۷۶۴ء۔میر قاسم ونواب شجاعُ الدّولہ اورانگریزوں کے درمیان۔

(۳)جنگِ کٹرہ میران پور،فتح گنج (بریلی،روہیل کھنڈ) ۱۷۷۴ء۔

حافظ رحمت خاں روہیلہ اور انگریزوں کے درمیان۔(اِس جنگ میں شجاعُ الدّولہ انگریزوں کے معاوِن اورحافظ رحمت خاں روہیلہ کے حریف ومخالف تھے)

(۴)جنگِ سرنگاپٹنم،میسور ۱۷۹۹ء۔سلطان ٹیپو اورانگریزوں کے درمیان۔

(۵)جنگِ آزادیِ ہند،۱۸۵۷ء۔

دہلی وروہیل کھنڈ اوراَوَدھ،وغیرہ کے انقلابیوں اورانگریزوں کے درمیان۔

نمبرایک تا چار،سبھی لڑائیاں،مقامی وعلاقائی جنگیں تھیں،جن میں سب سے زیادہ اہم جنگِ میسور ۱۷۹۹ءتھی۔اِسی جنگ میں سلطان ٹیپوکی شہادت ہوئی۔

اورانگریز کمانڈر نے سلطان ٹیپوکی شہادت کے بعد،یہ متکبرانہ وفاتحانہ اعلان کیا تھا کہ:

''ہم نے ہندوستان کوفتح کرلیااورآج سے ساراہندوستان،ہماراہے۔''

جنگِ آزادیِ ہند ۱۸۵۷ء،سب سے بڑی اور ہمہ گیر ملکی وعوامی جنگ تھی۔

جس میں دہلی سےلکھنؤ والٰہ آباد،اور بہارتک کے عُلَما وقائدین وعوام،سب کے سب شامل وشریک تھےاوراِسی جنگ کے نتیجے میں ہندوستان پر،ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ ملکۂ برطانیہ کی حکومت،قائم ہوئی اور ہندوستان،براہِ راست،برطانوی سامراج کے قبضے میں آگیا۔جس کے بعد،اگست ۱۹۴۷ءتک

ہندوستان پر برطانیہ کی غاصبانہ وجابرانہ حکومت واقتدار کا پرچم لہراتا رہا۔

۱۸۵۷ء کے بعدلکھی گئی اپنی ایک کتاب''ہمارے ہندوستانی مسلمان''میں

ڈبلیوڈبلیوہنٹر،مسلمانوں کے ماضی اورحال کا تجزیہ کرتے ہوئےلکھتا ہے کہ:

''حقیقت یہ ہے کہ جب،یہ ملک ہمارے قبضے میں آیا

تو مسلمان ہی سب سے اعلیٰ قوم تھی۔وہ،دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی ہی میں برتر نہ تھے،بلکہ سیاست اورحکمتِ عملی میں بھی،سب سے افضل تھے۔

لیکن،اس کے باوجود،مسلمانوں پرحکومت کی ملازمتوں کا دروازہ،بند ہے۔

غیرسرکاری ذرائعِ زندگی میں بھی انہیں کوئی نمایاں جگہ،حاصل نہیں۔''

(ص:۲۳۷۔''ہمارے ہندوستانی مسلمان''۔مؤلّفہ:ڈبلیوڈبلیوہنٹر)

..........جتنے ہندوستانی سِوِل سَروِسز میں داخل ہوئے،یاہائی کورٹ کے جج بنتے ہیں اُن میں ایک بھی مسلمان نہیں۔حالاں کہ جب،یہ ملک ہمارے قبضے میں آیا تواس کے کچھ عرصہ کے بعد تک بھی حکومت کے تمام کام،مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سرانجام پاتے تھے۔''(ص ۲۳۳۔''ہمارے ہندوستانی مسلمان''۔مؤلّفہ:ڈبلیوڈبلیوہنٹر۔
مطبوعہ:اَلکتاب انٹرنیشنل،مرادی روڈ،بٹلہ ہاؤس،جامعہ نگر۔نئی دہلی۔۲۵)

○○○

معرکۂ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء! واقعات وحقائق

انیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی میں دہلی سے ایک بڑی تحریک برپا ہوئی۔
جس کا آغاز، خالص مذہبی رنگ میں ہوا۔
سید احمد، رائے بریلوی وشاہ اسمٰعیل، دہلوی اس کے روحِ رواں تھے۔ ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء میں، یہ دونوں حضرات، معرکۂ بالاکوٹ میں سرحدی پٹھانوں سے جنگ کرتے ہوئے کام آئے۔
سید طفیل احمد، منگلوری، علیگ، لکھتے ہیں:
''سید احمد، رائے بریلوی صاحب کا مسلک، ہمہ گیر تھا۔ یوں کہنے کو
تو آپ کے مخالف آپ کی جماعت کو وہابی کہتے تھے
مگر، واقعہ، یہ ہے کہ وہ جماعت: دو مختلف اور متضاد گروہوں سے مرکّب تھی۔
جنہیں متحد رکھنے میں، وہ مدۃ العمر، ساعی رہے۔
ان میں ایک گروہ کے سردار، مولوی عبدالحیٔ (بڈھانوی)
اور مولوی کرامت علی، جون پوری تھے، جو اہلِ سُنّت کا طریقہ رکھتے تھے۔
اور دوسرے گروہ کے سردار، مولوی اسمٰعیل تھے
جو چاروں اماموں کی تقلید سے آزاد تھے اور براہِ راست، حدیث کو اپنا ماٴخذ، قرار دیتے تھے۔
خود، سید احمد صاحب، عمل کے اعتبار سے حنفی تھے۔
مگر، اسی کے ساتھ، مولوی اسمٰعیل کی جماعت کی سرپرستی کرتے تھے۔
جو اپنے کو ''محمدی'' کہتے تھے۔''
(ص: ۸۷۔ **کلکتہ ریویو**، جلد ۱۷، ۱۸۷۱ء۔ مضامین مسٹر جیمس اوکینلے، (ص ۱۲۸۔ **مسلمانوں کا روشن مستقبل**۔
مؤلّفہ: سید طفیل احمد، منگلوری، مکتبۃ الحق، جوگیشوری، بمبئی۔ ۱۴۲۲ھ/نومبر ۲۰۰۱ء۔ طبعِ اول ۱۹۳۷ء)
مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء) بیان کرتے ہیں کہ:
''مولانا محمد اسمٰعیل شہید، مولانا منورالدین (دہلوی، شاگردِ مولانا شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی) کے ہم درس تھے۔ شاہ عبدالعزیز کے انتقال کے بعد، جب انہوں نے تقویۃ الایمان

اور جلاء العینین لکھی اور ان کے مسلک کا ملک میں چرچا ہوا، تو تمام عُلما میں ہلچل پڑ گئی۔
ان کے رَد میں سب سے زیادہ سرگرمی، بلکہ سربراہی، مولانا منورالدین نے دکھائی۔
متعدد کتابیں لکھیں اور ۱۲۴۰ھ والا مشہور مباحثۂ جامع مسجد (دہلی) کیا۔
تمام عُلمائے ہند سے فتویٰ مرتّب کرایا اور پھر، حرمین سے فتویٰ منگایا۔
ان کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ:
انہوں نے ابتدا میں مولانا اسمٰعیل اور ان کے رفیق اور شاہ صاحب کے داماد مولانا عبدالحیٔ (بڈھانوی) کو بہت کچھ فہمائش کی اور ہر طرح سمجھایا۔
لیکن، جب ناکامی ہوئی تو بحث ورَدو میں سرگرم ہوئے۔
اور جامع مسجد (دہلی) کا وہ شہرۂ آفاق مناظرہ، ترتیب دیا
جس میں ایک طرف، مولانا اسمٰعیل اور مولانا عبدالحیٔ تھے۔
اور دوسری طرف، مولانا منورالدین اور تمام عُلمائے دہلی۔''
(ص: ۲۸۔ **آزاد کی کہانی**۔ مرتّبہ: مولانا عبدالرزّاق، ملیح آبادی، ندوی۔ مکتبہ خلیل، اردو بازار، لاہور)
مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی لکھتے ہیں:
''حضرت شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی کے تلامذہ
اور ان سے اِنتساب رکھنے والوں میں ایک گروہ، تو شاہ صاحب کے
مسلک پر گامزن تھا اور مسائلِ شرعی سے سرِ مُو انحراف، پسند نہیں کرتا تھا۔
مگر، دوسرا گروہ، اِجتہاد اور عدمِ تقلید کا رُجحان رکھتا تھا۔
چنانچہ، رفتہ رفتہ، ان گروہوں میں مختلف مسئلوں میں اختلاف، رُونما ہوا۔''
(ص: ۱۳۸۔ **مفتی صدرالدین آزردہ**۔ مؤلّفہ: عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی۔ مطبوعہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵)
لیکن، داستان سرائی اور افسانہ طرازی کا حیرت انگیز نمونہ، یہ ہے کہ:
مولانا عبیداللہ سندھی (متوفی اگست ۱۹۴۴ء) ایک نئی تاریخ، یوں ایجاد فرماتے ہیں:
''امام عبدالعزیز نے سید احمد شہید کے بورڈ کو پہلی دفعہ، ۱۲۳۱ھ میں بیعتِ طریقت کے لئے اور دوسری دفعہ، بیعتِ جہاد لینے کے لئے دَورے پر بھیجا۔
اس کے بعد، سارے قافلہ سمیت حج پر جانے کا حکم دیا، تاکہ ان کی تنظیمی قوت کا تجربہ ہوجائے۔

جب قافلہ **۱۲۳۹**ء میں واپس آیا، تو امام عبدالعزیز، **فوت ہو چکے تھے۔"**

(۱۵۳۔ **شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک**، از مولانا عبیداللہ سندھی۔ مطبوعہ: لاہور)

سید احمد، رائے بریلوی صاحب کے پہلے سفرِ ٹونک (راج پوتانہ) کے بارے میں
مولانا سید محمد میاں، دیوبندی لکھتے ہیں:

"حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیز نے
اپنے خلیفۂ خاص، حضرت سید احمد صاحب شہید کو، ۱۸۱۰ء میں اس محاذ پر کام کرنے کے لئے بھیجا
تو مشترک جدو جہد پر، شرعی تصدیق کی مُہر بھی ثبت ہوگئی۔
کہا جاتا ہے کہ سید صاحب، نواب امیر علی خاں کی فوج میں ایک سوار کی حیثیت سے
ملازم تھے۔" الخ۔ (ص: ۲۷۔ **عُلمائے ہند کا شاندار ماضی**۔ جلدِ چہارم۔
مؤلّفہ: سید محمد میاں، دیوبندی۔ کتابستان، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶)

"خود، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنے خاص معتقد اور مُرید
سید احمد صاحب کو، امیر علی خاں کے پاس (ٹونک) بھیجا۔" (ص: ۸۳، جلد دوم)

مولانا سید محمد میاں، دیوبندی کی اِس روایت کا ماخذ
مولانا عُبید اللہ سندھی (متوفی ۱۹۴۴ء) کی تالیف "**شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک**" ہے۔
چنانچہ، مولانا سید محمد میاں، دیوبندی لکھتے ہیں:

"بہر حال! اس سفر کے متعلق، حضرت مولانا عُبید اللہ سندھی کی تحقیق ہی
درست، معلوم ہوتی ہے۔ اور قیاسی قرائن، اسی کی تصدیق کرتے ہیں کہ:
اَرْسَلَهُ الْإمام عَبدُ الْعَزِیز اِلیٰ النَّوابِ امیرعلی خان
لِتَحْصِیلِ الْمَهَارَةِ فِی الْعُلُومِ الْعَسْکَرِیة۔
امام عبدالعزیز ہی نے سید صاحب کو، امیر علی خاں، نواب ٹونک کے لشکر میں بھیجا۔
تاکہ فنونِ جنگ میں عملی تجربہ اور مہارت، حاصل کر لیں۔"
(ص: ۳۷۔ **عُلمائے ہند کا شاندار ماضی**۔ جلدِ چہارم۔ مطبوعہ دہلی)

اس "**پروازِ خیال**" یا "**ایجادِ بندہ**" یا "**فرضی تاریخ نویسی**" کو انتہا تک پہنچاتے ہوئے
غیر مقلّد عالم، ابو یحییٰ امام خاں، نوشہروی (متوفی ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۶ء) رقم طراز ہیں:

"سیدنا شاہ محمد اسمٰعیل نے اپنے پیر و مُرشد، حضرت امیر المؤمنین، سید احمد، رائے بریلوی
علیہ الرحمہ کی قیادت میں جس جہاز و جہاد میں شرکت وشہادت کا مرتبہ، حاصل کیا۔
اِس کے بانی، السید ممدوح مرحوم کے پیر و مُرشد
حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب عَلَیْهِ الْغُفْرَان ہی تھے۔"

"چنانچہ، جب، سید صاحب، دہلی سے باہر، بیعت کے لئے دَورہ کو نکلے
تو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنا سیاہ عمامہ اور سفید قبا، دستِ مبارک سے
سید صاحب کو پہنا کر، رخصت کیا۔" (ص: ۱۱۵۔ **تراجمِ علمائے حدیث**۔ مؤلّفہ: ابو یحییٰ امام خاں
نوشہروی۔ مطبوعہ: اَلکتاب انٹرنیشنل، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵)

"**شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک**" کا مسوّدہ، اُس کے مؤلّف، مولانا عُبید اللہ، سندھی
(متوفی ۱۹۴۴ء) نے بغرضِ ملاحظہ ومطالعہ، سید احمد، رائے بریلوی وشاہ محمد اسماعیل، دہلوی کے
افکار وتحریکات کے حامی مؤرخ اور غیر مقلّد عالم، مولانا غلام رسول مہر (متوفی ۱۹۷۱ء) کو دیا تھا۔
بعدِ مطالعہ، مولانا مہر بھی، چند اہم "ایجادات وقیاسات وتجاوزات" سے اتفاق نہ کر سکے۔
اِس لئے انھوں نے بعض مقامات پر نظرِ ثانی کی، مولانا سندھی سے گزارش کی۔
مگر، اپنے مسوّدہ میں کسی ترمیم واصلاح سے مولانا سندھی نے صراحۃً، انکار کر دیا۔
ایک مضمون بعنوان "شاہ عبدالعزیز محدّث، سید احمد شہید اور مولانا عُبید اللہ سندھی"
بقلم: مولانا غلام رسول مہر کے تحریر شدہ، چند حقائق، اِس سلسلے میں، نذرِ قارئین ہیں:

"ایک سوال یہ کہ: آیا، سید احمد صاحب کو، شاہ عبدالعزیز نے
نواب، امیر خاں (بانیِ ریاست ٹونک، راج پوتانہ) کے پاس بھیجا تھا؟
میرے نزدیک، اس کا جواب، نفی میں ہے۔ اس کے وجوہ بھی، اِختصاراً، سن لیجیے:
(۱) سید احمد، تعلیم کے لئے دہلی آئے تھے، تو غالباً ۱۸۰۸ء میں وطن، واپس آ گئے۔
وہاں پہنچنے کے بعد، ان کی شادی ہوگئی۔ اور ۱۸۰۹ء میں ان کی بڑی بچی، سیدہ سائرہ، پیدا ہوئیں۔
(۲) ۱۸۱۰ء میں، وہ، گھر سے نکلے، تو ارادہ یہی تھا کہ نواب امیر خاں کے پاس جائیں۔
اس دَوران میں شاہ عبدالعزیز سے، نہ کوئی ملاقات ہوئی اور نہ مشورے کا کوئی موقع، پیدا ہوا۔
(۳) نواب امیر خاں کی نظروں میں سید صاحب، اجنبی، نہ تھے۔

اِس لئے کہ سید صاحب کے بڑے بھائی، سید ابراہیم، پہلے سے نواب کے لشکر میں موجود تھے۔
انھوں نے، غالباً، سید صاحب کے پہنچنے سے پہلے، وفات پائی۔
(۴) اگر، شاہ عبدالعزیز صاحب، اِس سے پہلے، بورڈ بنا چکے تھے
تو تنہا سید صاحب کو، وہاں کیوں بھیجا؟
بورڈ کے دو دوسرے ممبروں، یعنی شاہ اسمٰعیل اور مولانا عبدالحیٔ کو، کیوں نہ بھیجا؟
جو علم میں سید صاحب سے بڑھے ہوئے تھے اور عمر میں بھی بڑے تھے۔
بہر حال! سید صاحب، کسی کے بھیجے ہوئے نہیں گئے تھے، بلکہ خود گئے تھے۔
ان کی نیت کیا تھی؟ کیوں، سات آٹھ برس، نواب کے پاس گذارے؟
کس وجہ سے الگ ہو گئے؟
یہ سب سوالات، یہاں، نہیں چھیڑے جا سکتے۔''
(ص ۱۹۹۔۲۰۰۔ سہ ماہی مجلّہ ''**احوال وآثار**'' کاندھلہ ضلع مظفر نگر، یو پی۔ شمارہ نمبر ۲۱۔۲۰۔ جلد نمبر ۲۔
شوال ۱۴۲۹ھ تا ربیع الاول ۱۴۳۰ھ۔ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء و جنوری تا مارچ ۲۰۰۹ء۔
مرتَّب و مدیرِ مجلّہ: مولانا نور الحسن راشد، کاندھلوی)
بہر حال! تحریکِ جہاد (از ۱۸۲۶ء تا ۱۸۳۱۔ رائے بریلی تا، بالاکوٹ) نے
نہایت سُرعت و تیز رفتاری کے ساتھ، عسکری رنگ، اختیار کر لیا۔
جس نے پنجاب و سرحد کے وسیع علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔
اس تحریک کو ''**تحریکِ جہاد**'' اور ''**تحریکِ بالاکوٹ**'' کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔
سکھوں کے مظالم سے پنجاب کے مسلمانوں کو نجات دلانے کے نام پر، یہ تحریک
میدانِ عمل میں آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے، ہزاروں ہندوستانی مسلمان، اس سے وابستہ ہو کر
''**سکھوں سے جہاد**'' کا عزم لے کر نکلے اور سکھوں سے نبرد آزما ہوئے۔
اس ''**تحریکِ جہاد**'' سے وابستہ جماعت اور اس کے رضا کاروں و حامیوں کی
ہندوستان کے اندر، وسیع پیمانے پر نقل و حرکت، اَسلحہ و آلاتِ جنگ کا انتظام
انگریز حکومت اور اس کے آفیسران کا، اس کے بارے میں ہمدردانہ رویّہ
پنجاب و سرحد پہنچنے کے بعد

پہلی، پھر آخری جنگ، سرحدی پٹھانوں اور پنجابی سکھوں ہی سے کیوں؟
آخری معرکۂ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء کے بعد ''**جماعتِ مجاہدین**'' کی سرگرمیاں
۱۸۴۵ء کے حالات میں انگریزوں کا رویّہ، ۱۸۵۷ء سے اس جماعت کی لاتعلقی
جنگِ شاملی، ۱۸۵۷ء، جنگِ امبیلہ ۱۸۶۳ء، مقدمۂ انبالہ (پنجاب) ۶۴۔۱۸۶۳ء۔
و پٹنہ ۱۸۶۵ء، وغیرہ وغیرہ۔
یہ کچھ، ایسے پہلو اور گوشے ہیں، جن کے مطالعہ اور غور و فکر کے وقت
کسی بھی مؤرخ، یا۔ باشعور قاری کو واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ:
بیانِ واقعات و حالات میں اَدوار و عُہود کے لحاظ سے تبدیلی ہوتی رہی ہے۔
اور انگریزی حکومت کا رویّہ بھی اپنے مفادات کے اعتبار سے
پہلے، کچھ تھا اور بعد میں، کچھ سے کچھ ہوتا چلا گیا۔
تاریخ نگاری کا یہ تضاد، خود، حامیان و وابستگانِ تحریک کی تحریروں کے اندر، موجود ہے۔
جس کا بڑی جسارت و دیدہ دلیری کے ساتھ، اظہار اور اعلان کرتے ہوئے اِس موضوع کے
معروف غیر مقلّد محقق و مؤرخ، غلام رسول مہرؔ (متوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) فرماتے ہیں:
''**میں، مجاہدین کی شان و آبرو، قائم رکھنے کا قائل ہوں۔**
اگر چہ، وہ بعض سابقہ بیانات، یا۔ توجیہات کے عین مطابق، نہ ہو۔''
(ص: ۳۳۳، **اِفاداتِ مہرؔ**۔ از شیر محمد پنّی۔ مطبوعہ: شیخ غلام علی اینڈ سنسز، لاہور)
رائے بریلی (موجودہ یو پی) کے سید احمد، رائے بریلوی (متوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء۔
درمعرکۂ بالاکوٹ) حضرت شاہ عبد العزیز، محدّث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء)
فرزندِ حضرت شاہ ولی اللہ، محدّث دہلوی سے نسبتِ بیعت و اِرادت رکھتے تھے۔
شاہ محمد اسمٰعیل، دہلوی، مؤلّفِ تقویۃُ الایمان، فرزندِ شاہ عبدالغنی دہلوی، فرزندِ شاہ ولی اللہ
محدّث دہلوی، حضرت شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی کے بھتیجے تھے۔
شاہ اسمٰعیل، دہلوی، سید احمد رائے، بریلوی کے مرید ہو گئے تھے۔
نسبتِ سیادت و نسبتِ ولی اللّٰھی کا مسلمانانِ ہند کے دلوں میں جو احترام تھا، اُس کا ان دونوں
حضرات نے فائدہ اٹھایا اور اسی نسبت و عقیدت کے سہارے

تحریکِ بالاکوٹ میں بھی عام مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد، شامل وشریک ہوگئی۔
دوسری جانب، پنجاب وسرحد کے عام مسلمان، سکھ مظالم سے عاجز تھے۔
اِس لئے ان مسلمانوں نے بھی سید احمد، رائے بریلوی وشاہ محمد اسمٰعیل، دہلوی کی
دعوتِ جہاد/تحریکِ بالاکوٹ سے وابستہ ''جماعتِ مجاہدین'' کا
اپنی سرزمین پر عقیدت مندانہ جوش وجذبہ کے ساتھ، استقبال کیا۔
جمادیٰ الآخرہ ۱۲۴۱ھ/جنوری ۱۸۲۶ء میں ''جماعتِ مجاہدین''
رائے بریلی (موجودہ یوپی) سے روانہ ہوکر فتح پور، گوالیار، ٹونک، سندھ، بلوچستان ہوتے ہوئے
نومبر ۱۸۲۶ء میں پشاور پہنچی اور اِس خطے میں مذہبی تبلیغ اور عسکری سرگرمی کے ذریعہ
اپنی ایک حکومت کے قیام کی جان توڑ کوشش میں لگ گئی۔
جس کا نقطۂ عروج، معرکۂ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء ہے۔
اور اِسی معرکہ میں مذکورہ دونوں حضرات بھی کام آگئے۔
کسی بھی مؤرخ نے اپنی کسی تحریر اور اپنی کسی کتاب ورسالہ میں، یہ نہیں لکھا ہے کہ:
جنوری ۱۸۲۶ء سے مئی ۱۸۳۱ء تک، رائے بریلی سے پشاور تک کے کسی بھی مرحلے میں
انگریزوں کی جانب سے ''جماعتِ مجاہدین'' کی کوئی ادنیٰ سی بھی مزاحمت ہوئی ہو۔
انگریزوں سے جنگ، اِس ''جماعتِ مجاہدین'' کے عزائم ومقاصد کے خلاف بھی تھا۔
کیوں کہ سید احمد، رائے بریلوی صاحب کو ''اِلہام وبشارت'' کے ذریعہ
صرف ''سکھوں سے جہاد'' پر، مامور کیا گیا تھا، چنانچہ، وہ خود فرماتے ہیں:
''امّا بیانِ اِلہام، پس، فقیر (سید احمد) از پردۂ غیب، بہ بشارتِ رَبّانی
باستیصالِ کفارِ درازمویاں، مامورست۔'' (ص: ۱۸۰، **سوانحِ احمدی**، مطبوعہ لاہور)
ایک نہایت قابلِ غور نکتہ، یہ ہے کہ:
ہندوستانیوں کی ساری چھوٹی بڑی جنگوں کا رُخ، انگریزوں کے خلاف تھا۔
جب کہ اِس تحریکِ بالاکوٹ کا رُخ، پہلے مرحلے میں، صرف سکھوں کے خلاف
وعظ وتبلیغ وجہاد اور دوسرے مرحلے میں پنجابی وسرحدی پٹھانوں کے خلاف ہوگیا۔
اور یہ کسے معلوم نہیں کہ:

پٹھان اور سکھ، دو مضبوط وقوی ہندوستانی بازو، ظالم وغاصب انگریزوں سے
نبرد آزما ہونے کی بھرپور صلاحیت اور شجاعت وطاقت کے حامل تھے۔
حیرت انگیز حقیقت، یہ ہے کہ:
سکھوں سے جہاد کے نام پر، کوچ کرنے والے فوجی دستہ کا
''پہلا جہاد'' سکھوں سے نہیں، بلکہ پٹھانوں سے ہوا۔
مولانا عاشق اِلٰہی، میرٹھی (متوفی ۱۳۶۰/۱۹۴۱ء) بیان کرتے ہیں کہ:
سید صاحب نے پہلا جہاد، یار محمد خاں، حاکمِ یاغستان سے کیا تھا۔''
(ص ۲۷۰۔ **تذکرۃ الرشید**، حصہ دوم۔ طبعِ اول ۱۹۰۸ء۔ میرٹھ)
تاریخی شہادتیں، بیان کرتی ہیں کہ:
ہندوستان بھر کے انگریز حکمرانوں، اُن سے وابستہ متعدد مسلم امیروں
اور حکومت کے ذِمّہ داروں نے ''**تیاریِ جہاد**'' اور ''**سفرِ جہاد**'' کی، نہ صرف یہ کہ:
کھلی چھوٹ دے رکھی تھی، بلکہ میزبانی ومہربانی کے مشتاق ومتمنّی بھی رہا کرتے تھے۔
سید طفیل احمد، منگلوری، علیگ کی مشہور کتاب ''**مسلمانوں کا روشن مستقبل**''، جس کی پہلی طباعت
واِشاعت ۱۹۳۷ء میں ہوئی تھی اور اب تک اس کے متعدد اڈیشن نکل چکے ہیں۔
اس کے اندر، سید طفیل احمد، منگلوری، علیگ لکھتے ہیں:
''سید احمد، رائے بریلوی صاحب کے سوانح میں ہے:
جب آپ، سکھوں کے خلاف، جہاد کرنے کو تشریف لیے جا رہے تھے
کسی شخص نے پوچھا کہ:
آپ، سکھوں پر، اتنی دور، جہاد کرنے کیوں جاتے ہیں؟
انگریز جو اِس ملک پر حاکم ہیں اور دینِ اسلام سے مُنکِر ہیں، گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے
ملک ہندوستان لے لیں۔ یہاں، لاکھوں آدمی، آپ کے شریک اور مددگار ہو جائیں گے۔''
جواب دیا کہ:
کسی کا ملک چھین کر، ہم، بادشاہت نہیں کرنا چاہتے، نہ انگریزوں کا نہ سکھوں کا
ملک لینا، ہمارا مقصد ہے۔ بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی، صرف یہی وجہ ہے کہ:

وہ ہمارے برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے
اوراذان وغیرہ، فرائضِ مذہبی ادا کرنے میں مُزاحم ہوتے ہیں۔
اگر، سکھ، اب، یا ہمارے غلبہ کے بعد، ان حرکاتِ مستوجبِ جہاد سے باز آجائیں گے
تو، ہم کو، ان سے لڑنے کی ضرورت، نہ رہے گی۔
اور سرکارِ انگریزی، گو، مُنکرِ اسلام ہے، مگر، مسلمانوں پر کچھ ظلم وتعدّی نہیں کرتی۔
اور، نہ ان کو، فرضِ مذہبی وعباداتِ لازمی سے روکتی ہے۔ پھر، ہم، سرکارِ انگریزی پر
کس سبب سے جہاد کریں؟ اور خلافِ اصولِ مذہب، طرفین کا خون، بلا سبب، گراویں؟
(ص ۷۰۔ **سوانحِ احمدی**۔ مؤلّفہ: مولوی محمد جعفر، تھانیسری۔ مطبوعہ: لاہور)
جہاد پر جانے سے قبل، سید (احمد، رائے بریلوی) صاحب نے
شیخ غلام علی، رئیسِ الہٰ آباد کی معرفت، نواب لیفٹینٹ گورنر کو، ارادۂ جہاد کی اطلاع دی۔
جواب ملا کہ: جب تک انگریزی عمل داری میں کسی فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ ہو
ہم، ایسی تیاری کے مانع نہیں ہیں۔ (ص ۷۰۔ **سوانحِ احمدی**۔ مؤلّفہ: محمد جعفر، تھانیسری۔ مطبوعہ لاہور)
اس بارے میں سر سید احمد خاں مرحوم نے بھی حسبِ ذیل، تحریر فرمایا تھا:
اس زمانہ میں علی العموم، مسلمان عوام کو سکھوں پر جہاد کرنے کی ہدایت کرتے تھے۔
ہزاروں مسلّح مسلمان اور بے شمار سامانِ جنگ کا ذخیرہ، سکھوں پر جہاد کرنے کے واسطے
جمع ہو گیا۔ مگر، جب، صاحب کمشنر اور صاحب مجسٹریٹ کو اس کی اطلاع ہوئی
تو انہوں نے گورنمنٹ کو اطلاع دی۔
گورنمنٹ نے صاف لکھا کہ: **تم کو، دست اندازی، نہ کرنی چاہیے۔''**
دہلی کے ایک مَہاجن نے جہادیوں کا روپیہ، غبن کیا
تو، ولیم فریزر، کمشنر دہلی نے ڈگری دی، جو، وصول ہو کر، سرحد بھیجی گئی۔''
(مضمونِ سرسید۔ بجواب ڈاکٹر ہنٹر، مندرجہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ، ۸؍ستمبر ۱۸۷۱ء)
سوانحِ احمدی میں، اس روپیہ کے بارے میں تحریر ہے کہ:
''سید صاحب، یاغستان میں مصروف، بہ جہاد تھے
تو سات ہزار روپیہ کی ایک ہُنڈی، پنجاب میں موصول، نہ ہونے پر، دیوانی میں دعویٰ کیا گیا۔

جس کی ڈگری، دیوانی اور ہائی کورٹ سے ملی۔''
(ص: ۷۰۔ **سوانحِ احمدی**۔ مؤلّفہ: محمد جعفر تھانیسری)
گورنمنٹ انگریزی نے، اس وقت، یہ کیوں گوارا کیا کہ:
تمام ہندوستان میں جہاد کے لئے سامانِ جنگ اور روپیہ، فراہم ہوتا رہے۔
اور گورنمنٹ کی طرف سے، نہ صرف اس کی اجازت ہو
بلکہ مجاہدین کو، ہر قسم کی امداد دی جائے اور ان کا روپیہ، وصول کر کے، انہیں دیا جائے؟
اس کا جواب، حسبِ ذیل اقتباس میں ملے گا:
''اِس میں شک نہیں کہ:
اگر، سرکار، اُس وقت، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ہوتی
تو ہندوستان سے، سید صاحب کو کچھ بھی مدد نہ پہنچتی۔
مگر، سرکارِ انگریزی، اُس وقت، دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔''
(ص: ۱۳۹۔ **سوانحِ احمدی**۔ مؤلّفہ: محمد جعفر، تھانیسری)
(ختم شد، تحریر سید طفیل احمد، منگلوری، ص: ۱۳۲ تا ۱۳۴، ''**مسلمانوں کا روشن مستقبل**''۔
مؤلّفہ: سید طفیل احمد، منگلوری۔ طبعِ جدید ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء۔ مکتبۃ الحق، جوگیشوری، بمبئی
۲۰۰۱ء۔ عکسِ طبع دسمبر ۱۹۴۵ء۔ طبعِ اول: ۱۹۳۷ء)
منشی محمد جعفر، تھانیسری (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۵ء) کی کتاب ''**سوانحِ احمدی**'' و ''**تواریخ عجیبہ**''
اور مرزا حیرت دہلوی (متوفی ۱۳؍ذوالقعدہ ۱۳۴۶ھ/۴؍مئی ۱۹۲۸ء) کی کتاب
''**حیاتِ طیبہ**'' (طبعِ اول، مطبع فاروقی، دہلی ۱۳۲۴ھ)
جناب سید احمد، رائے بریلوی وشاہ اسمٰعیل، دہلوی اور تحریکِ بالاکوٹ کے قدیم ماٰخذ ہیں۔
جن کے مشمولات کا جدید کتب ورسائل سے موازنہ کیا جائے
تو حیرت انگیز بلکہ مضحکہ خیز تضادات سامنے آئیں گے۔
تحریکِ جہاد، شروع ہونے سے بہت پہلے، سید احمد، رائے بریلوی صاحب
بانی ونوابِ ریاستِ ٹونک (راج پوتانہ) امیر خاں کے فوجی ملازم تھے۔ یہ ۱۸۱۰ء تا ۱۸۱۸ء
کی بات ہے۔ یہاں کا ایک تاریخی کارنامہ (در ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۱ء) بیان کرتے ہوئے

مرزا حیرت دہلوی (متوفی ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۸ء) لکھتے ہیں:

''۱۲۳۱ھ تک، سید احمد صاحب، امیر خاں کی ملازمت میں رہے۔
مگر، ایک ناموری کا کام آپ نے، یہ کیا کہ:
انگریزوں اور امیر خاں کی صلح کرادی۔ اور آپ ہی کے ذریعہ، جو شہر، بعد ازاں دیے گئے
اور ان پر آج تک امیر خاں کی اولاد، حکمرانی کرتی ہے، دینے طے پائے تھے۔
لارڈ ہیسٹنگ، سید صاحب کی بے نظیر کارگزاری سے بہت خوش تھا۔
دونوں لشکروں کے بیچ ایک خیمہ کھڑا کیا گیا اور اس میں تینوں آدمیوں کا
باہم معاہدہ ہوا۔ امیر خاں، لارڈ ہیسٹنگ اور سید احمد صاحب۔
سید احمد صاحب نے، امیر خاں کو، بڑی مشکل سے شیشے میں اتارا تھا۔
آپ نے، اسے یقین دلایا تھا کہ:
انگریزوں سے مقابلہ کرنا اور لڑنا بھڑنا، اگر تمہارے لئے بُرا نہیں
تو تمہاری اولاد کے لئے سمِ قاتل کا اثر رکھتا ہے۔
انگریزوں کی قوت، دن بہ دن، ترقی پذیر ہے اور تمام قومیں
دن بہ دن، تنزل کرتی جارہی ہیں۔ تمہارے بعد، فوج کو، کون سنبھالے گا؟
اور عظیم الشان لشکرِ انگلشیہ کے مقابل میں کون، میدانِ جنگ میں لا کے جمائے گا؟
یہ باتیں، امیر خاں کی سمجھ میں آ گئی تھیں۔ اور وہ اب، اس بات پر، رضامند تھا کہ:
گذارا کے لئے کچھ ملک، مجھے دے دیا جائے، تو میں، بآرام بیٹھوں۔''

امیر خاں نے ریاستوں اور ان کے ساتھ، انگریزوں کا بھی ناک میں دَم کر رکھا تھا۔
آخر، ایک بڑے مشورہ کے بعد، سید احمد صاحب کی کارگزاری سے
ہر ریاست میں سے کچھ کچھ حصہ دے کر، امیر خاں سے معاہدہ کر لیا۔
جیسے، جے پور سے ٹونک دِلوایا اور بھوپال سے سرونج۔
اِس طرح، متفرق پرگنے، ریاستوں سے بڑی قیل وقال کے بعد
انگریزوں نے دِلوا کر بپھرے ہوئے اِس شیر کو حکمت سے ایک پنجرے میں بند کر دیا۔''

(ص:۴۲۱۔ حیاتِ طیبہ۔ مؤلّفہ: مرزا حیرت دہلوی۔ مطبوعہ: لاہور)

آغازِ سفرِ جہاد و اثنائے سفرِ جہاد سے متعلق، مزید چند بیانات و حقائق و واقعات
ذیل میں پیش کیے جارہے ہیں، جن سے عام قارئین بھی از خود، بہت سے نتائج، اخذ کر سکتے ہیں۔

غیر مقلّد عالم، مولوی عبد الرحیم، صادق پوری، عظیم آبادی کا بیان ہے:

''سید صاحب کی، برابر، یہ رَوِش رہی کہ:
ایک طرف، لوگوں کو سکھوں کے مقابل، آمادۂ جہاد کرتے
اور دوسری جانب، حکومتِ برطانیہ کی امن پسندی، جتا کر
لوگوں کو اس کے مقابلے سے روکتے۔''

(ص:۲۵۲، اَلدُّرُّ الْمَنْثُور۔ از مولوی عبدالرحیم، صادق پوری۔ مطبوعہ: ہادی المطابع، کلکتہ)

مرزا حیرت دہلوی اور منشی محمد جعفر تھانیسری کا مشترکہ بیان ہے کہ:

''کلکتہ میں، جب، مولانا اسمٰعیل نے جہاد کا وعظ فرمانا، شروع کیا۔
اور سکھوں کے مظالم کی کیفیت پیش کی، تو ایک شخص نے دریافت کیا:
آپ، انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے؟
آپ نے جواب دیا:
ان پر جہاد کسی طرح، واجب نہیں ہے۔ ایک تو ان کی رعیت ہیں۔
دوسرے، ہمارے مذہبی ارکان ادا کرنے میں وہ، ذرا بھی دست اندازی نہیں کرتے۔
ہمیں، ان کی حکومت میں ہر طرح، آزادی ہے۔
بلکہ، اگر، ان پر کوئی حملہ آور ہو، تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ:
وہ، اس سے لڑیں۔ اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ، نہ آنے دیں۔''

(ص:۴۲۴، حیاتِ طیبہ از مرزا حیرت، دہلوی، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۶ء (طبع اول، مطبع فاروقی، دہلی)
و ص:۳۷۔ تواریخِ عجیبہ، مؤلّفہ: محمد جعفر تھانیسری، مطبع فاروقی، دہلی)

''سید صاحب کے پاس، مجاہدین، جمع ہونے لگے
تو سید صاحب نے مولانا اسمٰعیل کے مشورے سے شیخ غلام علی، رئیسِ الہ آباد کی معرفت
لیفٹینٹ گورنر ممالکِ مغربی شمالی کی خدمت میں اطلاع دی کہ:
ہم لوگ، سکھوں پر جہاد کی تیاری کرنے کو ہیں، سرکار کو، تو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے؟

لیفٹیننٹ گورنر صاحب نے صاف لکھ دیا کہ:

ہماری عمل داری میں اور امن میں کوئی خلل، نہ پڑے، تو ہمیں کچھ سروکار نہیں۔"

(ص:۳۰۲۔حیاتِ طیبہ۔از مرزا حیرت دہلوی۔مطبع فاروقی، دہلی)

"جب، مہیب تحریک پھیلی، تو ضلع کے حُکّام، اس سے چوکنّا ہوئے۔

اور انہیں، خوف، محسوس ہوا کہ کہیں، ہماری سلطنت میں تو رَخنہ نہیں پڑے گا؟

اِس نظر سے حُکّامِ ضلع نے حُکّامِ اعلیٰ کو لکھا۔ وہاں سے جواب آ گیا کہ:

ان سے، ہرگز، مزاحمت، نہ کرو۔ ان مسلمانوں کو، ہم سے کوئی لڑائی نہیں ہے۔

یہ سکھوں سے انتقام لینا چاہتے ہیں۔

اور حقیقت میں بات یہی تھی۔ بھلا، مسلمان کو، گورنمنٹ انگلش سے کیوں سروکار ہونے لگا؟

جہاں، وہ، اپنے دین کے ارکان، بخوبی، ادا کر سکتے تھے، اور کرتے تھے۔"

(ص:۳۷۰۔حیاتِ طیبہ۔مؤلّفہ: مرزا حیرت دہلوی۔مطبوعہ: لاہور، ۱۹۷۲ء)

شیخ غلام علی، رئیسِ الٰہ آباد کا سوال اور لفٹنٹ گورنر ممالکِ مغربی شمالی کا جواب گذر چکا، جس کا ذکر کرتے ہوئے مرزا حیرت دہلوی (متوفی ذوالقعدہ ۱۳۴۶ھ/مئی ۱۹۲۸ء) لکھتے ہیں:

"یہ تمام بیّن ثبوت، صاف صاف، اِس امر پر، دلالت کرتے ہیں کہ:

"یہ جہاد، صرف سکھوں کے لئے مخصوص تھا۔ سرکار انگریزی سے مسلمانوں کو ہرگز، مخالفت، نہ تھی۔" (ص:۵۲۳۔حیاتِ طیبہ۔مؤلّفہ: مرزا حیرت دہلوی، مطبع فاروقی، دہلی)

محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۵ء) لکھتے ہیں:

"آپ کی سوانح عمری اور مکاتیب میں، بیس (۲۰) سے زیادہ، ایسے مقامات ہیں:

جہاں، کُھلے کُھلے اور اعلانیہ طور پر، سید صاحب نے بدلائلِ شرعی

اپنے پیَرو لوگوں کو، سرکار انگریزی کی مخالفت سے منع کیا ہے۔"

(ص:۲۲۶۔سوانحِ احمدی۔مؤلّفہ: محمد جعفر، تھانیسری، مطبوعہ: اسٹیم پریس، لاہور)

"اِس سوانح اور مکتوباتِ منسلکہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ:

سید صاحب کا، سرکار انگریزی سے جہاد کرنے کا ارادہ، ہرگز، نہ تھا۔

وہ، اِس عمل داری کو اپنی ہی عمل داری، سمجھتے تھے۔

اور اِس میں شک نہیں کہ: اگر، سرکار انگریزی، اُس وقت، سید صاحب کے خلاف ہوتی

تو، ہندوستان سے، سید صاحب کو کچھ مدد نہ پہنچتی۔

مگر، سرکار انگریزی، اُس وقت، دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔"

(ص:۱۸۲۔تواریخِ عجیبہ۔مؤلّفہ: محمد جعفر تھانیسری)

نواب صدیق حسن، بھوپالی (متوفی جمادی الآخرہ ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء) لکھتے ہیں:

"نہ، انہوں نے سرکار انگریزی سے کبھی جہاد کیا، اور، نہ ہندوستان میں جہاد کا فتویٰ لکھا۔

..........گورنمنٹ اگر ساری کتابوں کو جمع فرما کر ملاحظہ کرے گی

تو کسی کتاب میں ان کتب سے مسئلہ جہاد، یا۔ بغاوت کا، سرکارِ انگلشیہ سے

یا۔ فساد سکھانے والی کوئی بات، نہیں پاوے گی۔"

(ترجمانِ وہابیہ۔مؤلّفہ: نواب صدیق حسن، بھوپالی، مطبوعہ: امرتسر، پنجاب)

سر سید احمد خاں (متوفی مارچ ۱۸۹۸ء) اپنے رسالہ

"اسبابِ بغاوتِ ہند" مطبوعہ ۱۸۵۸ء میں لکھتے ہیں:

"بیس تیس برس پیشتر، ایک بہت بڑے نامی مولوی، محمد اسمٰعیل نے ہندوستان میں جہاد کا اعلان کیا اور آدمیوں کو جہاد کی ترغیب دی۔ اُس وقت انہوں نے صاف، بیان کیا کہ:

"ہندوستان کے رہنے والے، جو سرکار انگریزی کے امن میں رہتے ہیں

ہندوستان میں جہاد نہیں کر سکتے۔

اس لئے ہزاروں آدمی جہادی، ہر ضلع ہندوستان میں جمع ہوئے اور سرکاری عمل داری میں کسی طرح کا فساد نہیں کیا اور غربی سرحدِ پنجاب پر جا کر لڑائی کی۔"

(ص:۸۱۰۔حیاتِ جاوید۔مؤلّفہ: خواجہ الطاف حسین حالی، مطبوعہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی۔ طبع پنجم۔۲۰۰۴ء)

مولانا فضلِ حسین، بہاری (متوفی ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۶ء) شاگردِ مولانا نذیر حسین، بہاری دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) لکھتے ہیں:

"آپ (شاہ محمد اسمٰعیل) اپنے شیخِ طریقت، سید احمد صاحب کو، امام تسلیم کر کے

مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ، جہاد کے لئے پنجاب پہنچے۔
گورنمنٹ انگلشیہ نے بھی آپ کے اِس ارادے میں
کسی طرح کی مزاحمت، یا پیچیدگی، پیدا نہیں کی۔"

(ص: ۱۳۴۔ اَلْحَیَاةُ بَعْدَ الْمَمَاة۔ مؤلّفہ: فضلِ حسین، بہاری۔
مطبوعہ: اَلکتاب انٹرنیشنل، مرادی روڈ، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی ۲۵۔)

مولانا محمد حسین، بٹالوی (متوفی ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء) شاگردِ مولانا نذیر حسین، بہاری، دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) لکھتے ہیں:

"سید صاحب، مولوی اسمٰعیل صاحب نے انگریزوں سے جہاد کا ارادہ، نہیں کیا۔
اور مولوی اسمٰعیل صاحب نے کلکتہ میں اپنی مجلسِ وعظ میں، برملا کہہ دیا کہ:
ہم کو، انگریزوں سے جہاد کرنا، جائز نہیں۔"

(ص: ۵۔ ضمیمہ: ۶، جلد: ۲۔ **اِشاعةُ السُّنّہ**، لاہور۔ از محمد حسین، بٹالوی)

مذکورہ حقائق اور اپنی سابقہ تاریخ کی تکذیب و تردید کرتے ہوئے
دَورِ مابعد کے بعض عُلما و مؤرخین نے طبع زاد اور فرضی تاریخ نویسی، بلکہ تاریخ گری کا
جو عجوبۂ روزگار کارنامہ انجام دیا ہے، اُسے دیکھ کر، اِس کے سِوا، اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

ناطقہ سر بگریباں ہے، اِسے کیا کہیے؟
خامہ انگشت بدنداں ہے، اِسے کیا لکھیے؟

اِس موضوع کے خصوصی محقق و مؤرخ، غلام رسول مہر (متوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) کے خیالات، بلکہ ان کی جسارت و دیدہ دلیری، آغازِ تحریر ہی میں آپ، ملاحظہ فرما چکے ہیں۔
اب بے سند اور فرضی تاریخ گری کے، دو نادِر نمونے، ذیل میں مزید، ملاحظہ فرماتے چلیں:
"**سکھ مخالف مُہم**"، کو "**انگریز مخالف مُہم**" کی شکل دینے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے
سابق صدر جمعیة العلماء ہند، مولانا حسین احمد مدنی (متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء)
سابق شیخ الحدیث، دارالعلوم دیوبند "**جہاد کا مقصد**" کے ذیلی عنوان کے تحت
بحوالہ ماہنامہ، برہان۔ دہلی۔ جلد ۲۱۔ اگست ۱۹۴۸ء۔ یوں، تحریر فرماتے ہیں:

"سید صاحب کا اصل مقصد، چوں کہ:

ہندوستان سے انگریزی تسلُّط و اِقتدار کا قلع قمع کرنا تھا
جس کے باعث، ہندو اور مسلمان، دونوں ہی پریشان تھے۔
اِس بِنا پر آپ نے اپنے ساتھ، ہندوؤں کو بھی شرکت کی
دعوت دی اور اس میں صاف صاف، انہیں بتا دیا کہ:
"آپ کا واحد مقصد، ملک سے پردیسی لوگوں کا اقتدار، ختم کر دینا ہے۔
اس کے بعد، حکومت کس کی ہوگی؟ اِس سے آپ کو، غرض نہیں۔
جو لوگ، حکومت کے اہل ہوں گے۔ ہندو، یا مسلمان، یا دونوں، وہ حکومت کریں۔"

(ص: ۱۹۔ حصہ دوم۔ نقشِ حیات۔ (۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء) مؤلّفہ: مولانا حسین احمد مدنی۔
مکتبہ دینیہ، دیوبند، ضلع سہارن پور۔ ۱۹۹۹ء)

اِس تحریر پر، تبصرہ کرتے ہوئے فاضلِ دارالعلوم، دیوبند
مولانا عامر عثمانی (متوفی ۱۹۷۵ء) مدیر ماہنامہ تجلی، دیوبند لکھتے ہیں:
"کوئی شک نہیں، اگر، استادِ محترم، حضرت مدنی کے ارشادِ گرامی کو
درست مان لیا جائے، تو حضرت شاہ اسمٰعیل کی شہادت، محض افسانہ بن جاتی ہے۔
مادّی پریشانیوں کو، رفع کرنے کے لئے غیر ملکی حکومت کے خاتمے کی کوشش کرنا
ذرا بھی مقدس نَصبُ العین نہیں۔ اِس نَصبُ العین میں کافر و مومن، سب، یکساں ہیں۔
اِس طرح کی کوشش کے درمیان، مارا جانا، بھلا اُس شہادت سے کیا تعلق رکھے گا
جو، اسلام کی ایک معزز ترین مخصوص اصطلاح ہے۔
اور اِس طرح کی کوششوں کے نتیجے میں قید و بند کی مصیبتیں اٹھانا
اَجرِ آخرت کا موجب کیوں ہوگا؟" (**ماہنامہ تجلی، دیوبند**۔ شمارہ مئی ۱۹۷۳ء)

ابو یحییٰ امام خاں، نوشہری (متوفی رمضان ۱۳۸۵ھ/جنوری ۱۹۶۶ء) رفیقِ مولانا ثناء اللہ امرتسری (متوفی ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) بعنوان "**ترغیبِ جہاد**" اس طرح، دادِ تحقیق دے رہے ہیں:
"سیدنا شاہ محمد اسمٰعیل شہید نے اپنے پیر و مُرشد، حضرت امیر المؤمنین، سید احمد، بریلوی
علیہ الرحمۃ کی قیادت میں، جس جہاز و جہاد میں شرکت و شہادت کا مرتبہ، حاصل کیا
اس کے بانی، جناب السید ممدوح مرحوم کے پیر و مرشد، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب

علیہ الغفر ان ہی تھے کہ صوبہ پنجاب میں مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم
شاہ (عبدالعزیز) صاحب کی زندگی میں ٹوٹنے لگے تھے۔
مگر، کوئی ایسا مردِ میدان، نہ تھا کہ اس فتنہ کو دبانے کے لئے سربکف ہو کر نکل آئے۔
تا آنکہ آپ کے برادرزادہ، سیدنا شہید (شاہ محمد اسمٰعیل) نے ہوش سنبھالا۔
اور حضرت السید احمد (امام الوقت) کی بیعت کا، ربقہ، اپنی گردن میں ڈال کر
جامع مسجد، دہلی کی سیڑھیوں پر، اِس زور سے نعرۂ جہاد کو بلند کیا کہ:
اس کی آواز، پنجاب کی فضا کو چیر کر، کوہستانِ کشمیر تک جا پہنچی۔
اِس تحریص وتحریض علی الجہاد کے بانی، جناب شاہ عبدالعزیز مرحوم تھے۔'' الخ۔
(ص ۸۹، ۹۰۔ **تراجم علمائے اہل حدیث**۔ مولّفہ: ابویحییٰ امام خاں، نوشہروی۔
مطبوعہ: اَلکتاب انٹرنیشنل، مُرادی روڈ، بٹلہ ہاؤس۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵۔)

'' یہاں، یہ بتا دینا، ضروری ہے کہ:
یہ سلسلۂ بیعت، شاہ عبدالعزیز صاحب سے شروع ہوتا ہے کہ:
شاہ صاحب ممدوح، بنفسہٖ، سکھوں کے مظالم کی وجہ سے، ان کے ساتھ، جہاد کے متمنی تھے
(جیسا کہ آپ کے حالات میں بیان کیا جا چکا ہے)
مگر، ضعفِ پیری اور کفِّ بصر کے ہاتھوں، بے بس تھے۔
چنانچہ، جب، سید صاحب، دہلی سے باہر، بیعت کے لئے دَورہ کو نکلے
تو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنا سیاہ عمامہ اور سفید قبا، دستِ مبارک سے
سید صاحب کو پہنا کر، رخصت کیا۔'' (ص ۱۱۵۔ **تراجم علمائے اہلِ حدیث**۔ مولّفہ: ابویحییٰ امام خاں
نوشہروی۔ مطبوعہ اَلکتاب انٹرنیشنل۔ مُرادی روڈ۔ بٹلہ ہاؤس۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵۔)

یہاں، دوبارہ، وہی بات، عرض کی جائے گی کہ:
''**سکھ مخالف مُہم**'' کو ''**انگریز مخالف مُہم**'' قرار دینے کا عمل
سابقہ روایتوں اور شہادتوں کی روشنی میں ''**سفید جھوٹ**'' اور ''**پروپیگنڈہ مُہم**'' کے سِوا، اور کیا ہے؟
اِسی طرح ''تحریکِ بالاکوٹ'' کا رشتہ، حضرت شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی سے جوڑنے
اور انہیں، بانیِ تحریک کہنے اور لکھنے کی جسارت بھی اہلِ علم ومطالعہ کے نزدیک

''**بے بنیاد نکتہ آفرینی**'' اور ''**پادَر ہوا**'' کے علاوہ، کچھ بھی نہیں ہے۔
تاریخ نویسی کے نام پر، تاریخ گری کی اِس جسارت پر، مؤرخین بھی بلبلا اٹھیں گے کہ:

''**حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنے افکار میں**
جہاں، تقلیدِ شخصی کی بندھنیں ڈھیلی کیں، توحید وسنّت کو فروغ دیا۔
اسلام فہمی کے ایک نئے اصول فقہ الحدیث کی طرح ڈالی۔
وہاں، مسلمانوں کے خُفتہ جہادی جذبات کو فروغ دینے کی کوشش کی۔
اور حُریتِ فکر کے ساتھ، جذبۂ جہاد کو اُبھارا۔
اِسی مشن کو آگے بڑھانے کے لئے اُن کے سب سے بڑے صاحبزادے
شاہ عبدالعزیز نے مسلمانوں سے مسلّح جہاد کی اپیل کی۔
اور اس سلسلے میں اپنے شاگرد، سید احمد شہید، متوفیٰ ۶ رمئی ۱۸۳۱ء کو، امیرِ جہاد، مقرر فرمایا۔
اور اپنے بھتیجے، سیدنا اسمٰعیل شہید، اپنے داماد اور بھانجے، مولانا عبدالحئی شاہ، بڈھانوی کو
ان کے ساتھ کر دیا۔ بعدازیں، شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی، وفات پا گئے۔
شاہ (عبدالعزیز) صاحب کے جانشینوں نے مرکز میں شاہ عبدالعزیز کے نواسے
شاہ محمد اسحٰق کو، امیرِ جہاد، مقرر کیا۔ شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد شہید نے جہاد کی تیاریاں، شروع کر دیں
اور مجاہدین کی بھرتی، شروع کر دی۔'' الخ۔ (ص: ۲۵۲۔ **تحریکِ اہلِ حدیث! تاریخ کے آئینے میں**۔
مؤلّفہ: قاضی محمد اسلم سیف فیروزپوری۔
مطبوعہ: اَلکتاب اِنٹرنیشنل۔ بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر نئی دہلی۔ اپریل ۱۹۹۶ء)

فرضی تاریخ نویسی کی، یہ حوصلہ افزائی بھی کچھ کم، عبرت ناک نہیں ہے کہ:
مولانا ابوالحسن علی ندوی، سابق ناظمِ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ (متوفی دسمبر ۱۹۹۹)
رقم طراز ہیں:

''**اِس کا کوئی تحریری ثبوت، ابھی تک نہیں ملا ہے کہ:**
حضرت سید صاحب، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی صریح ہدایت اور حکم سے
نواب امیر خاں (بانی ونواب ریاستِ ٹونک، راجپوتانہ) کے لشکر میں گئے۔
لیکن، اس کا قرینہ، ضرور پایا جاتا ہے کہ:

یہ اِقدام، حضرت شاہ صاحب کے ایما، یا۔ کم از کم، تائید و پسندیدگی سے ہوا۔‘‘

(ص ۳۷۱۔ **تاریخِ دعوت و عزیمت**۔ مؤلّفہ: مولانا ابوالحسن علی، ندوی۔

مطبوعہ: تحقیقات و نشریاتِ اسلام، ندوہ، لکھنؤ۔ طبعِ پنجم۔ ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء)

اِس ’’**قرینہ**‘‘ کی کوئی بنیاد اور اس کی داخلی، یا۔ خارجی شہادت، ضرور ہونی چاہیے۔

ورنہ، حضرت شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی کے احوال و آثار و خدمات پر مُطّلع

عُلما و مؤرخین اِسے بھی محض ’’**ذہنی پیداوار**‘‘ اور ’’**ایجادِ بندہ**‘‘ قرار دیں گے۔

کیوں کہ ’’**قرینہ**‘‘ سے محض ’’**اِمکان**‘‘ کی گنجائش ہوا کرتی ہے۔

جس کے ’’**وقوع**‘‘ کو ثابت کرنے کے لئے، روایت و شہادت کی ضرورت ہے۔

اور یہ روایت و شہادت بھی معقول و مستند ہونی چاہیے۔

حقیقت، یہ ہے کہ اِس قسم کا تصوراتی محل، مولانا عُبید اللہ، سندھی (متوفی اگست ۱۹۴۴ء) نے
سب سے پہلے اپنی کتاب ’’**شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک**‘‘ میں تعمیر کیا ہے۔

جسے مولانا مسعود عالم، ندوی ’’**حزبِ ولی اللہ کی تشکیل اور مَن مانی توجیہ**‘‘ قرار دیتے ہیں۔

(ص ۸۔ **ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک**۔ مؤلّفہ: مسعود عالم ندوی۔

مطبوعہ: مرکزی مکتبہ اسلامی۔ ابوالفضل انکلیو۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵)

مولانا عبیدُ اللہ، سندھی اپنے اِختراعی و فرضی بورڈ کے بارے میں لکھتے ہیں:

**’’مولانا محمد اسحٰق، مکہ معظّمہ میں اپنے بھائی، مولانا محمد یعقوب، دہلوی کو اپنے ساتھ لے گئے
اور دہلی میں مولانا مملوک علی کی صدارت میں مولانا قطب الدین، دہلوی
مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور مولانا عبدالغنی، دہلوی کو ملا کر ایک بورڈ بنا دیا۔
جو، اس نئے پروگرام کی اشاعت کر کے، نئے سرے سے جماعتی نظام پیدا کرے۔
یہی جماعت ہے، جو آگے چل کر ’’دیوبندی نظام‘‘ چلاتی ہے۔‘‘**

(ص: ۹۸۔ **شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک**۔ مؤلّفہ: مولانا عبیدُ اللہ سندھی، مطبوعہ: لاہور)

مولانا فیصل احمد، ندوی، بھٹکلی، استاذِ دارالعلوم ندوۃ العُلما، لکھنؤ، اِس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

**’’مولانا عُبیدُ اللہ سندھی نے ’’شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک‘‘ میں
شاہ محمد اسحٰق (دہلوی) کے قائم کردہ، جس بورڈ کا ذکر کیا ہے، نیز، تُرکی سلطنت کے اِتّصال**

**کے بارے میں، جو کچھ لکھا ہے، وہ، ان کی ’’ذہانت کی پیداوار‘‘ ہے۔
حقیقت سے، اس کا کوئی تعلق نہیں۔ معتبر ذرائع سے،، اس کی تائید نہیں ہوتی۔
بورڈ سے متعلق، مولانا سندھی ہی کے مَتن کی، مولانا سید محمد میاں نے ’’عُلمائے ہند کا
شاندار ماضی‘‘ میں تشریح کی ہے۔ یا۔ بالفاظِ دیگر، اُنھیں کی بنیاد پر عمارت کھڑی کی ہے۔
اِسی طرح، سلطنتِ عثمانیہ سے رَبط، اور حجاز میں بیٹھ کر، شاہ صاحب (شاہ محمد اسحٰق، دہلوی)
کی اِس سلسلے کی کوششوں کو بھی تحریکِ آزادی پر لکھنے والے بعض مصنفین نے خوب پھیلا کر بیان کیا
ہے۔........ کچھ، اِس قسم کی تفصیل، بیان کی ہے، جیسے، حقیقتِ حال کا بیان ہے۔**

**یہاں، مولانا نورُالحسن راشد کاندھلوی کے خط کا ایک اِقتباس، فائدہ سے خالی نہیں ہوگا۔
جس میں، وہ لکھتے ہیں:**

**’’دراصل، یہ قصہ ہی سرے سے غلط اور بے اصل ہے کہ:
ہندوستان کی آزادی اور انگریزوں کے خلاف، عملی جدوجہد کے لئے
حضرت شاہ عبدالعزیز، یا۔ حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب نے کوئی بورڈ بنایا ہو۔
اِس کی اطلاع، میری معلومات میں صداقت سے عاری ہے۔
یہ بات، مولانا عُبید اللہ سندھی کی کتاب ’’شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک‘‘ سے
چلی ہے۔ مولانا نے، اس کے لئے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔
اور جو دیگر اطلاعات و مآخذ ہیں، وہ، اس کی کسی طرح بھی، تائید نہیں کرتے۔
شاہ محمد اسحٰق، اِس قسم کا کوئی بورڈ، یا مشاورتی انجمن بناتے، تو اس کا کوئی اور بھی کہیں ذکر کرتا۔
کسی خط، تحریر، وعظ، تقریر میں اس کا ذکر آتا۔ مگر، کچھ بھی نہیں ہے۔
بہر حال! یہ روایت، جہاں بھی ہے، مولانا سندھی سے لی گئی ہے۔
جو کسی طرح بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔
میری زیرِ طبع کتاب ’’مولانا مملوک العلی‘‘ میں بھی اس پر بحث ہے۔
میں نے اس کو، بالکل رَد کر دیا ہے۔‘‘**

(حاشیہ ص ۲۷۶ و ۲۷۷۔ **تحریکِ آزادی میں عُلما کا کردار**۔ مؤلّفہ: فیصل احمد، ندوی، بھٹکلی۔

مطبوعہ: مجلسِ تحقیقات و نشریاتِ اسلام، ندوہ لکھنؤ۔ طبعِ دوم: رمضان ۱۴۲۷ھ/اکتوبر ۲۰۰۶ء)

مولانا فیصل احمد ندوی، مزید لکھتے ہیں:

''شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتوی کے تعلق سے بھی مضمون نگاروں نے

بالکل بے سروپا باتیں لکھی ہیں۔ ان کی وضاحت، یہاں، ضروری، معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً:

جناب، ضیاء الدین صدیقی (اورنگ آباد) لکھتے ہیں:

''ٹیپو سلطان نے ایک خط میں شاہ صاحب کے جہادی فتوی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''محض ایمان اور آزادی کے تحفظ کے لئے انگریزوں سے لڑ رہا ہے۔''

(ششماہی ''الحرکۃ'' نئی دہلی۔ جلد ۱۔ شمارہ ۲، رجب تا ذوالحجہ ۱۴۱۸ھ / مطابق نومبر ۱۹۹۷ء تا اپریل ۱۹۹۸ء۔ صفحہ ۷)

جب کہ، ٹیپو سلطان کی شہادت، بالاتفاق مئی ۱۷۹۹ء میں ہوئی۔ اور یہ فتوی، مندرجہ بالا صراحتوں کے مطابق ۱۸۰۳ء کے بعد کا ہے۔ پھر، سلطان ٹیپو کی، اس سے واقفیت، کیسی؟

............میں نے ٹیپو سلطان پر علمی کام کرنے والوں میں ڈاکٹر بی یو علی شیخ صاحب

جناب سید خورشید مصطفیٰ رضوی صاحب اور مولانا الیاس ندوی صاحب سے رابطہ کیا۔

نیز، خانوادۂ ولی اللّٰہی پر تحقیقی نظر رکھنے والوں میں پروفیسر نثار احمد فاروقی

اور مولانا نور الحسن راشد، کاندھلوی سے رجوع کیا، مگر، سب نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا۔

ٹیپو سلطان کی، شاہ عبدالعزیز صاحب سے مراسلت

یا۔ ٹیپو کی شاہ صاحب کے فتوی سے واقفیت، کوئی بات،، تاریخ سے ثابت نہیں۔

............ایک دن، مولانا ضیاء الدین، فاروقی (پاکستان) کی

ایک مطبوعہ تقریر بعنوان ''علمائے دیوبند کون ہیں اور کیا ہیں؟'' پر نظر پڑی۔

اس میں وہ، شاہ عبدالعزیز صاحب کے متعلق ایک جگہ کہتے ہیں:

۱۷۶۳ء میں، اس بچہ نے دیکھا کہ:

انگریز کا بڑے بڑے علاقوں پر تسلّط ہو گیا ہے۔ ۱۷۷۲ء میں سب سے پہلے ہندوستان کی تاریخ میں جس شخص نے انگریز کے خلاف، دشمنی کا بیج بویا، وہ شاہ عبدالعزیز تھے۔

انہوں نے، سب سے پہلے، انگریزی حکومت، انگریزی ذرّیت، انگریزی قوم کے خلاف جہاد کا فتوی، جاری کیا........سلطان ٹیپو نے ۱۷۷۲ء میں شاہ عبدالعزیز کے فتوی............

ٹیپو کے وہ خطوط اُٹھا کر دیکھو، جو انہوں نے سید احمد شہید کو لکھے۔

وہ کہتے ہیں کہ انگریز کو ختم کر کے برِصغیر پر اسلامی حکومت، قائم کرنا چاہتا ہوں۔'' (۱۳۔۱۴)

............جس کی تاریخ پر نظر ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ:

اس میں کیا کیا غلطیاں ہیں۔ البتہ، صرف آخری فقرہ کے متعلق، اتنا عرض ہے کہ:

ٹیپو کی شہادت کے وقت، سید احمد شہید، صرف بارہ برس کے لڑکے تھے

اور تکیہ کلاں رائے بریلی میں محصور۔

دنیا سے ابھی ان کا سابقہ، نہیں پڑا تھا۔ پھر، سلطان (ٹیپو) سے مراسلت کیسی؟''

(حاشیہ ص ۲۵۲ تا ۲۵۴۔ تحریکِ آزادی میں عُلما کا کردار۔ مؤلّفہ: فیصل احمد، ندوی، مطبوعہ لکھنؤ۔ طبع دوم ۲۰۰۶ء)

جس سفرِ ٹونک کو، حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کی ہدایت و رہنمائی کا نتیجہ، قرار دیا گیا۔

اور کوئی سند اور روایت، نہ ہونے کی کمزوری کو ''قرینہ'' کے حوالے کر دیا گیا تھا

اُس سے آگے بڑھ کر، معروف غیر مقلّد عالم و مؤرخ، غلام رسول مہر صاحب کہتے ہیں کہ:

یہ سفرِ ٹونک ''اشارۂ غیبی'' کے مطابق ہوا تھا۔ چنانچہ، مہر صاحب لکھتے ہیں:

''اوپر، جو کچھ بیان ہوا ہے، اُس سے صاف آشکارا ہے کہ:

سید صاحب نے بطورِ خود، یہ فیصلہ، صادر فرمایا۔ شاہ (عبدالعزیز) صاحب کے اَمر و حکم کا اِس اِقدام سے کوئی تعلق، نہ تھا۔ انہیں، رائے بریلی ہی میں اشارۂ غیبی ہوا کہ:

نواب کے پاس جاؤ۔ چنانچہ، وہ نکل پڑے اور دہلی ہوتے ہوئے راجپوتانہ (ٹونک) پہنچ گئے۔''

(ص ۹۳۔ سید احمد شہید۔ مؤلّفہ: غلام رسول مہر۔ طبعِ سوم: لاہور۔ ۱۹۶۸ء)

''خود، سید صاحب کا بیان ہے کہ:

غیبی اشاروں کی بنا پر، وہ، نواب صاحب کے لشکر میں گئے تھے۔

وقائع میں ہے کہ جب وہ لشکر میں تھے، تو ایک روز فرمایا:

قصبہ رائے بریلی میں مجھ کو جنابِ الٰہی سے اِلہام ہوا:

''یہاں سے نوابِ نامدار، امیر الدَّولہ بہادر کے لشکر میں جا۔

وہاں کی خدمت، ہم نے تجھ کو دی۔ وہاں، ہم کو تجھ سے کچھ اور بھی کام لینے ہیں۔''

یہ مژدۂ غیب سن کر، مَیں وہاں سے روانہ ہوا۔

چند روز میں آ کر ملازمت، نواب ممدوح صاحب کی، حاصل کی۔''

(ص ۸۷۔ **سید احمد شہید**۔ مؤلّفہ: غلام رسول مہرؔ، مطبوعہ: لاہور)

ریاستِ ٹونک (راجپوتانہ) کی خدمت کے دَوران، ایک کام کا ذکر کرتے ہوئے
اور امیر خاں کی انگریز سے ایک جنگ کی حیرت انگیز منظر کشی کرتے ہوئے
غیر مقلّد عالم، محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۹۰۵ء) لکھتے ہیں:

''ایک روز کا ذکر ہے کہ:

لشکرِ نواب امیر خاں مرحوم، انگریزوں کے لشکر سے لڑ رہا تھا۔ دونوں طرف توپ اور بندوقیں چل رہی تھیں۔ اُس وقت، سید صاحب اپنے خیمے میں تشریف رکھتے تھے۔

آپ نے اپنا گھوڑا تیار کرایا اور اس پر سوار ہو کر مثل ہَوا کے، دونوں لشکروں کو چیرتے ہوئے اُس مقام پر پہنچ گئے، جہاں، انگریزی فوج کا سپہ سالار مع اپنے مُصاحبوں کے، کھڑا تھا۔

پس، وہاں سے، اس سپہ سالار کو لے کر
پھر، دونوں لشکروں کو چیرتے ہوئے اپنے خیمے تک چلے آئے۔
یہاں آ کر تھوڑی سی بات چیت کے بعد، سپہ سالارِ مذکور نے عہد کر لیا کہ:
میں، اسی دم اپنے لشکر کو بمقابلہ نواب امیر خاں سے واپس لے جاؤں گا۔
اور پھر مقابلہ کو نہ آؤں گا۔ بلکہ جہاں تک ممکن ہوگا
اپنی سرکار کو، اس بات پر مجبور کروں گا کہ نواب امیر خاں سے صلح کر لے۔''
اِس واقعہ کے بعد، پھر، سرکارِ انگریزی اور نواب امیر خاں میں جنگ نہیں ہوئی۔
بلکہ صلح کی بات چیت اور رَسل و رسائل، شروع ہو گئے۔
اور، لارڈ ہسٹنگ صاحب بہادر، وائسرائے ہند کے عہد میں ٹونک کا ملک نواب صاحب کو دے کر صلح کر لی گئی۔

(ص ۷۱۔ **حیاتِ طیبہ** (حیاتِ سید احمد شہید) مؤلّفہ: محمد جعفر تھانیسری۔ مطبوعہ: کراچی۔ ۱۹۶۸ء)

صلح کی اِس بات کے بعد، ۱۸۱۶ء میں سید صاحب، دہلی کے لئے روانہ ہوتے وقت
جو پیش گوئی کر گئے، اُس کے بارے میں نواب امیر خاں کے فرزند
وزیر الدّولہ اپنے ''**وصایائے وزیری**'' میں، اِس طرح لکھتے ہیں:

سید صاحب نے مولوی نذیر محمد صاحب سے کہ وہ بھی اس لشکر میں موجود تھے

اپنے رخصت ہونے کے وقت فرمایا تھا کہ:

''اب، جلد، صلح ہو جائے گی۔ اور فلاں فلاں شہر، فلاں فلاں علاقہ سرکارِ انگریزی، نواب صاحب کو دے دے گی۔''

اِس پیشین گوئی کا ذکر کرنے کے بعد
نواب وزیر الدّولہ، فرزندِ امیر خاں، بانی و نوابِ ریاستِ ٹونک لکھتے ہیں:

''موافق، اِس پیشین گوئی کے، جو جو شہر اور ممالک، آپ نے بتائے تھے ٹھیک، وہی، سرکارِ انگریزی نے ہم کو دیے اور صلح ہو گئی۔''

(ص ۷۱ و ۷۲۔ **حیاتِ طیبہ** (حیاتِ سید احمد شہید) مؤلّفہ: محمد تھانیسری، مطبوعہ کراچی)

مرزا حیرت دہلوی (متوفی ذوالقعدہ ۱۳۴۶ھ/مئی ۱۹۲۸ء) نے
اِس صلح و کارگذاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ایک ناموری کا کام، آپ (سید احمد، رائے بریلوی) نے یہ کیا کہ:
''انگریزوں اور امیر خاں کی صلح کرا دی۔ اور آپ ہی کے ذریعہ، جو شہر، بعد ازاں دیے گئے اور جن پر آج تک امیر خاں کی اولاد، حکمرانی کرتی ہے، دینے طے پائے تھے۔
لارڈ ہسٹنگ، سید صاحب کی بے نظیر کارگذاری سے بہت خوش تھا۔
دونوں لشکروں کے بیچ میں ایک خیمہ کھڑا کیا گیا۔ اور اس میں تین آدمیوں کا، باہم معاہدہ ہوا۔
امیر خاں، لارڈ ہسٹنگ، اور سید احمد۔'' الخ (ص ۴۲۱۔ **حیاتِ طیبہ**۔ مؤلّفہ: مرزا حیرت، دہلوی۔ مطبوعہ: لاہور ۱۹۷۶ء۔ طبعِ اول، مطبع فاروقی، دہلی)

بہر حال! سفرِ بالاکوٹ (۱۸۲۶ء) اور سکھوں و پٹھانوں سے جہاد کا
انجام (۱۸۳۱ء) کچھ اِس طرح ہوا کہ:

''چنانچہ، ۱۸۲۴ء میں وہابیوں نے پہاڑیوں پر، جا کر قیام کیا۔
اور انھوں نے اس بات کا قصد کیا کہ سکھوں پر ہم لوگ، جہاد کریں اور شہید ہوں۔
لیکن، چونکہ پہاڑی قومیں، ان کے عقائد کی مخالف تھیں۔ اس لئے وہ وہابی
ان پہاڑیوں کو ہرگز، اس بات پر راضی نہ کر سکے کہ وہ ان مسائل کو بھی اچھا سمجھتے۔
مگر، چونکہ وہ سکھوں کے جور و ستم سے نہایت تنگ تھے

اِس سبب سے، وہابیوں کے اس منصوبے میں شریک ہو گئے کہ:
سکھوں پر حملہ کیا جاوے اور آخر کار، وہابیوں اور پہاڑیوں نے متفق ہو کر حملہ بھی کیا۔
لیکن، یہ قوم، چونکہ، مذہبی مخالفت میں نہایت سخت ہے
اِس سبب سے، اس قوم نے آخر میں وہابیوں سے دغا کر کے سکھوں سے اتفاق کر لیا۔
اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب اور سید احمد صاحب کو شہید کر دیا۔''

(ص ۱۳۹ و ۱۴۰۔ **مقالاتِ سرسید**، حصہ نہم۔ مطبوعہ: لاہور)

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے کہ:

''سید احمد صاحب کو، اُتمان زَئی قبیلہ نے قتل کر ڈالا تھا۔''

(ص ۳۴۔ **ہمارے ہندوستانی مسلمان**۔ مؤلّفہ: ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر۔
مطبوعہ: اَلکتاب انٹرنیشنل، مُرادی روڈ، بٹلہ ہاؤس۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی)

مولانا محمد ابراہیم میر، سیالکوٹی (متولد ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۱ء۔ متوفی ۱۳۷۶/۱۹۵۶ء)
شاگردِ مولانا نذیر حسین، بہاری، دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء)
شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی کے بارے میں لکھتے ہیں:
''پنجاب میں سکھوں کے ساتھ، آپ نے متعدد جہاد کیے۔
مگر، بعض لوگوں کی بے وفائی کی وجہ سے آپ اپنے پیر، سید احمد شہید کے ہمراہ
لڑتے ہوئے ۱۲۴۶ھ میں بمقام بالاکوٹ (علاقۂ سرحد) زخمِ تفنگ سے شہید ہوئے۔''

(ص ۴۲۲۔ **تاریخِ اہلِ حدیث**۔ مؤلّفہ: محمد ابراہیم میر، سیالکوٹی۔
مطبوعہ: اَلکتاب انٹرنیشنل۔ بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ستمبر ۱۹۹۵ء)

جب کہ فتح و نصرت کی بشارتوں اور اِلہامات کا عالم، یہ تھا کہ:
بار بار، غیبی اشارے ہو رہے تھے اور ان کا ذکر و اعلان کر کے اپنی جماعت کے لوگوں میں
یہ جذبۂ جہاد پیدا کیا جا رہا تھا اور اپنی کامیابی کا یقین دلایا جا رہا تھا۔
چنانچہ، روانگیِ رائے بریلی، بارادۂ جہادِ پنجاب (۱۸۲۶ء) کا یہ اِلہام، بیان کیا جاتا ہے:
''سید محمد یعقوب، آپ کے بھانجے سے، روایت ہے کہ:
بروقتِ روانگیِ خراسان، آپ اپنی ہمشیرہ یعنی والدۂ سید محمد یعقوب سے

رخصت ہونے لگے، تو آپ نے ان سے فرمایا کہ:
'' اے میری بہن! میں نے تمہیں خدا کے سپرد کیا اور یہ بات، یاد رکھنا کہ:
'' جب تک، ہند کا شِرک اور ایران کا رِفض اور چین کا کفر اور افغانستان کا نِفاق
میرے ہاتھوں سے مَحو ہو کر، ہر مُردہ سنّت، زندہ نہ ہو جائے گی
اللہ ربّ العزت مجھ کو نہیں اُٹھائے گا۔ اگر، قبل از ظہورِ اِن واقعات کے
کوئی شخص، میری موت کی تم کو خبر دے اور تصدیق پر حلف بھی اٹھائے
تو تم اس کے قول پر، ہرگز اعتبار نہ کرنا۔ کیوں کہ، میرے رب نے مجھ سے وعدۂ واثق کیا ہے کہ:
ان چیزوں کو میرے ہاتھ پر، پورا کر کے مارے گا۔''
آپ (سید صاحب) کے سفرِ جہاد سے پہلے، آپ کو، یہ اِلہامِ رَبّانی ہوا تھا کہ:
ملکِ پنجاب آپ کے ہاتھوں پر فتح ہو کر، پشاور سے دریائے ستلج تک
مثل ملک ہندوستان کے، رشکِ اَفزائے چمن ہو جائے گا۔
چنانچہ، ان متواتر وعدہ ہائے فتح سے آپ کا، ہر مُرید، واقف تھا۔''

(ص ۱۷۱ و ۱۷۲۔ **حیاتِ سید احمد شہید**۔ مؤلّفہ: محمد جعفر، تھانیسری۔ مطبوعہ: کراچی)

غیبی بشارت، پھر، اِستحقاقِ خلافت، پھر، اِمارت و اِمامت کا ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۷ء میں
اِس طرح، اِشتہار و اعلان، سید احمد رائے بریلوی صاحب نے خود، جاری کیا تھا:
''اللہ کا شکر و احسان ہے کہ اس مالکِ حقیقی اور بادشاہِ تحقیقی نے
اس گوشہ نشین فقیر عاجز اور خاکسار کو پہلے تو غیبی اشاروں سے اور اپنے اِلہامات کے ذریعہ
جن میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ خلافت کا اہل ہونے کی بشارت دی۔
دوسرے، یہ کہ مسلمانوں کی بڑی جماعت اور خاص و عام کی تالیفِ قلوب کے لئے
مرتبۂ اِمامت سے مجھ کو مشرَّف فرمایا۔
چنانچہ، بتاریخ ۱۲/ جمادیٰ الثانی، روز پنج شنبہ ۱۲۴۲ھ، ساداتِ کرام، عُلمائے مشاہیر
اور بڑے بڑے مشاہیر، اور بڑے بڑے مشائخ اور باحشمت صاحب زادوں
اور بلند مرتبہ خوانین نے مع تمام خاص و عام مسلمانوں کے، میرے ہاتھ پر بیعت کر کے
مجھ کو اپنا امام، قرار دیا۔ اور میری امامت اور حکومت کو تسلیم کر کے میری اطاعت پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔

اوراُس روز سے اب تک، یہ بیعت، اِس فقیر کے ہاتھ پر جاری ہے۔

اورتمام مسلمانوں میں اس کا چرچا ہے۔''

(ص ۱۱۹۔ترجمۂ مکتوباتِ سیداحمد شہید۔مؤلّفہ: محمد جعفرتھانیسری۔مترجم، سخاوت مرزا۔مطبوعہ کراچی)

سیداحمد، رائے بریلوی صاحب کی، یہ''اِمامت''اتنی جبری وقہری تھی کہ:

جو، اسے، قبول نہ کرے، یا قبول کرنے کے بعد، اسے مُسترد کردے

وہ مباحُ الدَّم ہوجاتا۔یعنی اس کا قتل، جائز ہوجاتا۔ چنانچہ، شاہ محمد اسمٰعیل، دہلوی لکھتے ہیں:

''ہرکہ امامتِ آں جناب، ابتدأً قبول، نہ کند، یا بعدالقبول، انکارنماید

پس ہموں است باغی، مُستَحلُّ الدَّم کہ قتلِ او، مثلِ قتلِ کفار، عین جہاداست۔

وہتکِ او، مثلِ ہتکِ سائرِاہلِ فساد، عین مرضیِ ربّ العباد۔

چہ اَمثال ایں اشخاص، بہ حکمِ احادیثِ متواترہ ازجملۂ کلاب النّارو ملعونینِ اَشراراَند۔

این است مذہبِ این ضعیف، بدیں مقدمہ۔

پس، جواباتِ اعتراضاتِ معترِضین، ضرب بِالسُّیوف است، نہ تحریروتقریر۔

(**سیرتِ سیداحمد شہید**۔حصہ اول، مؤلّفہ: مولانا ابوالحسن علی، ندوی، مطبوعہ لکھنؤ، ص:۱۶۹۔

ومکتوب ۳۱۔**مکتوباتِ سیداحمد شہید**۔نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۹ء)

مکتوب کے ایک نسخہ میں کلاب رفتار اور دوسرے میں کلابُ النّار ہے۔

(ترجمہ ازفارسی) آں جناب (سیداحمد، رائے بریلوی) کی امامت

جوشخص، ابتداہی سے قبول نہ کرے۔یا قبول کرنے کے بعد، اس سے، انکارکردے

تو وہ باغیِ مباحُ الدَّم ہے (انکار کی وجہ سے باغی ہے اوراس کا خون بہانا، حلال ہے)

اس کا قتل، کافروں کے قتل کی طرح، عینِ جہاد ہے۔

اس کی اِہانت وہتکِ حُرمتِ، اہلِ فساد کی اِہانت وہتک کی طرح، ربُّ العباد کی عین مرضی ہے۔

کیوں کہ ایسے لوگ، احادیثِ متواترہ کے حکم کے مطابق، جہنم کے کُتے اورشرپسند ملعون ہیں۔

اِس معاملے میں، عاجز (محمد اسمٰعیل دہلوی) کا یہی مسلک ہے۔اِس لئے معترضین کے

اعتراضات کا جواب، تلوار کی مار ہے، نہ کہ تحریروتقریر۔'' (مکتوباتِ شاہ اسمٰعیل، دہلوی)

پنجاب وسرحد پر، رفتہ رفتہ، انگریزوں کا غلبہ ہوتا چلا گیا اور ادھر''جماعتِ مجاہدین'' کا بڑا طبقہ

بشمول عُلمائے صادق پور (پٹنہ) ''عقیدۂ غیبوبت'' کے نشے میں سرشار، رہا کہ:

سیداحمد، رائے بریلوی صاحب، اگرچہ ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء میں

معرکۂ بالاکوٹ کے دَوران، بظاہر، ہماری نظروں سے غائب ہوگئے ہیں۔

مگر، وہ جلد ہی دوبارہ تشریف لاکر سکھوں اورکافروں وباغیوں کا قلع قمع کریں گے۔

اور، یہ عقیدۂ غیبوبیت اِس لئے عام اورمؤثر ہوا کہ سیداحمد صاحب، امام مَہدی ہیں۔

خانوادۂ صادق پور (پٹنہ) کے ایک محقق فرد، پروفیسر، قیام الدین احمد

عقیدۂ مَہدویت کا ذکرکرتے ہوئے لکھتے ہیں

''ہندوستانی وہابیت کا ایک دوسرا طُرَّہ ٔ امتیاز ایک مرحلے پر، مَہدوی تحریک سے اس کا اتفاق تھا۔

مَہدیِ موعود کے ظہور کے عقیدے پر ہندوستانی وہابیوں نے کثیر لٹریچر، فراہم کرلیا تھا۔

اسی کے بعد، سیداحمد نے رحلت کی۔''

(ص ۵۸۔**ہندوستان میں وہابی تحریک**۔مؤلّفہ: پروفیسر قیام الدین احمد (مقالۂ ڈاکٹریٹ منظورشدہ ازپٹنہ یونیورسٹی بہار ۱۹۶۱ء) مطبوعہ: مکتبۃ الفَہیم، مئوناتھ بھنجن۔صوبہ اترپردیش۔اگست۔۲۰۰۱ء)

عقیدۂ غیبوبیت کے بارے میں محمد جعفرتھانیسری (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۵ء) لکھتے ہیں

''مولوی جعفرعلی نقوی، جوآپ (سیدصاحب) کا باڈی گارڈ تھا

اورکندھے سے کندھا ملاکر کھڑا رہتا تھا، لکھتا ہے کہ:

''جنابِ حضرت امیرالمومنین، درہَم جماعت ازنظرِ مَن، غائب شُدند''

یہ واقعۂ جگرسوز ۲۴/ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ کو واقع ہوا۔اُس وقت آپ کے غائب ہوجانے کی وجہ سے سارے لشکرِ اسلام میں ہلچل مچ گئی۔'' (ص ۲۸۸۔**حیاتِ سیداحمد شہید**، مطبوعہ: کراچی)

مولوی جعفرعلی، نقوی، یہ بھی کہتے ہیں کہ:

''بعد میں لوگوں کی زبانی، اِس امر کی تصدیق ہوئی ہے کہ:

سیداحمد صاحب کی ٹانگ پر، ایک گولی کا زخم بھی لگا تھا۔

آپ ایک پتھر پر بیٹھے ہوئے، رُوبقبلہ، دعا، مانگ رہے تھے کہ:

''اسی وقت، پتھر سے غائب ہوگئے۔''

(ص ۲۸۹۔**حیاتِ سیداحمد شہید**۔مئولّفہ: محمد جعفرتھانیسری۔مطبوعہ: کراچی)

''سید احمد صاحب کی چھوٹی بیوی صاحبہ، جن سے معرکۂ بالاکوٹ سے پہلے
سید صاحب نے اپنی غیبوبت کی پیش گوئی کی تھی اور سید صاحب کے اکثر اَقرِبا اور اہلِ قافلہ
آپ کی غیبوبت کے قائل تھے۔'' (ص ۲۹۰۔ حیاتِ سید احمد شہید۔ مئولّفہ: محمد جعفر تھانیسری، مطبوعہ کراچی)

مولانا عاشق الٰہی، میرٹھی (متوفی ۱۹۴۱ء) نے، تذکرۃُ الرشید، جلدِ دوم: مطبوعہ میرٹھ کے
ص ۲۷۱ پر، غیبوبت اور اس کے بعد، بعض افراد کی ملاقات کے
دو تین واقعات وروایات، درج کیے ہیں۔

مولانا عُبید اللہ، سندھی (متوفی ۱۹۴۴ء) عقیدۂ غیبوبت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:
''آخر میں ہم، صادق پوری پارٹی کی مرکزی فکر کے متعلق
مولانا شمس الحق، عظیم آبادی (تلمیذِ خاص، سید نذیر حسین، دہلوی) کی کتاب
''عونُ المعبود'' سے چند جملے، نقل کر کے، اِس بحث کو ختم کرتے ہیں:
**''اکثر عوام اور چند ایک خواص کا، غازی شہید امام مجدّد، سید احمد بریلوی کے متعلق
یہ خیال ہے کہ وہ مَہدی تھے۔ نیز، انھوں نے میدانِ غزا میں شہادت نہیں پائی۔
بلکہ، وہ لوگوں کی نظروں سے غائب ہوگئے۔ وہ اب تک، زندہ ہیں اور اس عالم میں
موجود ہیں۔''** الخ۔ (ص: ۱۰۵۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک۔ مؤلّفہ: عُبیدُ اللہ سندھی۔ مطبوعہ: لاہور)

غلام رسول مہر (متوفی ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۱ء) اِس سلسلے میں لکھتے ہیں:
**''سرحد کے بعض اکابر کہہ رہے تھے کہ:
انھوں نے واقعۂ بالاکوٹ کے بعد، سید صاحب کو، زندہ دیکھا ہے۔''**
(ص ۸۱۱۔ سید احمد شہید۔ مؤلّفہ: غلام رسول مہر)

**.........لیکن، حیرت، یہ ہے کہ سید صاحب کے بعض اکابر خُلفا نے بھی اسے قبول کیا۔
نہ محض قبول کیا، بلکہ اسے، مدت تک، دعوتِ اتحاد کا مرکز بنائے رکھا۔''** (ص ۸۱۰۔ حوالۂ مذکورہ)

**''حد درجہ تعجب کی بات اِس پر ہے کہ:
اِرادت مندوں کے حلقۂ خاص میں سے اہلِ صادق پور نے
عقیدۂ غیبوبت کو پورے کاروبارِ جہاد کا مدار و محور بنایا۔
مولانا ولایت علی، صادق پوری، مرحوم نے ''دعوت'' کے نام سے**

**ایک رسالہ، مرتّب کیا تھا، اس میں لکھتے ہیں کہ:
بالاکوٹ میں شکست، اِس لئے ہوئی کہ:
ایمان والوں کے دل میں غرور کا مَیل، نہ جمنے پائے۔
شکست کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت (سید احمد) کو، چِلّہ گذاری
اور دعا وزاری کے لئے پہاڑوں پر بلایا۔
سچ ہے کہ خلوت بھی انبیائے کرام کی سنّت ہے۔
.........سید صاحب کی شہادت کی خبر، شیطان نے جھوٹی مشہور کی۔ کیوں، نہ ہو؟
یہ (سید صاحب) بھی، تو، ان (اَنبیا) کے پَیرو ہیں۔ ان کی سُنّتوں سے کیوں محروم رہیں؟
اور ہمارے حضرت (سید احمد) کی خلوت، کوئی عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلام کی سی، نہ سمجھے کہ
کسی سے ملاقات، نہیں ہوتی۔ یا۔ ظہور میں ان کے، عرصۂ بعید، گذرے گا۔
یہاں تو اکثر لوگ، جب چاہتے ہیں، تھوڑی سی کوشش سے
حضرت (سید احمد) کی زیارت سے مشرّف ہوجاتے ہیں۔
اور انشاء اللہ، عرصۂ قریب میں مثلِ خورشید جہاں کے، ظاہر ہوکر
عالَم کو اپنے انوارِ ہدایت سے منور فرمائیں گے۔''** (ص ۸۱۳۔ سید احمد شہید۔ مرتّبہ: غلام رسول مہر)

مولانا عُبید اللہ سندھی (متوفی ۱۹۴۴ء) عقیدۂ مَہدویت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:
**''حضرت سید احمد شہید، کتنے بڑے بزرگ تھے۔ لیکن، دیکھو!
وہ بھی اسی رَو میں بہ گئے۔ بجائے اِس کے کہ:
وہ افغان نمایندوں پر مشتمل ایک جمہوری نمایندہ حکومت بناتے۔
وہ خود، امام اور مَہدی بن گئے۔ اور اس طرح، سارا معاملہ، غتر بود ہوگیا۔''**
(ص ۱۶۶۔ اِفادات وملفوظاتِ مولانا سندھی۔ مرتّبہ: پروفیسر محمد سرور، جامعی۔ مطبوعہ: لاہور ۱۹۷۲ء)

پروفیسر محمد سرور جامعی (یکے از اَبنائے قدیم، جامعہ مِلّیہ اسلامیہ، نئی دہلی) لکھتے ہیں:
**''بدقسمتی یہ ہوئی کہ سید صاحب نے اِمامت و مَہدویت کے دعوے کر دیے۔
اس سے، خواہ مخواہ، سرحد کے اُمَرَ اوَخَوانین میں بدمزگی پیدا ہوئی۔
دوسری طرف، اِمامت اور مَہدویت کے بعد، جماعتی فیصلوں کی اہمیت نہ رہی۔**

اس سے عوام پٹھان بگڑ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سید صاحب شہید ہو گئے۔

(ص ۳۴۹۔ **اِفادات وملفوظاتِ مولانا سندھی**۔ مؤلّفہ: پروفیسر محمد سرور، جامعی۔ مطبوعہ: لاہور ۱۹۷۲ء)

یہاں، یہ حقیقت، واضح رہے کہ:

معرکۂ بالا کوٹ ۱۸۳۱ء تک، انگریزوں کا رَوَیَّہ ’’جماعتِ مجاہدین‘‘ کے ساتھ موافقت ومعاونت کا تھا۔ کیوں کہ سکھوں اور پٹھانوں کو کمزور کرنا، انگریزی سیاست کا ایک حصّہ تھا۔

مگر، جب سید احمد، رائے بریلوی وشاہ اسمٰعیل دہلوی صاحبان کے بعد

’’**جماعتِ مجاہدین**‘‘ کی مرکزی قیادت، منتشر ومضمحل اور غیر مؤثر ہو گئی

تو انگریزوں نے اپنا رنگ بدل کر ۱۸۴۵ء میں خود، سکھوں کے خلاف، فوجی اقدام کر دیا۔

اور اس ’’**جماعتِ مجاہدین**‘‘ کو حکم دے دیا کہ:

اب آپ، اسلحہ وغیرہ، جمع کر کے، اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں۔

چنانچہ، عبدالرحیم، صادق پوری (عظیم آبادی۔ متوفی ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء) لکھتے ہیں کہ:

گلاب سنگھ (سِکھ راجہ) اور انگریزی حکومت کے درمیان ۱۸۴۹ء میں معاہدہ ہو جانے کے بعد

’’گورنمنٹ انگریزی نے ایک خط، بنام مولوی ولایت علی (صادق پوری) وعنایت علی (صادق پوری) علیہما الرحمۃ لکھا کہ:

گلاب سنگھ نے، سرکارِ انگریزی سے معاہدہ کیا ہے۔ اور بموجب، اِس معاہدہ کے

اب، وہ، گورنمنٹ کی حمایت میں ہے۔ اب، اس سے لڑنا، عین حکومت سے لڑنا ہے۔

لِھٰذا، تم کو چاہیے کہ اب، اس سے نہ لڑو۔‘‘

(ص ۱۰۰۔ **تذکرۂ صادقہ**۔ از عبدالرحیم، صادق پوری، عظیم آبادی۔ بارِ اول۔ ہادی المطابع، کلکتہ)

’’یہ دونوں حضرات (مولوی ولایت علی ومولوی عنایت علی)

مع فوج وتوپ خانہ وسامانِ جنگ، زیرِ نگرانیِ افواجِ انگریزی، لاہور پہنچے۔

ان ایام میں، جون لارنس صاحب بہادر، چیف کمشنر، پنجاب کے تھے۔ صاحب بہادر اِستقبال کر کے مولوی صاحب کو لاہور لائے اور بہت گفتگو کے بعد، یہ بات، قرار پائی کہ:

یہ دونوں حضرات (مولوی ولایت علی ومولوی عنایت علی) مع ہندوستانی مجاہدین کے اپنے وطن، واپس جائیں۔ اور کُل اسلحہ مع توپ خانہ، گورنمنٹ کے ہاتھ، فروخت کر کے

اس کی قیمت سے فوج کی بقایا تنخواہ دے کر، برخاست کر دیں۔

اس کے بعد، صرف پانچ سو مجاہدین آپ کے ساتھ رہ گئے تھے۔‘‘

(ص: ۱۰۱۔ **تذکرۂ صادقہ**۔ از عبدالرحیم، صادق پوری، عظیم آبادی۔ بارِ اول۔ ہادی المطابع، کلکتہ)

سید طفیل احمد، منگلوری، علیگ لکھتے ہیں:

’’آخر کار، ۱۸۴۵ء میں انگریزوں نے سکھوں سے پہلی جنگ کی

جس میں سکھوں کو شکست ہوئی۔ اس وقت سے انگریزی فوج، لاہور میں رہنے لگی۔

اور انگریزوں نے گلاب سنگھ سے مصالحت کر کے، انہیں کشمیر کا حاکم بنا دیا۔

اور ہندوستانی مجاہدین کو ہندوستان جانے پر مجبور کیا۔‘‘

(ص: ۱۴۳۔ **مسلمانوں کا روشن مستقبل**۔ مؤلّفہ: سید طفیل احمد، منگلوری۔ مطبوعہ بمبئی، ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء)

مولانا مسعود عالَم، ندوی لکھتے ہیں:

’’حکومت نے مولوی ولایت علی کو اطلاع دی کہ:

’’اب، گلاب سنگھ پر حملہ کرنا، خود انگریزی حکومت سے لڑائی، مول لینا ہے۔‘‘

(انگریزی) حکومت کی پالیسی، یہ تھی کہ:

جب تک، اس پر، براہِ راست، زَد، نہ پڑے، مجاہدین سے ٹکّر، نہ لی جائے۔

اور انہیں سکھوں سے لڑنے دیا جائے۔

مجاہدین اور سکھوں میں سے جس کی بھی شکست ہو گی، سرکارِ عالی کا بہر حال، فائدہ تھا، اِس لئے شروع شروع میں مجاہدین سے روک ٹوک نہیں کی گئی۔

لیکن، جب، پنجاب کا بڑا حصہ، انگریزوں کے قبضے میں آ گیا، تو مجاہدین، حکومت کی نظر میں کھٹکنے لگے۔ مجاہدین بھی حکومت سے خواہ مخواہ، نبرد ہونا، خلافِ مصلحت، خیال کرتے تھے۔‘‘

(ص: ۴۷۔ **ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک**۔ مؤلّفہ: مسعود عالَم، ندوی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ مارچ ۱۹۹۹ء)

مولوی ولایت علی ومولوی عنایت علی، لاہور سے پٹنہ آ کر

چند سال، مقیم رہے۔ پھر، اَستھانہ (سرحد) جا کر، درس وتدریس کا سلسلہ، شروع کیا۔

انگریزوں نے ان کی نگرانی رکھی کہ، یہ منظّم ہو کر کچھ کرنے، نہ پائیں۔

جب انگریزوں نے سرحد کی طرف، پیش قدمی کی
تو انھوں نے ہندوستان سے، ان کا سلسلہ، بالکل، منقطع کرنے کا حکم دیا۔
مگر، تعلق، باقی رکھنے کے جرم میں ان کی گرفتاری ومقدمہ کا سلسلہ، شروع ہوا۔

۱۸۶۳ء میں اَمبیلہ میں جھڑپ بھی ہوئی۔مقدمۂ اَنبالہ ۱۸۶۴ء ومقدمۂ پٹنہ ۱۸۶۵ء مشہور ہیں۔تفصیلات، اس موضوع کی متعدد کتابوں میں مذکور ہیں۔

سید احمد، رائے بریلوی (متوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) وشاہ محمد اسمٰعیل، دہلوی (متوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) سے وابستہ خواص وعوام ومجاہدین، شروع ہی سے
مسلمانانِ پنجاب وسرحد کی نظر میں مذہبی وسیاسی طور پر مشکوک ومشتبہ تھے۔
جس کے متعدد تحریری شواہد، کتبِ تاریخ میں مذکور وموجود ہیں۔

"جب حضرت شہید، بعزمِ جہاد، صوبہ سندھ اور سرحد کے علاقے میں داخل ہوئے
تو ان کے متعلق، عام طور، یہ شبہ کیا گیا کہ:
یہ، انگریزوں کے جاسوس ہیں۔اور یہ شُبہ اِس بنا پر کیا گیا کہ:
حضرت شہید کے تعلقات، انگریزوں سے نہایت درجہ خوش گوار تھے۔"

(حاشیہ، ص: ۲۵۔ **مقالاتِ سرسید**۔حصہ شانزدہم۔مطبوعہ: لاہور)

"وہ، ہمارے تمہارے مذہب کے مخالف ہیں۔ایک نیا دین، انہوں نے نکالا ہے۔
کسی ولی اور بزرگ کو، نہیں مانتے۔سب کو، برا کہتے ہیں۔
انگریزوں نے انہیں تمہارے ملک کا حال، معلوم کرنے کی غرض سے
جاسوس بنا کر بھیجا ہے۔ان کی باتوں میں، نہ آنا۔عجب نہیں کہ تمہارا ملک، چھنوا دیں۔"

(ص: ۲۸۰۔ **سید احمد شہید**، حصہ دوم، مؤلّفہ: غلام رسول مہرؔ)

اِس ضمن میں مختلف ہندوستانی اقوام کو، ایک دوسرے سے لڑا بھڑا کر، انہیں کم زور کرنے پھر، انہیں مغلوب کر کے ان پر قبضہ واختیار اور حکومت کرنے کی انگریزی حکمتِ عملی سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل اِقتباس، ملاحظہ فرمائیں۔سید طفیل احمد، منگلوری، علیگ لکھتے ہیں:

"ایک زمانہ، وہ تھا کہ بقول میجر باسو:
انگریزوں نے سکھوں کو بڑھایا تھا۔تا کہ وہ، سِندھیا کا مقابلہ کریں۔اِس لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ، ہمیشہ، انگریزوں سے ملے رہے اور شکر گذار رہے۔" (تاریخِ میجر باسو۔جلد۲۔ص۱۵۳)

مگر، اب، حکومت کی ضروریات، بدلیں، تو بقول میجر موصوف کے:
کپتان ایبٹ نے، جو، ریزنڈنٹ لاہور کا اسسٹنٹ تھا
سردار چتر سنگھ سکھ کو بہت تنگ کر کے اسے مقابلہ پر مجبور کیا۔
اور صوبہ ہزارہ کے مسلمانوں میں، جن کی آبادی، بہت تھی اور جنگ جُو تھے
روپیہ تقسیم کر کے، ان سے کہا کہ:
"سکھوں نے مسلمانوں پر، جو مظالم کیے تھے، ان کا تمہیں بدلہ لینا چاہیے۔"
اِس طرح سے مسلمانوں کو سکھوں کے مقابلے میں کھڑا کیا۔تاریخِ میجر باسو۔جلد۳۔ ص۲۴۵۔ (ص۱۴۲و۱۴۳۔ **مسلمانوں کا روشن مستقبل**۔مؤلّفہ: سید طفیل احمد، منگلوری۔مطبوعہ: مکتبۃُ الحق۔ جوگیشوری۔ممبئ۔۲۰۰۱ء۔عکسِ طبعِ دسمبر ۱۹۴۵ء۔طبعِ اول در ۱۹۳۷ء وطبعِ ثانی در ۱۹۳۸ء)

تحریکِ بالاکوٹ (۱۸۲۶ء تا ۱۸۳۱ء) کے پیچ وخَم اور زُلفِ برہم سلجھانے اور سنوارنے کی کوشش کرتے ہوئے، مولانا حسین احمد مدنی (متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷) رقم طراز ہیں:

"ہندوستان کی، یہ بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ:
سید صاحب کو مسلمانانِ پنجاب کی حد درجہ پامالی وزبوں حالی کے باعث
مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بِالمقابل، صف آرا ہونا
اور آخر کار معرکۂ بالاکوٹ میں جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ورنہ، اصل، یہ ہے کہ:
سید صاحب کا اصل مقصد، ہندوستان کے ہندو اور مسلمان کو
ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلُّط واِقتدار سے نجات، دلانا تھا۔انگریز، خود، اسے محسوس کرتے تھے۔
اور اِس تحریک سے بڑے خوف زدہ تھے۔اِسی بنا پر، جب، سید صاحب کا ارادہ
سکھوں سے جنگ کرنے کا ہوا، تو انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا۔
اور جنگی ضرورتوں کے مہیّا کرنے میں سید صاحب کی مدد کی۔
سید صاحب کا اصل مقصد، چوں کہ:
ہندوستان سے انگریزوں کے تسلُّط واِقتدار کا قلع قمع کرنا تھا
جس کے باعث، ہندو ومسلمان، دونوں ہی پریشان تھے، اِس بنا پر آپ نے اپنے ساتھ

ہندوؤں کوبھی شرکت کی دعوت دی اوراس میں صاف صاف انہیں بتادیا کہ:

’’آپ کاواحد مقصد،ملک سے پردیسی لوگوں کااقتدار،ختم کردیناہے۔
اس کے بعد،حکومت کس کی ہوگی؟اس سے آپ کوغرض نہیں۔
جولوگ،حکومت کے اہل ہوں گے،ہندو،یامسلمان،یادونوں،وہ،حکومت کریں گے۔‘‘

(ص:۱۹۔نقشِ حیات۔حصہ دوم۔ازمولاناحسین احمد،مدنی۔مکتبہ دینیہ،دیوبند،۱۹۹۹ء)

اس کے بعد،مولانا مدنی نے ریاستِ گوالیار کے مدارُ المہام اورمہاراج، دولت رائے سِندھیا کے وزیرو برادرِ نسبتی کے نام سے مراسلہ اوراسی ریاستِ گوالیار کے مسلم عہدہ دار غلام حیدرخاں کے نام،ایک مکتوبِ فارسی مع اردوترجمہ،نقل کیاہے۔

یہ دونوں مکتوبات،سیداحمد،رائے بریلوی صاحب کے ہیں۔

اس کے بعد مولاناحسین احمد،مدنی،تحریرکرتے ہیں:

’’حضرت سیدصاحب(مرحوم)کے اِن خطوط کوغورسے پڑھنے کے بعد
تجزیہ کیجئے،توحسبِ ذیل اُمورپرروشنی پڑتی ہے:

(۱)آپ،انگریزوں کو’’بیگانگانِ بعیدُالوطن‘‘اور پردیسی سمجھتے تھے۔
اوران کے اِستیلا وتغلّب سے تنگ آ کر،اُن سے لڑنے کا عزم رکھتے تھے۔

(۲)آپ،ہندوستان کواپناملک اوروطن سمجھتے تھے۔

(۳)جہادسےآپ کا مقصد،خوداپنی حکومت قائم کرنا،ہرگزنہیں تھا۔
بلکہ دینِ ربّ العالمین کی خدمت کرناتھا۔

(۴)ہندوؤں سے اختلافِ مذہب کی بنا پر،آپ کو پرخاش تو کیا ہوتی،آپ، کمپنی کے ہاتھوں،مظلومیت وپامالی میں ہندواورمسلمان،دونوں کو،یکساں،شریک جانتے تھے۔
اور جہادسے آپ کی غرض،دونوں کوہی اجنبی اقتدارکی مصیبت سے نجات،دلاناتھا۔

(۵)کامیاب ہونے کے بعد،ہندوستان میں ملکی حکومت کانقشہ کیاہوگا؟
اس کافیصلہ،آپ،طالبینِ مناصبِ ریاست وحکومت پرچھوڑتے ہیں۔
مگر،ہندوؤں کو،یہ اطمینان،ضروردلاتے ہیں کہ:
وہ سیدصاحب کی کوشش کواپنی ریاست کی بنیادکے مستحکم ہونے کاباعث سمجھیں۔

اور پھر، سید صاحب کا، ہندو ریاستوں کو مدد اور شرکتِ جنگ کی دعوت دینا اوراپنے توپ خانہ کاافسر،راجہ رام راج پوت کومقررکرنا،خود،اس کی دلیل ہے کہ:
آپ،ہندوؤں کواپنامحکوم نہیں،بلکہ شریکِ حکومت بناناچاہتے تھے۔‘‘

(ص:۲۲۔نقشِ حیات۔حصہ دوم،ازمولاناحسین احمد،مدنی۔مطبوعہ:دیوبند)

مولاناحسین احمد،مدنی(متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء)تحریکِ بالاکوٹ کے مزیدنتائج،اَخذکرتے ہوئے،رقم طراز ہیں:

’’مذکورہ بالا اِقتباس سے بہت سے اُمور پرروشنی پڑتی ہے:

(الف)یہ تحریکِ آزادی،عُلماے ہند کے ہاتھوں،انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی حصہ سے شروع ہوئی اوراس کا سنگِ بنیاد، رکھنے والے،حضرت شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی اوران کے خاندان کے لوگ،اوران کے شاگرداورمُریدین ہیں۔

(ب)اس تحریک میں فرقہ واریت اورمذہبی تنگ دلی کا نام، نہ تھا۔ بلکہ تمام ہندوستان اوراس کے باشندوں کو،بدیشی مظالم سے،جوکہ تمام ملک کوبربادکررہے تھے،نجات دلاناتھا۔

(ج)اِس تحریک میں غیرمسلموں کوبھی شریک کیاگیاتھااوران کوبلایاگیاتھا۔

(د)سکھوں سے جنگ،فرقہ واریت کی بناپر،نہیں تھی۔
بلکہ اس بناپرتھی کہ وہ،انگریزوں کے حلیف اورمددگارتھے۔
انگریزوں نے،ان کوہندوستان میں اپنی حکومت کی حفاظت کے لئے
افغانستان کے راستہ میں آہنی دیواراورسدِّسکندری بنایاتھا،اِس لئے ان کاقلع قمع کرنا،لازم تھا۔
اس کے علاوہ،وہ بے پناہ مظالم بھی مُحرِّک تھے
جن کا،وہ،انتہائی بربریت کے ساتھ،اِرتکاب کررہے تھے۔

(ھ)اس تحریک کا مقصد،دنیاوی مفاد، ملک گیری،خودغرضی،عہدوں اورمنصبوں کو حاصل کرنا،کسی قوم کوغلام بنانااوران کی دولت وذرائعِ دولت کوہتھیانا،ہرگز، نہ تھا۔
بلکہ محض،خدا کی ہندوستانی عام مخلوق کو،یورپین،سپید بھیڑیوں اوران کے حُلَفا کی لوٹ چیر پھاڑ،تذلیل وتوہین وغیرہ سے بچاناتھا،جوکہ اِعلاءِ کلمۃ اللہ کاعظیم ترین مقصد ہے۔
عدل وانصاف،امن وامان،انسانی ہم دردی،غُربا پروری،کمزوروں کی امداد

اِسی مقصدِ اعلیٰ کے پھل پھول اور شاخیں ہیں۔
(و) یہ تحریک، شخصی، یا کسی فرقہ کی حکومت، فسطائیت کے لئے، نہیں عمل میں لائی گئی تھی۔
بلکہ حقیقی جمہوریت، اِس کا مطمحِ نظر تھا۔''

(ص:۲۳و۲۴۔ **نقشِ حیات**، حصہ دوم۔ از مولانا حسین احمد مدنی، مکتبہ دینیہ دیوبند۔ ۱۹۹۹ء)

مولانا حسین احمد مدنی کے بیان کردہ نِکات کا تجزیہ و اِحتساب کیجیے
تو کئی سوالات ایسے اُبھرتے ہیں، جو عُقدۂ لاینحل کی حیثیت، رکھتے ہیں، مثلاً:

(۱) یہ کیسی اسلامی تحریک اور کیسا اسلامی جہاد ہے؟ اور اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(۲) سید احمد، رائے بریلوی و شاہ محمد اسمٰعیل، دہلوی نے ''مذہبی فرض'' کے نام سے
انگریزوں کے تعلق سے، جو، مؤیدانہ بیانات دیے ہیں، اُن کی مذہبی حیثیت کیا ہے؟

(۳) اوّلین سوانح نگاروں کے بیانات، انگریز حامی ہیں۔ پھر، بعد کے سوانح نگار
کیوں اس تحریک کو انگریز مخالف بنا کر، اسے، ملک و قوم کے سامنے، بیان کرنے لگے؟

(۴) ۲۱-۱۹۲۰ء میں گاندھی و نہرو کی قیادت میں برپا تحریکِ آزادی اور حصولِ آزادی کے
بعد، تشکیل پانے والی کانگریسی حکومت اور تحریکِ بالاکوٹ
نیز، اس کی کوششوں سے متوقع کسی حکومت کے درمیان، بنیادی فرق کیا ہے؟

اور پھر، مندرجہ ذیل حقائق کو، کہاں، دفن کریں گے، جو سر چڑھ کر بول رہے ہیں؟
مولانا سید محمد میاں، دیوبندی لکھتے ہیں:
''شمال مغربی سرحد میں ایک آزاد حکومت، قائم کرنے کے بعد
جو اِعلامیہ، شائع کیا گیا، اُس کا ایک فقرہ، یہ ہے:
نہ با کسے از اُمَراے مسلمین، منازعت داریم، و نہ با یکے از رؤساے مؤمنین، مخالفت
نہ با کفّار، مقابلہ داریم، نہ با مُدّعیانِ اسلام
صرف، با درازمویاں، مقاتلہ، نہ با کلمہ گویاں و اسلام جویاں، و نہ با سرکار انگریزی، مخاصمت داریم
و نہ راہِ تنازعات کہ از رِعایاے او ہستیم بہ حمایتش از مظالمِ بَرایا۔'' (**سوانحِ احمدی**۔ ص:۲۳۶)
ترجمہ: نہ کسی مسلمان حاکم سے ہمارا جھگڑا ہے، نہ کسی مسلمان رئیس سے مخالفت۔
نہ غیر مسلموں سے مقابلہ ہے اور نہ مدّعیانِ اسلام سے۔

ہماری جنگ، صرف، لانبے بال والوں (سِکھ) سے ہے، نہ کلمہ گو، اور طالبانِ اسلام سے۔
اور سرکار انگریزی سے بھی ہماری مخالفت نہیں۔ کیوں کہ:
ہم، اس کی رعایا ہیں۔ اور اس کی پناہ و حفاظت میں مظالم سے محفوظ ہیں۔''

منشی محمد جعفر تھانیسری ''**سوانحِ احمدی**'' میں تحریر فرماتے ہیں:
''یہ بھی ایک صحیح روایت ہے کہ:
جب آپ، سکھوں سے جہاد کرنے کو تشریف لے جاتے تھے
تو کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ:
آپ، اتنی دور، سکھوں سے جہاد کرنے جاتے ہیں۔
انگریز، جو، اِس ملک پر حاکم ہے، وہ، دینِ اسلام سے کیا مُنکر نہیں ہیں؟
گھر کے گھر میں، ان سے جہاد کر کے، ملکِ ہندوستان لے لو۔
یہاں لاکھوں آدمی، آپ کا شریک اور مددگار ہو جائے گا۔
سید صاحب نے جواب دیا کہ:
کسی کا ملک، چھین کر، ہم، بادشاہت کرنا نہیں چاہتے۔
سکھوں سے جہاد کی صرف، یہ وجہ ہے کہ وہ، برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے ہیں۔
اور اذان وغیرہ، فرائضِ مذہبی، ادا کرنے کے مُزاحم ہوتے ہیں۔
............اور سرکارِ انگریزی، گو، مُنکرِ اسلام ہے، مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم و تعدّی نہیں کرتی
نہ ان کو اداے عبادت سے روکتی ہے۔'' الخ۔ **سوانحِ احمدی**، ص:۹۱۔

(ص:۲۳۶و۲۳۷۔ **علماے ہند کا شاندار ماضی**۔ حصہ دوم۔ کتابستان، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶)

''تواریخِ عجیبہ'' از محمد جعفر تھانیسری کے مطابق:
۶/ربیع الاول ۱۲۴۵ھ/۵/ستمبر ۱۸۲۸ء، باتفاقِ رائے جُملہ عُلما و رؤساے مذکورہ
''**اِعلام نامۂ شرعی**'' (نہ با کسے از اُمراے مسلمین، منازعت داریم، اِلیٰ آخرِہٖ)
بہ نام، سلطان محمد خاں، حاکمِ پشاور اور اس کی نقول
بہ نام ساکنانِ شہرِ پشاور و اَطرافِ پشاور، روانہ کی گئیں۔
سردار محمد خاں نے، اس کے جواب میں لکھا کہ:

''ہم نے آپ کے مضمون نامہ پر، اطلاع پائی۔ آپ نے، جو۔ یہ لکھا ہے کہ:
''ہم، خدا کے واسطے، اِس ملک میں کفّار سے جہاد کرنے آئے ہیں۔
اور کلمہ گویان سے لڑنے نہیں آئے ہیں''
یہ سب، آپ کی اَبلہ فریبی ہے۔ آپ کا عقیدہ، فاسِد اور نیت، کاسِد ہے۔
آپ، فقیر ہو کر، ارادہ، امامت اور حکومت کا، رکھتے ہیں۔
پس! ہم نے بھی خدا کے واسطے، کمر باندھ رکھی ہے کہ:
تم کو قتل کر کے، اِس سرزمین کو پاک کریں گے۔'' (**تواریخِ عجیبہ**، از محمد جعفر تھانیسری)

انگریزوں کو معرکۂ بالاکوٹ، (۱۸۳۱ء) کا، جو نقد فائدہ ہوا، وہ، یہ ہے۔
محمد جعفر، تھانیسری (متوفی ۱۹۰۵ء) لکھتے ہیں:
''اور آخر، ۱۸۴۵ء میں معرکۂ بالاکوٹ کے پندرہ برس بعد
کُل سلطنتِ پنجاب، سکھوں سے نکل کر ''ہماری عادِل سرکار'' کے قبضے میں آ گئی۔''
(ص:۳۸۔ **سوانحِ احمدی**۔ مؤلّفہ: جعفر تھانیسری)

اِختتامِ معرکۂ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء، اِس طرح ہوا:
''چوں کہ، یہ قوم (افغانی) مذہبی مخالفت میں نہایت سخت ہے
اِس سبب سے اِس قوم نے اخیر میں وہابیوں سے دَغا کر کے سکھوں سے تعاون کر لیا۔
اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب اور سید احمد صاحب کو شہید کر دیا۔''
(ص:۱۴۰۔ **مقالاتِ سرسید**، جلدِ نہم)

مولانا مسعود عالم ندوی، حقیقتِ حال کا اِظہار، اِس طرح کرتے ہیں:
''کہنا، یہ ہے اور صاف صاف کہ:
جب تک ''مجاہدین''، سکھوں سے اُلجھے رہے
کمپنی کی حکومت خاموش اور غیر جانب دار رہی۔ مقصود، یہ تھا کہ:
مجاہدین اور سکھوں کی آویزش میں سرکارِ عالی کا، کچھ نہ کچھ، فائدہ ہی ہو رہے گا۔
لیکن، جوں ہی پنجاب کا اِلحاق، عمل میں آیا
کمپنی اور سرکار کی نظر میں ''مجاہدین'' سے بُرا، کوئی نہیں تھا۔''

(ص:۱۱۳۔ **ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک**۔ مؤلّفہ: مسعود عالم ندوی۔ ادارہ مطبوعاتِ سلیمانی، لاہور)

عبدالرحیم، صادق پوری، عظیم آبادی لکھتے ہیں کہ:
گلاب سنگھ اور سرکار انگریزی کے درمیان ہونے والے معاہدہ کے بعد
''گورنمنٹ انگریزی'' نے ایک خط، بنام مولوی ولایت علی و عنایت علی علیہما الرحمۃ لکھا کہ:
''گلاب سنگھ نے، سرکار انگریزی سے معاہدہ کیا ہے اور بموجب، اس معاہدہ کے:
اب، وہ (گلاب سنگھ) گورنمنٹ کی حمایت میں ہے۔
اب، اس سے لڑنا، عین گورنمنٹ سے لڑنا ہے، لہٰذا، تم کو چاہیے کہ اب، اس سے نہ لڑو۔''
(ص:۱۰۰۔ **تذکرۂ صادقہ**، از عبدالرحیم، صادق پوری، بارِ اول۔ ہادی المطابع، کلکتہ)

اِلہام، بشارت، اِشارۂ غیبی، وعظ، جہاد، اِمارت، اِمامت، حکومت، غنیوبت کا
ایسا طویل سلسلہ تھا، جو، ختم ہونے کا نام، نہ لیتا تھا۔
انگریزی مفادات کی تکمیل اور ۱۸۴۵ء میں انگریزی گورنمنٹ کی سکھ راجہ، گلاب سنگھ پر
فتح کے بعد، بچے کھچے ''مجاہدینِ بالاکوٹ'' یا۔ بالفاظِ دیگر ''عُلمائے صادق پور'' میں سے
بعض، جو اپنی سابقہ رَوِش پہ قائم تھے، اُن کے خلاف، انگریزوں نے چھان بین اور دار و گیر
کی پالیسی اپنا رکھی تھی۔ چنانچہ، ایسے ہی لوگوں کے خلاف، مقدمۂ انبالہ ۱۸۶۴ء چلا۔
جس میں مولوی یحییٰ علی، صادق پوری، و مولوی عبدالرحیم، صادق پوری
اور مولوی محمد جعفر تھانیسری، وغیرہ، ماخوذ تھے۔
اِسی طرح، مقدمۂ پٹنہ ۱۸۶۵ء بھی چلا۔ ہندوستانی انگریزی حکومت نے
انہیں ہندوستانی قید و بند، یا کالا پانی کی سزا دی اور ان کے مکانات بھی منہدم کر دیے۔
مقدمۂ انبالہ ۱۸۶۴ء میں کئی ایک نے گواہی دی کہ:
صادق پور (پٹنہ/عظیم آباد) کے مرکز میں جتنے لوگ پہنچتے تھے
انہیں باقاعدہ، تلقین کی جاتی تھی کہ:
''سید صاحب کا ظہور، قریب ہے۔ وہ، امامِ وقت ہیں۔
ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان کے ظہور سے پہلے، مقامِ ظہور (صوبہ سرحد) پر پہنچ جائے۔''
مولوی محمد جعفر، تھانیسری، صاحبِ **تواریخ عجیبہ** بھی

سید صاحب کو زندہ مانتے تھے۔ اور ان کا دعویٰ تھا کہ:

**"دو مرتبہ، زیارتِ جسمانی کا شرف، حاصل ہو چکا ہے۔
اور حضرت (سید احمد) کے زندہ ہونے کا، مجھے، ایسا یقین ہے، جیسا اپنی موت کا۔"**

مولانا مظفر حسین، کاندھلوی، فرمایا کرتے تھے کہ:

**"سید صاحب سے، دس (۱۰) باتیں، سنی تھیں۔
نو (۹) پوری ہو چکی ہیں۔ ایک، باقی ہے۔ یعنی غیبوبت کے بعد ظہور۔"**

(ص ۸۱۴۔ **سید احمد شہید**، از غلام رسول مہر)

"**مہدویت و غیبوبت**" ہی، ماننے پر "**جماعتِ مجاہدین**" نے اِکتفا نہیں کیا۔
بلکہ بعض نے "**وضعِ احادیث**" (حدیث گڑھنے کا عملِ مذموم) کو بھی اپنا حربہ بنایا۔
مولانا عنایت اللہ، اثری، وزیرآبادی، ایک متاخّر سرگروہ بالاکوٹ
مولانا فضلِ الٰہی (وزیرآبادی۔ متوفی ۱۹۵۱ء) اور نظریۂ غیبوبت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

**"اَوائل میں ایک دفعہ، میں نے سید احمد صاحب کو شہید بتایا
تو آپ، سخت ناراض ہوئے اور مجھے، دھکّا دے کر، چارپائی سے نیچے گرا دیا۔
اور فرمایا کہ: وہ زندہ اور غائب ہیں۔ عنقریب، ظاہر ہوں گے۔"**

نیز، آپ نے اِس جماعت کا شائع کردہ ایک رسالہ
بنام "**خُلاصہ**"، مجھے دکھایا، جس میں یہ حدیث تھی:

اِذا مَضَتْ اَلْفٌ وَمِائتا ن وَاَرْبَعُونَ سنةً، بَعَثَ اللّٰهُ الْمَهْدِی ۔فَيُبَا يِعُ عَلىٰ يَدِهٖ خَلقٌ كثيرٌ ۔ثُمَّ يُغَيِّبُهُ اللّٰهُ تعالىٰ فَيَرْتَدُّوْنَ اِلىٰ دينِ آباءِ هِمْ اِلاَّ مَنِ اتَّبَعَ كتابَ اللّٰهِ وَسنَّةَ نَبِيِّهٖ۔

ترجمہ: بارہ سو چالیس (۱۲۴۰ھ) ہجری کے بعد
اللہ تبارک و تعالیٰ، مہدی کو بھیجے گا، جس کے ہاتھ پر بہت سے لوگ، بیعت کریں گے۔
پھر، انھیں (مہدی) اللہ، غائب فرما دے گا۔
تو لوگ، مُنحرف ہو کر اپنے آبائی دین کو، پھر، اختیار کر لیں گے۔ سِوا، اُن کے
جو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنّت کی اتباع کرنے والے ہیں۔"
مگر، یہ روایت، حدیث کی کسی بھی کتاب میں نہیں ملی۔

بلکہ جو، ذخیرہ "موضوعات" کے نام سے عُلمائے کرام نے جمع فرمایا ہے، اُس میں بھی نہیں۔
معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کی شہادت کے بعد، اسے، وضع کیا گیا ہے۔
اور ایک روایت، یوں بھی، بیان کی جاتی ہے:

فَيُقاتِلُ كَفَرَةَ لَاهَور ۔اور کفّارِ لاہور سے جنگ کریں گے۔"

(ص ۸۶۔ **مکاتیبُ العجالہ**۔ مرتّبہ: عنایت اللہ اثری، وزیرآبادی۔ مطبوعہ: لاہور۔ ۱۹۶۹ء)

نواب، امیر خاں، بانی و والی ریاستِ ٹونک (راجپوتانہ) نے انگریزوں سے صلح کر لی۔ سرحد و پنجاب، سکھوں اور پٹھانوں کے ہاتھ سے نکل کر، انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔
سید احمد، رائے بریلوی صاحب کے اِلہامات اور بشارتوں
اور شاہ اسمٰعیل دہلوی کے وعظ و تبلیغ اور ان دونوں حضرات کے مشترکہ حکمِ جہاد و سفرِ جہاد
اور واضح لفظوں میں ہونے والے "اشارۂ غیبی"، اور، ان سب کا انجام کیا ہوا؟

**یہ داخلی راز اور خارجی مُعَمّا، قارئینِ کرام، اچھی طرح سمجھ کر
اسے خود ہی حل کر لیں، تو زیادہ مناسب اور بہتر ہوگا۔**

معرکۂ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) کے بعد، باقی ماندہ "جماعتِ مجاہدین" کے بارے میں غیر مقلّد مؤرخ، مولانا قاضی محمد اسلم سیف، فیروزپوری لکھتے ہیں:

**"یہ بات، ذہن نشین رکھی جائے، بلکہ اس کو، لوحِ قلب پر نقش کر لیا جائے کہ:
سانحۂ بالاکوٹ کے بعد، تحریکِ مجاہدین، کلّیۃً "اہلِ حدیث" کے ہاتھ میں چلی گئی۔
ہمیں، خوردبین لگا کر بھی، کہیں "غیرِ اہلِ حدیث" دکھائی نہیں دیتے۔" الخ۔**

(ص: ۲۵۵۔ **تحریکِ اہلِ حدیث! تاریخ کے آئینے میں**۔ مؤلّفہ قاضی محمد اسلم سیف فیروزپوری۔ مطبوعہ: اَلکتاب انٹرنیشنل، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ اپریل۔ ۱۹۹۶ء)

انگریزوں کے خلاف، ہندوستان کے اندر، سب سے ہمہ گیر عوامی جنگ ۱۸۵۷ء میں ہوئی
جس میں تحریکِ بالاکوٹ اور اس کے بعد کے باقی ماندہ وابستگانِ سید احمد، رائے بریلوی
و شاہ محمد اسمٰعیل، دہلوی کا کردار، بالکل غیر جانب دارانہ رہا۔
جس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں:
"۱۸۵۷ء کا، پُرآشوب حادثہ پیش آیا۔ گو، مجاہدین اور ان کے معاونین، ایک دینی نظام سے

وابستہ ہونے کی وجہ سے، **اس قومی لڑائی میں غیر جانب دار، رہے۔**'' الخ

(ص ۵۸۔ **ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک**۔ مؤلّفہ: مولانا مسعود عالم ندوی۔
مطبوعہ: مرکزی مکتبہ اسلامیہ، ابوالفضل انکلیو۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی)

''عاجز، یہ عرض کرتا ہے کہ:

مجاہدین، جماعتی حیثیت سے، ۱۸۵۷ء کی قومی لڑائی سے الگ رہے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کو ایک قومی جنگ سے زیادہ، اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ اِس لئے سید صاحب کے ماننے والے ایک دینی نظام سے وابستہ ہونے کے بعد، اس سے الگ رہے۔''

(حاشیہ ۵۸۔ **ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک**۔ مؤلّفہ: مسعود عالم ندوی۔ مطبوعہ: دہلی)

مولوی محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۵ء) کا ذکر کرتے ہوئے
مولانا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں:

''سید صاحب کے ماننے والوں کی جماعت میں یہی ایک ذِمّہ دار آدمی
ایسے ہیں، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شرکت کی تھی۔''

(ص ۱۰۲۔ **ہندوستان کی ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک**۔ مؤلّفہ: مسعود عالم ندوی، مطبوعہ: دہلی)

محمد جعفر تھانیسری کی مذکورہ شرکت بھی بے سند و بلا روایت و شہادت کے، محض دس آدمیوں کے ساتھ تھی۔ جس کی نشان دہی کرتے ہوئے، مولانا ندوی، خود، اس روایت پر، حاشیہ لکھتے ہیں کہ:

''یہ بھی ہنٹر کا بیان ہے۔ اور دوسرے ذرائع سے اس کی تصدیق نہیں ہوسکی۔''

(حاشیہ ص ۱۰۲۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔ مطبوعہ: دہلی)

مولانا عُبید اللہ سندھی (متوفی ۱۹۴۴ء) لکھتے ہیں کہ:

''یہی لوگ ہیں، جنھوں نے شاہ عبد الرحیم، شاہ ولی اللہ، شاہ عبد العزیز، شاہ اسحاق کے حنفی طریقے کو چھوڑنے کی ضرورت، محسوس کی۔

اور ۱۸۵۷ء کے معرکۂ دہلی میں بے تعلق رہے۔

ہم، انہیں ''حزبِ صادق پوری'' کا نام دیتے ہیں۔''

(حاشیہ: ص: ۱۰۵۔ **شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک**۔ مطبوعہ: لاہور)

مولانا سید محمد میاں، دیوبندی کی دو متضاد تحریریں، ملاحظہ فرمائیں:

''مولانا مملوک العلی صاحب، پرنسپل عربک کالج، دہلی، حکومت کے ملازم تھے۔
وہ، سرکار کے وفادار سمجھے جاتے تھے۔ ان کی قیادت میں
جو تنظیم ہو رہی تھی، وہ شک و شبہ سے محفوظ تھی۔
لیکن، ۱۸۵۷ء کے مجاہدین، زیادہ تر، مولانا مملوک العلی کے شاگرد ہی تھے۔

(چند جملوں کے بعد) مختصر، یہ کہ جس بورڈ نے شاہ محمد اسحٰق کے تشریف لے جانے کے بعد دہلی میں نہایت راز داری کے ساتھ، کام سنبھالا، اُس کے صدر، مولانا مملوک علی صاحب تھے۔''

(ص: ۲۵۱۔ **عُلمائے ہند کا شاندار ماضی**۔ جلدِ دوم۔ مطبوعہ: دہلی)

''دوسری تنظیم، جو، اِس تحریک (۱۸۵۷ء) کے زمانہ میں موجود تھی۔
جس کو وہابی تحریک کہا جاتا ہے، جس کا مرکز، صادق پور تھا۔
یہ تنظیم، بحیثیت تنظیم، تحریک سے الگ رہی۔
بلکہ اگر، مولانا عبد الرحیم صاحب، مصنفِ ''اَلدُّرُّ الْمَنْثُور'' کا قول، صحیح تسلیم کر لیا جائے تو، یہ تنظیم، ۱۸۵۷ء کی تحریک کی مخالف رہی''۔ (ص: ۱۹۱۔ **عُلمائے ہند کا شاندار ماضی**۔
جلدِ چہارم، مؤلّفہ: سید محمد میاں، دیوبندی۔ مطبوعہ: کتابستان، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶)

خود، مولانا عبد الرحیم، صادق پوری، اپنے والد
مولانا فرحت حسین، صادق پوری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''۱۸۵۷ء کے غدر میں فرقۂ اہلِ حدیث، جو شریکِ باغیانِ سرکار، نہ ہوا
آپ ہی کی بدولت۔ آپ نے نہایت شد و مد کے ساتھ، تاکید بلیغ، فرمائی تھی کہ:
کوئی مُرید ہمارا، باغیوں کا ساتھ، نہ دے۔ یہ بغاوت، سراسر خلافِ شرع ہے۔''

(ص: ۱۹۹، اَلدُّرُّ الْمَنْثُور فِی تَراجِمِ اَھْلِ صادق فور۔ مطبوعہ: ہادی المطابع، کلکتہ)

عظیم آباد (پٹنہ) کے عُلمائے صادق پور، جو تحریکِ بالاکوٹ (۱۸۲۶ء تا ۱۸۳۱ء) میں پیش پیش، بلکہ اس کے دست و بازو تھے، اُن کے مذکورہ اہم اور ممتاز فرد، عبد الرحیم، صادق پوری ''اِیقاظ'' کے عنوان سے اپنی کتاب ''اَلدُّرُّ الْمَنْثُور'' میں، یہ تاریخی ریکارڈ، درج کرتے ہیں:

''میں، اِس جگہ ایک فہرست اُن حضرات کی لکھتا ہوں کہ جن کے نامِ نامی، اس تذکرہ میں درج ہوئے ہیں۔ اور ان کو، ہماری گورنمنٹ عالیہ عادلہ کی طرف سے خطاب، عطا ہوا ہے۔

اور وہ کُل، سات ہیں:
پانچ، ان میں سے، وہ ہیں کہ جن کو ''**شمس العلما**'' کا خطاب، مرحمت ہوا۔
اور، دو، وہ ہیں، جن کو ''**خان بہادر**'' کا خطاب بخشا گیا۔ وَھُوَ ھٰذِہٖ:
(۱) **شمس العلما**، جناب حضرت مولانا محمد سعید قُدِّسَ سِرَّہٗ، ساکن محلّہ مغل پورہ، شہر پٹنہ۔ (بہار)
(۲) **شمس العلما**، جناب مولانا محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ، ساکن محلّہ صادق پور، شہر پٹنہ۔
(۳) **شمس العلما**، برادرِ عزیز مولوی عبدالرؤف مرحوم ومغفور، ساکن محلّہ صادق پور، شہر پٹنہ۔
(۴) **شمس العلما**، مولوی امجد علی صاحب سلّمہ ایم اے۔
پروفیسر میور سنٹرل کالج الہ آباد۔ ساکن صادق پور، پٹنہ۔
(۵) **شمس العلما**، جناب حضرت مولانا نذیر حسین، محدّث دہلوی۔
ساکن سورج گڈھ ضلع مونگیر۔ (بہار)
(۶) **خان بہادر**، قاضی سید محمد اجمل مرحوم، ساکن قصبہ باڑہ ضلع پٹنہ۔
(۷) **خان بہادر**، جناب قاضی مولوی فرزند احمد صاحب سلّمہ، ساکن گیا (بہار)

چونکہ، یہ خطابات، بلا عوض کسی خدمت کے محض براہِ شفقت ومہربانیِ خسروانہ وعنایتِ شاہانہ
ہم مسلمانوں کی عزت افزائی وقدر شناسی کے لئے گورنمنٹ عالیہ نے مرحمت فرمائے ہیں
پس، ہم سب مسلمانوں کو، عموماً، اور فرقۂ اہل حدیث کو، خصوصاً
اور علی الخصوص خاندانِ صادق پور کو، اس کا شکریہ، قولاً وفعلاً، ادا کرنا چاہیے۔
کیوں کہ اَلشُّکرُ یَزِیدُ النِّعمۃ۔

ہم مسلمانوں کا فطری اور مذہبی شیوہ ہے کہ: مُحسن کے احسان کا، قولاً وفعلاً، اعتراف کریں۔
جیسا کہ جناب سرورِ کائنات، فخرِ موجودات، رَحمَۃٌ لِلعَالَمِین کا ارشاد ہے:
لا یشکر اللہَ مَنْ لا یَشکُرِ النَّاس۔ پھر، کون مسلمان ہوگا، جو، اس پر عمل نہیں کرے گا؟
خاص کر، فرقۂ اہل حدیث کے لئے، تو کسی سلطنت میں بھی
یہ آزادیِ مذہبی (کہ وہ، بلا مزاحمت اپنے تمام ارکان، ادا کریں)
نصیب نہیں، برٹش حکومت میں انہیں، حاصل ہے۔
پس! ان کا فرضِ مذہبی ومنصبی، دونوں ہے کہ:

وہ، ایسی عادل اور مہربان گورنمنٹ کے مطیع وفرماں بردار رعایا ہوں۔
اور ہمیشہ، دعا گوے سلطنت رہیں۔ **فَتَدَبَّرُو وَتَفَکَّرُو وَلَاتَکُنْ مِنَ الْغَافِلِین۔**
(ص۲۔ اَلدُّرُّ الْمَنْثُور۔ از عبدالرحیم، صادق پوری۔ طبعِ اول۔ ہادی المطابع، کلکتہ)

مذکورہ فہرست کے پانچویں نمبر کے محدّثِ دہلوی۔ فرقۂ غیر مقلّدین کے نہایت عظیم
اور نامور محدّث، مولانا نذیر حسین۔ بہاری ثم دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) ہیں۔
جن کے بارے میں محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۹۰۵ء) لکھتے ہیں:
''چنانچہ۔ مولوی نذیر حسین، محدّث دہلوی، جو ایک نامی خیر خواہ، دولتِ انگلشیہ کے ہیں۔''
(ص۱۹۔ تواریخ عجیب/ کالا پانی۔ مؤلّفہ: محمد جعفر تھانیسری۔
مطبوعہ: دینی تعلیمی بورڈ۔ گلی قاسم جان، دہلی۔ ۱۹۶۹ء)

ہندوستانی وہابیت (غیر مقلّدیت) کو، مذہبی وجماعتی شکل دینے میں
مولانا نذیر حسین بہاری ثم دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء)
اور نواب صدیق حسن، بھوپالی (متوفی ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء) کا نمایاں کردار ہے۔
جس کا ذکر، غیر مقلّد اصحابِ علم اپنی تحریروں میں جا بجا کرتے چلے آئے ہیں۔
چنانچہ، مولانا قاضی محمد اسلم سیف، فیروز پوری اپنے ان دونوں اکابر علما، کا
اِس طرح، تعارف کراتے ہیں:
''حضرت میاں سید نذیر حسین محدّث دہلوی، مرکزِ علوم، مصدرِ فنون
اور منبعِ فیوض وبرکات کی حیثیت رکھتے تھے۔ موصوف نے مسندِ رحیمیہ (دہلی) پر بیٹھ کر
ساٹھ (۶۰) برس، علوم وفنون کے ساتھ، صحاحِ ستّہ اور بخاری شریف کا درس دیا۔
.........مسلکی تبلیغ واشاعت میں حضرت میاں صاحب کی تدریس نے اس قدر کام کیا کہ
اس کی مثال، پیش کرنا، ناممکن ہے۔ جیسا کہ نواب سید صدیق حسن خاں کے قلم اور سرمایہ نے
مسلک کے لئے وہ، کام کیا، جو اسلام کے لئے حضرت خالد بن ولید کی تلوار نے کیا۔
حضرت میاں صاحب کا مدرسہ، ایک مرکز تھا، جہاں پر متشدد سے متشدد مقلّدین بھی
کاروانِ عمل بالحدیث میں شامل ہونے پر مجبور ہو جاتے'' الخ
(ص: ۳۲۹۔ **تحریکِ اہلِ حدیث! تاریخ کے آئینے میں**۔ مؤلّفہ: مولانا قاضی محمد اسلم سیف

فیروز پوری۔مطبوعہ: اَلکتاب انٹرنیشنل۔بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔اپریل ۱۹۹۶ء)

سرخیل وسرگروہِ جماعتِ غیر مقلّدین، مولانا نذیر حسین، دہلوی نے
جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے دَوران، اپنے گھر میں ایک انگریز میم کو پناہ دے رکھی تھی۔

اس کے آگے کا حال، مولانا نذیر حسین دہلوی کے شاگرد اور ان کے سوانح نگار غیر مقلّد عالم
مولانا فضلِ حسین، بہاری (متوفی ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء) کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''تین مہینوں کے بعد، جب پوری طرح، امن قائم ہو چکا تھا
تب اس نیم جاں میم کو، جو، اَب بالکل، تندرست وتوانا تھی، انگریزی کیمپ میں پہنچادیا۔
جس کے صلے میں مبلغ ایک ہزار تین سو اور مندرجہ ذیل سارٹیفکٹس ملیں۔'' الخ

(ص: ۹۵۔ اَلحَیَاۃ بعد المَمَاۃ۔مؤلّفہ: مولانا فضل حسین، بہاری
مطبوعہ: اَلکتاب انٹرنیشنل۔بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی)

اسی واقعہ کے بارے میں تحریکِ بالاکوٹ کے ''**تاریخ ساز مؤرخ**'' اور غیر مقلّد صاحبِ علم
وقلم، غلام رسول مہؔر (متوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) کی **تاریخ سازی وافسانہ طرازی**، ملاحظہ فرمائیں:

''یہ بھی صحیح ہے کہ میاں نذیر حسین مرحوم نے ایک زخمی انگریز عورت کو
جو، بے بس پڑی تھی، اٹھا کر اپنے یہاں، علاج کرایا تھا۔ وہ تندرست ہوگئی
اور اسے اس کی خواہش کے مطابق، دہلی کا محاصرہ کرنے والی انگریزی فوج کے کیمپ میں پہنچادیا تھا۔
مگر، اس کا، صِلہ، کچھ نہیں لیا تھا اور کہا تھا کہ:
یہ میرا، اسلامی فرض تھا۔'' (ص:۲۳۶۔اِفاداتِ مہؔر، مطبوعہ لاہور)

مولانا نذیر حسین، بہاری، دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) کے ایک شاگرد
مولانا محمد حسین، بٹالوی (متوفی ۱۹۲۰ء) لکھتے ہیں:

''مفسدۂ ۱۸۵۷ء میں، جو مسلمان شریک ہوئے تھے، وہ، سخت گنہ گار
اور بحکمِ قرآن، وہ مُفسِد وباغی وبدکردار تھے۔ اکثر، ان میں، عَوَام کالْاَنعام تھے۔
بعض، جو خواص وعُلما کہلاتے تھے، وہ بھی اصل علوم دین سے بے بہرہ، یا نافہم وبے سمجھ۔
باخبر، سمجھ دار عُلما، اس میں ہرگز شریک، نہ ہوئے اور، نہ ہی اس فتویٰ پر
جو، اِس غدر کو جہاد بنانے کے لئے مُفسِد لیے پھرتے تھے، انہوں نے خوشی سے دستخط کیے۔

یہی وجہ تھی کہ مولوی اسمٰعیل دہلوی جو حدیث وقرآن سے باخبر اور اس کے پابند تھے
اپنے ملک، ہندوستان میں انگریزوں سے (جن کے امن وعہد میں رہتے تھے)
نہیں لڑے، اور، نہ اس ملک کی ریاستوں سے لڑے۔
اس ملک سے باہر ہوکر، قوم سکھ (جو مسلمانوں کے مذہب میں دست اندازی کرتے تھے،
کسی کو اونچی اذان نہیں کہنے دیتے تھے) سے لڑے۔''

(ص۵۰۔اَلِاقتصاد فِی مَسَائِلِ الْجِھاد۔مؤلّفہ: محمد حسین، بٹالوی۔مطبوعہ: وکٹوریہ پریس۔لاہور)

دوسرے شاگرد، مولانا فضلِ حسین، بہاری (متوفی ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء)
اپنے استاد، مولانا نذیر حسین، بہاری، دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) کے
سفرِ حج کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حج کو جاتے وقت، جو چٹھی، کمشنر دہلی وغیرہ نے، میاں صاحب (نذیر حسین دہلوی) کو
دی تھی، اُس کی نقل، سفرِ حج کے بیان میں ہدیۂ ناظرین کی جائے گی۔
مگر، اسی کے ساتھ یہ بتادینا بھی ضروری ہے کہ:
میاں صاحب (نذیر حسین، دہلوی) بھی گورنمنٹ انگلشیہ کے کیسے وفادار تھے۔
زمانۂ غدر، ۱۸۵۷ء میں، جب، دہلی کے بعض مقتدر، اور بیشتر معمولی مولویوں نے
انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ دیا، تو، میاں صاحب (نذیر حسین، دہلوی) نے، نہ اس پر دستخط کیا نہ مہر۔
بہادر شاہ کو بھی بہت سمجھایا کہ انگریزوں سے لڑنا، مناسب نہیں ہے۔
مگر، وہ، باغیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو رہے تھے۔ کرتے تو کیا کرتے؟

(ص۹۳۔اَلْحَیاۃ بَعد الْمَمَاۃ۔مؤلّفہ: فضل حسین بہاری۔
مطبوعہ: اَلکتاب انٹرنیشنل۔بٹلہ ہاؤس۔جامعہ نگر۔نئی دہلی ۲۵)

تیسرے شاگرد، مولانا محمد ابراہیم میر، سیالکوٹی (متوفی ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء)
اپنے استاذ، مولانا نذیر حسین، بہاری دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) کے بارے میں
اپنی کتاب ''**تاریخِ اہلِ حدیث**'' (محرّرہ ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء) میں لکھتے ہیں:

''وہابیت کا مقدمہ، ۶۵۔۱۸۶۴ء میں، جب، ہندوستان کے اکثر شہروں میں چلایا گیا
تو بیشتر ماخوذین کے لئے حبسِ دوام، بعبور دریائے شور کا حکم دیا گیا۔

میاں صاحب (نذیر حسین، دہلوی) پر بھی، مؤاخذہ ہوا۔
جو، صرف مُخبِروں کی غلط خبر رسانی اور اہل کاروں کی غلط فہمی پر مبنی تھا۔
آپ، تا تحقیقاتِ کامل، کم وبیش ایک برس تک، راول پنڈی (پنجاب) کی جیل میں
نظر بند رہے۔ بعد تحقیقاتِ کامل، معلوم ہو گیا کہ:
مؤاخذہ، ناجائز ہے، اِس لئے آپ کو رہا کر دیا گیا۔"

(ص ۴۲۸۔ تاریخِ اہلِ حدیث۔ مؤلّفہ: محمد ابراہیم میر، سیالکوٹی۔
مطبوعہ: اَلکتاب انٹرنیشنل۔ بٹلہ ہاؤس۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ستمبر ۱۹۹۵ء)

اِن تاریخی حقائق کے باوجود، بِن بلائے مہمان کی تیزی وطرّاری
اور بے چینی کا یہ عالَم ہے کہ پورا دسترخوان ہی سمیٹ لینا چاہتے ہیں۔

چنانچہ، ایک غیر مقلّد مؤرخ، قاضی محمد اسلم سیف، فیروز پوری، یہ تاریخ "ایجاد" فرماتے ہیں:
.... تا آں کہ، میرٹھ چھاؤنی سے، یہ لاوا، ۱۸۵۷ء کو پھٹ گیا۔
اور تمام چھاؤنیوں سے مسلمان فوجیوں نے علَمِ جہاد، بلند کر دیا۔
اور جنرل بخت، جو، پکّے اہلِ حدیث تھے، کی قیادت میں دہلی پر قبضہ کر لیا۔
آخری مغل تاجدار، بہادر شاہ ظفر کو حکمرانی کے لئے آمادہ کیا۔
ایک دوسرے اہلِ حدیث سپوت، مولانا احمد اللہ (مدراسی) کی خدمات بھی
تاریخِ آزادیٔ ہند کا سنہری باب ہیں۔
دیہات وقصبات کے مسلمان عوام، خصوصاً، اہلِ حدیث حضرات نے
اس تحریک میں بھر پور کردار، ادا کیا۔" الخ

(ص: ۲۵۷ و ۲۵۸۔ تحریکِ اہلِ حدیث! تاریخ کے آئینے میں۔ مؤلّفہ: مولانا قاضی محمد اسلم سیف
فیروز پوری، مطبوعہ: اَلکتاب انٹرنیشنل، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۹۹۶ء)

کوئی مسلمان، یا کوئی مؤرخ، قاضی صاحب کا کیا بگاڑ سکتا تھا
اگر، مذکورہ داستان سرائی وافسانہ طرازی میں یہ جملہ بھی ارشاد فرما دیتے کہ:
"بہادر شاہ ظفر کو حکمرانی کے لئے آمادہ کر لیا، جو، پکّے اہلِ حدیث تھے۔"

ایسے ہی بہادر مصنّفین اور جرأت مند مؤرخین کی تحریروں میں، مَیں نے پڑھا ہے کہ:

حضرت سیدنا الشیخ عبد القادر، جیلانی، بغدادی، رَضِیَ اللّٰہُ عَنہُ اور شاہ عبد الحق، محدّث دہلوی
(وصال ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) اہلِ حدیث تھے۔ اور علّامہ فضلِ حق خیر آبادی (وصال ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء)
وہابی مجاہدِ آزادی تھے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔

۱۸۵۷ء میں متحدہ ہندوستان کے اندر، کتنے وہابی رہے ہوں گے؟ اسے جاننے کے لئے
اسی دَور اور اسی طبقہ کے، محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۹۰۵ء) کی یہ تحریر، ملاحظہ فرمالیں:
"میری موجودگیِ ہند کے وقت (۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء)
شاید، پنجاب بھر میں، دس (۱۰) بھی، وہابی عقیدہ کے مسلمان، موجود، نہ تھے۔"

(ص: ۸۱۔ تواریخِ عجیبہ۔ مؤلّفہ: محمد جعفر تھانیسری۔ مطبوعہ: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور)

ایک دوسرے غیر مقلد صاحبِ قلم، حافظ صلاح الدین یوسف کا
بلند بانگ دعویٰ اور بلا طلب لَنْ تَرانی، یہ ہے کہ:
"اور واقعہ، یہ ہے کہ شہیدَین کے سانحۂ شہادت کے بعد
یعنی ۱۸۳۱ء سے ۱۹۳۴ء تک، یہ خون بہانے والے، اہلِ حدیث ہی تھے۔
اور اس پورے عرصے میں بلکہ اس کے بعد تک
تحریکِ جہاد کی قیادت، علمائے اہلِ حدیث ہی کے ہاتھ میں رہی ہے۔
اور انہیں اہلِ حدیث علما اور اَعیان اور ان کے عوام اور تجّار کی بے مثال جہاد سے وابستگی
اور جان و مال کی بے بہا قربانیوں سے انگریز کے خلاف، جہاد کا یہ شجرِ طوبیٰ پروان چڑھتا رہا
جس کے گھنے سائے اور نتیجے میں اِستخلاصِ وطن کی، وہ مختلف تحریکیں اُٹھیں
جن میں پھر، متحدہ ہند کے تمام طبقوں نے درجہ بدرجہ، حصہ لیا۔" الخ۔

(ص: ۵۸۔ تحریکِ جہاد! جماعتِ اہلِ حدیث، اور علمائے احناف، مؤلّفہ: حافظ صلاح الدین یوسف
مطبوعہ: دارُ الکتب الاسلامیہ، اردو مارکیٹ، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی۔۔ مارچ، ۲۰۰۰ء)

"حکومت کی طرف سے خطاب" کے عنوان سے غیر مقلّد عالم، مولانا میر، سیالکوٹی لکھتے ہیں:
"جون ۱۸۹۷ء مطابق محرم ۱۳۱۵ھ میں آپ (مولانا نذیر حسین، دہلوی) کو
گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے "شمس العلماء" کا خطاب ملا۔"

(ص ۴۳۰۔ تاریخِ اہلِ حدیث۔ مؤلّفہ: مولانا میر، سیالکوٹی۔

مطبوعہ: اَلکتاب انٹرنیشنل۔ بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵)

مولانا محمد حسین، بٹالوی (متوفی ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء) شاگردِ مولانا نذیر حسین، دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) فرقۂ اہلِ حدیث کے نامی گرامی عالم وصحافی ورہنما ہیں۔

جن کے مختلف کارنامے اور سرگرمیاں، کچھ اِس طرح ہیں:

معروف غیر مقلّد عالم، مولانا مسعود عالم، ندوی (مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ایک اہم دوست اور ہم خیال وہم مزاج) کی مشہور کتاب ''**ہندوستان میں پہلی اسلامی تحریک**'' میں ہے:

''مولوی محمد حسین، بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ) نے، جہاد کی منسوخی پر ایک رسالہ (**اَلْاِقْتِصَاد فِی مَسَائِلِ الْجِهَاد**) فارسی زبان میں تصنیف فرمایا تھا۔

اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے، شائع کرائے تھے۔

معتبر اور ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ:

''اِس کے معاوضے میں، سرکار انگریزی سے انہیں جاگیر بھی ملی تھی۔''

(حاشیہ ص ۲۰۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔ مؤلّفہ: مولانا مسعود عالم ندوی۔
مرکزی مکتبہ اسلامی، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۹۹۹ء)

ذیل کی عبارت میں مولانا بٹالوی، جو لکھ رہے ہیں (یعنی ہندوستان، دارُ الاسلام ہے)

اس کی اصل نیت ''جاگیر معاوضہ'' سے واضح ہے۔

''جس شہر، یا ملک میں، مسلمانوں کو مذہبی فرائض ادا کرنے کی آزادی ہو
وہ شہر، یا ملک، دارُ الحرب نہیں کہلاتا۔ پھر، اگر، وہ، دراصل، مسلمانوں کا ملک، یا شہر ہو
اور اقوامِ غیر نے اس پر تغلُّب سے تسلُّط پالیا ہو
تو جب تک، اس میں ادائے شعائرِ اسلام کی آزادی ہے
وہ، بحکمِ حالتِ قدیمہ، دارُ الاسلام کہلاتا ہے۔''

(ص ۱۹۔ **اَلْاِ قتصاد فِی مَسَائِلِ الْجِهَاد**۔ مؤلّفہ: محمد حسین بٹالوی۔ وکٹوریہ پریس، لاہور)

اَلْاِ قتصاد فِی مَسَائِلِ الْجِهَاد کے حوالے سے مولانا محمد حسین، بٹالوی

اپنے رسالہ **اِشَاعَۃُ السُّنَّہ**، لاہور میں لکھتے ہیں:

''۱۸۷۲ء میں ایڈیٹر، **اِشَاعَۃُ السُّنَّہ**، لاہور اپنا رسالہ ''**اَلْاِ قْتِصَاد فِی مَسَائِلِ الْجِهَاد**''

تالیف کر چکا ہے، جس میں قرآن وحدیث وفقہی دلائل سے ثابت ومدلّل کیا ہے کہ:

''اِس گورنمنٹ سے مسلمانوں کا، ہند کے ہوں، خواہ روم، یا عرب کے مذہبی جہاد، جائز نہیں۔''

''اور اسی سال، پنجاب کے عام اہلِ حدیث نے بذریعہ ایک عرض داشت اپنی عقیدت واِطاعتِ گورنمنٹ کا اظہار کیا تھا۔

جس پر، گورنمنٹ کی طرف سے، اس کی تائید وتصدیق میں ایک سرکلر، جاری ہوا تھا جو، **اِشَاعَۃُ السُّنَّہ**، نمبر ۹۔ جلد ۸ میں منقول ہو چکا ہے۔''

(ص ۲۶۔ جلد ۹۔ شمارہ ۱۔ اِشَاعَۃُ السُّنَّہ، لاہور۔ از محمد حسین، بٹالوی)

ملکۂ برطانیہ کی گولڈن جبلی (۱۸۸۶ء) کے موقع پر، فرقۂ اہلِ حدیث کا پیش کردہ سپاس نامہ
مولانا محمد حسین، بٹالوی (متولد ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء۔ متوفی ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء)
اِس طرح، نقل کرتے ہیں:

''پس، واضح ہو کہ جو کچھ اِس موقع پر، اہلِ حدیث نے کیا ہے، وہ اُمورِ ذیل ہیں:

(۱) ملکۂ معظّمہ کی تعظیم کرنا اور تعظیمی الفاظ سے، ان کو یاد کرنا۔

(۲) ملکۂ معظّمہ کی پنجاہ سالہ حکومت پر خوشی کا اظہار کرنا۔

اور اس خوشی میں مسلمانوں کو کھانا کھلانا۔

(۳) برٹش حکومت کی اِطاعت وعقیدت، ظاہر کرنا اور اس کو فرضِ مذہبی، بتانا۔

(۴) ملکۂ معظّمہ اور ان کی سلطنت کے لئے دعاے سلامتی وحفاظت وبرکت کرنا۔

وَعَلیٰ هٰذا الْقِیاس۔

اِن اُمور میں کوئی امر بھی، ایسا نہیں ہے، جس کے جواز پر شریعت کی شہادت، نہ پائی جاتی ہو۔''

(ص ۲۲۹۔ اِشَاعَۃُ السُّنَّہ، لاہور۔ ج ۹۔ شمارہ ۸۔ از محمد حسین، بٹالوی)

مولانا محمد حسین، بٹالوی (متوفی ۱۹۲۰ء) کی تحریک اور کوشش کے نتیجے میں

عُلما وزُعَماے اہلِ حدیث نے حکومتِ ہند کو، یہ درخواست دی کہ:

جماعتِ اہلِ حدیث، حکومتِ ہند کی مکمل وفادار اور خیر خواہ ہے، اس لئے لفظ ''وہابی'' کی جگہ لفظ ''اہلِ حدیث'' لکھنے اور سرکاری کاغذات میں اِسی طرح، اِندراج کرنے کا

سرکاری حکم، صادر فرمایا جائے۔

حکومتِ ہند کے نام دی گئی اِس درخواست پر دستخط کرنے والے

چند نمایاں عُلمائے اہلِ حدیث کے نام، یہ ہیں:

سید محمد نذیر حسین، دہلوی وابوسعید محمد حسین، بٹالوی، وکیلِ اہلِ حدیث ہند ومحمد یونس خاں
رئیسِ علی گڑھ وقطب الدین، روپڑی ومحمد سعید، بنارسی وسید نظام الدین، بنارسی۔''

(ص۴۲۔اِشَاعَۃُ السُّنَّہ، لاہور۔ج۱۱۔شمارہ ۲۵۔)

چنانچہ، یہ درخواست ۱۹؍جنوری ۱۸۸۷ء میں تحریری طور پر، منظور ہوئی۔

اور ۱۸۸۸ء میں اِس کے لئے سرکاری پروانہ، مسٹر، جے بی ہیوٹ
انڈر سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا نے ۱۱؍جون ۱۸۸۸ء کو، شملہ سے جاری کیا۔''

(ص۴۷۔اِشَاعَۃُ السُّنَّہ، لاہور۔ج۱۱۔شمارہ ۲۵۔ازمحمد حسین، بٹالوی)

''**وہابی**'' کی جگہ ''**اہلِ حدیث**'' نام، منظور کرانے کی اصل وجہ، سیاسی ہے۔ کیوں کہ:

انقلابِ ۱۸۵۷ء کے نتیجے میں انگریزوں نے، وہابیوں سے عام مسلمانانِ ہند کی نفرت کے
پیشِ نظر اور خود اپنی پروپگنڈہ مُہم کے تحت، جب جس عالم اور مسلمان کو پکڑا
یا۔اس سے کچھ خطرہ محسوس کیا، تو فوراً اُس پر، وہابی کا لیبل لگادیا اور اپنی کارروائی، شروع کردی۔

اسی پروپگنڈہ مُہم کے شکار، بہت سے ہندوستانی مؤرخین بھی ہوئے۔

اور انہوں نے انقلابی عُلما اور مسلمانوں کے جس طبقے کو، چاہا، وہابی لکھ دیا۔

جس طرح، آج کل، یہودی وامریکی وبرطانوی پروپگنڈہ ''جہاد'' اور ''جہادیوں'' کے
خلاف، جاری ہے اور ہندوستانی پولس بھی جس مسلم نوجوان کو چاہتی ہے۔
''جہادی'' کہہ دیتی ہے اور نیشنل میڈیا بھی اسے ''جہادی'' کی شکل میں پیش کردیتا ہے۔

غیر مقلّدین، یعنی جماعتِ اہلِ حدیث کا وہابی ہونا، ایک الگ حقیقت ہے۔

اور اِس جماعت کا وہابی سے اہل حدیث ہونے کا، اِسمی ورَسمی سفر، ایک الگ سیاست ہے۔

بہرحال! تحریکِ بالاکوٹ اور فرقۂ اہلِ حدیث وحلقۂ دیوبند کے ایک حامی مؤرخ
پروفیسر محمد ایوب قادری (متوفی نومبر ۱۹۸۳ء۔کراچی)
مولانا محمد حسین بٹالوی (متوفی ۱۹۲۰ء) شاگردِ مولانا نذیر حسین، دہلوی (متوفی ۱۹۰۲ء) کی

یہ جماعتی تحریر، نقل کرتے ہیں:

''اِس گروہِ اہلِ حدیث کے خیر خواہ و وفادار رِعایائے برٹش گورنمنٹ ہونے پر
ایک روشن اور قوی دلیل، یہ ہے کہ:

یہ لوگ، برٹش گورنمنٹ کے زیر حمایت رہنے کو، اسلامی سلطنتوں کے ماتحت رہنے سے بہتر
سمجھتے ہیں اور اس امر کو اپنے قومی وکیل اِشَاعَۃُ السُّنَّہ، لاہور کے ذریعہ سے جس کے نمبر ۱۰۔جلد ۶
میں اس امر کا بیان ہوا ہے۔(اور وہ نمبر، ہر ایک لوکل گورنمنٹ آف انڈیا میں پہنچ چکا ہے)
گورنمنٹ پر، بخوبی، ظاہر اور مدلّل کرچکے ہیں۔

جو آج تک، کسی اسلامی فرقہ رعایائے گورنمنٹ نے ظاہر نہیں کیا۔اور نہ آئندہ، کسی سے
ظاہر ہونے کی امید ہوسکتی ہے۔'' (ص۲۷۔**مقدمۂ حیاتِ سید احمد شہید**۔مطبوعہ: کراچی)

چند سطور کے بعد، اپنی تحقیق اِس طرح، پیش کرتے ہیں:

''مولوی محمد حسین، بٹالوی کی پوری پالیسی میں
شمس العلما، شیخ الکل، میاں، نذیر حسین، دہلوی، مُمِد ومُعاوِن، بلکہ سرپرست ودخیل رہے۔
اور صادق پور (پٹنہ) کے بجائے، مرکزِ قیادت، دہلی اور لاہور، منتقل ہوگیا۔
پھر، بیسویں صدی عیسوی کے آغاز پر، دسمبر ۱۹۰۶ء میں بمقام آرہ (بہار)
آل انڈیا اہلِ حدیث کانفرنس، جس کے سب سے فعّال کارکن، مولانا ثناء اللہ، امرتسری تھے۔
''**اہلِ حدیث کانفرنس**'' کی پالیسی بھی کم وبیش، مولوی محمد حسین، بٹالوی کے انداز پر رہی۔''

(ص۲۸۔**مقدمۂ حیاتِ سید احمد شہید**۔مطبوعہ کراچی)

مولانا محمد حسین، بٹالوی (متوفی ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء) کی طرح
مولانا ثناء اللہ، امرتسری (متوفی ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) بھی، جماعتِ اہلِ حدیث کے سرگرم
عالم وصحافی اور مولانا نذیر حسین، دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) کے شاگرد تھے۔

مولانا امرتسری نے علمِ حدیث کا زیادہ حصہ، مولانا عبدالمنّان، وزیرآبادی
(متوفی، رمضان ۱۳۳۴ھ۔وزیرآباد ضلع گوجرانوالہ، پنجاب) سے پڑھا تھا
جو، مولانا نذیر حسین، دہلوی کے خصوصی شاگرد تھے۔

○○○

جنگِ شاملی ۱۸۵۷ء! واقعات وحقائق

متحدہ ہندوستان کا اسمٰعیلی وہابی فرقہ ایک مدت بعد، دو مذہبی حصوں میں تقسیم ہونے کے بعد (۱) غیر مقلّد اور (۲) دیوبندی کے نام سے موسوم ہوا۔

غیر مقلّد حضرات کی مذہبی وسیاسی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد

اب ضروری ہے کہ دیوبندی حضرات کی تاریخی حقیقت بھی

دستاویزی روایتوں اور شہادتوں کے ساتھ، منظر عام پر آجائے۔

دہلی سے کچھ دوری پر واقع ضلع سہارن پور، متعدد حیثیتوں سے ایک مشہور ومعروف ضلع ہے، جس کا کچھ علاقہ، اِس وقت، ضلع مظفر نگر میں شامل ہے۔

مغربی اتر پردیش کے اضلاع میں آج بھی، اس کی شہرت واہمیت ہے۔

ضلع سہارن پور کی ایک چھوٹی سی مسلم آبادی ''**دیوبند**'' کے اندر، حاجی سید عابد حسین، قادری چشتی، دیوبندی (وصال ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء) نے، اپنے کچھ مقامی اَحباب ومتعلقین کے تعاون سے بتاریخ ۱۵/محرم ۱۲۸۳ھ/۳۰/مئی ۱۸۶۶ء ایک ''**مدرسہ عربی وفارسی وریاضی**'' قائم کیا۔

جو آج، **دارالعلوم دیوبند** کے نام سے عالَم گیر شہرت کا حامل ہے۔

لیکن، اس کی تاریخ سے حاجی سید عابد حسین کا نام، اس طرح، غائب کر دیا گیا ہے کہ:

اکثر فُضَلائے دیوبند بھی، نہیں جانتے کہ یہ کون بزرگ ہیں؟

جب کہ اصل تاریخ، درج ذیل اقتباس میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، جس میں ڈھونڈ ھنے سے بھی کہیں، مولانا محمد قاسم، نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) کا نام نہیں ملے گا۔

''حاجی عابد صاحب نے تین چلّے کیے۔ پہلا جنگل میں، دوسرا، چودھری صابر بخش کی مسجد میں، اور تیسرا، مسجد چھتّہ میں۔ جب، آپ، تیسرے چلّے ہی میں تھے کہ:

آپ کو مدرسہ، قائم کرنے کا اِلہام ہوا۔

جمعہ کی شب، خواب دیکھا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔

اور حاجی صاحب قُدِّسَ سِرُّہٗ کو حکم فرما رہے ہیں کہ:

یہاں، ایک عربی مدرسہ، دینِ اسلام کی بقا وترویج کے لئے قائم کیا جائے۔''

صبح کو، حاجی صاحب نے دیوبند کے سربرآوردہ حضرات کو مسجد چھتّہ میں بلایا۔

مولانا مہتاب علی، مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمٰن، مولانا فضلِ حق

مولانا نذیر احمد اور دوسرے حضرات، شریک ہوئے۔

حضرت حاجی محمد عابد صاحب قبلہ نے، ان حضرات کے سامنے

اپنے رات کے خواب کو بیان کیا اور ایک عربی مدرسہ کے قیام کی رائے، پیش فرمائی اور فرمایا کہ:

''جب پرانے عالم، نہ رہیں گے، تو کوئی مسئلہ بتانے والا بھی نہ رہے گا۔''

ان حضرات نے مکمل طور پر تعاون کا یقین دلایا اور امداد کا وعدہ فرمایا۔

اسی مجلس میں عاجی عابد صاحب قدّسَ سِرُّہٗ نے اپنا سفید رومال چندہ کے لئے بچھا دیا اور ساتھ ہی اپنی جیب سے تین روپے، اس رومال پر رکھے اور ہمیشہ دینے کا وعدہ فرمایا۔

ان حضرات نے بھی اپنا نام لکھوایا اور مجلس، ختم ہوگئی۔ یہ واقعہ ۲/ذی القعدہ ۱۲۸۲ھ کا ہے۔

صبح ہوئی۔ اِشراق کی نماز کے بعد، گلے میں جھولی ڈالی اور اپنے تین روپے اس میں ڈالے اور گھر گھر جا کر چندہ کا عمل، شروع کر دیا۔ اور شام تک چار سو ایک روپے اور آٹھ آنے جمع ہوگئے۔ اور پھر، ڈیڑھ ماہ کی مدت میں اتنے روپے، جمع ہوگئے کہ:

۱۵/محرم ۱۲۸۳ھ کو دارالعلوم کا قیام، عمل میں آگیا۔

(ص ۳۔ **رودادِ دار العلوم دیو بند ۱۲۸۳ھ**۔ خواب اور چندہ کا واقعہ ''**تذکرۃُ العابدین**'' از مولانا نذیر احمد، دیوبندی، مطبوعہ: دہلی ۱۳۱۷ھ میں بھی مذکور ہے)

خانوادۂ حاجی سید عابد حسین، قادری، چشتی (وصال ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء) بانیِ مدرسہ دیوبند کے ایک فرد، سید افتخار حسین، محلّہ ضیاءالحق، دیوبند کی ایک تحریر کے اِقتباسات، ملاحظہ فرمائیں:

''وہ فخرِ اَماثل واَماجد، سید محمد عابد، رَحْمَۃُ اللہِ عَلَیْہِ ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کو سحاب کے برسنے تک اور کتاب کے پڑھے جانے تک، باقی رکھے۔

اس مدرسۂ مقدسہ کی بنیاد، قائم کرنے کا (اللہ نے، ان پر) اِلہام کیا۔

پس، حضرت ممدوح (**حاجی عابد**) نے، تائیدِ رائے کے لئے ۱۲۸۲ھ میں پُکارا۔

خلقت نے، اسے نہایت غور سے سنا اور قبول کیا۔ اور جنابِ والا کی اِلتماس کا اتباع کیا۔

پس، یہ مدرسہ، آں جناب (**حاجی عابد**) کی سَعیِ مشکور سے علم اور عُلما کا ٹھکانہ

اورمَرجِع فضل وفُضَلا وپناہِ دین ودین داراں بن گیا۔

(اَلْھَدِیَّۃُ السَّنِیَّۃُ فِی ذِکرِ الْمَدْرَسۃِ الْاِسْلَامِیَّۃِ الدِّیو بندِیَّہ۔ مطبوعہ ۱۳۰۷ھ۔
ازمولانا ذوالفقارعلی، دیوبندی، والدِ مولانا محمود حسن، دیوبندی)

''چندہ کے لئے رومال پھیلانے والے اورسب سے پہلے چندہ دینے والے
حاجی سید محمد عابد حسین صاحب، رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِ ہیں۔

جس زمانے میں مدرسہ، قائم ہوا، اُس زمانے میں مولانا محمد قاسم صاحب، نانوتوی
میرٹھ کے مطبع مجتبائی میں تصحیح کا کام انجام دیتے تھے، جس کا ذکر، مولانا محمد یعقوب صاحب نے
''**سوانحِ عمری مولانا محمد قاسم**'' (مطبوعہ ۱۳۰۷ھ) میں کیا ہے۔

دیوبند میں مولانا محمد قاسم کا قیام، ۱۲۹۰ھ سے پہلے، ثابت نہیں۔ اِس سے پہلے تک
مولانا محمد قاسم کا مستقل قیام، میرٹھ اور دہلی میں رہا۔ کبھی، نانوتہ اور دیوبند بھی آیا جایا کرتے تھے۔

۱۳۰۶ھ میں شاہ رفیع الدین صاحب کے دیوبند سے ہجرت کرجانے کے بعد
مدرسہ سے ایک اِشتہار، شائع ہوا تھا (جو، اَلْحَمْدُ لِلّٰہ، ہمارے پاس ابھی تک، محفوظ ہے)
جس پر، مندرجہ ذیل بزرگوں کے دست خط، موجود ہیں:

مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا ذوالفقار علی صاحب، مولانا فضل الرحمٰن صاحب
منشی فضلِ حق صاحب، مہتمم سوم، دارالعلوم دیوبند، حکیم مشتاق احمد، دیوبندی
حکیم ضیاء الدین صاحب، رام پوری۔

اِس اشتہار کا ایک ٹکڑا، یہ ہے:

''جُملہ خیرخواہانِ مدرسہ کو، بہ سبب روانگیِ مولوی صاحب موصوف کے
نہایت تشویش، پیش آئی۔ ناچار، بجز، اِس تدبیر کے، کوئی چارہ، نہ بن پڑا کہ:
سب مجتمع ہوکر بخدمت حضرت حاجی عابد صاحب، جو بانیِ مدرسہ، مجوِّزِ اول مدرسہ ھٰذا
وحامی وسرپرست وسرآمدِ اَربابِ شوریٰ ہیں، حاضر ہوکر، ملتجی ہوئے کہ:
اب، جناب اِس کارِ اہتمام کوانجام دیں کہ آخر، یہ مدرسہ آپ ہی کا ہے۔

ابتدائی تیس سالوں کی رودادوں میں بار بار، حاجی محمد عابد صاحب کو
اصلِ اصولِ مدرسہ لکھا گیا۔ ملاحظہ ہو، روداد۔ ۱۲۸۶ھ۔
حضرت نانوتوی کو مدیر لکھا گیا اور بعض جگہ، مربیِ اعظم کے الفاظ ہیں۔

لیکن، اصلِ اصول، حاجی صاحب ہی کو لکھا گیا۔ ملاحظہ ہو: روداد ۹۶۔۱۲۹۵ھ۔
(**روزنامہ، قومی آواز**، نئی دہلی۔ شمارہ ۲۲ر دسمبر ۱۹۹۷ء۔ بقلم: سیدِ افتخار حسین، محلّہ ضیاء الحق، دیوبند)

میرٹھ کے مطبع میں مولانا محمد قاسم، نانوتوی کی ملازمت، مشہور ومسلَّم ہے۔
چنانچہ، مولانا محمود حسن، دیوبندی (متوفی ۱۹۲۰ء) کی تعلیم کے بارے میں
مولانا عاشق الٰہی، میرٹھی (متوفی ۱۹۴۱ء) لکھتے ہیں:

''پھر، ۱۲۸۶ھ میں کتبِ صحاحِ ستّہ اور بعض دیگر کتب، اپنے فخرِ زمانہ استاد، حضرت مولانا
محمد قاسم صاحب سے پڑھیں۔ جو، اس وقت، میرٹھ میں منشی ممتاز علی کے مطبع کی خدمتِ تصحیح
قبول فرمائے ہوئے تھے۔'' (ص: ۱۰۔۱۱۔ **تذکرۃ الخلیل**، مولّفہ: مولانا عاشق الٰہی، میرٹھی۔ مطبوعہ: میرٹھ)

مولانا عبدالحمید، نعمانی، قاسمی (جمعیۃ العلماء ہند، نئی دہلی)
بانیِ مدرسہ دیوبند کے موضوع پر، اپنا حاصلِ تحقیق ومطالعہ، اِس طرح، بیان کرتے ہیں:

''دیوبند میں حضرت حاجی (عابد) صاحب کے سگے پوتے، سید شاداب، ہمارے ہم درس
تھے۔ ان کے پاس بہت سے پرانے کاغذات ہیں۔ جن سے صاف **معلوم** ہوتا ہے کہ:
قیامِ دارالعلوم کے اول محرِّک ومجوِّز، حضرت حاجی صاحب ہی تھے۔
البتّہ، حضرت مولانا محمد قاسم، نانوتوی سمیت، دوسرے اکابر سے صلاح ومشورہ کیا جاتا رہا۔''
(**روزنامہ، قومی آواز**، نئی دہلی۔ شمارہ ۲ر جنوری ۱۹۹۸ء۔)

مولانا محمد یونس، فاضلِ دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:

''مجھے یاد ہے۔ میں، اُس وقت، دارالعلوم دیوبند میں تعلیم، حاصل کررہا تھا۔
شیخ الاسلام، مولانا سید حسین احمد اور شیخ الادب والفقہ، مولانا اعزاز علی، حیات تھے۔
مولانا مناظر احسن، گیلانی کو، بانیِ دارالعلوم دیوبند کون؟ تحقیق، سپرد کی گئی۔
مولانا مناظر احسن، گیلانی نے اپنے قلم سے حضرت حاجی عابد کو، **بانیِ دارالعلوم** تحریر کیا۔
قاری محمد طیب صاحب نے اعتراض کیا۔ مولانا مناظر احسن، گیلانی نے فرمایا:
''میری تحقیق یہی ہے کہ:
حضرت حاجی عابد، بانیِ دارالعلوم ہیں۔ اور میں اپنے قلم سے اس کو قلم زَد، نہیں کروں گا۔
آپ کی مرضی۔ آپ اپنے قلم سے اس کو قلم زَد کردیجیے۔
قاری صاحب نے، برہمی کا اظہار فرمایا اور اپنے قلم سے، اس کو قلم زَد کردیا۔

حقیقت اپنی جگہ ہے کہ دارالعلوم کے بانی، حضرت حاجی عابد ہیں۔
حافظ محمد احمد (فرزندِ مولانا محمد قاسم، نانوتوی) مہتمم رہے۔
پھر، ان کے بیٹے، مولانا محمد طیب، مہتمم رہے۔
اِس وجہ سے ان کے دادا، دارالعلوم کے بانی، بن گئے۔"

(**روزنامہ، قومی آواز۔ نئی دہلی**، شمارہ ۱۶/دسمبر ۱۹۹۷ء)

یہ حقیقت، اپنی جگہ، ثابت شدہ ہے کہ حاجی سید عابد حسین ہی بانیِ مدرسہ دیوبند ہیں۔
اس کے علاوہ، جو کچھ ہے، وہ صرف افسانہ اور پروپگنڈہ ہے۔

"حاجی محمد عابد کی مساعی سے ۱۵/محرم الحرام ۱۲۸۳ھ/۳۰/مئی ۱۸۶۶ء، بروز پنج شنبہ اِس مدرسہ کی بنیاد پڑی۔ **اور اس کا نام "مدرسہ عربی و فارسی و ریاضی" رکھا گیا۔"**

(ص: ۱۵۵۔ **تاریخِ دارالعلوم دیوبند**۔ جلدِ اول، از سید محبوب علی رضوی۔ مطبوعہ: دہلی۔ ۱۹۷۷ء)

"اَربابِ حوائج، اکثر، ان (حاجی محمد عابد) کی خدمت میں آیا کرتے ہیں۔ صبح سے رات دس بجے تک، نقوش اور تعویذ، تقسیم کرتے ہیں۔ ساکنینِ دیوبند، ان کے بہت معتقد ہیں۔"

(ص ۸۰۔ **دہلی اور اس کے اَطراف**۔ مؤلّفہ: حکیم عبدالحئی، رائے بریلوی۔ مطبوعہ: اردو اکاڈمی، نئی دہلی)

"بعد نمازِ مغرب، نوافل وختمِ خواجگان وغیرہ سے فراغ، حاصل کر کے
جو کوئی مرید، یا مہمان ہوتا، اُس سے باتیں کرتے۔
ہر جمعہ کو، بعد نمازِ مغرب، مولود شریف کی محفل کا اِہتمام کرتے۔
اس میں بہت زَرِ کثیر، صَرف کرتے تھے اور تازیست، ہمیشہ کراتے رہے۔"

(ص ۷۷۔ **تذکرۃُ العابدین**۔ از مولانا نذیر احمد، دیوبندی۔ مطبوعہ: دہلی۔ ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء)

"چندروز کے بعد، حاجی عابد صاحب نے جگہ، تجویز کر کے خرید کی۔
اور اس کا بیع نامہ بھی حاجی صاحب کے نام ہوا۔ اور مولوی رفیع الدین، جو مدرسہ کے مہتمم تھے انہیں کے ذِمَّہ، مدرسہ کی تعمیر کا اِہتمام، سپرد ہوا۔ اور ایک لاکھ کی لاگت سے مدرسہ، تعمیر ہوا۔

(ص ۷۳۔ **تذکرۃ العابدین**۔ از مولانا نذیر احمد، دیوبندی۔ مطبوعہ: دہلی ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء)

"(حضرت حاجی صاحب) صاحبِ کشف وکرامات، بزرگ تھے۔ رُشد وہدایت اور تذکیر وتزکیۂ قلوب کے علاوہ، آپ کو، فنِ عملیات میں زبردست ملکہ، حاصل تھا۔"

(۲۲۲۔ ج ۲۔ **تاریخِ دارالعلوم دیوبند**۔ از سید محبوب علی رضوی۔ مطبوعہ دہلی۔ ۱۹۷۷ء)

حاجی عابد حسین، قادری، چشتی، دیوبندی (وصال ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء) کے لئے
ان کے قائم کردہ مدرسہ دیوبند میں کیسے نئے خیالات وحالات، رُونما ہوئے؟
اور اس کا ماحول کیسا بنا دیا گیا کہ انہیں اپنے قائم کردہ، مدرسہ سے الگ ہونا پڑا؟
یہ کوئی، سربستہ راز نہیں۔ بلکہ ذیل کی تحریر، حقیقتِ حال، واضح کرنے کے لئے کافی ہے:

"چوں کہ لوگوں کے دلوں میں خلوص نہیں رہا، اِس لئے اِختلاف، رُونما ہوتے رہے۔
نتیجہ، یہ ہوا کہ: ایک وقت آیا کہ:
آپ (حاجی عابد صاحب) مدرسہ کے کاروبار سے الگ ہو گئے اور فرمایا کہ:
"اب، لِلّھیت، نہ رہی، بلکہ نفسانیت آ گئی۔ فقیر کو، اِن سب باتوں سے کیا غرض؟"

(ص ۷۶۔ **تذکرۃُ العابدین**۔ از مولانا نذیر احمد، دیوبندی۔ مطبوعہ: دہلی ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء)

مزید وضاحت کے لئے مولانا انظر شاہ کشمیری (متوفی ۲۰۰۸ء)
خَلفِ مولانا انور شاہ کشمیری، شیخ الحدیث، دارالعلوم دیوبند کی، یہ تحریر، ملاحظہ فرمائیں:

"مجھے، عرض کرنے دیجیے کہ یہ آویزش، خالص نظریاتی جنگ تھی۔
میں تفصیلات میں، تو ہرگز نہ جاؤں گا۔ اِس لئے کہ وہ ایک دِل خراش تاریخ کا باب ہے۔
لیکن اپنے علم ومطالعہ کی بنیاد پر، اتنا عرض کر دوں گا کہ:
"جو دیوبند، حضرت حاجی عابد حسین، اَلمغفور کی زیر تربیت بن رہا تھا
وہ، یقیناً، اُس دیوبند سے مختلف ہوتا، جس کا تعارف اور شہرت
عالَمِ اسلام سے گذر کر، اَقصائے عالَم تک پہنچ چکی ہے۔"

(ص ۴۹۔ ماہنامہ **اَلبلاغ**، کراچی۔ شمارہ ذوالحجہ ۱۳۸۸ھ/مارچ ۱۹۶۹ء۔
از مولانا انظر شاہ کشمیری، شیخ الحدیث، دارالعلوم دیوبند)

"سمجھنے کے لئے صرف، اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ:
"چھتّہ کی مسجد، جہاں سے دارالعلوم کی ابتدا ہوئی ہے، حضرت حاجی صاحب کی نشست گاہ یہی مقدس عمارت ہے۔ اِس مسجد میں رمضان المبارک کے چاروں جمعوں میں
اب تک، میلاد، حضرت حاجی صاحب کی یاد میں جاری ہے۔
میں نے کیا لکھا؟ اِس اِجمال میں نکتہ سنج، اُن ساری تفصیلات کو پڑھ لیں
جسے، میں نے کم از کم، تاریخ نگاری کے تلخ فریضہ کے قطعاً خلاف، سنانے سے پہلو، بچا لیا۔"

(حاشیہ ص ۵۰۔ **ماہنامہ البلاغ۔ کراچی**۔ شمارہ ذوالحجہ ۱۳۸۸ھ/ مارچ ۱۹۶۹ء۔
از مولانا انظر شاہ کشمیری، شیخ الحدیث، دارالعلوم دیوبند)

مذکورہ تحریرات سے، روزِ روشن کی طرح، واضح ہے کہ:

(۱) **مدرسہ دیوبند کے مجوّز و محرّک و بانی، حاجی عابد حسین، قادری، چشتی، دیوبندی**
(وصال ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۳ء) ہیں۔ میلاد و ختمِ خواجگان وغیرہ، معمولاتِ اہلِ سنّت کے عامل
خوش عقیدہ مسلمان ہونے کے "جُرم" میں اِس مدرسہ دیوبند سے الگ ہونے پر
انہیں مجبور کردیا گیا، جس کے، وہ خود، بانی تھے۔

(۲) **انقلابِ ۱۸۵۷ء کے بعد، ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء میں مدرسہ دیوبند کی تاسیس ہوئی۔**
اِس لئے اِس مدرسہ اور اِس کے کسی فارغ التحصیل عالم و فاضل کے
انقلاب ۱۸۵۷ء میں شامل و شریک ہونے کا سوال ہی، خارج از بحث ہے۔

(۳) **قدیم دستاویزات اور اَساسی تحریرات، اِس پروپیگنڈہ کو غلط، ثابت کرتی ہیں کہ:**
وسیع پیمانے کی کسی منصوبہ بندی کے تحت، اِس مدرسہ کا قیام ہوا۔
جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے اثرات کو، زائل کرنے
اور متحدہ ہندوستان میں دینی تعلیم اور عسکری تربیت، عام کرنے کا، اسے ایک اہم مرکز بنایا جائے گا۔

مدرسہ دیوبند کے ابتدائی حالات و رُجحانات سمجھنے کے لئے
یہ تحریریں بھی خاصی اہمیت کی حامل ہیں:

(۱) حاجی سید عابد حسین، قادری، چشتی، دیوبندی (وصال ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۳ء)
بانیِ مدرسہ دیوبند (قائم شدہ ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء) معروف، بہ دارالعلوم دیوبند کو
مدرسہ سے بے اثر و بے دخل کیے جانے کے اَسباب و عوامل کی نشان دِہی کرتے ہوئے
حاجی عابد صاحب کے خانوادہ کے ایک فرد، سید افتخار حسین، دیوبندی لکھتے ہیں کہ:

"وہ نفسانیت، اِس کے سِوا، اور کیا ہوسکتی ہے کہ:
وہ (حاجی عابد) اس مدرسہ کے ذریعہ، اسلام کی حقانیت و صداقت کی نشر و اشاعت کا
اہم فریضہ، انجام دینا چاہتے تھے اور اس ادارہ کے دوسرے اراکین، اس سے متفق، نہ تھے۔۔
ان حضرات کا نقطۂ نظر، بالکل، جُداگانہ تھا۔
وہ، اس مدرسہ کو، انگریزی حکومت کی رضا و منشا کے مطابق، چلانا چاہتے تھے۔

کیوں کہ مدرسہ کے صدر مدرس، مولوی یعقوب صاحب، حکومتِ وقت کے زبردست بہی خواہ تھے۔
مدرسہ کی صدر مدرسی، قبول کرنے سے قبل، وہ کئی شہروں میں انگریزی گورنمنٹ میں
ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول کے فرائض، انجام دے کر، اپنے حُسنِ کارکردگی سے
انگریزوں کی نظر میں محبوب، بن چکے تھے۔
اپنے اس کامیاب تجربہ کی روشنی میں اس مدرسہ کو
اسی رَوِش پر لے جانا چاہتے تھے، جو، انگریزی حکومت کے عین منشا کے مطابق تھا۔
اِس لئے ان کے خیالات کا، حاجی محمد عابد کے **خیالات سے متصادم ہونا، ناگزیر تھا۔"**

(ص ۶۱۔ **دارالعلوم دیوبند کا بانی کون؟**۔ از سید افتخار حسین، دیوبند)

قاری محمد طیب، مہتمم دارالعلوم، دیوبند (متوفی ۱۹۸۳ء) بتاتے ہیں کہ:
مدرسہ دیوبند کے ابتدائی مدرسین، دو طرح کے تھے۔
مسجد نشین حضرات۔ یا۔ گورنمنٹ کے سابق ملازمین۔

چنانچہ، اس سلسلے میں وہ، فرماتے ہیں:
"پھر، جس میں اکثریت ایسے حضرات کی تھی، جو تارکُ الدُّنیا اور مسجد نشین بزرگ تھے۔
جنہیں، سیاسیات سے تو کیا، بجائے خود، عام شہری معاملات سے بھی کوئی خاص لگاؤ، نہ تھا۔
یا۔ ایسے بزرگوں کی تھی، جو گورنمنٹ کے قدیم ملازم اور حال پنشنر تھے۔
جن کے بارے میں گونمنٹ کو، شک و شبہ کی کوئی گنجائش، نہ تھی۔"

(حاشیہ ص ۲۴۶ و ۲۴۷۔ **سوانحِ قاسمی**۔ جلد دوم۔ مؤلّفہ: مولانا مناظر احسن، گیلانی، دارالعلوم دیوبند)

سہارنپوری عُلما کی ایک قابلِ لحاظ تعداد، انگریزی گورنمنٹ کے ملازمین کی ہے۔ مثلاً:
مولانا مملوک علی، نانوتوی و مولانا عبدالحئی، بڈھانوی و مولانا محمد احسن، نانوتوی و مولانا مظہر
نانوتوی و مولانا منیر، نانوتوی و مولانا ذوالفقار علی، دیوبندی و مولانا فضل الرحمن، دیوبندی، وغیرھُم۔
یہ حضرات، ۱۸۵۷ء کے آس پاس، انگریزی گورنمنٹ کے ملازم تھے۔
اکثر عُلمائے سہارن پور کے استاد، مولانا مملوک علی، نانوتوی، پرنسپل دہلی کالج تھے۔
مولانا رشید احمد، گنگوہی و مولانا محمد قاسم، نانوتوی کے بھی یہی استاد تھے۔
چنانچہ، مولانا سید محمد میاں، دیوبندی، ان کے تعارف میں لکھتے ہیں:
"ان دونوں بزرگوں (مولانا گنگوہی و مولانا نانوتوی) نے

درس کی اکثر کتب، حضرت مولانا مملوک العلی صاحب سے پڑھیں۔
جو اُس مدرسہ کے مدرس تھے، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی جانب سے
علومِ عربیہ ودینیہ کی تعلیم کے لئے اِس واسطے، قائم کیا گیا تھا کہ:
نیم غلام مسلمانوں کے سامنے، علم دوستی و مذہب پروری کا مُظاہرہ کرکے، ان کو پورا غلام
بنالیا جائے۔" (ص: ۶۹۔ **عُلمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے**۔ مطبوعہ: رحیم یار خاں، پنجاب، پاکستان)

جماعتِ اہلِ حدیث کے مشہور عالم اور "فیصل انعام یافتہ" مصنّف
مؤلِّفِ "اَلرَّحِیْقُ الْمَخْتُوم"، مولانا صفی الرحمٰن، مبارک پوری (جامعہ سلفیہ، بنارس)
لکھتے ہیں کہ:

"دیوبندی تحریک کے امیرِ اوّل، مولانا مملوک علی، نانوتوی کے متعلق
سوانح نگاروں کا اتفاق ہے کہ وہ، انگریزوں کے پکے وفادار تھے۔
موصوف، دہلی کالج میں جہاں سے انگریز نواز ہندوستانی تیار کیے جاتے تھے
تاحیات، مدرس رہے۔ بلکہ آپ کے حُسنِ کارکردگی سے متأثر ہوکر
مسٹر، ٹامسن کی سفارش سے ۷/نومبر ۱۸۴۱ء کو، آپ، صدر مدرس، قرار پائے۔
کالج کے تمام انگریز پرنسپل، مولانا پر، بہت اعتماد کرتے تھے۔
چنانچہ، ہر سالانہ رپورٹ میں آپ کی تعریف وتوصیف کی جاتی۔
گورنر جنرل نے مولانا کو انعام سے بھی نوازا اور خلعتِ سہ پارچہ، مرحمت کیا۔
دہلی کالج کے نصابوں کا کام، آپ کے زیرِ نگرانی ہوتا۔
۱۸۴۲ میں آپ نے حج کے لئے ایک سال کی رخصت لی
تو انگریز سرکار نے چھ ماہ کی تنخواہ آپ کو پیشگی، عنایت فرمادی۔" (تفصیل کے لئے دیکھیے
کتاب "**مولانا محمد احسن، نانوتوی**" مؤلّفہ: پروفیسر محمد ایوب قادری۔ مطبوعہ کراچی)

یہ تھے دیوبندی تحریک کے امیرِ اول، مولانا مملوک علی، نانوتوی۔
آپ نے اپنی سرکاری ملازمت کے فوائد کو، اپنی ذات تک، محدود، نہ رکھا
بلکہ اپنے اَعِزَّہ وَ اَقارِب کو بھی خوب فائدہ پہنچایا۔
مولانا مناظر احسن، گیلانی (متولد ربیع الاول ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء۔
متوفی ۱۳۷۶ھ/جون ۱۹۵۶ء) لکھتے ہیں:

"نانوتہ کے لئے تعلیمی راہ کا دروازہ، مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے
کُھل چکا تھا۔ وہ، دہلی میں مقیم تھے اور دہلی کی سب سے بڑی درس گاہ، دہلی کالج کے استاد تھے۔
نہ صرف نانوتہ، بلکہ عثمانی شیوخ کی برادری، اَطراف وجوانب کے جن قصبات میں پھیلی ہوئی
تھی، وہاں تک کے بچے، مولانا مملوک العلی کے، ان خاص حالات سے کافی اِستفادہ کررہے تھے۔"
(**سوانحِ قاسمی**، جلدِ اول۔ ص ۲۳۔ مؤلّفہ مولانا مناظر احسن، گیلانی۔ دارالعلوم دیوبند)

مولانا محمد احسن، نانوتوی اور ان کے دونوں بھائی
مولانا محمد مظہر، نانوتوی و مولانا منیر نانوتوی
شیخ الہند (مولانا محمود حسن، دیوبندی) کے والد، مولانا ذوالفقار علی (دیوبندی)
مولانا شبیر احمد، عثمانی کے والد، مولانا فضل الرحمٰن (دیوبندی)
ومولانا محمد یعقوب، نانوتوی اور مولانا محمد قاسم، نانوتوی نے، دہلی کالج میں تعلیم، حاصل کی۔
یہ تمام حضرات، بقول: مولانا مناظر احسن، گیلانی:

"مولانا مملوک علی سے تعلق کی وجہ سے دہلی پہنچے اور تعلیمی سہولتوں (وظائف وغیرہ) سے
مستفید ہوئے۔ پھر، ان میں سے مولانا قاسم، نانوتوی کو چھوڑ کر
باقی تمام حضرات نے سرکاری ملازمت بھی اختیار کی۔
مولانا محمد احسن، نانوتوی، مولوی مظہر اور مولوی منیر
تو، بنارس کالج، آگرہ کالج اور بریلی کالج میں ملازم ہوئے۔ اور مولوی ذوالفقار علی
ومولوی فضل الرحمٰن اور مولوی محمد یعقوب، نانوتوی، محکمۂ تعلیم میں انسپکٹر بھی رہے۔"
(دیکھیے "**مولانا محمد احسن، نانوتوی**"۔ ص ۲۶۔ مطبوعہ کراچی)

مولانا مملوک علی اپنے شاگردوں کو کس ڈھنگ سے تربیت دیتے تھے؟
اس کا اندازہ، اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ:
جب، جمال الدین افغانی نے مفتی محمد عبدہٗ اور سید رشید رضا کے ساتھ مل کر
عالَمِ اسلام کو متحد اور آزاد کرانے کی تحریک کو مصر میں خاصی قوت بخشی
تو انگریزوں نے، ان ہی مولانا مملوک علی، نانوتوی کے ایک شاگردِ رشید
مولوی سمیع اللہ کو سیاسی مشن پر مصر بھیجا اور مولوی سمیع اللہ نے انگریزوں کے تفویض کیے
ہوئے اس فرض کو اِس چابک دستی سے انجام دیا کہ جمال الدین افغانی کو مصر سے نکال دیا گیا۔

اوراس کارنامے پر مولوی سمیع اللہ کو انگریز کی طرف سے **سی، ایم، جی** کا خطاب، ملا۔(جناب محمد ایوب قادری نے بھی اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ملاحظہ ہو: ص ۱۸۴۔محمد احسن، نانوتوی۔مطبوعہ کراچی)

ظاہر ہے کہ اکابرِ دیوبند، جو ایسے استاذ کے تربیت یافتہ تھے، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں
ان کا رول کیا ہو سکتا تھا؟ چنانچہ، حالات وواقعات، شہادت دیتے ہیں کہ:
ان بزرگانِ دیوبند نے اپنے استاذ کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے
مِنْ حیث الجماعہ، انگریز کا ساتھ دیا۔ اِلیٰ آخِرِہٖ۔

(حاشیہ ص ۲۴۸ تا ص ۲۵۰۔ **اہلِ حدیث اور سیاست**۔ مؤلّفہ: مولانا نذیر احمد، رحمانی۔
اشاعتِ سوم، ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء۔ اِدارۃُ البحوث۔ **جامعہ سلفیہ، بنارس**۔ حاشیہ بقلم: مولانا صفی الرحمٰن، مبارک پوری)

مولانا صفی الرحمٰن، مبارک پوری (**جامعہ سلفیہ بنارس**) نے
مولوی سمیع اللہ، دہلوی، شاگردِ مولانا مملوک علی، نانوتوی کی
جس کارکردگی کا ذکر کیا ہے، اُس کے بارے میں سید طفیل احمد، منگلوری، علیگ لکھتے ہیں:

''انگریزی اور تُرکی حکومت کے خوش گوار تعلقات کے زمانہ میں
سرسید نے، تُرکوں کا لباس، اختیار کیا تھا۔ جو یورپ کے لباس اور تمدن سے قریب تر تھا۔
مگر، انگریزوں اور تُرکوں کے درمیان ۱۸۸۲ء میں جب، مصر کے بارے میں بدمزگی ہوئی
تو، سرسید نے انگریزوں کی تائید کی اور ان کی تحریک سے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب
جو علی گڑھ کالج، قائم کرنے میں، ان کے دستِ راست تھے، حکومت کی طرف سے مصر بھیجے گئے۔
اور انہوں نے مصری نوجوانوں کے خیالات، انگریزوں کی طرف سے درست کرنے
اور سیاسی امور میں لارڈ کرومر کا ہاتھ بٹانے میں نمایاں حصہ لیا۔
جس کے صلہ میں انہیں، **سی، ایم، جی** کا خطاب ملا۔
.... پندرہ سال بعد، ۱۸۹۷ء میں تُرکی اور یونان کی جنگ میں
جب، انگریزوں نے یونانیوں کی حمایت کی
تو مسلمانانِ ہند نے عام طور پر، انگریزوں سے ناراضی کا اظہار کیا۔
اُس وقت، سرسید اور حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب، رئیسِ علی گڑھ نے
انگریزوں کی حمایت میں مضامین کا سلسلہ نکالا'' الخ۔

(ص ۲۸۸ و ۲۸۹۔ **مسلمانوں کا روشن مستقبل**، از سید طفیل احمد، منگلوری۔

مطبوعہ: مکتبۃ الحق جوگیشوری، بمبئی، ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء۔ طبعِ اول ۱۹۳۷ء وطبعِ ثانی ۱۹۳۸ء)

دہلی اور بریلی و اجمیر پر عُلمائے سہارن پور کا اثر اور ان کا غلغلہ و دبدبہ
ثابت کرنے کے شوق میں مشہور دیوبندی عالم، مولانا خالد محمود (مانچیسٹر، انگلینڈ) لکھتے ہیں:

''مولانا محمد احسن، صدیقی، نانوتوی، حضرت مولانا قاسم، نانوتوی، بانیِ دارالعلوم دیوبند کے
ہم جَد تھے۔ آپ نے حضرت مولانا قاسم، نانوتوی کی کتاب
''**تَحذِیرُ النَّاس**'' اپنے مطبع (مطبع صدیقی، بریلی) سے شائع کی تھی۔
اس میں بطور مستفتی، مولانا محمد احسن، نانوتوی کا نام، درج ہے۔
اس سے پتہ چلتا ہے کہ:
بریلی کے اس علمی ماحول میں حضرت مولانا قاسم، نانوتوی، کس قدر ومنزلت سے
دیکھے جاتے تھے اور کس طرح، بریلی پر ''**مسلکِ دیوبند**'' کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔
شہر کی مرکزی عیدگاہ کے امام، یہی مولانا محمد احسن، صدیقی، نانوتوی تھے۔
جس طرح، ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں اسلام کی علمی قیادت
''**عُلمائے دیوبند**'' کے ہاتھوں میں تھی، بریلی میں بھی مسلمانوں میں یہی نظریات، غالب تھے۔
یہ بات، مولانا احمد رضا بریلوی سے بہت پہلے کی ہے۔
یہاں، سررشتۂ تعلیم میں بھی، یہی حضرات، چھائے ہوئے تھے۔
۱۸۵۰ء میں بریلی کالج، قائم ہوا، اور مولانا محمد احسن، نانوتوی، اس کے شعبۂ فارسی کے صدر
مقرر ہوئے اور جب، عربی شعبہ قائم ہوا، تو اس کے صدر بھی آپ ہی بنائے گئے۔
دیوبند کے حضرت مولانا ذوالفقار علی (۱۹۰۴ء) بریلی میں انسپکٹر مدارس رہے۔
۱۸۵۱ء میں آپ، یہیں تھے۔ ۱۸۵۷ء میں آپ، میرٹھ کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر
فائز رہے۔ ۱۸۵۷ء میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن، عثمانی (۱۸۹۱ء)
جو شیخ الاسلام، علّامہ شبیر احمد عثمانی کے والد تھے، بریلی میں انسپکٹر مدارس تھے۔''

(ص ۱۸۔ **مطالعۂ بریلویت**۔ جلدِ چہارم۔ از خالد محمود۔ مطبوعہ: حافظی بکڈپو، دیوبند)

''بریلی میں بڑے بڑے عُلما، پیدا ہوئے۔ شیخ الہند، حضرت مولانا محمود حسن، ۱۸۵۱ء میں
یہیں، پیدا ہوئے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن، عثمانی، مہتمم دارالعلوم دیوبند کے مولد ومنشا ہونے
کا شرف، اسی سرزمین کو، حاصل ہے۔ آپ، بریلی میں ۱۲۴۸ء میں پیدا ہوئے۔

ان سب اکابر کے استاذ، حضرت مولانا مملوک علی، ۱۲۶۷ء میں فوت ہوئے۔
آپ، دہلی کالج کے شعبۂ عربی کے صدر تھے۔
اور جس سال آپ، فوت ہوئے، وہی سال، حضرت شیخ الہند کا سالِ ولادت ہے۔''
(ص ۱۸۔ **مطالعۂ بریلویت**۔ جلدِ چہارم۔ مطبوعہ: دیوبند، مؤلّفہ: خالد محمود)

''اجمیر شریف، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی نسبت سے
ہندوستان کا ایک بڑا دینی وروحانی مرکز تھا۔ وہاں کی بڑی علمی شخصیت، کون تھی؟
حضرت مولانا محمد یعقوب، نانوتوی، جو پہلے، بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے
اور بعد میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس بنے، آپ، یہاں اجمیر کالج میں صدر مدرس تھے۔''
(ص ۲۰۔ **مطالعۂ بریلویت**۔ جلدِ چہارم۔ از خالد محمود۔ مطبوعہ: حافظی بکڈپو، دیوبند)

مدرسہ دیوبند، معروف، بہ دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس
یہی مولانا محمد یعقوب نانوتوی (۱۸۳۳ء۔ ۱۹۰۱ء)
فرزندِ مولانا مملوک علی، نانوتوی (متوفی ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) اجمیر کالج میں مدرس
پھر، بنارس وبریلی وسہارن پور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس اور پنشن یافتہ سرکاری ملازم تھے۔
یہی مولانا محمد یعقوب، نانوتوی، فرزندِ مولانا مملوک علی، نانوتوی، جنگِ ۱۸۵۷ء کو ''**غدر**''
اور انقلابیوں کو ''**مفسدین**'' سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ (**سوانحِ قاسمی**۔ مؤلّفہ: مولانا مناظر احسن، گیلانی)
مزید برآں، تاریخی ریکارڈ، یہ ہے کہ مدرسہ دیوبند کے مدرّسین کی اکثریت:
''ایسے بزرگوں کی تھی، جو گورنمنٹ کے قدیم ملازم اور حال پنشنر تھے۔ جن کے بارے میں
گورنمنٹ کو، شک وشبہ کرنے کی گنجائش ہی، نہ تھی۔'' (ص: ۲۴۷، حاشیہ **سوانحِ قاسمی**، دارالعلوم دیوبند)
قارئین کے لئے، یہ انکشاف، باعثِ حیرت نہیں ہوگا کہ:
مولانا محمد قاسم، نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) کے ہم جَد اور ان کی سخت متنازعہ کتاب
''**تحذیر الناس**'' کے مستفتی اور پہلے طابع وناشر، نیز، مولانا محمد مظہر، نانوتوی ومولانا محمد منیر، نانوتوی
کے بھائی، مولانا محمد احسن، نانوتوی (متوفی ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء) مالکِ مطبع صدیقی، بریلی
انگریز نواز مولانا تھے۔
چنانچہ، تحریکِ بالاکوٹ کے حامی مؤرخ
پروفیسر محمد ایوب قادری (متوفی نومبر ۱۹۸۳ء۔ کراچی) لکھتے ہیں:

''۲۲ مئی ۱۸۵۷ء کو نمازِ جمعہ کے بعد، مولانا محمد احسن صاحب نے
بریلی کی نَومحلّہ مسجد میں مسلمانوں کے سامنے، ایک تقریر کی اور اس میں بتایا کہ:
حکومت کے خلاف بغاوت کرنا، خلافِ قانون ہے۔''
ایک انگریز مؤرخ نے لکھا ہے کہ:
مولانا نے مسجد میں تقریر کی اور اس میں بتایا کہ: **حکومت سے بغاوت کرنا، خلافِ شرع ہے۔''**
اس تقریر نے، بریلی میں ایک آگ لگادی اور تمام مسلمان
مولانا محمد احسن، نانوتوی کے خلاف، ہوگئے۔
اگر، کوتوالِ شہر، شیخ بدرالدین کی فہمائش پر
مولانا، بریلی، نہ چھوڑتے، تو ان کی جان کو بھی خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔''
(ص ۵۰ و ۵۱۔ **مولانا محمد احسن، نانوتوی**۔ مرتّبہ: پروفیسر محمد ایوب قادری۔ مطبوعہ: کراچی ۱۹۶۶ء)

پیش کردہ تاریخی حقائق ودستاویزات کے ذریعہ، قارئین کی آنکھیں کھل چکی ہوں گی
مگر، ذیل کی داستان پڑھ کر، آپ، محوِ حیرت رہ جائیں گے کہ:
صرف ۱۸۵۷ء اور بعض دیگر اہم معاملات واُمور کی تاریخ نہیں، بلکہ خود، دارالعلوم دیوبند
کی تاریخ کے ساتھ، اس کے اربابِ حل وعقد نے کتنا بھیانک اور سنگین مذاق کیا ہے؟
خانوادۂ مولانا فضل الرحمٰن، عثمانی (مولانا شبیر احمد، عثمانی کے والد) کے ایک ممتاز فرد
دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور مشہور مذہبی صحافی، مولانا عامر عثمانی، مدیرِ اعلیٰ، ماہنامہ تجلّی دیوبند
(متوفی ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء) نے، ایک ایسی داستان، بیان کی ہے
جسے، تاریخ کا چہرہ، مسخ کرنے کی ایک بدترین مثال اور مکروہ ترین نمونہ، قرار دیا جانا چاہیے۔
دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے ایک معزز رکن، سید محی الدین صاحب تھے۔
جن کا مختصر تعارف، یہ ہے:
''ہمارے مخدوم ومحترم، الحاج المولوی سید محی الدین صاحب بی اے علیگ وبیرسٹرایٹ لا
جو حکومتِ آصفیہ، حیدرآباد دکن میں ایجوکیشن اور ریلیجین، یعنی تعلیم ومذہب کے محکمہ
کی معتمدی (سکریٹری شِپ) کے عہدہ سے وظیفہ یاب ہوکر
اب، بجائے اَلْبِہاری وَالْحیدر آبادی کے اَلْبَاکِسْتَانِی، بنے ہوئے، کراچی میں مقیم ہیں۔
ان کی، یہ خوش قسمتی تھی کہ چھتّہ کی مسجد (دیوبند) کے اس کمرے کی فرسودہ وربودہ حالت کو

دیکھ کر، اپنے ذاتی مصارف سے اتنا درست کرادیا کہ گویا ایک نیا کمرہ ہی بن گیا۔

جس سے طلبہ مستفید ہوتے رہے اور سید صاحب کے حق میں دعا گو ہیں۔"

(حاشیہ ص ۲۳۱۔ **سوانحِ قاسمی**۔ جلدِ دوم۔ مؤلّفہ: مولانا مناظر احسن، گیلانی۔ دارالعلوم دیوبند)

انہیں سید محی الدین صاحب، سابق ممبر مجلسِ شوریٰ، دارالعلوم دیوبند کی
ایک روایت، بیان کرتے ہوئے مولانا عامر عثمانی، فاضلِ دارالعلوم دیوبند
بڑے دردو کرب کے ساتھ لکھتے ہیں کہ:

"دارالعلوم کے سلسلے میں، عاجز کے بزرگ واَقربا کا تذکرہ
آپ نے جس والہانہ انداز میں کیا ہے، اُس پر، چند الفاظ کہنے کو، بے اختیار طبیعت، چاہتی ہے۔
آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ:
دارالعلوم دیوبند کی تاریخ، اب وہ، نہیں، جو آپ سمجھے بیٹھے ہیں۔
بلکہ وہ ہے، جسے "**سوانحِ قاسمی**" میں، باور کرایا گیا ہے۔
تاریخ نویسی کا فن، پرانا ہے اور اب، تاریخ سازی کا دَور ہے۔
مولانا مناظر احسن، گیلانی پر، اللہ کی رحمتیں ہوں، کچھ تو کرشمے، ان کی پروازِ خیال نے
دکھلائے ہیں، کچھ ان بزرگوں نے دکھائے، جن کے نزدیک، دارالعلوم کے قیام کا کریڈٹ
ایک خاص خاندان کو دینا، دین و مِلّت کی سب سے بڑی خدمت ہے۔
ابھی جولائی ۱۹۶۰ء میں خاکسار (عامر عثمانی) کراچی گیا تھا۔
یہاں، سید محی الدین صاحب، جو کبھی، دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کے ممبر بھی تھے۔
جن کی نیک نفسی اور زُہد و تقویٰ پر، ان کے واقف کاروں میں کوئی اختلاف نہیں۔
اور جن کے گہرے تعلقات، مولانا مناظر احسن، گیلانی سے بھی تھے، ملاقاتیں ہوئیں۔
ایک موقع پر، انہوں نے واقعہ سنایا کہ:
جب "**سوانحِ قاسمی**" چھپنے کی تیاریاں تھیں، تو ہمیں، اس کے پڑھنے کا بے حد اِشتیاق
لگا ہوا تھا۔ چھپ کر آ گئی، تو ذوق وشوق سے پڑھا۔ لیکن، بڑی حیرت ہوئی، یہ دیکھ کر کہ:
"جن تاریخی اُمور کا ہمیں علم تھا، اُن کا تو دور دور تک، اس میں پتہ نہیں۔
مگر، ایک نئی تاریخ، ضرور، موجود ہے۔"
اضطراب، ضبط نہ ہوا، تو سفر کر کے گیلانی صاحب کے پاس پہنچے اور عرض کیا کہ:

"حضرت! یہ آپ نے کیا کیا لکھ دیا؟"
گیلانی صاحب کے چہرے پر کرب کی علامات، ظاہر ہوئیں۔
اور تأسُّف کے ساتھ فرمانے لگے:
"کیا بتاؤں بھائی! کمال ہو گیا۔ جو کچھ میں نے لکھا تھا، وہ تو کچھ اور ہی تھا۔"
ہم نے پوچھا: اس کا کیا مطلب ہوا؟
انہوں نے فرمایا: میرے تقریباً، پانچ سو صفحات، بدل دیے گئے ہیں۔"
اِس حقیقت کو اور بھی متعدد حضرات، جانتے ہیں اور وہ، ابھی زندہ ہیں کہ:
"دارالعلوم کی طرف سے چھاپی ہوئی دارالعلوم کی مستند تاریخ
"سوانحِ قاسمی" کس بے تکلفی کے ساتھ، اصل مسوّدے میں تغیُّرات کر کے چھاپی گئی ہے۔
اور تغیُّرات، معمولی نہیں، وسیع تر اور بنیادی ہیں۔"

(ص ۵۷۔ ماہنامہ **تجلّی**، دیوبند۔ شمارہ فروری و مارچ ۱۹۶۱ء۔ بقلم: عامر عثمانی)

صرف، دارالعلوم دیوبند اور ۱۸۵۷ء کی تاریخ نہیں، بلکہ مسلمانانِ ہند کی تقریباً، ڈیڑھ سو سالہ
مذہبی و مِلّی و سیاسی تاریخ کو جس بے دردی کے ساتھ، فرقۂ اہلِ حدیث اور جماعتِ دیوبند کے
بعض مصنفین و مؤرخین نے مسخ کیا ہے، اُسے دیکھ کر، اِس کے سِوا، اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

قریب ہے یارو! روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر؟
جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

سیدھی سی بات، یہ ہے کہ:
انقلابِ ۱۸۵۷ء کی کمان، بعض معروف عُلمائے اہلِ سنّت
مثلاً: علّامہ فضلِ حق خیر آبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء۔ در جزیرۂ انڈمان) ومفتی
صدرالدین، آزردہ، صدرُ الصُّدور دہلی (متوفی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) ومولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی
(متوفی نامعلوم) ومولانا سید احمدُ اللہ شاہ مدراسی (متوفی ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء) ومولانا سید کفایت علی
کافی مرادآبادی (متوفی ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء) ومفتی عنایت احمد، کاکوری (متوفی ۱۲۷۹ھ/
۱۸۶۳ء) ومفتی مظہر کریم، دریابادی (متوفی ۱۲۸۹ھ/اکتوبر ۱۸۷۳ء)
ومولانا رحمت اللہ کیرانوی (متوفی ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء)
ومولانا ڈاکٹر وزیر خاں، اکبرآبادی، ابو العلائی، منعمی (متوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۳ء)

ومولانا وہاج الدین، مرادآبادی (متوفی ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء) وغیرھُم کے ہاتھوں میں تھی۔

اور تقویۃُ الایمان وتحریکِ بالاکوٹ حامی خیمہ، ۱۸۵۷ء کی سرگرمیوں سے بحیثیت جماعت وتنظیم، میلوں دور، خاموشی کے ساتھ، نیرنگیِ زمانہ کا مشاہدہ کررہا تھا۔

یہ روایت اور شہادت، اسی خیمے کی ہے، جو، اِس طرح ہے:

(۱) تحریکِ بالاکوٹ، از سید احمد، رائے بریلوی وشاہ محمد اسماعیل، دہلوی کے دست وبازو اور ''**عُلمائے صادق پور**'' (پٹنہ) کے ایک محقق فرد، ڈاکٹر قیام الدین احمد ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''اَلْغَرَض، ظاہر ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شورش کے موقع پر اور اس دَوران میں
برابر، وہابی، مستعدی سے سرحد پر، انگریزوں کے خلاف، مصروفِ کار رہے۔''

(ص ۲۱۴۔ **ہندوستان میں وہابی تحریک**۔ مؤلّفہ: ڈاکٹر قیام الدین احمد۔
مکتبۃ الفہیم۔ مئوناتھ بھنجن۔ یوپی۔ ۲۰۰۱ء)

(۲) سلسلۂ سیرتِ سید احمد، رائے بریلوی وتحریکِ بالاکوٹ کی چوتھی کتاب ''**سرگذشتِ مجاہدین**'' میں مولانا غلام رسول مہؔر (متوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) نے
دسویں اور گیارہویں باب میں ۱۸۵۷ء کے کچھ اَحوال ومعاملات کا ذکر کیا ہے۔
مگر، دہلی سے لکھنؤ وپٹنہ تک کے، اپنے وہابی مجاہدین کی کوئی سرگرمی وکارروائی، نہ لکھ سکے اور صرف، اتنا لکھنے پر، انہیں اِکتفا کرنا پڑا کہ:

''۱۱رمئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے، اِس ہنگامے کا آغاز ہوا۔
جسے، انگریزوں نے غدر قرار دیا اور اہلِ ملک، آزادی کی جنگ، قرار دیتے ہیں۔
اس ہنگامے نے، جابجا، انگریزوں کے لئے سخت نازک حالات، پیدا کردیے تھے۔
''مجاہدین'' کے لئے اِقدامات کا، یہ بڑا ہی اچھا موقع تھا۔
لیکن، اتفاق کی بات ہے کہ حالات، نظر بہ ظاہر، جتنے سازگار رتھے
بعض ناگہانی حوادث ووقائع کے باعث اتنے ہی ناسازگار ہوگئے۔''

(ص ۲۹۲۔ **سرگذشتِ مجاہدین**۔ از غلام رسول مہؔر۔ مطبوعہ: لاہور)

(۳) عُلمائے صادق پور (پٹنہ) کی جمعیت کے بارے میں
مولانا سید محمد میاں، دیوبندی لکھتے ہیں:

''یہ تنظیم، بحیثیت تنظیم، تحریک (۱۸۵۷ء) سے الگ رہی۔
بلکہ، اگر مولانا عبدالرحیم صاحب، مصنّفِ ''اَلدُّرُّ الْمَنْثُور'' کا قول
صحیح، تسلیم کرلیا جائے تو، یہ تنظیم، ۱۸۵۷ء کی مخالف رہی۔''

(ص ۱۹۱۔ **عُلمائے ہند کا شاندار ماضی**، جلدِ چہارم، از مولانا سید محمد میاں، دیوبندی۔ مطبوعہ: دہلی)

(۴) مولانا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں: ''**عاجز، یہ عرض کرتا ہے کہ:**

''مجاہدین'' جماعتی حیثیت سے ۱۸۵۷ء کی قومی لڑائی سے الگ رہے۔
۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کو ایک قومی جنگ سے زیادہ اہمیت، نہیں دی جاسکتی۔
اِس لئے سید صاحب کے ماننے والے
ایک دینی نظام سے وابستہ ہونے کے بعد اس سے الگ رہے۔''

(حاشیہ ص ۵۷ و ۵۸۔ **ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک**۔ از مولانا مسعود عالم ندوی۔ مطبوعہ: دہلی)

منشی محمد جعفر، تھانیسری (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۵ء) کا ذکر کرتے ہوئے
مولانا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں:

''سید صاحب کے ماننے والوں کی جماعت میں یہی ایک ذِمّہ دار آدمی
ایسے ہیں، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شرکت کی تھی۔''

(ص ۱۰۲۔ **ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک**، از مسعود عالم ندوی۔
مطبوعہ: مرکزی مکتبہ اسلامی۔ ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۹۹۹ء)

محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۵ء) کی یہ شرکت بھی
ڈبلیو ڈبلیو ہنسٹر کی بے سند وبے حوالہ روایت کے مطابق، محض، دس آدمیوں کے ساتھ تھی۔
جس کی نشان دِہی کرتے ہوئے خود ہی، مولانا مسعود عالم ندوی، اس پر، حاشیہ لکھتے ہیں کہ:

''یہ بھی، ہنٹر کا بیان ہے۔ اور دوسرے ذرائع سے اس کی تصدیق، نہ ہوسکی۔''

(حاشیہ ص ۱۰۲۔ **ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک**۔ از مولانا مسعود عالم ندوی۔ مطبوعہ: دہلی)

اِس سے پہلے، مولانا مسعود عالم ندوی لکھ چکے ہیں کہ:

''یہ سلسلہ، برابر، جاری رہا اور سارا کام، حسن وخوبی کے ساتھ، چلتا رہا کہ:
اسی دَوران میں ۱۸۵۷ء کا پُر آشوب حادثہ پیش آیا اور گو ''مجاہدین'' اور ان کے ''معاوِنین''
ایک دینی نظام سے وابستہ رہنے کی وجہ سے، اس قومی لڑائی میں غیر جانب دار، رہے۔'' الخ

(ص ۵۸۔ **ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک**۔ از مولانا مسعود عالم ندوی۔
مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی۔ ۱۹۹۹ء)

(۵) انگریزوں کے معتمد، اور ۱۸۵۷ء کے عینی شاہد

سر سید احمد خاں (متوفی مارچ ۱۸۹۸ء) نے ظن وتخمین اور ساری قیاس آرائی وداستان سرائی کی
جڑ بنیاد ہی اُکھیڑ کر رکھ دی اور صاف صاف لکھ دیا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں
صرف، وہ لوگ شریک ہوئے، جو وہابی تحریک کے مخالف تھے۔ چنانچہ، وہ لکھتے ہیں کہ:

**''بیس تیس برس پیشتر، ایک بہت بڑے نامی مولوی اسمٰعیل نے ہندوستان میں جہاد کا
وعظ کہا اور آدمیوں کو جہاد کی ترغیب دی۔ اُس وقت انھوں نے صاف صاف، بیان کیا کہ:
''ہندوستان کے رہنے والے، جو سرکار انگریزی کے امن میں رہتے ہیں
ہندوستان میں جہاد، نہیں کر سکتے''** (ص: ۱۶۔ **اسبابِ بغاوتِ ہند**۔ مؤلّفہ: سر سید احمد خاں۔
مطبوعہ: خدا بخش لائبریری، پٹنہ، اشاعتِ سوم ۱۹۹۹ء)

تحریکِ بالاکوٹ کے ہم نواؤں کے پاس، اِس کا کوئی ادنیٰ ثبوت اور کوئی ضعیف سے ضعیف
ایسا تاریخی بیان وروایت نہیں، جس کی بنیاد پر، وہ دعویٰ کر سکیں کہ:
ان کے فلاں قابلِ ذکر طبقے نے ۱۸۵۷ء میں دہلی و روہیل کھنڈ و اَوَدھ کے
کسی خطے میں انگریزوں کے خلاف، کسی طرح کی سرگرمی دِکھائی ہو۔ اور یہ واضح ہے کہ:
یہی وہ علاقے ہیں جہاں، ۱۸۵۷ء کی خوں ریز جنگ ہوئی، جس میں لاکھوں مسلمان
اور ہزاروں عُلما، شہید ہوئے اور ہلاکت وتباہی وبربادی کے لرزہ خیز حادثات ہوئے۔

اطمینانِ قلب کے لئے، یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمالیں:

''ہنگامۂ ۱۸۵۷ء میں پورے جوش کے ساتھ، انگریزوں کے خلاف
جنگ میں حصہ لینے والے، وہ، سب کے سب عُلمائے کرام شامل تھے
جو عقیدۃً، حضرت سید احمد اور حضرت شاہ اسمٰعیل کے شدید ترین دشمن تھے۔
اور جنھوں نے حضرت شاہ اسمٰعیل کے رَد میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں
اور اپنے شاگردوں کو لکھنے کی وصیت کی ہے۔''
(حاشیہ، ص: ۲۵۲۔ **مقالاتِ سر سید**۔ حصہ شانزدہم۔
مرتّبہ: محمد اسمٰعیل، پانی پتی۔ مطبوعہ: مجلس ترقی ادب۔ لاہور)

معرکۂ شاملی ۱۸۵۷ء، ایک بڑے طبقے (عُلمائے دیوبند) کا
وہ سرمایہ ہے، جس کی داستان سرائی ومبالغہ آرائی کر کے اپنے چند عُلما کے نام، گنانے
اور ان کے جنگی کارنامے، زبانی وتحریری طور سے بیان کر کے اپنے آپ کو خوش اور دوسروں کو
مطمئن بلکہ مرعوب کرنے کی کوشش کا سلسلہ، آزادیِ ہند کے بعد ہی سے جاری ہے۔
یہ سلسلہ بھی اپنی قدیم تاریخ کو مسخ کرتے ہوئے ۱۹۵۰ء کے بعد شروع ہوا ہے۔
اور تاریخ نویسی کی جگہ، فرضی تاریخ سازی کا مذموم فریضہ، انجام دیا گیا ہے۔
جدید فکر وتحریک (اسمٰعیلی وہابی) کے دونوں گروپ، یعنی غیر مقلدین (فرقۂ اہلِ حدیث)
اور مقلّدین (علمائے دیوبند) یہاں آپس میں برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔

چنانچہ، فرقۂ اہلِ حدیث کے ایک نمائندہ عالم اور فیصل ایوارڈ یافتہ مصنف
مولانا صفی الرحمٰن، مبارک پوری لکھتے ہیں:

''بس، پوری تاریخ میں یہی ایک واقعہ (شاملی) ہے، جسے بعد کے عُلمائے دیوبند نے
اپنے زبردست پروپگنڈے اور تاریخ سازی کے زور سے انگریزوں کے خلاف
جہاد کا رنگ دے دیا۔ حالاں کہ، یہ خلوص کی حد تک، انگریز سے تعاون تھا۔
چنانچہ، بعد میں ہنگامہ ختم ہونے کے بعد، قاضی محبوب علی خاں کی جھوٹی مُخبری پر
جب مولانا رشید احمد گنگوہی کو گرفتار کیا گیا، تو اپنے متعلق ان کے تأثرات، یہ تھے:

**''جب، میں حقیقت میں اپنی سرکار کا فرماں بردار ہوں، تو جھوٹے الزام سے
میرا بال، بیکا نہ ہوگا۔ اور اگر مارا بھی گیا، تو سرکار، مالک ہے، اسے اختیار ہے، جو چاہے کرے۔''**
(**تذکرۃُ الرشید**، ج ۱۔ ص ۸۰۔ مطبوعہ میرٹھ۔ ۱۹۰۸ء۔ مؤلّفہ: مولانا عاشق الٰہی، میرٹھی)

غرض، اُس وقت، جب کہ معمولی معمولی بات پر
لوگوں کو پھانسی اور کالے پانی کی سزا دی جا رہی تھی، انگریز نے
مولانا گنگوہی کی وفاداری سے جلد ہی مطمئن ہو کر انھیں رہا کر دیا۔
اور پھر، ان سے کوئی تعرُّض، نہ کیا۔ اَخیر میں اکابرِ دیوبند کے اس موقف کی شہادت سن لیجیے:
قیامِ مدرسہ دیوبند کے چند سال بعد، ۳۱ جنوری ۱۸۷۵ء کو
لیفٹینینٹ گورنر نے، اپنے خاص معتمد آدمی، **مسٹر پامر** کو دار العلوم دیوبند کے معائنہ کے لئے بھیجا
تو اس نے، ان الفاظ میں رپورٹ دی کہ:

’’یہ مدرسہ، خلافِ سرکار نہیں، بلکہ موافقِ سرکار و مُمِد و معاونِ سرکار ہے۔
یہاں کے تعلیم یافتہ لوگ، ایسے آزاد اور نیک چلن ہیں کہ ایک کو، دوسرے سے کچھ واسطہ نہیں۔‘‘
(**محمد احسن، نانوتوی**۔ص ۱۱۷)

ظاہر ہے کہ انگریز کے نزدیک، نیک چلن اور موافقِ سرکار، وہی ہوسکتا ہے
جو، اُس کا، کامل وفادار ہو۔۔ اور اس میں کسی قسم کی بغاوت کے جراثیم، نہ ہوں۔

سوال، یہ ہے کہ، یہ درویش صفت حضرات، اتنی بڑی انگریزی حکومت کی کیا معاونت کررہے تھے؟‘‘صفی الرحمٰن ،مبارک پوری۔(حاشیہ ص۲۵۱و۲۵۲۔**اہلِ حدیث اور سیاست**۔
مؤلّفہ: نذیر احمد، رحمانی۔ اِشاعتِ سوم ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء۔اِدارۃُ البحوث، **جامعہ سلفیہ**، بنارس)

شاملی اور تھانہ بھون (سہارن پور) کے اصل واقعہ کے برعکس، پوری اِختراعی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ، واقعۂ شاملی کو ایک بہت بڑا معرکہ اور جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے سنگِ میل، نیز، انقلابِ ۱۸۵۷ء کو
تحریکِ بالاکوٹ کا نتیجہ، قرار دیتے ہوئے عُلما و قائدینِ انقلابِ ۱۸۵۷ء کی صفِ اول میں مولانا قاسم، نانوتوی و مولانا رشید احمد، گنگوہی کا نام، درج کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔
آزادیِ ہند (اگست ۱۹۴۷ء) کے بعد سے، اس کوشش کا سلسلہ، جاری ہے۔
جس کا تحریری آغاز ۱۹۵۰ء کے بعد ہوا۔ اور مولانا حسین احمد مدنی کی خودنوشت سوانحی کتاب ’’**نقشِ حیات**‘‘ اور مولانا سید محمد میاں، دیوبندی کی تاریخی کتاب ’’**عُلمائے ہند کا شاندار ماضی**‘‘ میں اس کوشش نے ایک منظّم شکل، اختیار کرلی۔
مقامِ حیرت ہے کہ:
ان دونوں کتابوں میں روایت وشہادت اور سند وحوالہ کو بالکل، پسِ پشت ڈال کر ’’**عُلمائے دیوبند کا شاندار ماضی**‘‘ پیش کیا گیا ہے۔
حالانکہ سوانحِ مولانا رشید احمد، گنگوہی (متوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) بنام ’’**تذکرۃُ الرشید**‘‘ میں معروف دیوبندی عالم، مولانا عاشق الٰہی، میرٹھی (متولد ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء۔ متوفی ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) نے ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء ہی میں شاملی کے ہنگامے کا اصل واقعہ لکھ کر، اسے شائع کردیا تھا۔
چنانچہ، اسی طبقے کے ایک مؤرخ، ابوسلمان، شاہجہاں پوری
تذکرۃُ الرشید کی تالیف کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

’’۹/اگست ۱۹۰۵ء بروز منگل، حضرت گنگوہی نے انتقال فرمایا تھا۔
اس سے اگلے ہی سال ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء میں مولانا عاشق الٰہی، میرٹھی نے
اس کی تالیف کا آغاز کردیا تھا اور تقریباً، دو برس کی محنت کے بعد، ۳۰/ذی الحجہ ۱۳۲۶ھ مطابق ۵/فروری ۱۹۰۸ء بروز چہارشنبہ، اِس تذکرے کی تالیف سے فارغ ہوگئے تھے۔‘‘
(ص۱۹۔ **بزرگانِ دارالعلوم دیوبند**۔ مؤلّفہ: ابوسلمان، شاہجہاں پوری۔ مطبوعہ: فرید بکڈپو، مٹیامحل، دہلی)
مولانا محمد یعقوب، نانوتوی (۱۸۳۳ء۔۱۹۰۱ء) فرزندِ مولانا مملوک علی، نانوتوی کی تالیف
’’**سوانح عمری مولانا محمد قاسم**‘‘ کو، **تذکرۃُ الرشید** کے بیانِ واقعۂ شاملی کا
اصل ماخذ قرار دیتے ہوئے ابوسلمان، شاہجہاں پوری لکھتے ہیں:
’’ان کی تالیف ’’**سوانحِ عمریِ مولانا محمد قاسم**‘‘ تذکرۃُ الرشید سے تقریباً، انتیس (۲۹) برس پہلے، اور مولانا میرٹھی کی پیدائش سے ایک سال پہلے، ۱۸۸۰ء/۱۲۹۷ھ میں شائع ہوچکی تھی۔
یہ بائیس (۲۲) صفحوں کا ایک مختصر رسالہ ہے اور تقریباً، دو صفحوں میں
اس زمانے کے بعض واقعات بطور مشاہدات، بیان ہوئے ہیں۔
اور صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ تذکرۃ الرشید کے کئی بیانات کا ماخذ
مولانا محمد یعقوب نانوتوی کا یہی رسالہ ہے۔‘‘ (ص ۸۷۔ **بزرگان دارالعلوم دیوبند**۔
مؤلّفہ: ابوسلمان، شاہجہاں پوری۔ مطبوعہ: فرید بک ڈپو، مٹیامحل، دہلی)
تذکرۃُ الرشید کا مختصر تعارف کراتے ہوئے مولانا سید محمد میاں، دیوبندی لکھتے ہیں:
’’اِس کتاب کے مؤلِّف و مرتِّب، مولانا عاشق الٰہی صاحب، میرٹھی ہیں۔ (رَحِمَہُ اللّٰہ)
آپ، ۱۸۵۷ کے مشاہدین میں سے نہیں ہیں، لیکن، مشاہدہ کرنے والوں کو آپ نے قریب سے دیکھا ہے۔ بہت سے مردانِ کار کے حالات، خود، ان کی زبانی سنے ہیں۔‘‘ الخ۔
(ص:۲۵۲۔ **عُلمائے ہند کا شاندار ماضی**۔ جلدِ چہارم۔ مؤلّفہ: سید محمد میاں، دیوبندی۔
کتابستان، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی)
مولانا خلیل احمد، انبیٹھوی، سہارن پوری (متولد صفر ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء۔ متوفی ربیع الآخر ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۸ء) نے بھی قبلِ طبع، اِس کتاب **تذکرۃُ الرشید** کا مطالعہ کرلیا تھا۔
جس کی صراحت، **تذکرۃ الرشید**، حصہ دوم کے آخری صفحہ ۳۴۴ پر، ہے۔
مولانا مناظر احسن، گیلانی (متوفی ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء)

بڑے معنی خیز انداز میں **تذکرۃ الرشید** اور **ہنگامۂ شاملی ۱۸۵۷ء** کی طرف
اِس انداز سے اشارہ کر کے اصل حقیقت، واضح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں:

''بہر حال! مصنّفِ امام کی کتاب اور حضرت گنگوہی کی سوانح عمری، تذکرۃ الرشید
جسے، مولانا عاشق الٰہی، میرٹھی نے مرتّب فرما کر، جماعتِ دیوبند کے
ذِمّہ دار بزرگوں کی خدمت میں، پیش کی اور کافی تنقیح و تحقیق کے بعد، یہ کتاب، شائع ہوئی۔
اُس وقت، کسی قسم کی تنقید، اِس کتاب کی روایتوں پر
جہاں تک، میں جانتا ہوں، نہیں کی گئی ہے۔''

(ص ۹۹۔ **سوانحِ قاسمی**۔ جلد دوم۔ مؤلّفہ: مناظر احسن گیلانی۔ مطبوعہ: دار العلوم دیوبند)

ذہن نشین رہے کہ تذکرۃ الرشید، کسی کورٹ، یا کسی سرکاری افسر کے سامنے دیا گیا بیان نہیں۔
بلکہ برضا و رغبت لکھی ہوئی سوانح ہے۔ جو جماعتِ دیوبند کے ذِمّہ دار عُلما کی نظر سے گذر کر
ان کی منظوری کے بعد ہی اشاعت پذیر ہوئی ہے۔
اِس لئے قدیم اکابرِ دیوبند کی سندِ اعتبار، اسے ہی حاصل ہے۔
اور یہی ان کی اصل تاریخ کا آئینہ بھی ہے۔

آ گے، ہم، تذکرۃ الرشید، مؤلّفہ: مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (متوفی ۱۹۴۱ء) کی
کچھ تحریریں، بلا تبصرہ، نقل کر رہے ہیں، جس سے حقیقتِ حال، اچھی طرح، واضح ہو جائے گی:

''قاضی سعادت علی خاں، پسرِ نجابت علی خاں، رئیسِ اعظم زمیندار تھانہ بھون کے
دو بیٹے تھے: **قاضی عنایت علی اور قاضی عبد الرحیم۔**
ایک بار، قاضی عبد الرحیم مع چند احباب، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دَوران
سہارن پور کی ایک سرائے میں کسی دوست کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔
ایک مخالف بنیا نے، پنکی صاحب انگریز (اسپنکی۔ Spankee) سے
جو باغیوں کی سرکوبی کے لئے ضلع سہارن پور میں متعین تھا
اُس سے جھوٹی شکایت کر دی کہ تھانہ بھون کا رئیس، کمپنی کا باغی ہو گیا ہے۔
اور اس کا بھائی، دہلی کمک بھیجنے کے لئے یہاں، ہاتھی خریدنے آیا ہے۔
رئیس کے کچھ دشمنوں نے بھی، یہ افواہ پھیلا دی۔
جس کی بنیاد پر فوج کی ایک ٹکڑی نے قاضی عبد الرحیم کو مع ہمراہیان، گرفتار کر کے جیل بھیج دیا

اور بغاوت کے الزام میں انہیں پھانسی دے دی گئی۔
قاضی عنایت علی، اپنے بھائی (قاضی عبد الرحیم) کی پھانسی کی خبر، سُن کر جوشِ انتقام میں
کچھ فوجیوں کو، جو، سہارن پور سے کیرانہ کی طرف جا رہے تھے، اُن کا تعاقب کیا۔
اور مال و اسباب، لوٹ لیا۔ ایک فوجی، زخمی ہو کر بھاگا اور گھوڑے سے گر کر مر گیا۔
اِس فساد کی خبر، مظفر نگر پہنچی، تو حاکمِ ضلع نے تھانہ بھون پر فوج کشی کا حکم دے دیا۔
جس پر قاضی عنایت علی نے کھُلّم کھلا عَلمِ فساد، بلند کیا۔ چنانچہ، شاملی کی طرف
انگریزی فوج جانے کی جھوٹی خبر کا نقّارہ بجا کر، جتھہ کا جتھہ، تحصیل شاملی پر چڑھ دوڑا۔

(ملخصاً۔ حاشیہ، ص: ۷۴۔ **تذکرۃ الرشید**۔ حصہ اول۔ مؤلّفہ: مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔
مکتبہ خلیلیہ، متصل: مدرسہ مظاہر علوم، سہارنپور۔ یوپی)

مولانا میرٹھی، بعنوان ''**الزامِ بغاوت اور اس کی کیفیت**'' از ص ۷۳ تا ص ۸۰۔
تذکرۃ الرشید۔ حصہ اول، مطبوعہ: میرٹھ (۱۹۰۸ء) میں لکھتے ہیں:

کیا ظلم و ستم ہے کہ مسیحائے جہاں کو
اِفساد و ستم پیشہ و سَفّاک کہا جائے؟
جو گوشہ نشیں خود ہی گرفتارِ محَن ہو
کس مُنہ سے اسے مُفسِد و چالاک کہا جائے؟

''شروع ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء، وہ سال تھا، جس میں حضرت امامِ رَبّانی (مولانا رشید احمد
گنگوہی) قدس سرہ پر، اپنی سرکار سے، باغی ہونے کا الزام لگایا گیا۔
اور مفسدوں میں شریک رہنے کی تہمت، باندھی گئی۔'' (ص: ۷۳۔ **تذکرۃ الرشید**۔ حصہ اول)

''تباہ ہونے والی رعایا کی نحوستِ تقدیر نے، ان کو جو کچھ بھی سُجھایا
اُس کا انھوں نے نتیجہ دیکھا اور ان کی نسلیں، دیکھ رہی ہیں۔''

''جن کے سروں پر موت کھیل رہی تھی، انہوں نے کمپنی کے امن و عافیت کا زمانہ
قدر کی نظر سے، نہ دیکھا اور اپنی رحم دل گورنمنٹ کے سامنے، بغاوت کا علم، قائم کیا۔
فوجیں، باغی ہوئیں۔ حاکم کی نافرمان بنیں۔ قتل و قتال کا بند بازار کھولا اور جواں مردی کے
غرّہ میں خود اپنے پیروں پر کلھاڑیاں، ماریں۔'' (ص: ۷۳۔ **تذکرۃ الرشید**۔ حصہ اول)

''اِسی بلا خیز قصہ میں تھانہ بھون کا وہ فساد، واقع ہوا، جس میں قاضی محبوب علی خاں کی

مُخبری سے حضرت مولانا (گنگوہی) پر مقدمہ، قائم ہوا۔'' (ص:۷۳۔**تذکرۃ الرشید**۔حصہ اول)

''اس بدنامی کی حالت میں جس کو قصبہ کی اصلیت ظاہر کرنے کے لئے
مختصر الفاظ میں حاشیہ پر، درج کر دیا گیا، عام باشندگانِ قصبہ کی یہ حالت ہوئی
گویا، ان کا مُربی پادشاہ، سر سے اٹھ گیا اور شرعی و طبعی ضروریات و مخمصات میں بھی
کوئی خبر گیراں، نہ رہا، جس کی رائے پر عمل کریں۔
پس، یہ لوگ، اعلیٰ حضرت، حاجی (امداد اللہ) صاحب کی خدمت میں
حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ:
بلا کسی حاکم کی سرپرستی کے، گذران، دشوار ہے۔ گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت کے باعث
اپنا امن اٹھالیا اور بذریعۂ اشتہار، عام اطلاع دی ہے کہ:
اپنی اپنی حفاظت، ہر شخص کو، خود کرنی چاہیے۔
اِس لئے آپ، چوں کہ ہمارے دینی سردار ہیں، اِس لئے دنیاوی حکومت کا بھی
بار، اپنے سر رکھیں اور امیرُ المؤمنین بن کر ہمارے باہمی قضیے، چکا دیا کریں۔
اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ) کو، ان کی درخواست کے موافق
ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا اور آپ نے دیوانی و فوج داری کے جُملہ مقدمات
شرعی فیصلہ کے موافق، چند روز تک قاضیِ شرع بن کر فیصل بھی فرمائے۔
اِسی قصہ نے مفسدوں میں شریک ہونے کی راہ چلائی اور مُخبِروں کو جھوٹی سچی مُخبری کا موقع دیا۔
حضرت امامِ ربّانی (مولانا گنگوہی) قدس سرہٗ، دس برس ہوئے
اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ) کو اپنے دین و دنیا کا سردار بنا ہی چکے تھے۔
ہمیشہ آمد و رفت رہتی ہی تھی۔ اب جب کہ ہر چہار طرف، بدامنی تھی
آپ کے لئے یہاں، حاضر رہنے سے زیادہ بہتر، کوئی جگہ، دنیا میں نہیں تھی۔
ادھر، اعلیٰ حضرت کو حکومت کے فیصلے اور شرعی قضا میں مولوی کی ضرورت تھی کہ:
حق بات میں اِعانت کرتا رہے، اس لئے آپ اور مولانا محمد قاسم صاحب مع دیگر خُدّام کے
یہیں رہ پڑے۔'' (ص:۷۴۔**تذکرۃ الرشید**۔حصہ اول)

''ان ایام میں آپ کو، ان مُفسِدوں سے مقابلہ بھی کرنا پڑا، جو غول کے غول، پھرتے تھے۔
حفاظتِ جان کے لئے تلوار، البتّہ، اپنے پاس رکھتے تھے۔

اور گولیوں کی بوچھار میں بہادر شیر کی طرح، نکلے چلے آتے تھے۔
ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ:
حضرت امام ربّانی (مولانا گنگوہی) اپنے رفیقِ جانی، مولانا قاسم العلوم
اور طبیبِ روحانی، اعلیٰ حضرت، حاجی صاحب، نیز، حافظ ضامن کے ہمراہ تھے کہ:
بندوقچیوں سے مقابلہ ہو گیا۔ یہ نبرد آزما جتّھہ اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے
بھاگنے، یا۔ ہٹ جانے والا نہ تھا، اِس لئے اٹل پہاڑ کی طرح، پَرا جما کر ڈٹ گیا۔
اور سرکار پر اپنی جاں نثاری کے لئے طیار ہو گیا۔
اللہ رے شجاعت و جواں مردی کہ:
جس ہولناک منظر سے شیر کا پتّہ، پانی اور بہادر کا زہرہ آب ہو جائے
وہاں، چند فقیر، ہاتھوں میں تلوار لیے، جمِ غفیر بندوقچیوں کے سامنے
ایسے جمے رہے گویا، زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔
چنانچہ، آپ پر، فیریں ہوئیں اور حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ
زیرِ ناف گولی کھا کر شہید بھی ہو گئے۔
حضرت مولانا قاسم العلوم، ایک مرتبہ، یکا یک، سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔
جس نے دیکھا، جانا کہ کنپٹی پر گولی لگی اور دماغ، پار کر کے نکل گئی۔
اعلیٰ حضرت نے، لپک کر زخم پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: کیا ہوا میاں؟
عمامہ، اُتار کر سر کو جو دیکھا، کہیں، گولی کا نشان تک، نہ ملا۔
اور تعجب، یہ ہے کہ: خون سے تمام کپڑے، تر۔'' (ص:۷۴و ۷۵۔**تذکرۃ الرشید**۔حصہ اول)

''جب، بغاوت و فساد کا قصہ، فرو ہوا اور رحم دل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پا کر
باغیوں کی سرکوبی شروع کی، تو جن بُزدل مُفسِدوں کو، سوا، اِس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ، نہ تھا کہ:
جھوٹی سچی تہمتوں اور مُخبری کے پیشہ سے سرکاری خیر خواہ، اپنے کو ظاہر کریں۔
انہوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات پر بھی بغاوت کا الزام لگایا
اور یہ مُخبری کی کہ: تھانہ بھون کے فساد میں، اصلُ الاصول، یہی لوگ تھے۔
اور شاملی کی تحصیل پر حملہ کرنے والا یہی گروہ تھا۔'' (ص:۷۶۔تذکرۃ الرشید، حصہ اول)

''حالاں کہ، یہ کمل پوش، فاقہ کش، نفس کش حضرات، فسادوں سے کوسوں، دور تھے۔''

(ص:۷۶۔تذکرۃ الرشید۔حصہ اول)

''حق تعالیٰ کا شکر ہے کہ:

سچ، سچ ہو کر رہا اور جھوٹ، جھوٹ۔ ان حضرات پر، اِتّہام کا

بِحمدِ اللہ کوئی ثمرہ، مرتّب، نہ ہوا۔ گو، خدائی آزمائش میں جھڑجھڑائے گئے۔

پریشانیاں اٹھائیں۔ کوفت سہی۔ روپوش رہے۔

مگر، انجامِ کار، حق کو غلبہ ہوا اور دودھ کا دودھ، پانی کا پانی۔

ان پاک نفوس اور ملکوتی صفات بدنوں پر آنچ نہ آئی۔'' (ص:۷۶۔تذکرۃ الرشید۔حصہ اول)

''اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ) نے، چندماہ، انبالہ، تگری، پنجلاسہ، وغیرہا

مواضع وقصبات میں اپنے آپ کو چھپایا اور آخر، براہِ سندھ و کراچی، عرب کا راستہ لیا۔

ہندوستان کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہا اور جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظّمہ پہنچے۔''

(ص:۷۷۔تذکرۃ الرشید،حصہ اول)

''تینوں حضرات کے نام، چوں کہ وارنٹ گرفتاری، جاری ہو چکے اور گرفتار کنندہ کے لئے

صِلہ، تجویز ہو چکا تھا، اِس لئے لوگ، تلاش میں ساعی اور حراست کی تگ و دَو میں پھرتے تھے۔''

(ص:۷۷۔تذکرۃ الرشید،حصہ اول)

''ہر چند کہ، یہ حضرات، حقیقۃً، بے گناہ تھے۔ مگر، دشمنوں کی یاوہ گوئی نے

ان کو، باغی و مُفسِد اور مُجرم وسرکاری خطاوار، ٹھہرا رکھا تھا۔ اِس لئے گرفتاری کی تلاش تھی۔

مگر، حق تعالیٰ کی حفاظت، برسر تھی، اِس لئے کوئی آنچ نہ آئی۔

اور جیسا کہ آپ حضرات، اپنی مہربان سرکار کے دِلی خیر خواہ تھے، تا زیست، خیر خواہ ہی

ثابت رہے۔ ہاں! چندروز کی تفریق بینَ الاحباب، مقدّر تھی، وہ اٹھانی تھی، سو، اُٹھائی۔''

(ص:۷۹۔تذکرۃ الرشید،حصہ اول)

''حضرت امام رَبّانی، قطبُ الارشاد، مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ کو

اِس سلسلے میں امتحان کا بڑا مرحلہ طے کرنا تھا

اِس لئے گرفتار ہوئے اور چھ مہینے، حوالات میں بھی رہے۔

آخر، جب تحقیقات اور پوری تفتیش و چھان بین سے

کالشَّمسِ فِی نِصفِ النَّھَار، ثابت ہو گیا کہ:

آپ پر، جماعتِ مُفسِدِین کی شرکت کا محض الزام ہی الزام ہے اور بہتان ہی بہتان ہے

اُس وقت، رہا کیے گئے اور آپ، بخیر و عافیت، وطنِ مالوف کو واپس آئے۔''

(ص:۷۹۔تذکرۃ الرشید،حصہ اول)

''گرفتاری و حوالات اور رہائی و براءت'' کے عنوان سے

مولانا عاشق الٰہی، میرٹھی (متوفی ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) مؤلّفِ تذکرۃ الرشید لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا (گنگوہی) کو، یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ:

آپ کا نام بھی مشتبہ اور قابلِ اَخذ مجرموں کی فہرست میں درج ہو چکا ہے۔

اور آپ کی گرفتاری و تلاش میں دَوش آیا چاہتی ہے۔

مگر، آپ، کوہِ استقلال بنے ہوئے، خدا کے حکم پر راضی تھے اور سمجھے ہوئے تھے کہ:

''میں، جب، حقیقت میں سرکار کا فرماں بردار رہا ہوں، تو جھوٹے الزام سے میرا بال بھی

بیکا نہ ہوگا۔ اور اگر مارا بھی گیا، تو سرکار، مالک ہے، اُسے اختیار ہے، جو چاہے کرے۔''

(ص۸۰۔تذکرۃ الرشید۔حصہ اول)

''غرض، حاکم نے، ہر چند تحقیق کیا اور تجسُّس و تحقیق میں پوری کوشش، صَرف کردی۔

مگر کچھ ثابت، نہ ہوا۔ اور ہر بات کا معقول جواب پایا۔

آخر، بری کیے گئے اور فیصلہ سنا دیا گیا کہ:

رَشید احمد، رہا کیے گئے۔'' (ص۸۵۔تذکرۃ الرشید،حصہ اول۔

مؤلّفہ: عاشق الٰہی، میرٹھی۔ مکتبہ خلیلیہ، متصل: مدرسہ مظاہر علوم۔ سہارن پور)

۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء کے درمیان لکھی گئی، دو کتابوں (۱) عُلمائے ہند کا شاندار ماضی۔

از مولانا سید محمد میاں، دیوبندی (۲) نقشِ حیات۔ از مولانا حسین احمد مدنی نے

ہنگامۂ شاملی ۱۸۵۷ء کو جنگِ پانی پت بنا کر، اپنے مولانا حضرات کو

گویا، سلطان ٹیپو اور جنرل بخت خاں کا درجہ دے دیا۔

اِس حادثہ شاملی کو ۱۹۵۳ء میں مولانا حسین احمد مدنی (متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) نے

لکھا، تو، وہ، بلا سند و حوالہ کے، اِس طرح، منظّم و منصوبہ بند ہو گیا:

''پھر، جہاد کی تیاری، شروع ہو گئی اور اعلان کر دیا گیا۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو امام، مقرر کیا گیا اور حضرت مولانا قاسم

نانوتوی کو سپہ سالارِ افواج، مقرر کیا گیا اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب، گنگوہی کو قاضی بنایا گیا
اور مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی کو
میمنہ میسرہ (دائیں اور بائیں کا فوجی دستہ) کا افسر، قرار دیا گیا۔"

(ص ۵۷۔ نقشِ حیات، حصہ دوم۔ مؤلّفہ: مولانا حسین احمد مدنی۔ مکتبہ دینیہ، دیوبند۔ ۱۹۹۹ء)

جب کہ مولانا مناظر احسن، گیلانی (متوفی ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء) نے یقینی بات، جو لکھی، وہ یہ ہے:

"مقابلہ اور مقاتلہ میں عملی شرکت کا فیصلہ، اگر، سیدنا الامام الکبیر (مولانا محمد قاسم، نانوتوی)
پہلے سے کیے ہوئے ہوتے، تو اس زمانے تک آپ کا
جنگی حالات، کم از کم، بندوق کے استعمال سے، اِس درجہ، بیگانہ، رہ جانا، کیا ممکن تھا؟
کچھ بھی ہو، اتنی بات، بہر حال، یقینی ہے۔
اور ان ناقابلِ انکار چشم دید گواہیوں کا کھلا اقتضا ہے کہ:
"مالیخولیا" سے زیادہ، اِس قسم کی افواہوں کی کوئی قیمت نہیں ہے کہ:
ہنگامہ کے برپا کرانے میں دوسروں کے ساتھ، سیدنا الامام الکبیر (مولانا قاسم، نانوتوی)
اور آپ کے دینی و علمی رُفقا کے بھی ہاتھ تھے۔ بلکہ واقعہ، وہی ہے
جو مصنفِ امام نے لکھا ہے کہ: مولانا فساد سے، کوسوں، دور تھے۔"
آخر، حسبِ روایتِ مولانا طیب صاحب:
جب، سنبھالنے والے حضرات، نظر نہیں آ رہے تھے، تو "تعمیر" سے پہلے "تخریب" کی
یا "خروج" سے پہلے "ولوج" کا خیال، ممکن ہے، عامیوں کے نزدیک، ضروری ہو
لیکن، سیدنا الامام الکبیر جیسے دین کی مثالی شخصیتوں کے متعلق
اِس قسم کے خود تراشیدہ اوہام، بدخواہیوں کے سوا بھی کچھ ہو سکتے ہیں؟"

(ص ۱۰۹۔ سوانحِ قاسمی۔ جلدِ دوم۔ مؤلّفہ: مولانا مناظر احسن، گیلانی۔ دارالعلوم دیوبند)

وَہم و بدخواہی سے اپنے کو دور رکھتے ہوئے مشہور غیر مقلّد عالم، مولانا نذیر احمد، رحمانی
(متولد ذوالحجہ ۱۳۲۳ھ/فروری ۱۹۰۶ء۔ متوفی محرم ۱۳۸۵ھ/مئی ۱۹۶۵ء)
ایک دوسرے ہی رنگ میں ان عُلما کی شرکتِ ہنگامہ کو دیکھ رہے ہیں۔
چنانچہ، مولانا نذیر احمد، رحمانی لکھتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں، ان حضرات نے جو جنگ لڑی تھی، انگریزی سرکار کے خلاف

بغاوت کی جنگ، نہ تھی۔
بلکہ اس کے برعکس، وہ تو سرکار کی حمایت میں جاں نثارانہ و فدویانہ جنگ تھی۔
ان کی، یہ نبرد آزمائی، انگریزی فوج اور پلٹن کے مقابلے میں نہ تھی۔
بلکہ سرکار کے مخالف باغیوں کی سرکوبی کے لئے تھی۔
یہ کہنا، تہمت اور جھوٹی مُخبری ہے کہ:
انہوں نے تھانہ بھون کے فساد میں حصہ لیا اور شاملی تحصیل پر چڑھائی کی تھی۔"

(ص ۳۶۴۔ اہلِ حدیث اور سیاست۔ مؤلّفہ: نذیر احمد رحمانی۔
مطبوعہ: اِدارۃ البحوث۔ جامعہ سلفیہ، بنارس۔ یوپی۔ اشاعتِ سوم۔ ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء)

مولانا محمد قاسم، نانوتوی اور مولانا رشید احمد، گنگوہی، انگریزی دربار کے مقرّب و انعام یافتہ عالم، مولانا مملوک علی، نانوتوی، پرنسپل عربی کالج، اجمیری دروازہ، دہلی کے خصوصی شاگردوں میں سے تھے۔ تاریخ و تذکرہ کی متعدد کتابوں کے علاوہ
تذکرۃ الرشید از مولانا میرٹھی و **نقشِ حیات** از مولانا حسین احمد مدنی میں بھی اس کا ذکر ہے۔
چنانچہ، مولانا عاشق الٰہی، میرٹھی (متوفی ۱۹۴۱ء) لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا رشید احمد، گنگوہی کے مشہور استاذ، یہی استاذُ الکل، مولانا مملوک العلی صاحب
ہیں، جن کی خدمت میں، ہر دو شمس و قمر کو ایک زمانہ میں مدت تک، حاضر رہنے
اور نخلستانِ علم کی خوشہ چینی کا اتفاق رہا۔

"حضرت مولانا قاسم العلوم تو ۱۲۶۰ھ ہی میں استاذُ الکل رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ، دہلی آئے تھے۔ مگر، حضرت امام رَبّانی (مولانا گنگوہی) قدس سرہ کو ۱۲۶۱ھ میں دہلی پہنچنے کا اتفاق، پیش آیا۔"

(ص ۲۷۔ تذکرۃ الرشید۔ حصہ اول)

مولانا رشید احمد، گنگوہی کے بڑے ماموں اور خُسر، مولانا محمد تقی کے بارے میں
مولانا میرٹھی لکھتے ہیں:

"مولانا ممدوح، جھجھر (پنجاب) کی ریاست میں فوجی ملازم تھے۔
اور آقا کے جاں نثار خیر خواہ۔ ایامِ غدر میں آپ، مُفسِدین کے ساتھ، نہ تھے۔
بلکہ، اس جماعت میں تھے، جس کے غنیم سے لڑنے کی غرض سے، دو حصے کر دیے گئے تھے کہ:
ایک دستہ آج، میدان جنگ میں جائے، تو کل کو دوسرا۔

آپ، بلحاظِ تقسیم، ایک گروہ میں منقسم ہوئے تھے۔ مگر، شوقِ شہادت اور سرکار کی جاں نثاری
میں مقتول ہو جانے کی تمنا آپ پر، اس درجہ غالب تھی کہ:
ہر دو گروہ میں شریک ہوتے اور روزانہ، میدانِ جنگ میں چلے آیا کرتے تھے۔''
(ص ۳۷۔ **تذکرۃ الرشید**۔ حصہ اول)

''یکے بعد دیگرے، دو باغیوں کو (مولانا محمد تقی نے) قتل کیا اور تیسرے کے چہرے پر
چھرّے کا نشان لگایا اور گولی کا چل کر نکلنا تھا کہ خود بھی چلاّ اٹھے اور سفرِ آخرت کا تہیّہ کر دیا۔''
(ص ۳۸۔ **تذکرۃ الرشید**۔ حصہ اول)

مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی کی رفاقت و دوستی کے بارے میں مولانا میرٹھی لکھتے ہیں:
''حضرت امام ربّانی، گنگوہی قدس سرہ کو قاسم العلوم، زبدۃ الافاضل، مولانا المولوی محمد قاسم
صاحب، نانوتوی کے ساتھ، طالب علمی کے زمانے میں چار سال تک
مرافقت و معیت اور ہم سبقی و یک جہتی کے سبب، اس درجہ، تعلق بڑھ گیا تھا کہ:
فلکِ علم کے دونوں شمس و قمر، گویا، جسم و روح اور گل و بُو کا علاقہ رکھتے۔
اور، یک جان، دو قالب کا مظہر بنے ہوئے تھے۔''
(ص ۴۰۔ **تذکرۃ الرشید**۔ حصہ اول)

''**غول کے غول پھرنے والے مُفسِدین**'' جن سے مولانا نانوتوی و مولانا گنگوہی وغیرہ کا
مقابلہ ہوا، اور حافظ ضامن صاحب سے متعلق، بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اس میں شہید ہوئے۔

آخر کون تھے؟

(۱) انگریز مخالف تھے؟ (۲) انگریز حامی تھے؟

(۳) بدنظمی و افراتفری کا فائدہ اٹھانے والے آوارہ گرد لوگ تھے؟

آخر کون تھے، یہ عناصر، جن سے مقابلہ کرتے ہوئے مولانا قاسم، نانوتوی کے
مجروح اور حافظ ضامن کے جاں بحق ہونے کا حادثہ، پیش آیا؟

ہمارے سامنے، دو مؤرخین کی تحریریں ایسی ہیں، جن میں صاف و صریح الفاظ میں
تیسری صورت کی تعیین کی گئی ہے اور یہ دونوں مؤرخین، اسی خیمے سے تعلق رکھتے ہیں
جو تحریکِ بالاکوٹ و تقویۃ الایمان کا سرگرم حامی و مؤیّد ہے۔
شیخ محمد اِکرام (متولد ۱۹۰۸ء۔ متوفی جنوری ۱۹۷۳ء) لکھتے ہیں:

''جب، تھانہ بھون میں بے انتظامی، عام ہوئی
تو حاجی (اِمداد اللہ) صاحب نے قصبے کا انتظام، اپنے ہاتھ میں لیا اور دیوانی و فوجداری
کے جُملہ مقدمات، شرعی فیصلہ کے مطابق، چند روز تک، قاضیِ شرع بن کر فیصل بھی فرمائے۔
ان کوششوں میں مولانا رشید احمد، گنگوہی اور مولانا قاسم، نانوتوی آپ کے ساتھ تھے۔
اور ایک ہنگامہ میں ان حضرات کا اُن مُفسِدوں سے جو عام بدانتظامی کا فائدہ اٹھانے کے لئے
غول کے غول پھرتے تھے، مقابلہ بھی ہوا، اور مولانا محمد قاسم، ایک گولی سے زخمی ہوئے۔
جب، ہنگامۂ مذکورہ، فرو ہوا، اور انگریزی نظم و نسق، دوبارہ، قائم ہوا
تو مُخبِروں نے حاجی صاحب اور ان کے رُفقا کے خلاف، رپورٹ دی۔
اور پولیس ان کی گرفتاری کے درپے ہوئی۔''
(ص ۱۹۵ و ۱۹۶۔ **موجِ کوثر**۔ مؤلّفہ: شیخ محمد اِکرام۔ مطبوعہ: ادبی دنیا، مٹیا محل۔ دہلی ۶)

یہ فسادی گروہ، جس سے تصادم کے نتیجے میں حافظ ضامن کی شہادت، بیان کی جاتی ہے
اس کی نشان دہی کرتے ہوئے اسی طبقے کے دوسرے مؤرخ
ابوسلمان، شاہجہاں پوری، تحریر کرتے ہیں:

''دفعہ سوم سے پتہ چلتا ہے کہ:
کچھ غیر ذِمّہ دار (خواہ، ہندو ہوں، خواہ مسلمان) اہلِ وطن نے
حالات کی خرابی اور نظامِ حکومت کی اَبتری سے فائدہ اٹھا کر
اپنے ہی ہم وطنوں کی لوٹ کو اپنا شِعار بنا لیا تھا۔
یہ فساد، تھا اور اس کے پھیلانے والے، مُفسِد تھے۔
یہی (دفعہ)، اس طرف، اشارہ کرتی ہے کہ:
حضرت امامِ ربّانی (مولانا گنگوہی) اور آپ کے رُفقائے محترم نے
ان فسادیوں سے سختی سے نمٹا تھا اور نہایت بہادری کا ثبوت دیا تھا۔
صاحبِ تذکرۃ الرشید کے الفاظ میں:
''ان ایام میں آپ کو، ان مُفسِدوں سے مقابلہ کرنا پڑا، جو غول کے غول پھرتے تھے۔''
اس کا سیاق و سباق اور اسلوبِ بیان، اس بات کا غماز ہے کہ:
ایک بار سے زیادہ، اس قسم کا واقعہ، پیش آیا تھا۔

نیز، یہ کہ غول کے غول، انگریزی حکومت کے وفادار نہیں تھے۔
بلکہ، صاف اشارہ، اہلِ ملک فسادیوں کی طرف ہے۔
جنھوں نے حضرت حاجی (امداداللہ) صاحب کے
نظامِ امامت، یا حکومت کو بھی قبول نہیں کیا تھا۔
اس وقت، انگریزی نظامِ حکومت، اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ، موجود بھی، نہ تھا۔
اگر، اعلیٰ حضرت، حاجی صاحب، ان فسادیوں سے تعرض، نہ کرتے
انہیں، ان کے حال پر چھوڑ دیتے، تو فرائضِ امامت/امارت میں کوتاہی ہوتی۔"

(ص ۴۰۔ **بزرگانِ دارالعلوم دیوبند**۔ مؤلّفہ: ڈاکٹر ابوسلمان، شاہجہاں پوری۔
مطبوعہ: فرید بک ڈپو۔ مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی ۶)

شیخ الحدیث، مولانا محمد زکریا، سہارن پوری (متوفی ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء) اپنی کتاب
"**تاریخ مشائخِ چشت**" محرّرہ ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۵ء ومُصدّقہ مفتیِ محمود حسن، مفتیِ دارالعلوم دیوبند
کے اندر، حاجی امداداللہ، مہاجر مکی (وصال ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء) کی
ہجرتِ مکہ مکرمہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حضرت اَقدس (حاجی امدادُ اللہ) کے قلب میں، جو کیفیاتِ شوقیہ، روزافزوں ترقی پذیر
رہتی تھیں، انہوں نے ہجرت کا ولولہ، حضرت کے ذہن میں پیدا کیا۔
لیکن، اکابر کا نقل وحرکت، چوں کہ تابعِ حکم ہوتا ہے
اِس لئے یہ اشتیاق، دل ہی دل میں رہا کہ اتفاقاً، ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء میں غدر کا کریہہ منظر، پیش آیا۔
اور "مُفسِدین" نے اپنی براءت، اسی میں سمجھی کہ:
دوسروں کا نام بتاؤ، تا کہ ہم لوگ، خیرخواہِ سرکار شمار ہوں۔"
اور یہ گروہ، چوں کہ سرکاری درباری قصوں سے متنفّر اور مسجد کے کونوں کا خوگر تھا
نہ لسّانیت کا عادی، نہ قوانین سے واقف، نہ رشوت کی بھینٹ، نہ فضول روپیہ پاس۔
جس کے ذریعہ، اپنی براءت، ثابت کر سکے اور دوسروں کا جھوٹ بتلائے۔
اِس لئے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کی
اور اسی ذیل میں حضرت حاجی صاحب نے بہ زبانِ حال، یہ مصرع، دُہراتے ہوئے۔ ع
جاتے ہیں ترے کوچے سے ظالم! خفا، نہ ہو

....

ہند کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہا" (ص ۲۴۹۔ **تاریخ مشائخِ چشت**۔ مؤلّفہ: شیخ محمد زکریا
کاندھلوی۔ مکتبہ شیخ زکریا۔ مفتی اسٹریٹ۔ سہارن پور، یوپی۔ طبعِ اول ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء)

مولانا رشید احمد، گنگوہی کی گرفتاری اور چھ ماہ کی سزا
اور مولانا قاسم نانوتوی کے نام، گرفتاری وارنٹ، کوئی نادِر بات نہیں۔
اُس زمانے کی، یہ عام شکایت تھی کہ:
مُخبِر جسے چاہتے، جب چاہتے، گرفتار کرادیتے، سزا دلا دیتے
پھانسی اور گولی کا شکار بنا دیا کرتے تھے۔
۱۸۵۷ء/۱۸۵۸ء میں، اِس طرح کے سیکڑوں نہیں، ہزاروں حادثات ہوئے۔
مولانا قاسم، نانوتوی، گرفتاریِ وارنٹ کے باوجود، آزادانہ گھومتے رہے۔
صرف تین روز، رُوپوش رہے۔ اور نومبر ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ کی جانب سے جاری
عام معافی نامہ، مع بعض مستثنیات کے بعد، مولانا نانوتوی، بالکل ہی بے فکر ہو گئے۔
۱۸۶۰ء میں حج بھی کیا۔ (تفصیل کے لئے دیکھیے: **سوانحِ قاسمی**۔ جلدِ دوم)
ان تمام مراحل میں گرفتاری، نہیں ہوئی۔
کیا، ۱۸۵۷ء کے کسی سرغنہ اور سرکردہ انقلابی قائد کے ساتھ
انگریزوں نے کہیں بھی اِس طرح کی دیدہ ودانستہ چشم پوشی کی؟
اِن حقائق کا کھلا ہوا مطلب ہے کہ:
مُخبِروں کی احتیاطی، یا ذاتی انتقامی کارروائی، یا انگریز حکومت کی خوشنودی
حاصل کرنے کے لئے کی جانے والی خبر رسانی کے نتیجے میں مقامی پولیس نے
تھوڑی سی توجہ کی، اس کے بعد، سارا معاملہ، ہمیشہ کے لئے، رفع دفع ہو گیا۔
مولانا نانوتوی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء تک۔ اور مولانا گنگوہی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء تک۔ بقیدِ حیات
رہے۔ مگر، کسی مُخبِر کو، نہ کسی پولیس کو، نہ کسی سرکاری اہل کار کو، کسی نگرانی وتفتیش کی کبھی کوئی ضرورت
پیش آئی۔ نہ بعد کے کسی دَور میں مقدمہ وگرفتاری سے کبھی دوچار ہونا پڑا۔ ایں چہ بوالعجبی ست؟
آغازِ تحریر سے اب تک کے پیش کردہ حقائق ومعلومات وتحریرات کا
تحقیقی وتنقیدی اور دیانت دارانہ تجزیہ واِحتساب کرنے پر خلاصہ اور نتیجہ، یہ نکلتا ہے کہ:

(۱) سید احمد، رائے بریلوی و شاہ اسمٰعیل، دہلوی کی تبلیغِ جہاد و سفرِ بالاکوٹ کا
شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی اور شاہ محمد اسحٰق، دہلوی سے
کسی طرح کے تعلق و ایما و حکم کا، کوئی ثبوت و سند و حوالہ نہیں۔
(۲) تحریک و سفرِ بالاکوٹ، از رائے بریلی ۱۸۲۶ء کو، انگریز حکومت کی خاموش
اور بنارس والٰہ آباد و پٹنہ وغیرہ کے، اُن مسلم اُمَرا اور رُؤسا کی
کھلی ہوئی تائید و حمایت، حاصل تھی، جو انگریزوں کے معتمد و مقرّب تھے۔
بعض جگہ، پادریوں نے قافلۂ بالاکوٹ کی ضیافت کی۔
اور ''مجاہدین'' کے ساتھ عقیدت و احترام سے پیش آئے۔
(۳) اعلیٰ انگریزی حُکّام کی طرف سے ماتحت حُکّام کو ہدایت تھی کہ:
اِس قافلہ کے سفر اور اس کی تیاری و انتظام کی راہ میں کوئی رکاوٹ، نہ ڈالی جائے۔
اور ان سے کسی طرح کا تعرض، نہ کیا جائے۔
(۴) ۱۸۲۶ء سے ۱۸۳۱ء تک، انگریز پالیسی یہی رہی کہ:
''مجاہدین''، سکھوں اور افغانوں سے لڑ بھڑ کر، ایک دوسرے کو تباہ و برباد کرتے رہیں۔
جس کا فائدہ، انگریزی حکومت کو ہی ہوگا۔
(۵) سکھوں سے ''جہاد'' کے اعلان کے ساتھ، شروع ہونے والا جہاد
افغان مسلمانوں سے جہاد میں تبدیل اور مصروف ہوگیا۔
(۷) ۱۸۴۵ء میں سکھوں پر، انگریزوں کا غلبہ ہوگیا۔
تو کچھ دنوں بعد، انگریزوں نے ''مجاہدین'' کو حکم دیا کہ:
اب آپ سب اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں اور سکھوں سے ہرگز کوئی جنگ
نہ کریں، ورنہ اب سے کی جانے والی ہر جنگ، انگریزی حکومت سے جنگ سمجھی جائے گی۔
(۸) ۱۸۴۵ سے ۱۸۶۴ء تک ''مجاہدین'' نے انگریزوں کے خلاف، صوبۂ سرحد میں جو کچھ
سرگرمی دکھائی اور جھڑپ ہوئی، اُسے عام ہندوستانی مسلمانوں کی تائید و حمایت، حاصل نہیں تھی۔
بلکہ ایک محدود و مخصوص وہابی طبقہ، ہی اِس سلسلے میں سرگرم تھا۔
(۹) ''مجاہدین'' کی تگ و دَو کا مقصد، کسی سرحدی علاقے میں صرف، اپنی حکومت کا قیام
تھا اور آزادیِ ہند کا کوئی تصور، دور دور تک، ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔

(۱۰) تقویۃ الایمانی و بالاکوٹی جماعت کے کسی ادنیٰ گروہ نے بھی جماعتی حیثیت سے
انقلابِ ۱۸۵۷ء میں دہلی و روہیل کھنڈ و اَوَدھ اور بہار میں کہیں کوئی حصہ نہیں لیا۔
(۱۱) ۱۸۵۷ء میں مدرسہ دیوبند کا وجود نہیں تھا اور اس کی بنیاد، ۱۸۶۶ء میں ایک مدرسہ کی
شکل میں رکھی گئی۔ اِس لئے جنگِ ۱۸۵۷ء میں مدرسہ دیوبند کے کسی تعلیم یافتہ
اور کسی فارغُ التحصیل کی شرکت کا سوال ہی، خارج از بحث ہے۔
(۱۲) مدرسہ دیوبند کے مجوِّز و محرِّک و بانی، حاجی عابد حسین، قادری، چشتی، دیوبندی
(متوفی ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء) ہیں۔
مولانا قاسم، نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) کو، اس کا بانی کہنا
خلافِ حقیقت اور خلافِ واقعہ ہے۔ قیامِ مدرسہ دیوبند سے سالہا سال بعد، وابستہ ہوکر
اس کی توسیع و تشہیر اور اس کا معیارِ تعلیم بلند کرنے میں
البتّہ، مولانا نانوتوی کی کوششوں کا دخل ہے۔
(۱۳) ہنگامۂ شاملی ۱۸۵۷ء کے وقت
مولانا محمد قاسم، نانوتوی و مولانا رشید احمد، گنگوہی وغیرہ کی، جس ٹولی اور غول سے مڈبھیڑ ہوئی
وہ اُس وقت کے کچھ آوارہ گرد اور لوٹ مار کرنے والے فسادی عناصر تھے۔
وہ، انگریزی حکومت کے خیر خواہ اور کسی طرح، اس کے حمایت یافتہ، نہ تھے۔
(۱۴) مذکورہ عُلما اور ان کی جماعت کا انقلابِ ۱۸۵۷ء میں کوئی حصہ
کسی معاصر، یا مستند تاریخی حوالہ سے ثابت نہیں۔
(۱۵) اِس سلسلے کے ''قدیم حقائق''، ''جدید روایات'' بلکہ ''اِختراعات'' کی
مکمل تردید و تکذیب کرتے ہیں۔
شاہ محمد اسمٰعیل، دہلوی (متوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کی تقویۃ الایمان اور ان کی تحریکِ جہاد
کے حامیوں و ہم نَواؤں کے دونوں گروہ (۱) غیر مقلّدین/اہلِ حدیث
(۲) مقلّدین/علمائے سہارن پور کی، انقلابِ ۱۸۵۷ء سے دوری کے اسباب کا سُراغ
اُس بیان اور تحریر سے اچھی طرح مِل جاتا ہے، جسے انگریزوں کے مُعتمد اور جنگِ آزادی
۱۸۵۷ء کے شدید مخالف، سرسید احمد خاں (متوفی مارچ ۱۸۹۸ء) نے ''**اسبابِ بغاوتِ ہند**''
مؤلّفہ ۱۸۵۸ء میں، بڑے اعتماد کے ساتھ، درج کیا ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ

اسی سال، انگریز حُکّام کی خدمت میں پیش بھی کر دیا تھا۔ سرسید نے لکھا ہے کہ:
''مسلمانوں کا، بہت روزوں سے آپس میں سازش اور مشورہ کرنا
اِس ارادے سے کہ ہم باہم متفق ہو کر، غیر مذہب کے لوگوں سے جہاد کریں
اور ان کی حکومت سے آزاد ہو جائیں، نہایت بے بنیاد بات ہے۔ جب کہ:
مسلمان، ہماری گورنمنٹ کے مستأمن تھے
کسی طرح سے گورنمنٹ کی عمل داری میں جہاد نہیں کر سکتے تھے۔
بیس تیس برس پیشتر، ایک بہت بڑے نامی مولوی محمد اسمٰعیل نے ہندوستان میں
جہاد کا وعظ کہا اور آدمیوں کو جہاد کی ترغیب دی۔ **اُس وقت اس نے صاف بیان کیا کہ:**
''ہندوستان کے رہنے والے، جو سرکار انگریزی کی امن میں رہتے ہیں
ہندوستان میں جہاد نہیں کر سکتے۔
اِس لئے ہزاروں آدمی جہادی، ہر ایک ضلع ہندوستان میں جمع ہوئے۔
اور سرکاری عمل داری میں کسی طرح کا فساد نہیں کیا اور غربی سرحد پنجاب پر جا کر لڑائی کی۔
اور، جو، ہر ضلع میں پاجی اور جاہلوں کی طرف سے جہاد کا نام ہوا، اگر ہم، اس کو جہاد ہی
فرض کریں، تو بھی اس کی سازش اور صلاح، قبل دسویں مئی ۱۸۵۷ء مطلق، نہ تھی۔
غور کرنا چاہیے کہ اس زمانے میں جن لوگوں نے جہاد کا جھنڈا بلند کیا
ایسے خراب اور بدرَویّہ اور بداَطوار آدمی تھے کہ:
بجز شراب خوری اور تماش بینی اور ناچ اور رنگ دیکھنے کے
کچھ وظیفہ، ان کا نہ تھا۔ بھلا، یہ کیوں کر پیشوا اور مقتدا، جہاد کے گنے جا سکتے تھے؟
اِس ہنگامے میں کوئی بات بھی مذہب کے مطابق نہیں ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ:
سرکاری خزانہ اور اسباب، جو امانت تھا، اس میں خیانت کرنا
ملازمین کو نمک حرامی کرنی، مذہب کی رو سے، درست، نہ تھی۔
صریح ظاہر ہے کہ بے گناہوں کا قتل، علی الخصوص، عورتوں اور بچوں اور بُڈھوں کا
مذہب کے بموجب، گناہِ عظیم تھا، پھر کیوں کر، یہ ہنگامۂ غدر، جہاد ہو سکتا تھا؟
ہاں! البتّہ، چند بد ذاتوں نے دنیا کی طمع اور اپنی منفعت اور اپنے خیالات پورا کرنے
اور جاہلوں کے بہکانے کو، اور اپنے ساتھ، جمعیت، جمع کرنے کو، جہاد کا نام دے دیا۔

پھر، یہ بات بھی مُفسِدوں کی حَرمزدگیوں میں سے ایک حَرمزدگی تھی، نہ واقع میں جہاد۔
دلی میں جہاد کا، جو فتویٰ چھپا، وہ ایک عمدہ دلیل، جہاد کی سمجھی جاتی ہے۔
مگر، میں نے، بتحقیق سنا ہے اور اس کے اِثبات پر بہت دلیلیں ہیں کہ وہ محض بے اصل ہے۔
میں نے سنا ہے کہ جب فوج نمک حرام، میرٹھ سے دلی میں گئی
تو کسی نے جہاد کے باب میں فتویٰ چاہا۔ سب نے فتویٰ دیا کہ جہاد نہیں ہو سکتا۔
اگر چہ، اس فتویٰ کی نقل، میں نے دیکھی ہے، مگر جب کہ وہ اصل فتویٰ، معدوم ہے
تو اس نقل کو نہیں کہہ سکتا کہ کہاں تک، لائق، اعتماد کے ہے؟
مگر، جب، بریلی کی فوج، دلی پہنچی اور دوبارہ فتویٰ ہوا
جو مشہور ہے اور جس میں جہاد کرنا، واجب لکھا ہے، بلاشبہ، اصلی نہیں ہے۔
چھاپنے والا، اس فتویٰ نے (کا) جو ایک مُفسِد اور نہایت قدیمی بدذات تھا
جاہلوں کے بہکانے اور ورغلانے کو، لوگوں کے نام لکھ کر اور چھاپ کر، اس کو رونق دیا تھا۔
بلکہ ایک آدھ مُہر، ایسے شخص کی چھاپ دی تھی، جو قبلِ غدر، مر چکا تھا۔
مگر، مشہور ہے کہ:
چند آدمیوں نے فوج باغی، بریلی اور اس کے مُفسِد ہمراہیوں کے جبر اور ظلم سے مُہریں بھی کی تھیں۔
دہلی میں ایک بڑا گروہ، مولویوں اور ان کے تابعین، کا ایسا تھا کہ:
وہ، مذہب کی رُو سے، بادشاہِ دلی کو بہت بُرا اور بدعتی سمجھتے تھے۔ ان کا، یہ عقیدہ تھا کہ:
دِلی کی جن مسجدوں میں بادشاہ کا قبض و دخل اور اِہتمام ہے
اُن مسجدوں میں نماز، درست نہیں۔
چنانچہ، وہ لوگ، جامع مسجد میں بھی (نماز) نہیں پڑھتے تھے۔
اور غدر سے بہت قبل کے چھپے ہوئے فتوے، اس معاملے میں موجود ہیں۔
پھر، کبھی عقل، قبول کر سکتی ہے کہ:
ان لوگوں نے جہاد کے درست ہونے میں اور بادشاہ کے سردار بنانے میں فتویٰ، دیا ہو؟
جن لوگوں کی مہر، اس فتویٰ پر چھاپی گئی ہے، ان میں سے بعضوں نے عیسائیوں کو پناہ دی
اور ان کی جان اور عزت کی حفاظت کی، اُن میں سے کوئی شخص، لڑائی پر نہیں چڑھا۔
مقابلے پر، نہیں آیا۔ اگر، واقع میں وہ، ایسا ہی سمجھتے جیسا کہ مشہور ہے، تو، یہ باتیں کیوں کرتے؟

غرض، میری رائے میں مسلمانوں کے خیال میں بھی نہیں آیا کہ:
باہم متفق ہوکر، غیر مذہب کے حاکموں پر، جہاد کریں۔
اور جاہلوں اور مُفسِدوں کا غلغلہ ڈال دینا کہ:
جہاد ہے جہاد ہے۔ اور ایک نعرۂ حیدری پکارتے پھرنا، قابل، اعتبار کے، نہیں۔"
(ص ۱۶ تا ص ۱۸۔ **اسبابِ بغاوتِ ہند**۔ مؤلّفہ: سر سید احمد خاں۔
مطبوعہ: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ۔ بہار۔ اشاعتِ سوم ۱۹۹۹ء۔)
خواجہ الطاف حسین، حالؔی (متوفی ۱۹۱۴ء) نے، سرسید کے اَحوال و سوانح پر مشتمل
اپنی کتاب "**حیاتِ جاوید**" کے ضمیمہ کے طور پر "**اسبابِ بغاوتِ ہند**" کو، شامل کر کے
۱۹۰۱ء میں ہی قوم کے سامنے، پیش کر دیا تھا۔
سرسید نے "اسبابِ بغاوتِ ہند" کا انگریزی ترجمہ
۱۸۵۸ء یا ۱۸۵۹ء میں (مع اردو) لندن، بھیج دیا تھا۔
دہلی کے، اس "بڑے گروہ اور ان کے تابعین" کا معاملہ، یہیں تک، محدود نہیں تھا کہ:
وہ جامع مسجد، دہلی میں نماز پڑھنے کو، جائز نہیں سمجھتے تھے۔
بلکہ "تُرکوں کو بھی، یہ لوگ، بدعتی سمجھتے تھے۔
اور ائمۂ مسجدِ حرام و مسجدِ نبوی کو بھی بدعتی سمجھتے تھے۔ اس لئے سید احمد، رائے بریلوی صاحب نے
مریدوں و عقیدت مندوں کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ:
"جب، دوسرے لوگ، فارغ ہو جائیں، تو اپنی جماعت، کھڑی ہو۔"
(ص: ۲۲۲۔ **سید احمد شہید**۔ از غلام رسول مہؔر۔ مطبوعہ: شیخ غلام علی اینڈ سنسز، لاہور)
تاریخ کا چہرہ مسخ کرنے کی عملی کوشش کے ساتھ "پروپیگنڈسٹ گروپ" کے
عُلما و مؤرخین نے قوم و ملک کو گمراہ کرتے رہنے کا
جو مسلسل کارنامہ، انجام دیا ہے، اُس کا انتقام، تاریخ، ضرور لے گی
اور اس کے حساب کے لئے یقیناً، ایک یومِ حساب، مقرر و متعین ہے۔
ذرا جرأت و جسارت اور دیدہ دلیری دیکھیے کہ:
اِسی طبقے کے ایک معروف اور "جماعتِ مجاہدین" کے سرگرم وکیل
غلام رسول مہؔر (متوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) بہ بانگِ دُہل، یہ تحریری اعلان کرتے ہیں کہ:

"میں، مجاہدین کی شان و آبرو قائم رکھنے کا قائل ہوں۔
اگرچہ، وہ بعض سابقہ بیانات، یا۔ توجیہات کے عین مطابق، نہ ہو۔"
(ص: ۳۳۳۔ **اِفاداتِ مہؔر**۔ مؤلّفہ: شیر محمد پنّی۔ مطبوعہ: شیخ غلام علی، لاہور)
تحریکِ بالاکوٹ کی "جماعتِ مجاہدین" کے بارے میں
مولانا عبیداللہ، سندھی (متوفی اگست ۱۹۴۴ء) کہتے ہیں:
"ایک بار، مَیں، سرحد پار "بَنَیر" کے مقام پر گیا......... میں اس امید میں تھا کہ:
شاید، سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کی "جماعتِ مجاہدین" میں
زندگی کی کوئی کرن دکھائی دے، ادھر چل دیا۔ وہاں، پہنچ کر میں نے جو کچھ دیکھا
وہ، حد درجہ افسوسناک اور قابلِ رحم تھا۔
وہاں پہنچ کر، مجھے معلوم ہوا کہ:
"وہ جماعت، جو "مجاہدین" کے نام سے یاد کی جاتی ہے، کیسی بری حالت میں ہے۔
اور اس کی گذران اور اس کی زندگی، کس طرح
صاحب زادہ عبدالقیوم خاں کی وساطت سے انگریزی حکومت کی رہینِ منّت ہے۔"
(ص ۳۶۲۔ **اِفادات و ملفوظاتِ مولانا سندھی**۔ مرتّبہ: محمد سرور جامعی۔ مطبوعہ: لاہور)
قارئین، ضرورت سمجھیں، تو آخر میں مولانا عاشق الٰہی، میرٹھی کے
ان اِلفاظ اور جملوں پر بھی غور کر لیں:
"رحم دل گورنمنٹ" "مہربان سرکار" "بندوقچی" "کارتوسوں پر چربی لپیٹے جانے کی جھوٹی
خبر" "کمپنی کے امن و عافیت کا زمانہ" "رحم دل گورنمنٹ" کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پا کر
"باغیوں" کی سرکوبی، شروع کی" "گوشہ نشین حضرات پر بغاوت کا الزام اور مُخبری"
"مہربان سرکار کے دِلی خیرخواہ" "تازیست خیرخواہ"
(**تذکرۃ الرشید**، مؤلّفہ: مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، طبعِ اول، میرٹھ)
کوئی بتلائے کہ ہم، بتلائیں کیا؟
۱۹۲۰ء سے شروع ہونے والی تحریکِ تَرکِ موالات اور پھر آزادیِ ہند کی تحریک کے بعد
جب کہ ہندوستانی حالات، اِس طوفانی رفتار سے تبدیل ہوئے کہ:
انگریزی حکومت ہی نہیں، بلکہ انگریزوں کا تحفظ و دفاع بھی خطرے کی زد میں آ گیا۔

انگریزوں کے خلاف، احتجاج ومظاہرہ وتقریر وتحریر کا سیلاب اُمنڈ پڑا۔

اُس وقت بھی **تذکرۃُ الرشید** کے مؤلّف، مولانا عاشق الٰہی، میرٹھی (متوفی ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) اور اسے پڑھ کر، اس کی تصدیق کرنے والے عُلمائے سہارن پور نے، مذکورہ ہنگامۂ شاملی ۱۸۵۷ء کے بیانات وتحریرات میں کسی ترمیم واصلاح کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

تو پھر، آزادیِ ہند ۱۹۴۷ء کے بعد، ۱۹۵۰ء کے عَشرے میں سابقہ حقائق کے خلاف
فرضی تاریخ لکھنے اور سابقہ تحریرات کے اندر، کسی تاویل
اور انگریزی دَور کے حالات کی دُہائی دینے کی گنجائش، کہاں، باقی رہ جاتی ہے؟

اپنی مرضی سے اپنے سوانحی تحریری بیان (**تذکرۃُ الرشید**) میں
اس کے مؤلّف: مولانا خلیل احمد، انبیٹھوی، سہارن پوری (متوفی ۱۹۲۸ء)
یا **تذکرۃُ الرشید** پر نظر ثانی کرنے والے کسی، مُصدِّق، یا ان کے ہم پلّہ، کسی معاصر کی جانب سے بھی
تقریباً ۱۹۵۰ء تک، کسی ترمیم وتردید، نہ کیے جانے کا بھی سیدھا مطلب یہی ہے کہ:
تذکرۃُ الرشید، مصدَّقہ عُلمائے سہارن پور میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہی اصل ہے۔
اور باقی جو کچھ ہے، وہ افسانہ اور جھوٹی تاریخ نویسی کا نہایت افسوس ناک اور عبرت ناک نمونہ ہے۔

قریب ہے یارو! روزِ محشر، چُھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر؟
جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

○○○

ہندوستان! دارُالحرب ہے، یا دارُالاسلام؟

۱۲۹۸ھ میں مرزا علی بیگ، بدایونی نے تین سوالات پر مشتمل، ایک سوال نامہ بھیجا۔
جس کا پہلا سوال، یہ تھا کہ: ہندوستان! دارُالحرب ہے۔یا۔ دارُالاِسلام؟
اِس سوال نامہ کے جواب میں ایک رسالہ، تیار ہو گیا جس کا نام ہے:
''اِعْلَامُ الْاَعْلَام بِاَنَّ ہندوستان دَارُ الْاِسْلَام''۔

سائل ومستفتی کے پاس، یہ جواب، اپنے وقت پر پہنچ گیا ہوگا۔
مگر، اسے رسالہ کی شکل میں پہلی بار، ۱۹۲۷ء میں حَسَنی پریس، بریلی سے شائع کیا گیا۔
یعنی، امام احمد رضا کے وصال (۱۹۲۱ء) کے چھ سات سال بعد (۱۹۲۷ھ میں) اِس فتویٰ کی بشکلِ رسالہ، طباعت واِشاعت ہوئی۔ بعد میں اسے فتاویٰ رضویہ میں بھی شامل کر دیا گیا۔

فتویٰ کا آغاز، اِن کلمات سے ہوتا ہے:
''ہمارے امام اعظم، رَضِیَ اللّٰہُ تَعالیٰ عَنْہُ بلکہ عُلمائے ثلٰثہ، رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِم کے مذہب پر، ہندوستان، دارُالاسلام ہے۔ دارُالحرب، ہرگز نہیں ہے۔'' اِلیٰ آخِرِہٖ۔
(ص ۱۰۵۔ فتاویٰ رضویہ مترجَم، جلد چودہ۔ مطبوعہ: ہند و پاک)

امام احمد رضا کے مُعتمد ومُقرَّب خلیفہ اور فقہی بصیرت کے وارث، صدرُ الشَّریعہ، مولانا محمد امجد علی، اعظمی، رضوی (وصال، ذوالقعدہ ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) نے بھی
بعد کے کسی دَور میں ایک اِستفتا کا جواب، دیتے ہوئے یہی فتویٰ، جاری کیا کہ:
''ہندوستان، دارُالاسلام ہے۔ اسے دارُالحرب قرار دینا، غلطی ہے۔'' اِلیٰ آخِرِہٖ۔
(ص ۲۲۹۔ فتاویٰ امجدیہ، جلدِ سوم۔ دَائِرَۃُ الْمَعَارِفِ الْاَمْجَدِیہ۔ قصبہ گھوسی، ضلع مئو۔ اتر پردیش)

ابو الحسنات، مولانا محمد عبد الحیٔ، فرنگی محلی، لکھنوی
(وصال، ربیعُ الاوّل ۱۳۰۴ء/دسمبر ۱۸۸۶ء) کا بھی، یہی فتویٰ ہے کہ:
''بلادِ ہند، جو قبضۂ نصاریٰ میں ہیں، دارُالحرب نہیں۔''
(ص ۳۰۲۔ فتاویٰ عبد الحیٔ، جلدِ اول۔ مطبع یوسفی، لکھنؤ)

مولانا محمد قاسم، نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) کہتے ہیں:

’’ہجرت کے معاملے میں دارُالحرب اور سود کے معاملے میں دارُالاسلام، قرار دینا چاہیے۔

(خلاصۂ مفہوم۔ص۳۶۲و ص۳۷۱۔از **قاسم العُلوم**، مطبوعہ: لاہور)

مولانا رشید احمد، گنگوہی (متوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) لکھتے ہیں:

’’دارُالحرب ہونا، ہندوستان کا، مختلف، عُلماے حال میں ہے۔

اکثر، دارُالاسلام کہتے ہیں اور بعض، دارُالحرب کہتے ہیں۔

بندہ، اس میں فیصلہ نہیں کرتا۔ فقط۔‘‘ **وَاللہُ تَعالیٰ اَعْلَم۔**

(ص۷۔**فتاویٰ رشیدیہ، جلدِ اول**۔کتب خانہ رحیمیہ، دہلی۔و ص۸۔فتاویٰ رشیدیہ، جلدِ اول۔کتب خانہ میر محمد، کراچی)

مولانا اشرف علی، تھانوی (متوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) کے نزدیک

ہندوستان، دارُالحرب نہیں بلکہ دارُالاسلام ہی ہے۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ:

’’عموماً، دارُالحرب کا معنیٰ، غلطی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ:

جہاں، حَرب، واجب ہو۔ سو، اِس معنیٰ میں تو ہندوستان، دارُالحرب نہیں۔

کیوں کہ بوجہ معاہدہ کے، یہاں، حرب، درست نہیں۔

(ص۱۴۷۔بابِ اول۔ملفوظ ۶۱۴۔**کمالاتِ اشرفیہ**۔مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ۔تھانہ بھون، ضلع سہارن پور)

’’اور ہندوستان، نہ تو صاحبین کے قول پر، دارُالحرب ہے۔ کیوں کہ:

اگرچہ، اَحکام، شرک کے، اس میں عَلیٰ الْاِعْلَان، جاری ہیں۔

لیکن، اَحکام، اسلام کے بھی، بِلا خوف وخطر، مُشتہر ہیں۔

اور دونوں کے باقی رہنے سے، دارُالحرب نہیں ہوتا۔

اور، نہ امام (ابوحنیفہ) صاحب کے قول پر، دارُالحرب ہے۔‘‘ اِلیٰ آخِرِہٖ۔

(ص۸۔ **تَحْذِیرُ الْاِخْوَان**۔از مولانا تھانوی۔اشرفُ المطابع، تھانہ بھون، ضلع سہارن پور)

غیر مقلّد عالم ومحدِّث، مولانا نذیر حسین، بہاری ثُمَّ دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء)

کا فتویٰ، اُن کے سوانح نگار، مولانا فضلِ حسین، بہاری (متوفی ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء) یہ لکھتے ہیں کہ:

’’انہوں نے ہندوستان کو کبھی، دارُالحرب، نہ کہا۔‘‘

(اَلْحَیاۃُ بَعْدَ الْمَمَاۃ۔مؤلّفہ: فضلِ حسین، بہاری۔مطبوعہ: اَلکتاب انٹرنیشنل، مُرادی روڈ۔

بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ومکتبہ شعیب، کراچی)

مرکزی خلافت کمیٹی (تاسیس وتشکیل ۱۹۱۹ھ) کے بانی وروحِ رواں، حضرت مولانا عبدالباری

فرنگی محلی، لکھنوی (وصال، رجب ۱۳۴۴ھ/جنوری ۱۹۲۶ء) تحریر فرماتے ہیں:

’’ہم لوگ، ہندوستان کو دارُالاسلام سمجھتے ہیں۔

اور اِعزازِ دین و اِعلاے کلمۃُ الحق کی نیت سے قیام کیے ہوئے ہیں۔‘‘ اِلیٰ آخِرِہٖ۔

(مکتوبِ مولانا عبدالباری، فرنگی محلی۔مطبوعہ: **اخبارِ مشرق**، گورکھ پور۔بحوالہ ص ۱۳۸۔’’**تحریکِ خلافت**‘‘

مؤلّفہ: قاضی محمد عدیل عباسی۔مطبوعہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی۔طبعِ دوم۔۱۹۹۷ء)

قارئین پر، واضح رہے کہ:

انیسویں صدی عیسوی کے پہلے عَشرے میں سراجُ الہند، شاہ عبدالعزیز، محدِّث دہلوی (وصال ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) نے بعض ہندوستانی علاقوں اور خطّوں کے دارُالحرب ہونے کا فتویٰ

اُس وقت دیا تھا، جب ۱۸۰۳ء میں انگریز فوجی جنرل، لارڈ لِیک کی قیادت میں انگریزی فوج نے دہلی پر حملہ کرکے، اس پر قبضہ کرلیا تھا۔

اور اُس وقت کے مُغل حکمراں، شاہِ عالَم کو وظیفہ خوار بادشاہ بنا کر، الہ آباد میں قید کردیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی، اس نے اسلام و مسلمین کو سخت مظالم ومصائب سے دوچار کرکے مسلمانوں پر عرصۂ حیات، تنگ کردیا اور شعائرِ شریعتِ اسلامی کی توہین وتحقیر کے سارے اَبوَاب، کھول دیے تھے۔

مؤرِّخین، شاہ عبدالعزیز، محدِّث دہلوی (وصال ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) کے فتویٰ کے اِجرا کی تاریخ و ماہ وسال، متعین نہیں کرسکے ہیں، مگر، اِس پر سب کا اتفاق ہے کہ:

۱۸۰۳ء کے معاًبعد، یا چند سال بعد، یہ فتویٰ، جاری ہوا تھا۔

اور جب، حالات، سنبھل گئے اور نَظم ونَسق، بحال ہوگیا

تو خود، شاہ عبدالعزیز، محدِّث دہلوی نے مولوی عبدالحیٔ، بڈھانوی (متوفی شعبان ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۸ء) کو مفتیِ عدالتِ میرٹھ کا منصب، قبول کرنے کی اجازت، دے دی۔

اِس اجازت کا وَاضح وصریح مطلب، یہ ہے کہ:

حالات، بدل گئے۔ اِس لئے اب سابقہ حکم، باقی نہ رہا۔

اور ہندوستان، حسبِ سابق، دارُالاسلام ہوگیا۔

البتّہ، فقہی نقطۂ نظر سے، یہ پہلو، نہایت اہم اور قابلِ غور ہے کہ:

جب، دارُالحرب سے دارُالاسلام کی طرف، ہجرت، ضروری ہے

تو شاہ عبدالعزیز، محدِّث دہلوی نے مسلمانانِ ہند کو اِس کا حکم، کیوں نہیں دیا؟

دوسری صورت، جہاد کی ہے۔مگر، اس کا بھی آپ نے کبھی کوئی حکم نہیں دیا۔
ایسی کوئی مستند زبانی روایت، یا تحریری سند نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ:
آپ نے ہجرت، یا۔ جہاد کا حکم، صادر فرمایا ہو۔
اِس کی وجہ، اِس کے سِوا، کوئی اور سمجھ میں نہیں آتی کہ:
ہندوستانی مسلمان، اپنے حالات کے تحت، اُس وقت ،ہجرت، یا۔ جہاد کرنے سے معذور تھے۔اور جب، ہجرت، یا۔ جہاد سے حقیقۃً، مجبوری ومعذوری ہو
تو پھر ان میں سے کسی ایک کا بھی شرعی حکم نہیں دیا جاسکتا ہے۔ اور نہ کبھی دیا گیا ہے۔
جہاد، یا۔ ہجرت سے سکوت کی وجہ، شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی کی نظر میں غالبًا، یہی رہی ہوگی۔
مجبوری ومعذوری کی صورت اور اس کا حکم، امام احمد رضا نے، میاں تاج الدّین، لاہوری کے ایک اِستفتا، مؤرخہ ذوالحجہ ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء کے جواب میں تحریر فرمایا ہے۔
دیکھیے: ص ۱۰۲ و ص ۱۰۳۔ فتاویٰ رضویہ مترجَم، جلد چودہ۔ مطبوعہ ہندو پاک۔
اِستفتا (محرَّرہ ۱۲۹۸ھ) کا جواب دیتے ہوئے، اپنے فتویٰ، موسوم بہ، اِعْلامُ الْاَعْلام بِاَنَّ ھندوستان دَارُ الْاِسْلام ۔مطبوعہ بریلی ۱۹۲۷ء، ومشمولہ فتاویٰ رضویہ، مترجَم، جلد ۱۴۔ مطبوعہ: پاک وہند میں، امام احمد رضا حنفی، قادری برکاتی، بریلوی نے قدیم ومستند اور متداول کتبِ فقہ، مثلاً:
فتاویٰ ہندیہ وسراجِ وہاج وجامعُ الفصولین وشرحِ نقایہ وغیرہ کی
عبارات وحوالہ جات کے ذریعہ، واضح اور ثابت کیا ہے کہ:
جب، کسی دارُالحرب میں علانیہ، اَحکامِ اسلام، جاری ہوجائیں، تو وہ دارُالاسلام ہوجاتا ہے
اور جب، دارُالاسلام میں احکامِ کفر وشرک، اِس طرح، غالب ہوجائیں کہ:
احکامِ اسلام، وہاں جاری، نہ ہوسکیں، تو وہ، دارُالحرب ہوجاتا ہے۔
یعنی، سبب وعِلّت کے بدلنے کے ساتھ، اس کا حکم بھی بدلتا رہے گا۔
امام ابو یوسف وامام محمد کا یہی فتویٰ ہے۔
امامِ اعظم، ابوحنیفہ کے نزدیک، کسی دارُالاسلام کے دارُالحرب ہونے کی
تین شرطیں ہیں، جن کے پائے جانے کے بعد ہی کوئی دارُالاسلام، دارُالحرب ہوگا۔
مذکورہ احکام کے سلسلے میں امام احمد رضا نے فتاویٰ ہندیہ سے، یہ فقہی جزئیات، نقل کیے ہیں:
(ترجمہ) امام ابوحنیفہ، رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِ کے نزدیک

دارُالاسلام، تین شرائط سے دارُالحرب ہوجاتا ہے۔ جن میں سے ایک، یہ ہے کہ:
کفّار کے اَحکام، عَلانیہ، جاری کیے جائیں اور وہاں، اسلام کا کوئی حکم، جاری، نہ کیا جائے۔
پھر فرمایا: اور مسئلہ کی صورت، تین طرح ہے:
اہلِ حرب، ہمارے علاقہ پر غلبہ پالیں۔ یا۔ ہمارے کسی علاقہ کے شہری، مُرتد ہوکر، وہاں غلبہ، پالیں اور کفر کے اَحکام، جاری کردیں۔ یا۔ وہاں، ذِمّی لوگ، عہد توڑ کر غلبہ، حاصل کرلیں۔
تو، اِن تمام صورتوں میں وہ علاقہ، صرف، تین شرطوں سے دارُالحرب بنے گا۔
(اَلْفَتَاوىٰ الْهِندیه ۔اَلْبَابُ الْخَامِس)
یہی باتیں، امام احمد رضا کے تلمیذ وخلیفہ، صدرُ الشَّریعہ، مولانا امجد علی، اعظمی، رضوی (وصال ذوالْقَعدہ ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) نے وضاحت واِختصار کے ساتھ، اِس طرح، بیان فرمائی ہیں:
"جو جگہ، دارُالاسلام ہو، اُس کے دارُالحرب ہونے کے لئے فقط اتنی بات، ناکافی ہے کہ کفّار کی وہاں حکومت ہوجائے۔ بلکہ، اس کے ساتھ اور تین چیزوں کی ضرورت ہے:
(۱) اہلِ شرک کے احکام، علی الاعلان، جاری ہوں اور اسلامی اَحکام، بالکل، نہ جاری ہوں۔
(۲) دارُالحرب سے اس کا اِتّصال ہوجائے۔
(۳) کوئی ذِمّی، اَمانِ اوّل پر باقی، نہ رہے۔
چند فقہی عبارتیں، پیش کرنے کے بعد، لکھتے ہیں:
"اِس سے ظاہر ہے کہ:
اگر، اَحکامِ مسلمین واَحکامِ اہلِ شرک، دونوں، جاری ہوں تو وہ جگہ، دارُالحرب، نہیں ہوگی۔
اِسی شرطِ اوّل کو، اگر، دیکھا جائے، تو اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ:
ہندوستان، دارُالاسلام ہی ہے، دارُالحرب نہیں کہ بِحَمْدِہٖ تَعالیٰ:
اب بھی ہندوستان میں بہت کچھ اَحکامِ اہلِ اسلام، جاری ہیں۔
شعائرِ اسلام، باقی ہیں۔ اذانیں ہوتیں، جمعہ وعیدَین ہوتی ہیں۔
ترکہ ومیراث وغیرہ میں شریعتِ مطہَّرہ کے موافق، فیصلہ ہوتا ہے۔
لِھٰذا، یہاں، اگرچہ، اہلِ شرک کے اَحکام، جاری ہیں۔
مگر جب، اہلِ اسلام کے اَحکام بھی جاری ہیں

توبموجب تصریح، علّامہ ابن عابدین شامی، رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِمَا:
ہندوستان، دارُ الاسلام ہی ہے۔ اِلیٰ آخِرِہٖ۔

(۲۳۳و۳۳۳۔ فتاویٰ امجدیہ، جلدِ سوم۔ مطبوعہ دائرۃُ المَعارف الامجدیہ، قصبہ گھوسی، ضلع مئو۔ یوپی)

مذکورہ اُصولی وفقہی حقائق اور اِقتباسات کی روشنی میں
قارئین، اِس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ چکے ہوں گے کہ:
کسی ملک وعلاقہ کے سلطان وحکمراں اور حکومت وسلطنت کے بدلنے اور رہنے، نہ رہنے سے دارُ الاسلام اور دارُ الحرب کے ہونے، نہ ہونے کا کوئی بنیادی تعلق نہیں۔ بلکہ اَحکامِ شریعت کے کسی ملک وعلاقہ میں باقی اور جاری رہنے، نہ رہنے سے ان کا اصل تعلق ہے۔
اور حالات مع شرائط، بدلنے کے بعد ہی کسی ملک وعلاقہ کے
دارُ الاسلام، یا۔ دارُ الحرب ہونے کا فتویٰ اور حکم، صادر کیا جائے گا۔

امام احمد رضا، حنفی، قادری برکاتی، بریلوی نے اپنے فقہی مُوقِف ومُدَّعا کے اِثبات میں دُرَرِ غُرَر وَ جامعُ الفصولین سے، یہ عبارت، نقل کی ہے:
(ترجمہ) دارُ الحرب، اسلامی احکام، جاری کرنے سے، مثلاً:
جمعہ اور عیدَین، وہاں، ادا کرنے پر، دارُ الاسلام بن جاتا ہے۔ اِلیٰ آخِرِہٖ۔ (اَلدُّرَرُ الْغُرَر)
''امام صاحب کے نزدیک، دارُ الحرب کے علاقہ میں اسلامی احکام، جاری کرنے سے دارالاسلام بن جاتا ہے۔ تو جب تک، وہاں، اِسلامی اَحکام، باقی رہیں گے
وہ علاقہ، دارُ الاسلام رہے گا۔ یہ، اِس لئے کہ حکم
جب کسی عِلّت پر مبنی ہو، تو اس کی بقا سے حکم بھی باقی رہتا ہے۔ جیسا کہ معروف ہے۔''
فصولِ عمادیہ، سے منقول ہے کہ:
دارُ الاسلام، جب تک، وہاں اَحکامِ اسلام، باقی رہیں گے تو وہ دارُ الحرب، نہ بنے گا۔ اگر چہ، وہاں، اہلِ اسلام کا غلبہ، ختم ہو جائے۔''
دارُ الاسلام، صرف اِسلامی اَحکام، جاری کرنے سے بنتا ہے۔ تو جب تک، وہاں اسلام کے متعلقات، باقی رہیں گے، وہاں، اسلام کے پہلو کو، ترجیح، دی جائے گی۔''
کوئی علاقہ، اُس وقت تک، دارُ الحرب، نہ بنے گا، جب تک، وہاں کچھ اسلامی اَحکام

باقی ہیں۔ کیوں کہ اسلامی نشانات اور کلمۂ اسلام کے نشانات کو، ہم، ترجیح دیں گے۔''........
دارُ الحرب میں بعض اسلامی احکام کے نفاذ سے دارُ الاسلام بن جاتا ہے۔''
اِلیٰ آخِرِہٖ۔ (جامعُ الفصولین)
اَحکامِ اسلام اور اَحکامِ شرک، دونوں، کسی ملک میں جاری ہوں، تو کیا حکم ہوگا؟
اِس بارے میں امام احمد رضا، یہ صریح فقہی جُزئیہ پیش کرتے ہیں:
(ترجمہ) دُرِّ مُختار کے حاشیۂ طَحطاوِی میں ہے:
قَوْلُہٗ بِاِجْرَاءِ اَحْکَامِ اَھْلِ الشِّرْکِ (اس کا قول کہ اہلِ شرک کے احکام کے اِجرا سے دارُ الحرب بن جاتا ہے) اِس سے مراد، یہ ہے کہ:
وہاں، علانیہ، اَحکامِ شرک، نافذ کیے جائیں اور اہلِ اسلام کا کوئی بھی حکم، نافذ نہ ہو۔
''ہندیہ'' میں یوں ہے کہ:
''اِس سے ظاہر ہے کہ اگر، وہاں، احکامِ شرک اور اَحکامِ اسلام، دونوں نافذ ہوں
تو دارُ الحرب نہ ہوگا۔'' (حاشِیَۃُ الطَّحطَاوِی عَلَی الدُّرِّ الْمُخْتَار)

امام احمد رضا، بریلوی قُدِّسَ سِرُّہٗ نے خالص شرعی وفقہی موقف، اِختیار کرتے ہوئے متحدہ ہندوستان کے دارُ الاسلام ہونے کا فتویٰ دیا
جس سے آپ کی فقہی بصیرت واِصابتِ فکر وموقف،، روزِ روشن کی طرح، واضح وعَیاں ہے۔
ہندوستان کو دارُ الاسلام کہنے کا، یہ مطلب تھا اور آج بھی
اسے دارُ الاسلام سمجھنے اور کہنے کا، یہ صاف وصریح مطلب ہے کہ:
اپنی اسلامی شناخت کے ساتھ، اپنے اسلامی اُصول واَحکام پر عمل کرتے ہوئے
مسلمانانِ ہند یہاں، کل بھی تھے، آج بھی ہیں، اور کل بھی رہیں گے۔ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ تَعَالیٰ۔
اپنا وجود، اپنا تشخص اور اپنی شناخت، ہر حال میں باقی وقائم رکھیں گے۔
اس کے چپے چپے اور وادی وکوہسار پر، ہمارا پورا حق ہے۔
اِس لئے، یہ عزم وحوصلہ اور اِس کا اعلانِ عام ہے کہ:

کبھی شاخ و سبزہ وبرگ پر، کبھی غُنچہ وگُل و خار پر
مَیں، چمن میں چاہے جہاں رہوں، مرا حق ہے فصلِ بہار پر

حضرت شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی کی طرف سے ۱۸۰۳ء کے معاً بعد، یا چند سالوں بعد

متحدہ ہندوستان کے بعض علاقوں کے دارُالحرب ہونے کے جاری شدہ فتویٰ سے
خود، آپ نے بعد کے حالات میں مولوی عبدالحیٔ، بڈھانوی (متوفی ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۸ء) کو
میرٹھ کی ملازمت کی اجازت دے کر، عملاً اپنے موقف کے اندر، تبدیلی پیدا کر لی۔
علاوہ ازیں، اس سے آگے کی تاریخ کا نقشہ، کچھ سے کچھ ہوگیا۔
جسے مندرجہ ذیل تحریروں کے آئینہ میں اچھی طرح دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے:

.........''اِس گئے گذرے زمانہ میں، مدرسہ عالیہ، دیوبند کا وجود
مسلمانوں کے لئے چشمۂ فیضِ رَبّانی کا، کام دے رہا ہے۔
اور سچ پوچھو، تو اس کی بنیاد، ایسے مقدّس ہاتھوں سے رکھی گئی تھی
جنھیں بجُز اِخلاص، حرکت کرنا، حرام تھا۔
اے کاش! مسلمان، اِس سرچشمہ کے آبِ زُلال سے سَیراب ہونے کی خواہش، ظاہر کریں۔
سالِ گذشتہ میں، وہیں کے سرگرم ممبران کی صوابدید سے
''**جَمْعِیَّۃُ الْاَنْصَار**'' کا سلسلہ، جاری ہوا ہے۔ جس کا وجود، اَبرِ رحمت سے کم نہیں۔
لِہٰذا، ہر مسلمان کا فرض ہے کہ مفصَّل قواعد کی ایک کاپی
مہتمم مدرسہ سے طلب کرکے ''**جَمْعِیَّۃُ الْاَنْصَار**'' کی ممبری قبول کریں۔''
ذیل میں مفصَّل قواعد کے ایک ضمیمہ کی نقل، دی جاتی ہے جس سے بقدرِ ضرورت
اِس مجلسِ مبارک کی ضرورت اور عظمت کا ناظرین کو علم ہوسکتا ہے۔ (ایڈیٹر)
ضمیمۂ قواعد و مقاصد۔ ''**اَلْاَنْصَار**، دیوبند۔
''جمعیۃ، گورنمنٹ انگلشیہ کی (جس کے ظِلِّ عاطفت میں ہم، نہایت آزادی کے ساتھ، مذہبی
فرائض، ادا کرتے ہیں۔ اور مذہبی تعلیم کی ترقی کے لئے ہر قسم کی کوشش کر سکتے ہیں۔)
پوری وفادار، رہے گی۔ اور اَنارکِسٹانہ کوششوں کے قلع قمع میں اپنے اثر سے پورا کام لے گی۔''

(ص ۳۸۔ **مجلّہ اَلْھُدیٰ، دیوبند**۔ جلد ۷۔ نمبر ۹۔ ماہِ رجب المرجّب ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء)

''بدقسمتی سے ہند میں مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ، بمب بازی بھی ترقی پر ہے۔
گذشتہ، چند سالوں میں متعدد وَارداتیں ہوئیں۔
لیکن، ان سب میں زیادہ قابلِ نفرت اور امن پسند قلوب کو ہلا دینے والا وہ حادثہ ہے
جس میں ہز ایکسیلنسی، لارڈ، ہارڈِنگ جیسے مہربان و رحم دل وَائسرَائے پر

بوقت شاہی داخلہ، دہلی، ۲۳؍دسمبر ۱۹۱۲ء کو (جو تاریخِ ہند کے نئے دَور کا پہلا دن تھا)
کسی غیر معلوم شخص نے بمب پھینکا اور ہز ایکسیلنسی، وَائسرَائے، سخت زخمی ہوئے۔
دارالعلوم (دیوبند) کے اہلِ شوریٰ، اساتذہ، موجودہ طلبہ، پرانے طلبہ (**جَمْعِیَّۃُ الْاَنْصَار**)
اِس صدمہ کا اثر محسوس کرتے ہیں۔
مولانا محمد احمد صاحب، مہتمم دارالعلوم (دیوبند) نے
دارالعلوم کے تمام دوستوں کی طرف سے اِظہارِ ہمدردی اور غصہ و نفرت کا تار دیا۔
جس کا جواب، نہایت شکریہ آمیز الفاظ میں آیا۔''

(ص ۱۔ **ماہوار رسالہ ''اَلْقَاسِم'' مدرسہ عربیہ، دیوبند**۔ جلد ۳۔ نمبر ۶۔ ماہِ محرمُ الحرام ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء)

''**اخبار ''انجمنِ پنجاب'' لاہور، مجریہ ۱۹؍فروری ۱۸۷۵ء** (بہ حوالہ ص ۳۳۲ و ۳۳۴۔
''**تاریخِ صحافتِ اردو**'' جلدِ دوم (حصہ اول) مؤلّفہ مولانا امداد صابری، دہلوی، مطبوعہ: دہلی)
کے حوالہ سے پروفیسر محمد ایوب، قادری (کراچی)
مدرسہ دیوبند کے ایک معائنہ اور رپورٹ کے بارے میں لکھتے ہیں:
''اِس مدرسہ نے یَوماً فَیَوماً ترقی کی۔ ۳۱؍جنوری ۱۸۷۵ء، بروز یک شنبہ
لیفٹیننٹ گورنر کے ایک خُفیہ انگریز مُعتمد، مسمّٰی ''**پامر**'' نے مدرسہ کو دیکھا
تو اس نے نہایت اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے معائنہ کی چند سطور، دَرجِ ذَیل ہیں:
''جو، کام، بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپیہ کے صَرف سے ہوتا ہے
وہ، یہاں کوڑیوں میں ہو رہا ہے۔
جو، کام، پرنسپل، ہزاروں روپیہ ماہانہ تنخواہ لے کر، کرتا ہے
وہ، یہاں، ایک مولوی، چالیس روپیہ ماہانہ تنخواہ لے کر، کرتا ہے۔
یہ مدرسہ، خلافِ سرکار نہیں، بلکہ مُوافقِ سرکار، مُمِد و مُعاوِنِ سرکار رہے۔'' الخ۔

(ص ۱۷۔۲۱۔ کتاب ''**مولانا محمد اَحسَن نانوتوی**'' مولّفہ: پروفیسر محمد ایوب قادری۔ مطبوعہ: کراچی ۱۹۶۶ء)

○○○

انقلابِ ۱۸۵۷ء میں عُلماے اہلِ سُنَّت کا کردار

سَوَادِاعظم اہلِ سُنَّت و جماعت کی مرکزی درسگاہ، الجامعۃ الاشرفیہ
مبارک پور ضلع اعظم گڑھ، یوپی (انڈیا) کی جماعتِ سابعہ کے طلبہ
ہر سال، یوم مفتیِ اعظمِ ہند (حضرت مولانا الشَّاہ مصطفیٰ رضا، قادری، برکاتی
بریلوی۔ متوفی ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۱ء) کے موقع پر
ملک کی کسی معروف شخصیت کو مدعو کرتے ہیں اور اس کے خصوصی
خطاب سے سبھی طلبہ اور دیگر باذوق و باشعور حضرات، مستفید ہوتے ہیں۔

۲۰۰۷ء میں طلبہ نے حضرت مولانا یٰسٓ **اختر مصباحی**
بانی وصدر دارُالقلم، ذاکرنگر، نئی دہلی کو، مدعو کیا۔
آپ نے اشرفیہ، مبارک پور تشریف لاکر ۲؍فروری ۲۰۰۷ء کی شب میں
"انقلاب ۱۸۵۷ء میں عُلماے اہلِ سنّت کا کردار" کے موضوع پر
طلبہ و اساتذہ کو خطاب فرمایا۔

اِس موضوع کا انتخاب، طلبہ نے ہی کیا تھا۔ کیسٹ سے نقل کر کے
یہ خطاب، حاضرِ خدمت کیا جارہا ہے۔

امید ہے کہ ملک و بیرونِ ملک کے بیدار مغز حلقۂ اہلِ سُنَّت میں
اِس خطاب کے مُشتملات و نِکات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا
اور اس خطاب کی روح کو سمجھ کر، اس کے مطابق، عُلماے اہلِ سُنَّت کچھ اقدام
وعمل کی طرف بھی فوری توجہ، مبذول فرمائیں گے.... **محمد شہاب الدین، مصباحی**
متعلم درجۂ سابعہ الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور

بَعْدَ الْحَمْدِ وَ الثَّنَاءِ وَ الصَّلٰوۃِ وَ التَّسْلِیم۔

اساتذۂ کرام وعزیز طلبہ! میں آپ حضرات کی دعوت پر آپ حضرات کی خدمت میں حاضر ہوا۔ برادرِ مکرَّم، حضرت مولانا محمد احمد، اعظمی، مصباحی صاحب (صدرالمدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور) نے اپنے تعارفی کلمات میں، جو کچھ ارشاد فرمایا، اُسے آپ حضرات نے بغور سنا۔

ایک خاص بات، جو میرے لئے بہت مفید ہے، وہ، یہ ہے کہ:
اپنے خطاب اور طرزِ خطاب سے انھوں نے آپ حضرات کو بتایا اور باور کرادیا کہ:
آنے والے مقرر کی تقریر بھی، میری ہی تقریر کی طرح ہوگی۔"
یہ میرے کام کی بات تھی، جسے میں نے بطورِ خاص، توجہ سے سن کر سمجھ کر
اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا۔

یہاں پر سامنے، پیکٹ کی شکل میں، جو ہدایا و تحائف، نظر آرہے ہیں
وہ، غالبًا، کتابوں کے ہیں۔ جو طلبہ، یومِ مفتیِ اعظم کے اِس مبارک موقع پر مقالات ومضامین لکھ کر، اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے ہیں، انھیں، یہ تحفے، عطا کیے جائیں گے۔

اساتذہ و مدرسینِ کرام نے آپ حضرات کے ذوق وشوق
اور تحریری دل چسپی کے تعلق سے مجھے بتایا کہ:
اِس سال، تحریری مقابلے میں شریک ہونے والے طلبہ کی مجموعی تعداد، پانچ سو چھہتر (۵۷۶) ہے۔ جن میں سے پینتالیس (۴۵) طلبہ، بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے ہیں۔
باقی طلبہ نے بھی محنت سے مقالے لکھے ہیں۔

امید ہے کہ آئندہ سال، باقی ماندہ طلبہ میں، جو طلبہ، مضمون نویسی کے مقابلے میں حصہ لیں گے اُن میں سے، اچھے طلبہ، پینتالیس (۴۵) کی تعداد میں شریک ہوجائیں گے۔ اِنْ شاءَ اللّٰہ۔

اگر، میں، تحریر و مقالہ نویسی کے تعلق سے کچھ باتیں، عرض کروں
تو شاید، وقت، زیادہ ہوجائے گا اور مجھے جو عنوانِ خطاب، دیا گیا ہے
اُس پر بات بہت مختصر ہو پائے گی۔ اِس لئے میں آپ حضرات سے گزارش کروں گا کہ:
اپنے اساتذہ سے اس سلسلہ میں تربیت، حاصل کرتے رہیں۔
ان کی ہدایات پر عمل کرتے رہیں۔ تاکہ آئندہ آپ بھی ایک اچھے صاحبِ فکر و قلم بن سکیں۔

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ''**انقلاب ۱۸۵۷ء میں عُلمائے اہلِ سُنَّت کا تاریخی کردار**'' آپ کا موضوع ہوگا۔ اس پر آپ کچھ تاریخی حقائق، پیش کریں، تاکہ ہمارے طلبہ، انہیں سن کر، جان کر اصل تاریخ سے واقف ہوں اور ان کے اندر، یہ احساس، یہ جذبہ، یہ بیداری، پیدا ہو کہ:

ہم، صحیح تاریخ، دنیا کے سامنے پیش کریں اور بتائیں کہ عُلمائے اہلِ سُنَّت نے قوم کے لئے، ملک و ملّت کے لئے اپنے وطنِ عزیز کے لئے، کتنی عظیم اور تاریخی قربانیاں دی ہیں۔

ایسی عظیم قربانیاں کہ انہیں کے ذریعہ، آج، دینی علمی ادبی تاریخی صحافتی سیاسی تاریخ کا تسلسل ہے۔ اور ہم، اپنے اَبنائے وطن کے سامنے

اپنے اسلاف کی قربانیاں، پیش کر کے، اپنا سر، فخر سے اونچا کر سکتے ہیں۔

عزیز طلبہ! یہ بات، ہمیشہ، ذہن نشیں رکھیں کہ:

آپ کا منصب، آپ کی حیثیت، آنے والے دنوں میں آپ کا مقام اور کام

صرف، یہ نہیں ہے اور نہ، یہ ہونا چاہیے کہ:

ہم، تاریخ پڑھیں، تاریخ سنیں اور دوسروں کو سنائیں۔

بلکہ، آپ کے اندر، یہ حوصلہ ہونا چاہیے، آپ کا، یہ عزم ہونا چاہیے کہ:

ہم، آنے والی تاریخ، خود اپنے ہاتھوں سے ایسی بنائیں کہ:

بعد کی نسل، ہمارے کارناموں اور ہماری خدمات پر فخر کر سکے۔

آپ کا منصب و مقام، صرف تاریخ پڑھنے کا نہیں، بلکہ تاریخ بنانے کا ہے۔

آپ کی حیثیت، حالات کے دھارے میں بہنے کی نہیں ہے۔

بلکہ حالات کا دھارا، اور اس کا رُخ، موڑنے کی ہے۔

یہ اشرفیہ، مبارک پور اور اس کے فرزندانِ گرامی قدر، یہاں سے نکل کر

ہندوستان کے مختلف حصوں میں اور ہندوستان سے باہر، جہاں بھی گئے ہیں

انھوں نے وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر

اپنے اِخلاص واَخلاق، اپنی علمی فکری صلاحیت کی بنیاد پر، ایک گراں قدر نئی تاریخ بنائی ہے۔

چاہے، وہ، یوپی و بہار کی سرزمین ہو، خواہ، ساؤتھ افریقہ کی سرزمین ہو، خواہ، نیپال کی سرزمین ہو، خواہ، کراچی کی سرزمین ہو، خواہ، ہالینڈ کی سرزمین ہو۔

خواہ، انگلینڈ کی سرزمین ہو، خواہ، امریکہ کی، یا۔ آسٹریلیا کی سرزمین ہو۔

ہر جگہ اور ہر طرف، فرزندانِ اشرفیہ کا، مصباحیوں کا

پرچم اور ان کا علم لہراتا ہوا، نظر آتا ہے۔

''**انقلابِ ۱۸۵۷ء**'' ہندوستانی تاریخ کا نہایت خوں چکاں باب ہے۔

تاریخوں میں آپ نے کچھ ضرور پڑھا ہوگا کہ:

انگریز، ہندوستان کے اندر، شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں تاجر کی حیثیت سے آئے۔

لیکن، رفتہ رفتہ، کئی سو سال کی محنت کے بعد، انھوں نے دلی کے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا۔

۱۷۵۷ء میں ''پلاسی'' کی سرزمین پر، نواب سراج الدَّولہ اور انگریزوں کے درمیان جنگ ہوئی، لیکن، کچھ ہندوستانیوں ہی کی غدَّاری سے

نواب، سراجُ الدَّولہ کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اور انگریز، پورے بنگال پر، قابض ہو گئے۔

اس تاریخ کا، صرف، سیاست اور حکومت سے ربط و تعلق نہیں ہے۔

بلکہ مذہب، علم، اخلاق، ساری چیزیں، متأثر ہوئی ہیں ان سے اور ان جنگوں سے۔

انگریزوں کی حکومت، ان کے قبضے اور ان کے اختیار و اقتدار سے بھی

یہ چیزیں، کہیں، متأثر اور کہیں، مغلوب ہوئی ہیں۔

اِس لئے آپ حضرات کو، اس تاریخ سے بھی باخبر رہنا، نہایت ضروری ہے۔

ہندوستان کے شیر دل حکمراں، سلطان ٹیپو کو انگریزوں نے اپنے کچھ زرخرید ہندوستانی حریصوں، ہندوستانی غدَّاروں کی مدد سے ۱۷۹۹ء میں اس شیر دل حکمراں کو زیر کیا۔

اس کے بعد میدانِ جنگ ہی میں اپنے قلعہ کے سامنے، سلطان ٹیپو کو، انگریزوں نے شہید کیا۔

اور انھیں، جب، یقین ہو گیا کہ سلطان ٹیپو، اِس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے

تو، انگریز کمانڈر نے کہا تھا کہ ''**آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔**''

یعنی، آج، صرف، سلطان ٹیپو نے شکست نہیں کھائی ہے۔

بلکہ، ہندوستان نے شکست کھائی ہے اور ہمیں، دلی پر قبضہ کرنے سے، کوئی، روک نہیں سکتا۔

سلطان ٹیپو، وہی شخص ہے، جس کا، یہ مقولہ آپ حضرات نے بارہا سنا ہوگا کہ:

''**شیر کی ایک دن کی زندگی، گیڈر کی صدسالہ زندگی سے بہتر ہے۔**''

یعنی جیو، تو شیر کی طرح جیو، گیدڑ جیسی زندگی، نہ گذارو۔

۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے دلی پر مکمل قبضہ کرلیا۔

لیکن، اُس وقت کے شاہِ عالَم کو فاتح انگریزوں نے محض، ایک پنشن یافتہ سلطان کی حیثیت سے باقی رکھنا، اپنے حق میں مفید سمجھا اور شاہِ عالَم کے اختیارات، انگریزوں نے اتنے محدود کردیے کہ کہاجاتا تھا اور تاریخوں میں، یہ جملہ ملتا ہے کہ "**سلطنتِ شاہِ عالَم از دہلی تا پالَم۔**"

آج کا پالَم ہوائی اڈہ (نئی دہلی) نہایت مشہور ہے۔

اُس وقت، شاہِ عالَم کی سلطنت وحکومت، سمٹ کر، دہلی سے پالَم تک رہ گئی تھی۔

باقی پورے ہندوستان پر عملاً، انگریز، حاکم ہوگئے تھے۔

یہ قبضہ، یہ تسلسل، جاری رہا، تاآں کہ مئی ۱۸۵۷ء میں بعہدِ بہادر شاہ ظفر، میرٹھ میں دس مئی کو کچھ ہندوستانی فوجیوں نے بغاوت کی اور اس کے بعد، دہلی سے لکھنؤ تک، زبردست جنگ ہوئی۔

تقریباً، ساڑھے چار مہینے تک جنگ ہوئی دہلی میں، جس میں شکست (۱۹ر ستمبر ۱۸۵۷ء) کے بعد دہلی کے تخت وتاج پر، برطانیہ کی مکمل حکومت ہوگئی۔

"**ایسٹ انڈیا کمپنی**" کا نام بھی ختم ہوگیا۔

اور اس کی جگہ، براہِ راست، ملکۂ برطانیہ کی حکومت، قائم ہوگئی۔

۱۸۵۷ء کی تاریخ کا خلاصہ، یہ ہے اور یہی، درحقیقت، ملکی وعوامی جنگِ آزادی کی صحیح تاریخ ہے۔

اور بہادر شاہ ظفر، ایسے سنّی حنفی حکمراں اور خوش عقیدہ مسلمان تھے کہ:

میلاد وقیام وغیرہ کے تعلق سے حضرت علاّمہ فضلِ رسول، عثمانی، بدایونی سے باضابطہ انھوں نے اِستفتا کیا تھا۔

اور علاّمہ فضلِ رسول، بدایونی نے، اس اِستفتا کا تحریری جواب دیا۔

جس کی طباعت واِشاعت، مطبع مفیدُ الخلائق، دہلی سے ۱۲۶۸ھ میں ہوئی۔

جو "**اکمل التاریخ**"، مطبوعہ بدایوں کی جلدِ دوم کے اندر، موجود ہے۔ مع مکمل سوال وجواب۔

اسی طرح، بہادر شاہ ظفر نے، سلطانُ الہند، حضرت خواجہ معین الدین، چشتی، اجمیری رَضِیَ اللّٰہُ عَنہُ کی شان میں ایک بہت ہی شاندار اور بہت ہی ایمان افروز منقبت لکھی ہے۔

وہ منقبت پڑھ کر، سن کر، روح، وَجد میں آجاتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ:

عہدِ حاضر کا کوئی سنّی شاعر، حضرت خواجہ غریب نواز کی منقبت خوانی کررہا ہو۔

یا معین الدین چشتی، دست گیری، لازم ست۔

یہ بہادر شاہ ظفر، آخری مغل حکمراں تھے اور بزرگوں سے، یہ بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔

سنّی حنفی حکمراں تھے۔ اَعراسِ بزرگانِ دین میں شرکت، کرتے تھے۔

عُلمائے اہلِ سنّت سے ان کا رابطہ، قوی تھا۔ یہ ایک پہلو ہوا، حکومت اور اِقتدار کے لحاظ سے۔

عزیز طلبہ! آپ، تاریخ پڑھیے۔ دہلی کے صدرُ الصُّدور، حضرت علاّمہ فضلِ امام خیرآبادی، جو حضرت علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی کے والدِ محترم ہیں۔

جن کی کتاب "مرقات" کے نام سے منطق کی مشہور کتاب ہے۔

اور اسے درس کے اندر آپ پڑھتے ہیں۔

یہ دہلی کے صدرُ الصُّدور تھے اور ان کے بعد، ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے، آپ کے شاگردِ رشید حضرت مفتی صدرُ الدین، آزردہ، دہلوی، صدرُ الصُّدور ہوئے اور ان کی صدارت کی پوری مدت تقریباً، پندرہ سال تک تھی، یعنی، پندرہ سال تک، دہلی کے صدرُ الصُّدور رہے۔

(۱۸۲۷ء سے ۱۸۵۷ء تک، صدر امین وصدرُ الصُّدور دہلی۔ جون ۱۸۴۴ء میں دہلی کے صدرُ الصُّدور بنائے گئے تھے۔ اور ستمبر ۱۸۵۷ء تک اپنے منصب پر، برقرار رہے)

ان کی حیثیت یہ تھی کہ دہلی کے سارے اُدَبا، فُضَلا، شُعَرا

ان کے دولت کدے پر حاضر ہوتے تھے اور ان سے اِستفادہ کرتے تھے۔

اور دہلی کے سارے اصحابِ علم وفضل، براہِ راست، ان سے وابستہ تھے۔

مفتی صدرُ الدین آزردہ اور علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی، یہ دونوں، ہم سبق ساتھی تھے۔

اور علاّمہ فضلِ امام، خیرآبادی کے معقولات میں

اور شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی کے منقولات میں شاگرد تھے۔

مفتی آزردہ کا مسلک جاننے کے لئے، آپ ان کی مشہور کتاب

"مُنتَھیٰ الْمَقال فِی شَرحِ حَدِیثِ لَاتُشَدُّ الرِّحَال" کا مطالعہ کریں۔

یہ آپ کی کتاب ہے، جو آپ نے عربی وفارسی میں لکھی ہے۔

اور تقریباً، بیس (۲۰) سال پہلے، اس کا اردو ترجمہ، کراچی سے شائع ہو چکا ہے۔

یہ کتاب، میں نے خود پڑھی ہے، جس کے شروع میں، تمہید میں، آپ لکھتے ہیں کہ:

''اِس وقت، ایک جماعت، پیدا ہوگئی ہے، جو، ائمۂ مجتہدین پر، طَعْن و تَشْنیع کرتی ہے۔
اور اولیاے امّت کے خلاف، انگشت نمائی کرتی ہے۔''

اس سے، سیدھا سیدھا اشارہ آپ کا، فرقۂ وہابیہ کی طرف ہے۔

اور جو مباحث ہیں، ان مباحث کے اندر، آپ نے واضح طور پر ''ابنِ حزم ظاہری'' اور ''ابنِ تیمیہ حرّانی'' کا نام لے کر، ان کی تنقید و مذمّت کی ہے۔ ان کے مسلک کی مذمّت کی ہے۔

اِس **مُنْتَہیٰ الْمَقال** پر حضرت علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی و حضرت مفتی محمد سعدُ اللہ، مرادآبادی کی تحریری تصدیق (بزبانِ عربی) بھی، مطبوع و موجود ہے۔

''**اِمتناعِ نظیرِ محمدی**'' کے موضوع پر بھی مفتی آزردہ کی ایک تحقیقی کتاب کا مخطوطہ حکیم محمود احمد، برکاتی، ٹونکی (کراچی) کے ذاتی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

یہ حضرت آزردہ، بڑے جلیلُ القدر اور عظیم عالم و فاضل تھے۔ اور ان کا ذاتی کتب خانہ اُس زمانہ میں اتنا زبردست تھا کہ تین لاکھ (۳۰۰۰۰۰) روپے کی کتابیں، اپنی ذاتی آمدنی سے انھوں نے جمع کی تھیں۔ جنھیں ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں انگریزوں نے برباد کر دیا۔

پھر، آپ نے جولائی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف، فتواے جہاد پر، دستخط کیا تھا۔

جس کی پاداش میں آپ کی ساری جائداد، ضبط ہوگئی۔

بعد میں مقدمہ چلا۔ آپ، لاہور چلے گئے، پھر، واپس، دہلی آئے۔

اور جتنی جائداد، غیر منقولہ تھی، وہ سب کی سب، ضبط ہوگئی۔ تھوڑی سی چیز، واپس ملی۔

سیاسی حکومت و اِقتدار کے لحاظ سے اُس وقت، جو مرکز تھا، وہ بھی سنّی حنفی تھا۔

اور اس زمانے کا، جو صدرُ الصُّدور تھا، وہ، بھی سنّی حنفی تھا۔

حضرت مفتی صدرالدین آزردہ اُس وقت کے عُلما کے مرجع تھے۔ دہلی سے آگرہ و اَوَدھ تک کے عُلما، حضرت مفتی صدرالدین آزردہ کو، نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

طبقۂ عُلما میں جنگی لحاظ سے انقلابِ ۱۸۵۷ء میں سب سے زیادہ جس نے دادِ شجاعت دی اس کا نام ہے: **مولانا سید احمدُ اللہ شاہ، مدراسی۔**

سلطان ٹیپو کی فوج میں ان کے والد، بہت بڑے عہدیدار اور اپنے علاقہ کے نواب تھے۔

آپ، ان کے صاحبزادہ ہیں۔ اور میر قربان علی شاہ، جے پوری، ایک بزرگ تھے، جن سے سلسلۂ چشتیہ میں بیعت ہیں۔ پھر، ان کے بعد، یہ طالب ہوئے محراب علی شاہ قلندر، گوالیاری سے سلسلۂ قادریہ میں۔ جنھوں نے روحانی بیعت کے ساتھ، یہ بھی بیعت لی کہ:

انگریزوں کے خلاف، تم جہاد کرنا اور انہیں اِس ملک سے نکال باہر کر دینا۔''

مولانا احمدُ اللہ شاہ، مدراسی، ۱۸۴۶ء میں دہلی آئے۔

اور حُرّیت و استخلاصِ وطن کی مُہم جوئی و ماحول سازی اور کامیابی کے لئے مفتی صدرالدین، آزردہ سے ملاقات کی۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ:

اِس کام کے لئے سب سے بہتر جگہ، آگرہ ہے۔

اس زمانے میں ممالکِ متحدہ اَوَدھ و آگرہ کے نام سے آج پورے صوبہ یوپی کا یہ علاقہ، جانا جاتا تھا۔ آگرہ، صدر مقام تھا۔ جیسے لکھنؤ، اِس وقت، صدر مقام ہے۔

مفتی صدرُالدین آزردہ نے مولانا احمدُ اللہ شاہ مدراسی کو آگرہ بھیجا اور صرف بھیجا ہی نہیں بلکہ تعارفی مکتوب بھی لکھا، مولانا انعام اللہ، گوپامئوی کے نام۔ جس میں کچھ اس طرح، تحریر فرمایا کہ:

مولانا مدراسی کی جتنی مدد ہو سکے، آپ لوگ، مدد کریں۔''

آگرہ میں مولانا احمدُ اللہ شاہ، مدراسی نے بہت جَم کر کام کیا۔

دینی و تبلیغی کام بھی کیا اور جہاد کے لئے بھی لوگوں کو آمادہ کیا۔

اور اس زمانے میں آگرہ، چوں کہ مرکز تھا، اِس لئے بہت بڑے بڑے عُلما وہاں پر جمع تھے۔ بہت بڑے بڑے اُدَبا و شُعَرا، وہاں پر جمع تھے۔

حضرت مولانا فیض احمد عثمانی، بدایونی بھی وہاں پر تھے۔ حضرت غلام امام شہید، جو بہت بڑے عاشقِ رسول اور نعت گو شاعر ہیں، وہ بھی تھے۔ ڈاکٹر وزیر خاں، اکبرآبادی، مولانا سید محمد قاسم، داناپوری، اِس طرح کے بہت سارے عُلما تھے۔ ان سب کو آپ نے آمادۂ جہاد کیا **اور ''مجلسِ عُلما'' قائم کر کے، اس کے ذریعہ، حُریت پسند حضرات کو منظم کیا۔**

اور ایک بہت بڑا واقعہ، اُس زمانے میں یہ ہوا کہ:

۱۸۵۴ء میں پادری فنڈر اور عُلماے اہلِ سنّت کے درمیان، مناظرہ ہوا۔

مولانا رحمتُ اللہ، کیرانوی، مناظرِ اوّل تھے۔ مولانا ڈاکٹر وزیر خاں، اکبرآبادی

اورحضرت مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی، یہ حضرات، معاون مناظر تھے۔

آپ حضرات، ان سارے عُلَما کی تاریخ پڑھیں گے، تو معلوم ہوگا کہ:

یہ سارے کے سارے عُلَما، خالص سُنّی حنفی تھے۔ اور حضرت مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی توعلاّمہ فضلِ رسول، بدایونی کے بھانجے ہیں۔ اور بھانجہ ہونے کے ساتھ ساتھ، آپ اپنے نانا سے سلسلۂ عالیہ قادریہ برکاتیہ میں بیعت بھی ہیں۔

اوران کے نانا (حضرت مولانا شاہ عینُ الحق عبدالمجید، عثمانی، بدایونی)

حضرت سید شاہ آلِ احمد، اچھے میاں، قادری، برکاتی، مارہروی رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ کے چہیتے مرید اور مقرَّب ترین خلیفہ تھے۔

اس وقت، آگرہ کے جو بھی ممتاز عُلَما تھے، ان میں سے اکثر حضرات

۱۸۵۴ء میں آگرہ کے اندر، جمع تھے۔

پھر، مئی ۱۸۵۷ء میں، جب دہلی کے اندر، جنگ، شروع ہوئی، جنگ پھیلی

تو پوری مذہبی قیادت، ان عُلَمائے کرام نے کی

اور جہاد کی روح پھونکنے کی ذِمّہ داری ان سبھی حضرات نے انجام دی۔

جن میں سے حضرت مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی کے بارے میں آپ، جان چکے ہیں۔

دہلی کے اندر، ساڑھے چار ماہ کی جنگ ہوئی۔

جس میں جنرل بخت خان روہیلہ اور علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی، وغیرہ نے قائدانہ کردار ادا کیا۔

عزیز طلبہ! اب، آپ، یہاں پر، توجہ فرمائیں کہ:

۱۸۵۷ء کی پوری جنگ، جو لڑی گئی، وہ، دلی میں لڑی گئی۔

اس کے بعد ''روہیل کھنڈ'' (بریلی و پیلی بھیت و مرادآباد و بدایوں و شاہجہاں پور وبجنور، وغیرہ) میں لڑی گئی۔ الٰہ آباد و کان پور و لکھنؤ میں لڑی گئی۔

دلی کا پورا محاذ، دلی کے سُنّی عُلَما اور سپہ سالاروں نے سنبھالا اور ساری کمان ان کے ہاتھ میں تھی۔ بریلی میں خان بہادر خاں کی قیادت میں انگریزوں سے جنگ لڑی گئی جو، حافظ رحمت خاں روہیلہ (شہید و مدفون بریلی) کے پوتا تھے۔

اور حافظ رحمت خاں روہیلہ، صرف ایک سپہ سالار نہیں تھے، سُنّی حنفی مجاہد اور متبعِ شریعت بھی تھے۔

مجھے، اچھی طرح یاد ہے کہ حافظ ملت عَلَیْہِ الرَّحْمَۃُ وَ الرِّضْوَان (حضرت مولانا الشّاہ عبدالعزیز، مرادابادی، محدِّث مبارک پوری، بانیِ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور اعظم گڑھ، یوپی) جب طلبہ کو خطاب کرتے تھے۔ نماز کی پابندی کی نصیحت فرماتے تھے تو، حافظ رحمت خاں روہیلہ کا خصوصیت سے ذکر فرماتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ:

عین حالتِ جنگ میں بھی، حافظ رحمت خاں روہیلہ، جماعت کے ساتھ، نماز پڑھتے تھے۔

ان کے یہ پوتے تھے: خان بہادر خاں، روہیلہ۔

اوران کے معاون مفتی تھے، حضرت مفتی عنایت احمد، کاکوروی۔

جن کی ''**تواریخ حبیب اِلٰہ**'' و ''**علم الصیغہ**'' وغیرہ، آپ حضرات نے پڑھی ہوگی۔

علم الصیغہ داخلِ درس ہے، اِس لئے آپ میں سے اکثر حضرات نے، یہ کتاب پڑھی ہوگی۔

انگریزوں نے ایک فتویٰ پر آپ کے دستخط کی بنیاد پر جرمِ بغاوت میں

آپ کو ''**کالا پانی**'' کی سزا دی تھی۔

پھر، شہزادہ، فیروز شاہ، بریلی کے اندر تھا۔ جب، حج سے واپس آیا۔

اور انوکھی بات، یہ ہے کہ تمام سلاطینِ مغلیہ اور ان کے شہزادوں میں

صرف، شہزادہ فیروز شاہ ایسا تھا، جس نے حج کیا تھا۔

اس سے پہلے، یا اس کے بعد کسی بھی معروف مغل شہزادہ کے حج کا کوئی ذکر نہیں۔

اس دَور کا شہزادہ فیروز شاہ، مالوہ، اندور، آگرہ، متھرا، دھولپور، ہوتا ہوا دلی پہنچا۔

اس کے بعد، بریلی اور پھر، شاہجہاں پور میں اس نے پڑاؤ ڈالا۔

روہیل کھنڈ کا، یہ علاقہ، جو اِس وقت ہے، اس میں بریلی، شامل ہے۔ مرادآباد، شامل ہے۔ بدایوں، شامل ہے۔ شاہجہاں پور، شامل ہے۔

روہیلہ پٹھانوں کی اُس زمانے میں آبادی، یہاں، زیادہ تھی۔

اِس لئے اس پورے علاقہ کو، روہیل کھنڈ کہا جانے لگا۔

آج بھی وہاں اس علاقہ میں سنّیوں کی غالب اکثریت ہے۔

۱۸۵۷ء میں تو شاید باید، کوئی وہابی، اس علاقہ میں مشکل سے ملتا ہوگا۔

پیلی بھیت، مرکز تھا، جہاں کی جامع مسجد، حافظ رحمت خاں روہیلہ کی بنوائی ہوئی ہے۔

اور آپ حضرات نے تاریخ میں یہ بھی پڑھا ہوگا کہ:

فقیہِ اسلام، امام احمد رضا، قادری، برکاتی، بریلوی بھی افغانی تھے۔

بھڑیچ خاں قبیلہ سے ان کا تعلق تھا، اور، اوپر جا کر، روہیلہ سے اس کا رشتہ مل جاتا ہے۔

اور ''مسجد بی بی جی'' جو بریلی شریف کے اندر ہے۔ جہاں، اِس وقت، مفتیِ اعظم ہند (مولانا الشّاہ محمد مصطفیٰ رضا، قادری، برکاتی، بریلوی متوفی ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۱ء) کا دارُ العلوم مظہرِ اسلام، قائم ہے۔

امام احمد رضا، قادری، برکاتی، بریلوی نے جب ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء میں منظرِ اسلام، قائم کیا تو پہلے باضابطہ مدرسہ کی شکل میں تعلیم، اِسی مسجد بی بی جی، بہاری پور (بریلی) میں شروع ہوئی۔

یہ مسجد بھی حافظ رحمت خاں روہیلہ کے گھر کی کسی نیک خاتون کے نام سے موسوم ہے۔

انھوں نے اس کی تعمیر کرائی تھی اور ابھی تک اس کا نام ''مسجد بی بی جی'' ہی ہے۔

یہ، جو، روہیل کھنڈ کا علاقہ تھا، سب سے زبردست اور خون ریز جنگ، اسی علاقہ میں ہوئی تھی۔

اور یہاں، جتنے بھی عُلما تھے، سب کے سب، سنّی حنفی عُلمائے کرام تھے۔

جن کی کمان میں جنگ آزادی لڑی گئی۔ حضرت مفتی عنایت احمد، کاکوروی وحضرت مولانا رضا علی، بریلوی کی سرپرستی و پشت پناہی، بریلی کے مجاہدین کو حاصل تھی۔

امام احمد رضا، قادری، برکاتی، بریلوی کے حقیقی دادا، مولانا رضا علی، بریلوی

فنِ شاعری میں حضرت مفتی صدرُ الدین، آزردہؔ، دہلوی کے شاگرد تھے۔

مولانا رضا علی، بریلوی کے ایک چہیتے اور بہادر شاگرد، مولانا فخر الدین، جو سندیلہ، ہردوئی کے باشندے تھے، وہ، انگریزوں سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوگئے بریلی میں۔

درجنوں گھوڑے، مولانا رضا علی، بریلوی کے

انگریزوں کے خلاف لڑنے والے مجاہدین کے لئے، وقف تھے۔

علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی سے ۱۸۵۵ء مولانا سید احمد اللہ شاہ، مدراسی نے لکھنؤ میں ملاقات کی۔ باضابطہ، تفصیلی گفتگو ہوئی۔ جنرل بخت خاں نے دہلی میں آپ سے ملاقات کی۔

بہادر شاہ ظفر سے لال قلعہ (دہلی) میں مشورے ہوئے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ، دِلی سے لکھنؤ تک لڑی گئی اور اس جنگ کی قیادت

عُلمائے اہلِ سنّت نے کی۔

علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی کے بارے میں آپ حضرات نے پڑھا بھی ہوگا، عُلما کی زبانی سنا بھی ہوگا۔ آپ کی مشہور کتاب ''تَحقِیقُ الْفَتوىٰ فِی اِبطالِ الطَّغوىٰ'' ہے۔

اس کے علاوہ، داستانِ انقلاب پر مشتمل ایک منظوم عربی رسالہ ''اَلثَّورَۃُ الْھِندِیَّۃ'' ہے جس کا اردو ترجمہ بقلم مولانا عبد الشاہد، شیروانی، علی گڑھی ''**باغی ہندوستان**'' کے نام سے بجنور ولاہور اور المجمع الاسلامی، مبارک پور سے شائع ہوتا رہا ہے۔

''**اِمتِنَاعُ النَّظِیر**'' بھی، علاّمہ کی ایک بے نظیر کتاب ہے۔

ان کتابوں سے ان کا مذہب ومسلک اور ان کی عظمت وفضیلت

دودو چار کی طرح، واضح ہے۔

علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی نے جامع مسجد، دہلی میں انگریزی اِقتدار کے خلاف

۱۸۵۷ء میں تقریر کی اور جہاد کا فتویٰ دیا۔

جس کے نتیجے میں، دہلی کے اندر، نوے ہزار فوجی اور مجاہدین، جمع ہوگئے۔

حضرت مولانا سید کفایت علی، کافیؔ، مرادآبادی، رَحمَۃُ اللّٰہِ عَلَیہِ

جلیل القدر عالم وعاشقِ رسول اور نعت گو شاعر ہونے کے ساتھ، بہت بڑے قائد ومجاہد تھے۔

مرادآباد میں مجاہدین کی آپ نے قیادت کی۔

اور ۱۸۵۸ء میں گرفتاری ونمائشی مقدمہ کے بعد، آپ کو پھانسی کی سزا ہوئی۔

یہ اتنے بڑے عاشقِ رسول اور نعت گو شاعر تھے کہ:

تختۂ دار کی طرف آپ جس وقت جا رہے تھے، اُس وقت بھی آپ کے لبوں پر ترانۂ نعت جاری تھا اور یہ اشعارِ نعت گنگناتے ہوئے، تختۂ دار پر چڑھ گئے:

کوئی گُل باقی رہے گا، نَے چمن رہ جائے گا
پر رسول اللہ کا، دینِ حَسَن رہ جائے گا
ہم صفیرو! باغ میں ہے، کوئی دَم کا چہچہا
بلبلیں اُڑ جائیں گی، سونا چمن رہ جائے گا
اَطلس و کمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو
اِس تنِ بے جان پر، خاکی کفن رہ جائے گا

جو پڑھے گا صاحبِ لولاک کے اوپر درود
آگ سے محفوظ اُس کا، تن بدن رہ جائے گا
سب فنا ہوجائیں گے کافؔی و لیکن حشر تک
نعتِ حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا

مولانا سید کفایت علی، کافؔی مرادآبادی، اتنے بڑے عاشقِ رسول تھے
اتنے بڑے شاعرِ نعت تھے کہ تختۂ دار پر جاتے ہوئے بھی نعتِ رسول، گنگنا رہے تھے۔
تو، یہ پوری تاریخ، اہلِ سُنَّت وعُلماے اہلِ سنّت کی قربانیوں سے بھری ہوئی ہے۔
صرف ۱۸۵۷ء کی نہیں، بلکہ اس سے پہلے کی اوراس کے بعد کی بھی۔
اگر، میں، یہ تاریخ، بیان کروں، تو پوری رات گذر جائے گی۔
لیکن، میں نے صرف چند پہلوؤں کی طرف، نشان دِہی کی ہے۔
آپ حضرات اور ہم سب کی ذِمّہ داری ہے کہ:
صحیح تاریخ، دنیا کے سامنے پیش کریں اور بتائیں کہ:
ہندوستان کے مسلمانوں کی قیادت، ہم نے کی ہے۔
اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے خون کے قطرات، ہم نے بہائے ہیں۔
میدانِ جنگ میں تیروسنان کے مقابلے کی، جب بھی ضرورت پیش آئی ہے
تو ہم نے اپنا سینہ، پیش کیا ہے۔
اگر، کوئی نام نہاد مؤرخ، ہماری خدمات اور قربانیوں کو نظرانداز کرتا ہے۔
تاریخ بدلتا ہے۔ تاریخ کا چہرہ، مَسخ کرتا ہے۔ تو یہ اس کی بدبختی ہے۔
اور تاریخ کے ساتھ، وہ انصاف نہیں کررہا ہے بلکہ تاریخ کے ساتھ، ظلم کررہا ہے۔
۱۸۵۷ء کی پوری تاریخ، ہمارے عُلماے اہلِ سنّت کی قربانیوں سے بھری ہوئی ہے۔
اور دلی سے لے کر، روہیل کھنڈ تک، روہیل کھنڈ سے لے کر لکھنؤ تک، اوراس کے بعد جب انگریز اپنے مکروفریب کے ذریعہ، اپنی طاقت وقوت کے ذریعہ، مجاہدین پر غالب آگئے اور کچھ ہندوستانیوں کی نااہلی وغداری کی وجہ سے انہیں شکست وناکامی سے دوچار ہونا پڑا تو اکثر مجاہدین اور عُلماے کرام، شاہجہاں پور میں جمع ہوئے اور قصبہ محمدی (شاہجہاں پور)

ایک جگہ ہے، وہاں، مولانا سید احمد اللہ شاہ، مدراسی وغیرہ نے باضابطہ ایک مسلم حکومت، قائم کی۔
مولانا فیضِ احمد، بدایونی، مولانا وزیر خاں، اکبرآبادی، وغیرہ
اَرکانِ دولت وسلطنت، منتخب ہوئے۔
لیکن! وہاں بھی بعض غداروں کی وجہ سے میدان، ہاتھ سے نکل گیا اوراس کے بعد شہزادہ فیروز شاہ وجنرل بخت خاں ومولانا فیضِ احمد، عثمانی، بدایونی اوراِس طرح کے بہت سارے قائدین ومجاہدین، یہاں سے نکل کر، نیپال چلے گئے۔
اور پھر، اس کے بعد، ان میں سے اکثر کے بارے میں معلوم نہیں ہوسکا کہ:
کب؟ کیسے؟ کہاں؟ ان کا انتقال ہوا؟
البتّہ، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی ''قصبہ محمدی'' اوراس کے آس پاس کے ایک راجہ، بلدیو سنگھ کے فریب وغدر و بدعہدی کی وجہ سے جون ۱۸۵۸ء کے معرکۂ محمدی میں ہی شہید ہوگئے تھے۔
مولانا فیضِ احمد، بدایونی کے بارے میں، میں نے پڑھا ہے۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ:
حضرت علاّمہ فضلِ رسول، بدایونی نے بہت تلاش کیا آپ کو۔ کیوں کہ سگے بھانجے تھے۔
آپ کی تلاش میں صرف ہندوستان نہیں، بلکہ آپ کی تلاش میں قسطنطنیہ، ترکی تک، آپ گئے۔
لیکن، آپ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اور خدا جانے
کب؟ کیسے؟ کس عالم میں اور کہاں؟ آپ کا انتقال ہوا؟
عزیز طلبہ! یہ ہندوستانی تاریخ کی خون ریز جنگ (۱۸۵۷ء) علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی مفتی صدرُالدین، آزردہ، دہلوی، تلامذۂ حضرت شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی و حضرت علاّمہ فضلِ امام خیرآبادی کی دینی قیادت میں اور مولانا سید احمدُ اللہ شاہ، مدراسی وجنرل بخت خاں وشہزادہ فیروز شاہ وخان بہادر خاں روہیلہ کی فوجی کمان میں لڑی گئی۔ اور یہ سب کے سب، سُنّی صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔
ہمارا سلسلۂ ذکر وفکر اور سلسلۂ تعلیم، خیرآبادی عُلما سے اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی سے مذکورہ حضرات کے ذریعہ، ملتا ہے اور یہ حضرات، انہیں سے وابستہ تھے۔
مفتی صدرُالدین، آزردہ، دہلوی، حضرت شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی اور علاّمہ فضلِ امام خیرآبادی کے شاگرد تھے۔ حضرت علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی، شاہ عبدالعزیز اور اپنے والد دونوں کے شاگرد تھے۔ ہم اہلِ سُنَّت اور اِس وقت کے جوعُلماے کرام ہیں

ان کا سلسلۂ تلمذ بھی حدیث کا، حضرت شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی سے ملتا ہے
اور معقولات کا، حضرت علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی سے ملتا ہے۔
جو آگے چل کر عُلماے فرنگی محل لکھنؤ سے مل جاتا ہے۔
تو، یہ سلسلہ، جو اُس وقت، جاری ہوا، دینی، علمی اور روحانی شکل میں
وہ، اب بھی جاری ہے اور ہم اسی کے وارث اور جانشیں ہیں۔
عزیز طلبہ! تقریباً، دوسو سال کی تاریخ ایسی لکھی گئی ہے کہ:
عُلماے اہلِ سنّت کے کردار کو فراموش کرنے، یا۔ داغ دار بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔
اب، ہمارا، آپ کا فرض ہے کہ اس تاریخ کو درست کریں۔
سب سے پہلے، تاریخ کو سمجھیں سمجھائیں، پوچھیں، پڑھیں، تحقیق کریں اور اس کے بعد
اس تاریخ کو درست کریں اور دنیا کے سامنے پیش کریں کہ ہم، یہ ہیں اور ہمارا یہ کام ہے۔
عزیز طلبہ! اس تاریخ کی شکل، بگڑ جانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ:
ہمارے عُلماے اہلِ سُنّت، چوں کہ نہایت مخلص تھے اور ان کا جو بھی کام ہوتا تھا
وہ دین کے لئے، علم کے لئے، اپنی قوم، ملک، اور وطن کے لئے ہوتا تھا۔
جسے، نمایاں کرنا، اس کی نمائش کرنا، عُلماے اہلِ سُنّت کا مطمحِ نظر، نہیں تھا۔
اس لئے جو کام کیا، کیا، اِس کے بعد بھول گئے۔
عموماً، اسے ضبطِ تحریر میں لانے کی ضرورت، نہیں سمجھی۔
ان کے برعکس، دیگر عُلما کا نظریہ، کچھ اس طرح تھا کہ:
جو کام ہے تھوڑا بہت، وہ تو ہے ہی، جو کام اپنا نہیں ہے، اسے بھی زیادہ سے زیادہ نمایاں
کیا جائے، پھر، اس کو بھی اپنے کھاتے میں ڈال کر، دنیا کے سامنے پیش کیا جائے کہ:
ہم نے، یہ کارنامہ، انجام دیا۔ ہم نے، یہ تیر مارا۔ وغیرہ وغیرہ۔
اُس وقت کے عُلماے اہلِ سُنّت کا اِخلاص، ان کا جذبہ، بخیر تھا۔ نیت، صالح تھی۔
اللہ تعالیٰ کے یہاں، اس کا اجر، انہیں یقیناً ملے گا، یا ملا ہوگا۔
لیکن، ہم، چوں کہ ان کے وارث ہیں، جانشین ہیں، اِس لئے آج کے حالات میں
ہماری یہ ذِمّہ داری ہے کہ ہم، اس تاریخ کو، دنیا کے سامنے، پیش کریں۔

اور یہاں پر، میں اپنے عزیز طلبہ سے یہ کہنا چاہوں گا کہ:
ان میں سے بعض حضرات کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہوگا۔
اگر چہ میں نے اِخلاص اور نیک نیتی کے حوالہ سے، اس کا جواب دے دیا ہے کہ:
یہ کمی، کیوں رہ گئی کہ تاریخ، ہم نے صحیح طور پر، نہیں پیش کی؟
تو بجائے اس کے، ہم میں سے ہر شخص کو خود، یہ سوچنا چاہیے کہ:
کیوں رہ گئی خود، ہم سے تاریخ نویسی؟ کیوں نہ ہو سکی ہم سے تاریخ نویسی؟
اس پہلو پر غور کریں کہ اب، یہ کمی، نہیں رہنی چاہیے۔
اور اس تاریخ کی یہ کمی، دور کرنا اور اسے درست کرنا، ہماری ذِمّہ داری ہے۔ ہمارا کام
ہے۔ ہمارا فریضہ ہے۔ تو، یہ احساسِ ذِمّہ داری، ہم اپنے اندر، پیدا کریں۔ شعور، بیدار کریں۔
اور جو کمی رہ گئی، اس پر، غیر ضروری تنقید و تبصرہ کرنے، نکتہ چینی کرنے کی بجائے
اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کریں۔
اپنے باپ سے اپنے استاذ سے، یا کسی بڑے سے، اگر کوئی کمی کوتاہی، نظر آ جاتی ہے
تو اس کو، بار بار اور جگہ جگہ، بیان نہیں کیا جاتا۔ اس کی تشہیر، نہیں کی جاتی۔
اپنے باپ، یا استاذ، یا بڑے کو، مورِدِ الزام، نہیں ٹھہرایا جاتا ہے۔
بلکہ اس کمی کو لائق بیٹا اور لائق بھائی، سعادت مند وارث اور سعادت مند آدمی
اپنی محنت سے دور کرتا ہے۔ اپنے باپ کا اپنے بھائی کا اپنے بڑوں کا نام، روشن کرتا ہے۔
یہی شیوہ، ہمارا بھی ہونا چاہیے۔
جن عُلماے کرام کے نام، میں نے آپ کے سامنے، پیش کیے ہیں۔ مثلاً:
حضرت مفتی صدرالدین، آزردہ، دہلوی و حضرت علاّمہ فضلِ حق، خیر آبادی
و حضرت مفتی عنایت احمد، کاکوروی و حضرت مولانا سید کفایت علی، کافیؔ، مرادآبادی۔ وغیرھُم۔
مولانا فیض احمد، بدایونی و مولانا رحمت اللہ، کیرانوی، وغیرھُم۔
ان کے حالات، کہیں مختصر، کہیں، معمولی تفصیل کے ساتھ، کتابوں میں ملتے ہیں۔
ان کے حالات کو ہمیں جاننا چاہیے اور اپنی تقریر، اپنی تحریر کے اندر، ان کا ذکر و بیان کرنا چاہیے۔
عزیز طلبہ! اب، دوسروں کی تاریخ نگاری اور تاریخ کے ساتھ، مذاق کرنے کا یہ انداز ہے۔

یہ طریقہ ہے کہ ایک بزرگ عالمِ دین، جو اُس زمانے میں مجاہدِ آزادی بھی تھے:

مولانا رحمتُ اللہ کیرانوی، جن کا ذکر ہو چکا ہے۔

۱۸۵۷ء میں، دہلی پر، انگریزی قبضہ و اقتدار کے بعد

جب، گرفتاری کا سلسلہ، شروع ہوا، تو آپ ۱۸۵۸ء میں مکہ مکرّمہ کو ہجرت کر گئے۔

مدرسہ دیوبند ۱۸۶۶ء میں قائم ہوا۔

جس کے قیام سے آپ، آٹھ (۸) سال پہلے، ہندوستان چھوڑ چکے تھے۔

لیکن، ایک عرب مؤرخ لکھتا ہے کہ:

مولانا رحمتُ اللہ کیرانوی، دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور وہاں کے فارغُ التحصیل تھے۔

یعنی، جس ادارے کے قیام سے، آٹھ (۸) سال پہلے، مولانا رحمت اللہ، کیرانوی
ہندوستان چھوڑ چکے تھے، اُس کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ ہیں۔

فرضی تاریخ نویسی، اس کے پروپگنڈہ اور اس کے دھوکے میں ہی آ کر
عرب مؤرخ نے مذکورہ بات لکھی ہے۔

یہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی، وہ تھے کہ:

جب مصنفِ براہینِ قاطعہ، مولانا خلیل احمد، انبیٹھوی سہارن پوری اور حضرت مولانا
غلام دستگیر، قصوری کے درمیان ۱۳۰۶ھ میں بھاولپور، پنجاب کے اندر، مناظرہ ہوا
اور اس کی روداد "تَقْدِیسُ الْوَکِیل عَنْ تَوْھِینِ الرَّشِید وَ الْخَلِیل" کے نام سے شائع ہوئی
تو طبعِ دوم (۱۳۰۷ھ) کے اندر، مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی تحریری تصدیق، موجود ہے۔
آپ حضرات بھی پڑھ سکتے ہیں۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "میں، مولوی رشید احمد کو، رشید (ہدایت یافتہ) سمجھتا تھا۔
مگر، میرے گمان کے خلاف، یہ کچھ اور ہی نکلے۔"

تو، ایسے سنّی عالم (مولانا کیرانوی) کو بھی اپنا عالم کہنے، اور دارالعلوم دیوبند کا فارغ
بتانے میں، ذرا بھی دریغ اور ذرا بھی تکلف اور جھجھک محسوس نہیں کرتے کچھ لوگ۔

اس طرح سے پوری تاریخ کو کھنگالنے کی، پوری تاریخ کو جانچنے کی
پوری تاریخ کو صحیح طور پر پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

محترم اساتذہ وطلبہ! تاریخی حقیقت کا ایک، ناقابلِ تردید پہلو، یہ ہے کہ:

رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن اور کلکتہ سے، بالترتیب ۱۸۲۵ء اور ۱۸۳۸ء میں انگریزی اور اردو میں چھپنے والی کتاب، تقویۃ الایمان از شاہ اسمٰعیل دہلوی کے وہابی مسلک و نظریہ سے وابستہ عُلما کا، مجموعی طور سے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء سے، دور دور تک، کوئی تعلق، نظر نہیں آتا۔

یہ بات، سرسید نے اپنی کتاب "**اسبابِ بغاوتِ ہند**" مطبوعہ ۱۸۵۸ء میں صراحت کے ساتھ، تحریر کی ہے۔ اسی طرح، مقالاتِ سرسید حصہ شانزدہم کے حاشیہ میں صاف صاف لکھا ہوا ہے کہ انگریزوں کے خلاف، جنگ میں حصہ لینے والے، وہ سب کے سب، عُلمائے کرام تھے جو، سید احمد، رائے بریلوی و شاہ اسمٰعیل، دہلوی کے شدید ترین مسلکی مخالف تھے۔

آزادیِ ہند ۱۹۴۷ء کے بعد لکھی گئی کتاب "عُلمائے ہند کا شاندار ماضی" حصہ چہارم میں جمعیۃ العُلمائی مؤرخ، مولانا سید محمد میاں، دیوبندی نے لکھا ہے کہ:

عُلمائے صادق پور، پٹنہ، تنظیمی طور پر، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء سے بالکل الگ تھلگ رہے۔
اور مولانا عبدالرحیم، صادق پوری کی تحریر کے مطابق، یہ لوگ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے مخالف تھے۔

مجاہدِ آزادی، حضرت مولانا سید کفایت علی، کافیؔ، مراد آبادی کو
حضرت امام احمد رضا، قادری، برکاتی، بریلوی، نے اپنے اس شعر میں "**سلطانِ نعت گویاں**" فرمایا ہے:

کافیؔ سلطانِ نعت گویاں ہیں رضاؔ — **اِنْ شَاءَ اللہ، مَیں، وزیرِ اعظم**

عزیز طلبہ! آپ، اَبنائے اشرفیہ ہیں۔ آپ کو، کام کرنا ہے۔

مجھے، یاد ہے کہ میں ایک مرتبہ، حافظِ مِلّت (حضرت مولانا عبدالعزیز، محدّث مراد آبادی مبارک پوری) **عَلَیْہِ الرَّحْمَہ** کے دردولت پر (جہاں، اب، عزیزِ مِلّت، مولانا عبدالحفیظ عزیزی سربراہِ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، قیام پذیر ہیں) حاضر ہوا۔

مَیں نے جماعتی حالات سے متعلق، کچھ باتیں کرتے ہوئے عرض کیا کہ:

حضرت! ہمارے یہاں، فلاں کام کی طرف، زیادہ توجہ نہیں ہے۔

یہ کام نہیں ہو رہا ہے۔ فلاں کام ہونا چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ۔

تو، اُس وقت آپ نے ارشاد فرمایا کہ: "اِنْ شَاءَ اللہ کام ہوگا اور یہیں سے ہوگا"۔

حافظِ مِلّت **عَلَیْہِ الرَّحْمَہ** نے جو خواب دیکھا ہے۔ اُس کو آپ، شرمندۂ تعبیر کریں۔

اور پوری مِلّتِ اسلامیہ کی قیادت، سیادت، اوراس کی رہنمائی کا جوعظیم الشان فریضہ ہے۔
اسے انجام دیں۔کیوں کہ پورے ملک کی نگاہیں، ہماری طرف، آپ کی طرف لگی ہوئی ہیں۔
پورے ملک کی ہی نہیں، بلکہ ملک سے باہر کی بھی نگاہیں ہماری طرف لگی ہوئی ہیں کہ:

اشرفیہ، ہماری جماعت کا عظیم الشان مرکزی ادارہ ہے۔
اوراشرفیہ، ہماری جماعت کا ایک مرکز ہی نہیں، بلکہ اگر تعمیری اعتبار سے اس کی تعبیر کی جائے
تو اشرفیہ، ہمارے شہرِ اہلِ سُنَّت کا تاج محل ہے۔ ہمارا حُسن ہے۔ ہمارا وقار ہے۔
ہماری عظمت ہے۔اوراس سے ہماری شان وشوکت، وابستہ ہے۔

اِس طرح، پوری دنیاے اہلِ سُنَّت کی نگاہیں، ہماری طرف لگی ہوئی ہیں کہ:

فرزندانِ اشرفیہ، کام کرتے ہیں اور کام کریں گے۔''

اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔اس کا کرم واحسان ہے کہ قوم نے ہم سے جوتوقعات، وابستہ کر رکھی ہیں
ایک حد تک، ہم، وہ توقعات، رفتہ رفتہ، پوری بھی کر رہے ہیں۔
علمی میدان میں، فکری میدان میں، تحریری میدان میں، صحافتی میدان میں
اِس وقت، اگر، آپ پوری جماعت کا جائزہ لیں
تو ۷۰/۸۰ فیصد تعداد، فرزندانِ اشرفیہ کی نظر آئے گی۔
دہلی کے اندر، جب کبھی، دانشوروں، صحافیوں، لیڈروں، ایڈیٹروں سے میری گفتگو ہوتی ہے۔
عُلماے اہلِ سُنَّت، یا۔ مدارسِ اہلِ سُنَّت کا ذکر آتا ہے
تو عموماً، سب سے پہلے، وہ اشرفیہ مبارک پور کا نام لیتے ہیں۔
حکومتی حلقوں تک بھی یہ بات اچھی طرح، معلوم اور واضح ہو چکی ہے کہ:
اہلِ سُنَّت کا سب سے بڑا مدرسہ، مبارک پور میں ہے۔
اور اِس وقت کی جو خانقاہی، یا بریلوی قیادت ہے، اس کا مسلکی مرکز، بریلی ہے۔
مگر، علمی وفکری اعتبار سے اہلِ سُنَّت کی باگ ڈور، اشرفیہ مبارک پور کے ہاتھ میں ہے۔
تو، یہ تأثر، بھی عام ہو چکا ہے اور مزید توقعات بھی آپ سے وابستہ کی جارہی ہیں۔
آپ حضرات، یہ عزم لے کر، یہاں سے اٹھیں کہ:
یہ توقعات، ہمیں، پوری کرنی ہیں۔قوم کا ہمیں، قابلِ قدر سرمایہ، بننا ہے۔قوم نے ہم سے

جوتوقعات، وابستہ کر رکھی ہیں، ان کی توقعات سے کہیں آگے بڑھ کر، ہم کو، کام کرنا ہے۔
اس کے بعد آپ اور ہم، صحیح طور پر، فرزندانِ اشرفیہ کہے جانے کے مستحق ہوں گے۔
اور جو ہمارے سُنّی حنفی اسلافِ کرام تھے، انہیں کے نقشِ قدم پر چل کر، ہم، کامیاب ہو سکتے ہیں۔ہمیں، جو کچھ بھی کرنا ہے اپنے دل، دماغ، فکر اور سوچ کا
جو بھی استعمال کرنا ہے، وہ، استعمال کریں، لیکن، اپنے اکابر واسلاف کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے
اور ان کے ساتھ، سعادت مندی ووابستگی کا اظہار کر کے۔کیوں کہ:

اہلِ سُنَّت کا سرمایۂ افتخار یہی ہے: سعادت مندی اور بزرگوں کے ساتھ
عقیدت ومحبت اور احترام کا جذبہ رکھنا۔

اس سے ذرا بھی، جو شخص، اِنحراف کرتا ہے، پھر، اسے بے شمار نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔
وہ بہک جاتا ہے۔بے توفیق اور بے فیض ہو جاتا ہے۔
اس لئے اپنے اساتذہ سے، اپنے مشائخ سے، اپنے اسلافِ کرام سے
وابستہ رہ کر کے ہی ہم کو، سارا کام کرنا ہے۔
اس سے ایک اِنچ بھی الگ ہٹ کر، ہمیں، کوئی ایسا کام نہیں کرنا ہے
جو ہمارے موقف، ہمارے مسلک کے لئے باعثِ رسوائی اور باعثِ خسارہ، ثابت ہو۔
اس بات کو آپ سبھی حضرات، اچھی طرح، ذہن نشین کر لیں۔
اب بات، بہت ہو چکی ہے۔آیندہ پھر کبھی موقع ملے گا
تو، اِنْ شاءَ اللّٰہ، مزید کچھ باتیں، عرض کروں گا۔
وَ آخِرُ دَعوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن۔اَلسَّلَامُ عَلَیْکُم وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ وَ بَرَکَاتُہٗ۔

(مطبوعہ ماہنامہ، کنزالایمان، دہلی۔شمارہ جون ۲۰۰۷ء)

○○○

تحریکِ آزادی ۱۹۴۷ء اور جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء

جوش وخروش کے ساتھ، جشنِ آزادی منانے کی اپیل

یٰسٓ اختر مصباحی
دارُالقلم، ذاکرنگر، نئی دہلی

متحدہ ہندوستان کے جیالوں اور سرفروشوں نے ، بے پناہ جانی اور مالی قربانیوں کے بعد غاصِب وظالم انگریز حکمرانوں کو، دہلی کا تخت وتاج چھوڑنے اور ملک بدر ہونے پر مجبور کیا۔

ہزار ہا مصائب وآلام، برداشت کرنے کے بعد ہی، ان محسنینِ قوم وملک ووطن کو
برطانوی پنجۂ اِستبداد سے، ہندوستانیوں کی گردن چھُڑانے میں، کامیابی، حاصل ہوسکی۔

جو، آج، پوری آزادی کے ساتھ، اپنے ملک ووطن کے چپے چپے پر، عزت و اِفتخار اور امن وامان کی فضا میں، سانس لے رہے ہیں۔ اور جمہوری وقانونی واِنتظامی وتعلیمی وتجارتی، ہر طرح کے سپید وسیاہ
اور، اِختیار واِقتدار ونظامِ حکومت کے، خود، مالک ومُنتظم ہیں۔

اپنے داخلی اور قومی وملکی اور وطنی معاملات ومسائل کی ہر پیچیدہ گتّھی، سُلجھانے اور تعمیر وترقی کی ہر راہ پر چلنے کا، اب، مکمل اختیار ہے۔ جس میں، کسی بیرونی طاقت کی کوئی مداخلت، کسی محبِّ وطن کو، ہرگز، گوارا نہیں۔

اپنے لئے کوئی بھی قانون، ہم، خود، بناتے اور خود ہی، اسے، نافذ بھی کرتے ہیں۔

ہماری معاشرت ومعیشت، ہماری تجارت وصنعت، ہماری تعلیم، ہماری تنظیم، ہمارے ادارے، ہمارے مراکز سب کچھ، ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ آبادی سے، سرحد تک، ہمارا ہی کنٹرول ہے۔

دنیا کے ہر ملک وقوم کے ساتھ، اپنے مفادات ومصالح کے تحت، ہر طرح کا، رابطہ رکھنے
اور، اپنی خارجہ پالیسی بنانے کی، ہمیں، مکمل آزادی ہے۔

حوصلہ شکن اور صبر آزما حالات سے، دوچار ہونے والے ہمارے قائدین ومجاہدین نے نہایت طویل مَراحلِ امتحان سے گذرتے ہوئے، جو، پرچمِ آزادی
ہمارے سپرد کیا تھا، اُسے، سربلند رکھتے ہوئے آخر کار، ہم، اپنی منزلِ آزادی تک، پہنچ ہی گئے۔

اور اگست ۱۹۴۷ء میں، ہم، اپنے آزاد ملک کے آزاد شہری کی حیثیت سے، اپنی آزاد سرزمین کے جغرافیائی حُدود کے ساتھ، نقشۂ عالَم پر اُبھر کر، ساری دنیا کی توجُّہات کا مرکز بننے میں، سُرخرو اور کامیاب ہوسکے۔

تحریکِ آزادیِ ہند میں، جن رہنماؤں نے، جس انداز سے بھی، کوئی سرگرم حصہ لیا
اُن سب کو، یاد رکھنا آج کی نسل کی، قومی ومِلّی اور وطنی وملکی ذِمَّہ داری ہے۔ اور، اس ذِمَّہ داری کو ادا کرنا، اور اپنے قائدین ومحسنین کو یاد رکھنا
ہمارے جذبۂ احسان شناسی کا، ایک قابلِ قدر اور لائقِ تحسین مظاہرہ بھی ہے۔

تاریخِ آزادیِ ہند کا علم ومطالعہ رکھنے والے حضرات، اچھی طرح جانتے ہیں کہ:

تحریکِ آزادی (۱۹۴۷ء) کے آخری سالوں میں، متحدہ ہندوستان کی، دو بڑی سیاسی پارٹیاں (کانگریس اور مسلم لیگ) اپنے سیاسی خیالات ونظریات کی وجہ سے، ایک دوسرے سے، بہت دور ہوگئی تھیں۔

لیکن، اپنے شدید اختلافات کے باوجود، وہ، اِس نقطۂ اتحاد پر، متفق تھیں کہ:

انگریزی اِقتدار وحکومت کو، جڑ سے اُکھاڑ پھینکا جائے۔ اور زمامِ اِقتدار وحکومت باشندگانِ ملک کے حوالے کیا جائے، جس میں، انگریزی سامراج کا، کسی طرح، کوئی عمل دخل، نہ ہو۔

دونوں سیاسی دَھڑوں میں، ایک کی لیڈرشِپ، گاندھی، نہرو کے ہاتھ میں تھی۔
جب کہ، دوسرے کی قیادت، جناح، لیاقت کر رہے تھے۔

ان میں، جس سے بھی، کوئی شخص، اتفاق، یا۔ اختلاف کرے، یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔
مگر، تحریکِ آزادیِ ہند میں، ان دونوں دَھڑوں کی شرکت وحصہ داری، ایک واضح، تاریخی حقیقت ہے۔
جس کا، کُھلے دل سے، ہر آزادی پسند وحقیقت پسند اور اِنصاف پسند انسان کو، اعتراف کرنا چاہیے۔

تحریکِ آزادی (۱۹۴۷ء) کے معروف رہنماؤں اور لیڈروں کے ساتھ
اُن علما وقائدین کو بھی، ہمیں یاد، رکھنا چاہیے، جن کی کوششوں اور قربانیوں کے نتیجے میں
ہمارا کاروانِ آزادی، اپنی منزلِ مقصود (اگست ۱۹۴۷ء) تک پہنچا۔
اور آج، ہم، اپنی آزادی کی بے پناہ نعمتوں اور لذتوں سے، سرشار وشادکام ہو رہے ہیں۔

مثلاً: مولانا محمد نعیم الدین، مرادآبادی ومولانا سید محمد محدِّث، اشرفی، کچھوچھوی ومولانا محمد امجد علی، اعظمی رضوی ومولانا شاہ مصطفیٰ رضا، بریلوی ومولانا حسنین رضا، بریلوی ومفتی برہانُ الحق، جبل پوری ومولانا عبدالماجد قادری، بدایونی ومولانا عبدالباری، فرنگی محلی، لکھنوی ومولانا نثار احمد، کان پوری ومولانا ہدایت رسول، برکاتی لکھنوی ومولانا عبدالعلیم، صدیقی، میرٹھی، ومولانا عبدالحامد، قادری، بدایونی، ومولانا محمد عمر نعیمی، مرادآبادی ومولانا سید مصباحُ الحسن، چشتی، پھپھوندوی ودیوان آلِ رسول، اجمیری ومولانا معین الدین، اجمیری
وسید شاہ محمد فاخر، الٰہ آبادی۔ وَغَیرھُم۔

مولانا ہدایت رسول، قادری، برکاتی، لکھنوَی (متوفی ۱۹۱۵ء) نے
لکھنؤ میں، انگریزوں کے خلاف، زبردست تحریک چلائی تھی۔ اور ''لکھنؤ بند'' کا اعلان کیا تھا۔

''لکھنؤ بند'' کے دن، ساری دکانیں، بند تھیں۔ پورے شہر میں، کسی طرح کی خرید وفروخت، نہیں ہوئی۔
کسی انگریز نے، ایک بُڑھیا سے، جو، سبزی بیچا کرتی تھیں، اس سے کہا کہ:
مجھے، سبزی کی، سخت ضرورت ہے۔ اِسی لئے، میں، تمھارے پاس آیا ہوں۔''
بُڑھیا نے، برجستہ اور بلاخوف وخطر، اسے جواب دیا کہ:
''نہیں! آج، کچھ نہیں ملے گا۔ ہمارے مولانا نے، کسی طرح کی خرید وفروخت
اور، دوکان کھولنے سے، لکھنؤ والوں کو، منع کیا ہے۔''
شاید، اس انگریز نے، امتحان لینے کے لئے، ایسا کیا۔
مگر، اس بُڑھیا کا، جذبۂ حُریت اور جذبۂ اِطاعت، قابلِ صد تعریف وتحسین ہے کہ:
اس نے، اپنے اِس جواب کے ذریعہ، اس انگریز کو، پیغام دیا کہ:
ہمیں، اپنے ملک کا مفاد، عزیز ومحبوب ہے۔ جس کا، ہم، سَودا نہیں کر سکتے۔
اور ہم، تمھاری نہیں، بلکہ، اپنے قائد ورہنما ہی کی بات، مانیں گے۔''
مختلف اہم ملکی وقومی معاملات وتحریکات میں بے لَوث اور نہایت پُر جوش وسرگرم کردار ادا کرنے
والے نمایاں ترین مسلم لیڈر، مولانا محمد علی جوہر سے بھی نئی نسل، نام کے سِوا، کچھ زیادہ آشنا نہیں۔
کسی سیاسی پارٹی اور کسی حکومت کی بھی، کوئی قابلِ ذکر، توجہ نہیں۔
مولانا محمد علی جوہر (متوفی ۱۹۳۱ء) نے، گول میز کانفرنس، لندن (۱۹۳۱ء) میں
بہانگِ دُہل، یہ اعلان اور مطالبہ کیا تھا کہ:
''مجھے، آزادی کا، پروانہ، چاہیے۔ میں، غلام ملک میں، واپس نہیں جاؤں گا۔''
اسی دَورۂ لندن میں، اس مردِ قلندر کا، لندن ہی میں انتقال ہوا۔
اور جسدِ خاکی کو، بیتُ المقدس کی مبارک سرزمین میں، تدفین کی سعادت، حاصل ہوئی۔
مولانا جوہر نے، اپنی سرگرم قومی وسیاسی زندگی کی بعض شرعی غلطیوں سے، مولانا غلام معین الدین نعیمی
مرادآبادی (متوفی اگست ۱۹۷۱ء) شاگرد وسوانح نگارِ مولانا نعیم الدین، مرادآبادی (متوفی ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) کی
تحریری روایت کے مطابق اپنے، دورۂ لندن (۱۹۳۱ء) برائے شرکتِ گول میز کانفرنس سے
کچھ دِنوں پہلے، دہلی میں حضرت مولانا نعیم الدین، مرادآبادی سے
ایک ملاقات وگفتگو کے بعد آپ کے سامنے ہی توبہ ورُجوع کر لیا تھا۔
(''حیاتِ صدرُالافاضل''۔ مؤلّفہ: مولانا غلام معین الدین نعیمی۔ مطبوعہ لاہور)
مولانا محمد علی جوہر، حضرت مولانا عبدالباری، فرنگی محلی، لکھنوی سے
اور صف اول کے مشہور مسلم لیڈر، مولانا حسرت موہانی

حضرت مولانا عبدالوہاب، فرنگی محلی، لکھنوی سے نسبتِ بیعت وارادت رکھتے تھے۔
مولانا محمد نعیم الدین، مرادآبادی (متوفی ۱۹۴۸ء) نے، اپنے ماہنامہ ''اَلسَّوَادُ الْاَعْظَم'' مرادآباد
اور، اپنی قائم کردہ ''آل انڈیا سنّی کانفرنس'' کے پلیٹ فارم سے، پورے ہندوستان میں
جس جذبۂ حُرّیت کی روح پھونکی، وہ، تاریخ آزادیِ ہند کا، ایک درخشاں باب ہے۔
حضرت مولانا احمد رضا، قادری، برکاتی، بریلوی (متوفی ۱۹۲۱ء) لفافہ پر، ہمیشہ، اُلٹا ٹکٹ لگایا کرتے تھے
اور، یہ تاریخی جملہ، ارشاد فرماتے تھے کہ: ''میں نے، ''جارج پنجم'' کا، سَر نیچا کر دیا۔''
آپ کے بعض مکتوبات کی فوٹو کاپی، آج بھی موجود ہے، جن کے ٹکٹ پر، ملکۂ برطانیہ کا فوٹو ہے۔
اور ٹکٹ کو، لفافے پر، اُلٹا، چسپاں کیا گیا ہے۔ جو، آپ کے، اِس ارشاد کی عملی شہادت ہے کہ:
''میں نے، ملکۂ برطانیہ کا، سَر نیچا کر دیا۔''
آپ نے، اپنی پوری زندگی میں، کبھی، کسی انگریز سے ملاقات کی، نہ ہی، کسی انگریزی کورٹ کچہری میں
تشریف لے گئے، نہ ہی، اُن کی عدالت تسلیم کی، نہ اسے، کبھی، عدالت کہا۔
اور آپ نے، انگریزی حکومت واِقتدار کو بھی، کبھی، تسلیم نہیں کیا۔
باضابطہ تحریکِ آزادی، تو ۱۹۲۰ء کے بعد، شروع ہوئی تھی۔
لیکن، اس سے تقریباً، دس سال پیشتر، ۱۹۱۲ء ہی میں، آپ نے فتویٰ دیا تھا کہ:
''باستثناء اُن معدود باتوں کے، جن میں حکومت کی دست اندازی ہو
اپنے تمام معاملات، اپنے ہاتھ میں رکھتے۔ اپنے سب مقدمات، اپنے آپ، فیصل کرتے۔
یہ کروڑوں روپے، جو، اِسٹامپ ووکالت میں گھسے جاتے ہیں، محفوظ رہتے۔
اپنی حرفت وتجارت کو، ترقی دیتے کہ، کسی چیز میں، کسی دوسری قوم کے محتاج، نہ رہتے۔
یہ، نہ ہوتا کہ، یورپ وامریکہ والے
چھٹانک بھر تانبا، کچھ صَنّاعی کی گڑھنت کر کے، گھڑی وغیرہ، نام رکھ کر، آپ کو دے جائیں۔
اور، اس کے بدلے، پاؤ بھر چاندی، آپ سے لے جائیں۔''
(رسالہ ''تدبیر فلاح ونجات واِصلاح'' ۔ ۱۹۱۲ء۔ مطبوعہ بریلی وبمبئی ولاہور۔
مشمولہ: فتاویٰ رضویہ جلد ۱۵۔ مطبوعہ: پاک وہند)
ذہن نشیں رہے کہ ۱۹۱۹ء کے حادثہ ''جلیان والا باغ'' (امرتسر، پنجاب)
اور ۱۹۲۰ء کے حادثہ ''چوری چورا'' (گورکھپور) کے علاوہ، تحریکِ آزادیِ ہند میں
اگست ۱۹۴۷ء تک، کوئی، ایسا، بڑا، اور قابلِ ذکر حادثہ نہیں ہوا۔
بعض پُر جوش ہندوستانی نوجوانوں نے، انگریزوں کے خلاف

جو، کارروائی کی، اس کے خلاف انھیں، انگریزوں نے، ظالمانہ سزائیں دیں۔

اس طرح کے، اِکّا دُکّا واقعات ہی، پیش آئے۔

تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) کے بَطن سے پیدا ہونے والی تحریکِ عدمِ تعاون (۱۹۲۰ء)

اور ۱۹۲۰ء ہی کی تحریکِ ہجرت، انگریزی حکومت کے خلاف، ایک اِحتجاجی اِقدام تھا۔

اس کے بعد ہی باضابطہ، تحریکِ آزادی، شروع ہوئی اور جلسہ و جلوس کے ساتھ، ''**انقلاب**''، کے نعرے ہر طرف، گونجنے لگے۔ اِس طرح، انگریزی حکومت کے خلاف، بڑے پیمانے پر، احتجاج و مظاہرہ کا دَور، شروع ہوا۔

تحریکِ آزادی کا، ایک اہم سنگِ میل ''**ہندوستان چھوڑو**'' (۹/اگست ۱۹۴۲ء) کا نعرہ ہے۔ جس نے متحدہ ہندوستان کو، جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اور بڑی تعداد میں ہندوستانی، کُھل کر، انگریزی حکومت کے خلاف، صف آرا ہوگئے۔

اس تحریکِ آزادی میں، بعض سیاسی رہنماؤں کی گرفتاری اور قید و بند کے علاوہ، کوئی اور خطرہ، نہیں تھا۔

کیوں کہ، عالَمی سطح پر، برطانیہ کا، دَورِ زوال، شروع ہو چکا تھا۔ اور اس کا آفتابِ اقبال، غروب ہونے لگا تھا۔

جس کے نتیجے میں، اپنی بساط، سمیٹ اور لپیٹ کر، برطانیہ واپسی کے علاوہ

انگریزوں کے سامنے، کوئی متبادل راستہ، باقی، نہیں بچا تھا۔

انھیں، ہر حال میں، ہندوستان، چھوڑ کر، اپنے ملک (برطانیہ) واپس جانا ہی تھا۔

جب کہ ۱۸۵۷ء کا زمانہ، انگریزوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ اور وہ، ہر طرح، مضبوط و منظّم اور مسلَّح تھے۔

''ایسٹ انڈیا کمپنی'' نے، تجارتی بھیس میں، متحدہ ہندوستان کو لوٹ کر، اور نوابوں، راجاؤں کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر، پورے متحدہ ہندوستان کو، غلامی و محکومی کی زنجیروں میں، جکڑ دینے کی زبردست منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔

جس کی پُرزور مزاحمت اور خونریز معرکہ آرائی، قائدین و مجاہدینِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء نے کی۔

اور، ان کے خون سے، سرزمینِ ہند، لالہ زار ہوگئی۔

ان تاریخی حقائق کے پیشِ نظر، سارے اہلِ ملک و وطن کا لازمی فریضہ ہے کہ:

تحریکِ آزادی (۱۹۴۷ء) کے ساتھ، جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) کو بھی ضرور، یاد رکھیں۔

اور، یہ اجتماعی غلطی، بلکہ، احسان فراموشی، ہرگز، نہ کریں کہ:

صرف، پسینہ بہانے والوں کی جدوجہد کو، یاد رکھا جائے۔

اور اپنا خون بہانے والوں کی قربانی کو، فراموش کر دیا جائے۔

عُلما و قائدینِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء۔ مثلاً:

مفتی صدرُ الدین، آزردہ، دہلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) و علّامہ فضلِ حق، خیرآبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) و مولانا سید احمد اللہ شاہ، مدراسی (متوفی ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء) و مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی (متوفی، نامعلوم) و مولانا سید کفایت علی، کافی مرادآبادی (متوفی ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء) و مولانا وہاج الدین

مرادآبادی (متوفی ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء) و مفتی عنایت احمد، کاکوروی (متوفی ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء) و مفتی مظہر کریم دریابادی (متوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۳ء) و مولانا، ڈاکٹر وزیر خاں، اکبرآبادی (متوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۳ء) و مولانا رحمت اللہ، کیرانوی (متوفی ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء) وغیرھُم۔

اپنے، جن اَسلاف و متقدمین سے فیض یاب تھے اور جن کی ہدایات و ارشادات سے

انھیں، ترغیب و تحریک ملی، ان میں سے، چند حضرات کے اسمائے گرامی، درج ذیل ہیں:

حضرت شاہ ولی اللہ، محدّث دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں، نقشبندی مجدّدی، دہلوی (متوفی ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) حضرت شاہ عبد العزیز، محدّث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) حضرت قاضی ثناءُ اللہ، مجدّدی، دہلوی (متوفی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) حضرت شاہ رفیع الدین، محدّث دہلوی (متوفی ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء) حضرت مفتی محمد عوض، عثمانی، بدایونی ثم بریلوی (متوفی ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء)

حضرت مفتی شرف الدین، رام پوری (متوفی ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء) وغیرھُم۔

یہ گرامی قدر اَفراد و رِجال، ہماری مذہبی و سیاسی تاریخ کے روشن نقوش و اَبواب ہیں۔

اور ہمارے حال کا رشتہ، ان کے وجود، اور ان کے ماضی سے جُڑا ہوا ہے۔

۱۰/مئی ۱۸۵۷ء کو، میرٹھ سے، جنگِ آزادی کا آغاز ہوا۔

جس کے بعد، راتوں رات، ہندوستانی فوجیوں کا، ایک پُر جوش اور پُر عزم دَستہ، ۱۱/مئی کو دہلی پہنچا۔

یہ فوجی دَستہ، پچاسی (۸۵) فوجیوں پر، مشتمل تھا۔ جس میں، ہندو مسلمان، دونوں، شامل تھے۔

مگر، اکثریت، مسلم فوجیوں ہی کی تھی۔

یہ فوجی دَستہ، سیدھے، لال قلعہ پہنچا اور اس نے، بوڑھے اور نحیف و ناتواں مغل تاجدار، بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت و سربراہی کا، اعلان کر کے، اپنی فوجی مُہم کا آغاز کر دیا۔ اور کشت و خون کا بازار، گرم ہوا۔

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں، ناکامی (۱۹/ستمبر ۱۸۵۷ء) کے بعد

ہندوستانیوں، بِالخصوص مسلمانوں کے خلاف، انگریزوں نے، جن وحشیانہ مظالم کا اِرتکاب کیا

اُس کا ذکر، بعض انگریز مؤرخین نے بھی، اِس طرح کیا ہے کہ:

ہم نے، ہندوستانیوں کے ساتھ، جو، سلوک کیا، اُس کا، اپنے ملک (برطانیہ) میں، تصور بھی، نہیں کر سکتے۔

متعدد مؤرخین نے، لکھا ہے کہ:

دہلی سے پشاور تک، گرینڈ ٹرنک روڈ کی دونوں جانب

شاید ہی کوئی خوش قسمت درخت ہوگا، جس پر، ایک، یا۔ دو عالم کو، پھانسی، نہ دی گئی۔

ایک اندازہ کے مطابق، تقریباً، بائیس ہزار عُلما کو، پھانسی دی گئی۔

اور، مجموعی طور پر، لگ بھگ پانچ لاکھ مسلمانوں کو، موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔

جو بھی معزز مسلمان، کسی انگریز کے ہاتھ لگ گیا، اُس کو، ہاتھی پر بیٹھایا گیا۔

اور کسی درخت کے نیچے لے جا کر، اس کی گردن میں، پھندا ڈال کر، ہاتھی کو، آگے بڑھا دیا گیا۔

ایسے مظلوموں کی تعداد، ہزاروں نہیں، بلکہ، لاکھوں میں ہے کہ:

جن کی لاشیں، پھندے میں، جھول گئیں، آنکھیں، اُبل پڑیں، اور زبان، باہر نکل آئی۔

ایک انگریز کمانڈر، لارڈ رابرٹس (Lord Roberts) بیان کرتا ہے کہ:

چاندنی چوک (دہلی) میں، شہرِ خموشاں کا منظر تھا۔ ہر طرف، لاشیں بکھری ہوئی تھی۔
ایک بھی زندہ مخلوق، ہماری نظر سے، نہیں گذری۔
کہیں، کوئی کتّا کسی لاش کو، بھنبھوڑ رہا تھا۔ کہیں، کوئی گِدھ، اپنی گھناؤنی غذا چھوڑ کر
پَھڑ پَھڑاتے ہوئے کچھ دور چلا جاتا، لیکن، اس کا پیٹ، اتنا بھر چکا ہوتا کہ وہ، اُڑ نہیں سکتا تھا۔
معلوم ہو رہا تھا کہ ہماری طرح، ہمارے گھوڑوں پر بھی خوف، طاری تھا۔
اس لئے، وہ، بھی، بار بار، بِدک جایا کرتے تھے۔

میجر، ٹامسن، اپنی یادداشت میں، لکھتا ہے کہ:

ہمارے اکثر نوجوان، محض اپنی خواہش اور اپنا شوق پورا کرنے کے لئے
ہندوستانیوں کو، گولیوں سے، بھون دیا کرتے تھے۔

ایک انگریز کمانڈر، جنرل نیل نے الہ آباد اور کان پور کے درمیان، بے شمار دیہات و قصبات کو جلا کر، خاکستر کر دیا۔ اور بے شمار دیہاتیوں اور قصباتیوں کو، موت کے گھاٹ، اُتار دیا۔

اس طرح کے المناک واقعات و حادثات سے، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی تاریخ
ہندوستانیوں کے خون سے، رنگین ہے۔ مگر، افسوس کہ:
آج کی نوجوان نسل، اپنے اِس کربناک و المناک ماضی سے بالکل بے خبر ہے کہ:
انگریزی سامراج نے کس طرح ہزاروں لاکھوں ہندوستانیوں کے ساتھ
خوفناک مظالم کر کے، دہلی کے تخت و تاج پر، قبضہ کیا تھا۔

اور انگریزوں کو، دہلی پر قبضہ کرنے سے، روکنے اور ان سے آزادی، حاصل کرنے کے لئے کتنی قربانیاں، اُس وقت کے انقلابیوں اور ہندوستانیوں نے دی ہیں۔

جن میں لاکھوں کو، اپنی جان، قربان کرنی پڑی۔

اور لاکھوں ہندوستانی بے گھر اور بے دَر ہو کر جنگلوں اور صحراؤں میں مارے مارے، پھرتے رہے۔

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں، کسی نہ کسی انداز سے، نمایاں کردار ادا کرنے والے
عُلما و قائدین میں مندرجہ ذیل حضرات کو، خصوصی حیثیت و اہمیت، حاصل ہے:

مفتی صدرُ الدین، آزردہ، دہلوی و علاّمہ فضلِ حق، خیر آبادی و مولانا سید احمد اللہ شاہ، مدراسی و مولانا فیض احمد عثمانی، بدایونی و مولانا ڈاکٹر وزیر خاں، اکبر آبادی و مولانا رحمت اللہ، کیرانوی و مولانا سید کفایت علی، کافیؔ مراد آبادی و مفتی عنایت احمد، کاکوروی و مولانا مظہر کریم، دریابادی و مولانا رضا علی خاں، بریلوی و مولانا شاہ احمد سعید مجدّدی، دہلوی و مولانا وہاج الدین، مراد آبادی و سید محمد قاسم شاہ، داناپوری و منشی رسول بخش، کاکوروی و منیرؔ، شکوہ آبادی و غلام امام شہید۔ وَغَیرھُم۔

ہندوستانی نوابوں اور سپہ سالاروں میں، جنرل بخت خاں و خان بہادر خاں روہیلہ و بیگم حضرت محل و نواب مُجّو خاں، مراد آبادی و شہزادہ فیروز شاہ و جنرل عظیم اللہ، کان پوری۔ وَغَیرھُم۔

اور ان حضرات سے، بہت پہلے، نواب، حافظ رحمت خاں، روہیلہ (والیِ روہیل کھنڈ) و نواب سراجُ الدّولہ (بنگال) اور شیرِ میسو، سلطان ٹیپو (فرماں رَوائے ریاستِ میسور) نے انگریزوں سے
گھمسان کی جنگ لڑتے ہوئے، ایک روشن تاریخ، رقم کی تھی۔

شیرِ میسور، سلطان ٹیپو (شہادت ۱۷۹۹ء) پورے متحدہ ہندوستان کی، وہ قابلِ افتخار شخصیت اور وہ ممتاز فرماں روائے ریاستِ میسور ہیں، جنھوں نے، انگریزوں سے لڑتے ہوئے، میدانِ جنگ میں شہادت پائی۔

اور، انگریز کمانڈر نے، سلطان ٹیپو کی شہادت کا بڑے فخر کے ساتھ، اعلان کیا تھا کہ:

"آج سے، ہندوستان، ہمارا ہے۔"

اور، یہی وہ شیر دل بہادر اور مردِ میدان ہے، جس کی زبان سے نکلا ہوا، یہ جملہ، زبان زدِ خاص و عام ہے کہ:
شیر کی ایک دن کی زندگی، گیدڑ کی، صد سالہ زندگی سے، بہتر ہے۔"

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء، میرٹھ، دہلی، آگرہ، بریلی، بدایوں، شاہ جہاں پور، کان پور، لکھنؤ، فیض آباد، الہ آباد کے وسیع علاقہ میں لڑی گئی۔ اِس طرح، یہ ایک مکمل اور ہمہ گیر عوامی جنگ تھی۔

صوبائی سطح کی ایسی ہمہ گیر، اور زبردست عوامی جنگ، سب سے پہلے
سرزمینِ بنگال میں، لڑی گئی تھی جس کا آغاز، ایک صوفی بزرگ، مجنوں شاہ نے کیا تھا۔
وجہ اس کی، یہ تھی کہ انگریزوں نے تجارتی بھیس میں، سب سے پہلے، بنگال ہی کو اپنا نشانہ بنایا تھا۔
اور ان کے تجارتی ادارہ "ایسٹ انڈیا کمپنی" نے ہُگلی (بنگال) میں
اپنی سب سے پہلی تجارتی عمارت بنا کر، اس کے ذریعہ، بنگالی کسانوں اور تاجروں کا خون چوسنا، شروع کیا تھا۔
ایسٹ انڈیا کمپنی نے کسانوں کا اِس بُری طرح، استحصال کیا کہ ان کی زندگی، اَجیرن ہو کر رہ گئی۔
غلّہ اور کاشتکاری کی پیداوار کو کمپنی کے مقرّرہ داموں پر، کمپنی ہی کو، فروخت کرنا
سارے کسانوں کے لئے کمپنی نے لازم کر دیا تھا۔
اور جو کسان، کسی بھی طرح، اس کی خلاف ورزی کرتا، اسے سخت سزا سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔

۱۷۶۵ء میں، بنگال پر، انگریز، مکمل طور سے قابض ہو چکے تھے۔
مجنوں شاہ کے متعدد خُلفا اور بے شمار مریدین کے ساتھ، عام بنگالی بھی، انگریزوں کے ظلم و جبر سے
عاجز آ کر، ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور ۱۷۶۳ء سے ۱۸۸۲ء تک، پورے بنگال میں
غاصِب و ظالم انگریز حکمرانوں سے کسی نہ کسی شکل میں جنگ کرتے رہے۔
اس جنگ میں کسان، پیش پیش تھے۔ اور اصل افرادی قوت انھیں کی تھی۔
جن میں ہندو مسلمان، دونوں شامل تھے۔ مگر، واضح اکثریت، مسلمانوں ہی کی تھی۔
۱۷۵۷ء میں جنگِ پلاسی، ۱۷۶۴ء میں جنگِ بکسر اور ۱۷۷۴ء میں جنگِ روہیل کھنڈ
تاریخِ جنگِ آزادیِ ہند کے وہ، خونچکاں ابواب ہیں
جن میں، نوابوں اور انگریزوں کے درمیان، خونریز جنگیں، ہوئیں۔
سب سے وسیع، ہمہ گیر اور عوامی جنگ، دہلی و روہیل کھنڈ سے اَوَدھ و الہ آباد و بہار تک ہونے والی
فیصلہ کن جنگ، ۱۸۵۷ء کی تھی۔ جس میں، کلیدی اور بنیادی کردار، عُلمائے کرام کا تھا۔
تحریکِ آزادی (۱۹۴۷ء) و جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) کے مشہور مؤرخ
رئیس احمد، جعفری، ندوی (متوفی ۱۹۶۸ء) اِس سلسلے میں، اپنا خلاصۂ مطالعہ، اِس طرح تحریر کرتے ہیں:
''اِس حقیقت سے، کوئی، انکار نہیں کرسکتا کہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں، عُلما نے نمایاں حصہ لیا۔
ایک اہلِ علم، و محقق کے بقول:
مولانا فضلِ امام، صدرُ الصُّدور، و مفتی صدرُ الدین خاں آزردہ، و مفتی عنایت احمد، کاکوروی
مُنصِف صدر امین، کول و بریلی، و مولانا فضلِ رسول، بدایونی، سررشتہ دار کلکٹری، صدر دفتر سَہسوان
و مفتی انعامُ اللہ، گوپامئوی، قاضیِ دہلی و سرکاری وکیل الہ آباد، و مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی، سررشتہ دار امین بریلی
و علّامہ فضلِ حق خیر آبادی، سررشتہ دار ریزیڈنسی دہلی و صدرُ الصُّدور لکھنؤ و مہتمم حضور تحصیل، اَوَدھ
و مولوی غلام قادر، گوپامئوی، ناظرِ سررشتہ دار عدالتِ دیوانی و تحصیل دار گوڑگاؤں، و مولانا قاضی فیض اللہ، کشمیری
سررشتہ دار صدرُ الصُّدور، دہلی۔ وغیرہ۔
یہ سب، اُس وقت کے بے نظیر و عدیم المثال اکابر عُلما تھے۔
حکومت کی باگ ڈور، انھیں کے ہاتھوں میں تھی۔
مسلمانوں کی سلطنت کی بربادی، ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ موقع کا انتظار تھا۔
۱۸۵۷ء کا وقت آیا، تو، سب میں، پیش پیش، یہی حضرات تھے۔
والیانِ ریاست، اور اراکینِ دولت میں ناقوسِ حریت پھونکنے والے، یہی تھے۔
عوام کو، اُبھارنا، انھیں کا، کام تھا۔

اور انقلابِ ۱۸۵۷ء کے بعد، سب سے زیادہ مصائب اُٹھانے والے
اور آتشِ حریت میں جلنے والے یہی شمعِ شبستانِ آزادی کے پروانے تھے۔''
(ص ۸۵۵۔ ''بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد''۔ مؤلّفہ: رئیس احمد، جعفری، ندوی۔ طبعِ اول: کتاب منزل، لاہور۔ ۱۹۵۶ء)
جنگِ آزادی کے لئے زیرِ زمین، ماحول سازی و ذہن سازی میں، دِلاور جنگ، مولانا سید احمد اللہ شاہ
مدراسی (شہادت ۱۸۵۸ء۔ در معرکۂ شاہجہاں پور) کی سرگرمیاں اور شبانہ روز کوششیں
نہایت اہم ہیں، جو، صفحاتِ تاریخ میں نمایاں طور سے مرقوم ہیں۔
سید احمد اللہ شاہ، مدراسی (بن سید محمد علی۔ نواب چنیا پٹن، تعلقہ پورنا ملی۔ جنوبی ہند
بن سید جلال الدین عادل) جنوبی ہند کا ایک روشن ستارا ہے، جس نے شمالی ہند کے آفاق کو مدتوں، روشن رکھا۔
اور، دہلی و آگرہ و لکھنؤ و فیض آباد و شاہجہاں پور کے اندر
اپنی تگ و تاز اور معرکہ آرائیوں کی ایک ناقابلِ فراموش تاریخ، رقم کی۔
حضرت میر قربان علی، چشتی (جے پور، راجپوتانہ) سے، مولانا مدراسی کو، نسبتِ بیعت و اِرادت کے ساتھ
خلافت بھی حاصل تھی۔ چشتیت کا آپ کے اوپر، غلبہ تھا۔ اِسی لئے محفلِ سماع کا، خاص اِہتمام کیا کرتے تھے۔
حضرت محراب شاہ قلندر، قادری، گوالیاری سے بھی آپ کو، سلسلۂ قادریہ میں، خلافت، حاصل تھی۔
جنھوں نے، مولانا مدراسی کو خلافت، عطا فرماتے وقت یہ عہد لیا تھا کہ:
''وطنِ عزیز کو، تمھیں، انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانا ہے۔''
مولانا مدراسی نے، اسے، بسر و چشم قبول کیا اور تکمیلِ عہد و پیمان کے لئے پورے طور سے سرگرم ہو گئے۔
۱۸۴۶ء میں، گوالیار سے دہلی پہنچے اور علّامہ فضلِ حق، خیر آبادی کے رفیقِ درس اور گہرے دوست
مفتی صدرُ الدین، آزردہ، دہلوی (متوفی ۱۸۶۸ء) صدرُ الصُّدور دہلی
تلمیذِ حضرت شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی و علّامہ فضلِ امام، خیر آبادی سے اس سلسلے میں، رازدارانہ مشورہ کیا۔
مفتی آزردہ، دہلوی کے مشورے کے مطابق، ان کے ایک خصوصی سفارشی مکتوب
بنام، مفتی انعامُ اللہ، گوپامئوی (متوفی ۱۸۵۹ء) کے ساتھ، اُس وقت کے مرکزی مقام، آگرہ پہنچے۔
اور، ایک ''مجلسِ عُلما'' قائم کر کے اپنی مُہم کا، باضابطہ، آغاز کر دیا۔
مولانا سید محمد میاں، دیوبندی، مؤلّفِ ''عُلمائے ہند کا شاندار ماضی'' اِس سلسلے میں، رقم طراز ہیں:
''حضرت مفتی محمد صدرُ الدین صاحب، جیسا اعلیٰ مدبر
جس نے حضرت سید احمد اللہ شاہ، مدراسی کی سیاسی تگ و دَو کے لئے آگرہ کا میدان، منتخب فرمایا۔
آپ (مفتی آزردہ) نے، خود ہی، اس کی ذمہ داری بھی لی کہ:
حضرت مولانا شاہ احمد اللہ صاحب، جیسے ہی، آگرہ پہنچیں، بلا کد و کاوش، کلیدی حضرات تک

ان کی رسائی ہو جائے۔ اور، یہ ان کا اعتماد، حاصل کر لیں۔

چنانچہ، حسبِ روایت مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبرآبادی:

''مفتی انعام اللہ، خان بہادر (گوپامئوی) جو، محکمۂ شریعت کے مفتی، رہ چکے تھے، اب، سرکاری وکیل تھے۔ حضرت آزردہ کے خط کے ذریعہ، شاہ صاحب (مدراسی) ان کے یہاں، آ کر، مقیم ہوئے۔

ان کا گھر، عُلما کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مفتی (انعام اللہ) صاحب کے صاحبزادے

مولانا اِکرام اللہ، صاحبِ ''تصویرالشُّعَرا'' آپ کے مرید ہوئے۔

عُلما و فُضلا کا یہ گلدستہ، جس کی شیرازہ بندی، اب تک، علمی و ادبی ذوق نے کر رکھی تھی

مولانا احمد اللہ شاہ کے پہنچنے کے بعد، اس میں سیاسی رنگ پیدا ہونا، شروع ہوا۔

اور ''مجلسِ علما'' کی شکل میں اس اجتماع کی تشکیل کی گئی۔''

(''مجلسِ علما'' کے انتیس (۲۹) ارکان کی مختصر فہرست دینے کے بعد، مولانا سید محمد میاں لکھتے ہیں)

یہ حضرات، صدارت، نظامت کے مختلف عہدوں پر فائز تھے۔ یا۔ وُکلا تھے۔ جنھوں نے

اس مجلس کی رکنیت، منظور کی۔ اور، دامے، دِرمے، قدمے، سخنے، شاہ صاحب کی تائید و اعانت، شروع کر دی۔''

(ص ۴۱۸ تا ص ۴۲۰۔ ''عُلمائے ہند کا شاندار ماضی''۔ جلدِ چہارم۔ مؤلّفہ: مولانا سید محمد میاں۔ مطبوعہ: کتابستان، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶)

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے دَوران، مولانا مدراسی کی واحد ایسی عظیم شخصیت ہے، جس نے

ریاستِ ''محمدی'' (شاہجہاں پور) میں اپنی حکومت، قائم کر لی تھی۔ اور آپ کے نام کا، سِکّہ بھی جاری ہو گیا تھا۔

سِکّہ زَد، بر ہفت کشور، ''خادم محراب شاہ''

حامیِ دینِ محمد، ''احمد اللہ بادشاہ''

انقلابِ ۱۸۵۷ء کا دل، دماغ، متعدد انگریز مؤرخین نے، مولانا مدراسی ہی کو قرار دیا ہے۔

انگریز مؤرخ، میلسن نے، اپنی تیس (۳۰) سالہ تحقیق کے بعد، اپنی تاریخی کتاب ''انڈین میوٹنی'' (۱۸۹۱ء)

میں مولانا مدراسی کی منصوبہ بندی اور شجاعت و بہادری کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔

ریاستِ محمدی کے وُزَرا و اَرکان میں، شہزادہ فیروز شاہ، جنرل بخت خاں، مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی

مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی، وغیرہ، شامل تھے۔

مولانا مدراسی نے ۱۸۵۵ء میں، لکھنؤ میں، علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی (متوفی ۱۸۶۱ء) سے

خصوصی ملاقات کی تھی۔ اور ان دونوں عُلما کے درمیان، رازدارانہ گفتگو بھی، ہوئی تھی۔

جزیرۂ انڈمان و نکوبار کی اپنی اسیری کے زمانے میں علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی نے

اپنے مشہور قصیدہ ''اَلثَّوْرَۃُ الْھِنْدِیَّۃ'' بنام اردو ''باغی ہندوستان'' میں مولانا مدراسی کی بڑی تحسین

و تعریف کرتے ہوئے جنگِ آزادی میں مولانا مدراسی کی قربانی اور شہادت کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔

مولانا مدراسی کی شہادت (۱۸۵۸ء۔ در شاہجہاں پور) کی خبر، جب، انگلینڈ، پہنچی

تو، انگریز، خوشی سے جھوم اُٹھے کہ، شمالی ہند میں، ہمارا سب سے خطرناک دشمن، ختم ہو گیا۔

انگریز مؤرخ، میلسن نے لکھا ہے کہ:

مولوی (احمد اللہ) بڑا عجیب انسان تھا۔ فوجی لیڈر کی حیثیت سے

اس کی صلاحیت کے بہت سے ثبوت ملے ہیں۔ اس کے علاوہ، کوئی دوسرا شخص یہ ناز نہیں کر سکتا کہ:

اس نے، سر، کالن کیمبل (انگریز فوجی کمانڈر) کو، دو مرتبہ، سرِ میدان، شکست دی۔''

اس نے مردانہ آن بان کے ساتھ، کُھلے میدان، میں، ڈٹ کر

اُن غیر ملکیوں کا مقابلہ کیا، جنھوں نے، اس کا ملک، چھین لیا تھا۔

ہر ملک کے بہادر اور سچے لوگوں کو چاہیے کہ:

مولوی (احمد اللہ) کو عزت سے یاد کریں۔ کیوں کہ وہ نہایت بہادر اور سچا محبِّ وطن تھا۔

انگریز مؤرخ، ہومز نے لکھا ہے کہ:

تمام باغیوں میں، مولوی احمد اللہ ہی، بادشاہت کا، سب سے زیادہ، مستحق تھا۔

پروفیسر محمد ایوب قادری (کراچی) لکھتے ہیں:

''شاہ احمد اللہ صاحب کی شہادت پر، روہیل کھنڈ ہی کی جنگِ آزادی نہیں

بلکہ درحقیقت، ہندوستان کی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء ختم ہو گئی۔

یہ وہ، بہادر و جاں باز مجاہد تھا

جس نے جنگِ آزادی کی تحریک کا آغاز کیا، اس کی تبلیغ کی، اور اس کو، پروان چڑھایا۔

اور آخر میں اپنی جان دے کر، اپنے عزائم و مقاصد کی بلندی پر، مہرِ تصدیق، ثبت کر دی۔''

(ص ۳۰۳۔ ''جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء''۔ مؤلّفہ: پروفیسر محمد ایوب قادری۔ مطبوعہ کراچی)

جنگِ آزادی کے ایام میں، انگریزی حکومت کے خلاف، جہاد کے دو تین فتاویٰ، جاری ہوئے

جن میں صرف ایک فتویٰ، محفوظ رہ گیا، جس کے لکھنے والے مجیب، مولانا نور جمال ہیں۔

اس کے علاوہ، کسی فتویٰ کے مَتن کا، کوئی سراغ نہیں ملتا۔

بہت سارے ثبوت و شواہد کی طرح یہ فتاویٰ بھی، گردشِ ایام کی نذر ہو گئے۔

صرف تحریری نہیں، بلکہ جہاد کے زبانی فتوے بھی دیے گئے تھے۔

اور ان زبانی و تحریری فتاویٰ ہی نے مسلمانوں اور انقلابی فوجیوں کے درمیان

انگریزوں کے خلاف، برسرِ پیکار ہونے کا حوصلہ اور جذبہ پیدا کیا تھا۔

مشہور مؤرخ، نجم الغنی خاں، رام پوری لکھتے ہیں:

"ہر جمعہ کو، مسجدوں میں، جہاد کے واسطے، وعظ کہا جاتا تھا۔" الخ

(ص ۵۸۔ **اخبارُ الصَّنادید**، جلدِ دوم۔ مؤلّفہ: نجم الغنی خاں، رام پوری۔
مطبوعہ: رضا لائبریری، رام پور۔ اتر پردیش۔ انڈیا)

عُلماے فرنگی محل، لکھنؤ سے تعلیم یافتہ اور وابستہ، ممتاز قائدِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء، مفتی مظہر کریم، دریابادی (متوفی اکتوبر ۱۸۷۳ء) کے ایک پوتے، مشہور اردو ادیب، عبد الماجد، دریابادی (متوفی ۱۹۷۷ء) اور دوسرے پوتے، ڈاکٹر محمد ہاشم، قدوائی ہیں۔ ڈاکٹر محمد ہاشم، قدوائی لکھتے ہیں:

"مفتی صاحب نے، انگریزوں کے خلاف، جہاد کا، فتویٰ دیا۔"

(**انقلابِ ۱۸۵۷ء نمبر**۔ ماہنامہ، نیا دَور، لکھنؤ۔ شمارہ اپریل مئی ۲۰۰۷ء)

**"انگریزی تسلُّط کے بعد، مفتی (مظہر کریم، دریابادی) صاحب کو گرفتار کیا گیا۔
ان پر الزام لگا کہ انگریزی حکومت کے خلاف، جہاد کے فتوے پر، ان کے دستخط تھے۔"** الخ۔ (حوالۂ مذکورہ)

**عقائد میں، ہم مسلک، عُلماے بدایوں کے تھے۔
"غایۃُ الْمَرَام فِی تَحقیقِ الْمَولُودِ وَالْقِیام" کے نام سے ایک کتاب
اپنے ایک عزیز قریب کے نام سے، محفلِ میلاد اور اس میں، قیامِ تعظیمی کی حمایت اور جواز میں چھپوائی۔
"مناقبِ غوثیہ" یعنی حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کی مدح اور توصیف میں ایک غیر مطبوع تصنیف چھوڑی۔**
فارسی میں بھی متعدد فقہی مسائل سے متعلق "**مسائلِ مذہبیہ**" کے نام سے
ایک تصنیف تھی۔ **جو، غیر مطبوع رہی۔"**

(ص ۹۷۔ "**انقلابِ ۱۸۵۷ء نمبر**"۔ ماہنامہ، نیا دَور، لکھنؤ۔ شمارہ اپریل رمئی ۲۰۰۷ء)

"مفتی عنایت احمد، کاکوروی (مؤلّفِ علم الصِّیغہ وتواریخ حبیب الٰہ۔ متوفی اپریل ۱۸۶۳ء)
بریلی میں صدر امین تھے۔ ان کے، حافظُ الملک، حافظ رحمت خاں کے خاندان سے بھی روابط تھے۔
**چنانچہ، نئی انقلابی حکومت (زیرِ قیادت: خان بہادر خاں، روہیلہ)
کی ہر طرح کی امداد و اعانت کرنے کا فتویٰ، مفتی صاحب نے ہی دیا تھا۔"**

(ص ۴۰۔ "**نواب خان بہادر خاں شہید**"۔ مؤلّفہ: سید الطاف علی، بریلوی۔
مدیر "اَلعِلم" کراچی۔ مطبوعہ: کراچی ۱۹۶۶ء)

**"مفتی عنایت احمد، کاکوروی، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں شریک تھے۔
پہلی مرتبہ، جہاد کے وجوب کا فتویٰ، جن لوگوں نے دیا، اُن میں، مفتی عنایت احمد، کاکوروی کا
نام بھی شامل تھا۔ اور جہاد کے تاریخی فتوے پر، ان کے بھی دستخط ہیں۔**

انھوں نے، فتویٰ بھی دیا۔ رائے عامّہ کو بھی، ہموار کیا۔ اور عملاً، جہاد میں بھی، حصہ لیا۔" الخ۔

(ص ۱۲۱۔ "**محاضراتِ سیرت**" از ڈاکٹر محمود احمد غازی۔ مطبوعہ: اریب پبلشر، پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج، نئی دہلی)

**"جب، مراد آباد میں، انگریز حامی نواب رام پور کی بالا دستی، قائم ہوئی
تو، مولانا سید کفایت علی، کافی مراد آبادی نے انگریزوں کے خلاف، فتواے جہاد، جاری کیا۔
اور اس کی نقلیں، دوسرے مقامات پر، بھجوائیں۔ اور بعض مقامات پر خود بھی تشریف لے گئے۔
آنولہ ضلع بریلی میں خاص، اسی مقصد سے ایک ہفتہ سے زیادہ، قیام فرمایا۔
حکیم سعید اللہ ولد حکیم عظیم اللہ، آپ کے ہم سبق ساتھی تھے۔ ان کے یہاں، قیام کیا۔
آنولہ سے، مولانا کافی، بریلی پہنچے۔ اور نواب خان بہادر خاں، روہیلہ
نبیرۂ حافظ رحمت خاں روہیلہ و مولوی سرفراز علی سے مشورہ وتبادلۂ خیال کیا۔**
پھر، بریلی سے دہلی کے لئے جانے والی وہ فوج، جو، جنرل بخت خاں روہیلہ کی ماتحتی میں
برسرِ پیکار تھی، اس کے ساتھ آپ، مراد آباد، واپس آئے۔"

(ملخص۔ "**جنگِ آزادی نمبر**"، **مجلّہ "اَلعلم"** کراچی۔ شمارہ اپریل تا جون ۱۹۵۷ء۔
بقلم: پروفیسر محمد ایوب قادری۔ کراچی)

نواب، مجد الدین، عُرف مَجّو خاں نے جب مراد آباد میں، اپنی ایک آزاد حکومت، قائم کی
تو، اس نے مولانا سید کفایت علی، کافی مراد آبادی (شہادت ۶ رمئی ۱۸۵۸ء) کو، **مراد آباد کا "صدرِ شریعت" بنایا۔**

مولانا کافی، مراد آبادی، تلمیذِ مولانا شرف الدین، رام پوری و شاہ ابو سعید، مجدّدی، رام پوری و شاہ رفیع الدین، محدّث دہلوی و شاہ عبد العزیز، محدّث دہلوی و تلمیذ و خلیفۂ شاہ غلام علی، مجدّدی، دہلوی ایک جلیلُ القدر عالم و محدّث اور مصنف ہونے کے ساتھ، بلند پایہ، شاعرِ نعت اور عاشقِ رسول بھی تھے۔
عشقِ رسولِ مقبول (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) کے جذبات سے
آپ کا دل، ہمہ وقت لبریز رہتا تھا اور نعتیہ اشعار کی صورت میں وہ، زبان پر آجا کرتے تھے۔
اسی جذبۂ مسعود اور وصفِ محمود سے متأثر ہو کر، عاشقِ رسول، امام احمد رضا، قادری، برکاتی، بریلوی نے آپ کو "**سلطانِ نعت گویاں**" اور خود کو "**وزیرِ اعظم**" قرار دیا ہے۔ چنانچہ، فرماتے ہیں:

مہکا ہے، مری بوئے دِہن سے عالَم	**یاں، نغمۂ شیریں، نہیں، تلخی سے بہم**
کافی، "سلطانِ نعت گویاں" ہیں، رضا	**اِنْ شَاءَ اللّٰہ، مَیں "وزیرِ اعظم"**

**مراد آباد ہی کے، مولانا وہاج الدین، عرف مولوی منو بھی، ایک سرکردہ مجاہد جنگِ آزادی تھے۔
جو، عربی و فارسی کے عالم اور اچھے انگریزی داں بھی تھے۔
انھوں نے، انگریزی حکومت کے خلاف، جہاد کا فتویٰ دیا اور مسلسل جہاد کا وعظ بھی کہتے رہے۔**

شہزادہ فیروز شاہ، جب، مرادآباد پہنچا اور انگریزوں سے گھمسان کی جنگ ہوئی
تو، مولانا وہاج الدین، مرادآبادی، شہزادہ فیروز شاہ کے، دستِ راست تھے۔
اس سے پہلے، یہ واقعہ ہو چکا تھا کہ، مولانا وہاج الدین کی قیادت میں
انقلابیوں کے ایک جمِ غفیر نے مرادآباد جیل کا پھاٹک توڑ کر، سارے قیدیوں کو آزاد کر دیا تھا۔
اور ان کے درمیان، اسلحہ تقسیم کر کے، انگریزوں کے خلاف، ایک بڑا محاذ بنا لیا تھا۔
مجاہدِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء، مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی (متوفی، نامعلوم)
شمسِ مارہرہ، حضرت سید شاہ، آلِ احمد، اچھے میاں، قادری، برکاتی، مارہروی (وصال ربیع الاول
۱۲۳۵ھ/جنوری ۱۸۲۰ء) کے خلیفۂ ارشد، حضرت مولانا شاہ، عینُ الحق عبد المجید، عثمانی، بدایونی کے نواسے
اور حضرت علّامہ فضلِ رسول، عثمانی، بدایونی کے بھانجے تھے۔
آپ کے بارے میں، پروفیسر محمد ایوب قادری (کراچی) لکھتے ہیں:
''جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں، جن عُلمائے بدایوں نے نمایاں حصہ لیا
اُن میں، سرِ فہرست، مولانا فیض احمد، بدایونی کا نام ہے۔ جو اپنے دَور کے نامور عالم تھے۔
سنٹرل بورڈ آف ریونیو (آگرہ) میں ملازم تھے۔ عربی فارسی کے بلند پایہ ادیب و شاعر تھے۔
انھوں نے آگرہ کے قیام میں مولانا رحمت اللہ، کیرانوی اور پادری فنڈر کے مناظرہ
(۱۸۵۴ء۔ بمقام آگرہ) میں، حصہ لیا اور مولانا رحمت اللہ، کیرانوی کے مددگار، رہے۔
پھر، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں، مَردانہ وار حصہ لیا۔ وہ، دہلی بھی گئے۔
آخری معرکہ، ککرالہ (بدایوں) میں ہوا۔
اس میں، ڈاکٹر وزیر خاں، اکبرآبادی، شہزادہ فیروز شاہ، جیسے بطلِ حریت بھی موجود تھے۔
انگریزوں کا مشہور جنرل پنی مارا گیا'' مجلّہ ''بدایوں'' کراچی۔
(ص۲۶۔ انسائیکلوپیڈیا آف بدایوں۔ جلدِ دوم۔ مطبوعہ کراچی)
پروفیسر، انیس زیدی لکھتے ہیں:
اس دَوران، ڈاکٹر وزیر خاں، اکبرآبادی، جنرل بخت خاں، مولانا فیض احمد، بدایونی
اپنے ساتھیوں کے ساتھ، بدایوں آئے۔ اور فتوائے جہاد کی تشہیر کی۔
اس فتویٰ پر، مولانا فضلِ حق، خیرآبادی، مفتی صدرُ الدین آزردہ، مفتی فضل کریم
اور مولوی عبد القادر وغیرہ کے دستخط تھے۔
ان حضرات کی آمد اور فتویٰ کی تشہیر کی وجہ سے بدایوں اور اس کے مضافات کے
ہزاروں افراد، مجاہدین میں شامل ہو گئے۔ مجلّہ ''بدایوں'' کراچی۔

(ص۱۴۔ انسائیکلوپیڈیا آف بدایوں۔ جلد دوم۔ مطبوعہ کراچی)
تذکرۂ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں، مولانا، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا فیض احمد، بدایونی کی
پُر جوش شرکت کے بارے میں مفتی انتظامُ اللہ، شہابی، اکبرآبادی (متوفی ۱۹۶۸ء) لکھتے ہیں:
ڈاکٹر وزیر خاں، مَردانہ وار، نکل آئے۔ آگرہ میں، جو فوج، فدائیوں کی آئی
اُس کی سرپرستی، ڈاکٹر وزیر خاں نے کی۔ انگریز، قلعہ بند ہو گئے۔
یہ، مولوی فیض احمد، بدایونی کو، ساتھ لے کر، دہلی پہنچے۔
بہادر شاہ ظفر کا دربار، جما ہوا تھا۔ بریلی سے جنرل بخت خاں آ چکے تھے۔ ''وار کونسل'' بنی ہوئی تھی۔
.....جنرل بخت، لارڈ گورنر تھے۔ انھوں نے، ڈاکٹر وزیر خاں کو، اپنے ہمراہ لیا۔
مولوی فیض احمد، شہزادہ، مرزا مغل کے پیشکار، مقرر ہوئے۔'' الخ۔
(ص۸۷۔ ''غدر کے چند عُلما'' مؤلّفہ: مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبرآبادی۔
مطبوعہ: دینی بک ڈپو۔ اردو بازار، دہلی)
آخری معرکۂ شاہجہاں پور ۱۸۵۸ء کے بعد، باقی ماندہ عُلما، روپوش ہو کر مختلف مقامات پر چلے گئے۔
مولانا فیض احمد، بدایونی، کسی طرح، نیپال پہنچے۔ مگر، آج تک کسی کو، سراغ نہیں مل سکا کہ:
مولانا فیض احمد، بدایونی کا انتقال، کب ہوا؟ اور کہاں، آپ کی تدفین ہوئی؟

بعدِ وفات، تُربتِ ما، در زمین مَجُوے
در سینہ ہائے مردمِ عارف، مَزارِ ما

علّامہ فضلِ حق، خیرآبادی (متوفی ۱۸۶۱ء) جنگِ آزادی کے، ایک مرکزی قائد تھے۔
چنانچہ، مولانا عبد الشاہد، شیروانی، علی گڑھی (متوفی فروری ۱۹۸۴ء)
سابق لائبریرین، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ لکھتے ہیں:
''علّامہ فضلِ حق، خیرآبادی سے (دہلی میں) جنرل بخت خاں (سالارِ اعظم، شاہی افواجِ دہلی)
ملنے پہنچے۔ مشورہ کے بعد، علّامہ (خیرآبادی) نے آخری تیر، تَرکش سے نکالا۔
بعد نمازِ جمعہ، جامع مسجد (دہلی) میں تقریر کی۔ اِستفتا، پیش کیا۔
مفتی صدرُ الدین خاں، آزردہ، صدرُ الصُّدور دہلی، مولوی عبد القادر، قاضی فیض اللہ، دہلوی
مولانا فیض احمد، بدایونی، ڈاکٹر، مولوی وزیر خاں، اکبرآبادی، سید مبارک شاہ، رام پوری نے دستخط کیے۔
اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔
دہلی میں، نوے ہزار سپاہ، جمع ہو گئی تھی۔''
تاریخ عروجِ سلطنتِ انگلشیۂ ہند۔ مؤلّفہ: مولوی ذکاءُ اللہ، دہلوی۔ مطبوعہ ۱۹۰۳ء۔

(ص ۱۵،۲۱۔ ''باغی ہندوستان'' از عبد الشاہد، شیر وانی، علی گڑھی۔
مطبوعہ: المجمع الاسلامی، مبارک پور ضلع اعظم گڑھ۔ اتر پر دیش۔ انڈیا)

پروفیسر، محمد ایوب قادری (کراچی۔ متوفی ۱۹۸۳ء) لکھتے ہیں:

''دہلی میں بہادر شاہ ظفر نے خودمختاری کا اعلان کر دیا۔
مولانا فضلِ حق، خیر آبادی، نیز، دوسرے عُلما، دہلی میں، موجود تھے......
جنرل بخت خاں کے مشورے سے، علاّمہ فضلِ حق، خیر آبادی نے، بعد نمازِ جمعہ
جامع مسجد، دہلی میں جہاد کی اہمیت وضرورت پر تقریر کی۔ اور جہاد کا، اِستفتا، مرتّب کر کے پیش کیا۔
جہاد کے فتویٰ کی تیاری میں، جنرل بخت خاں کی خاص کوشش تھی۔''

(ص ۲۲۔ ''جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد! مولانا فیض احمد، بدایونی۔''
بقلم: پروفیسر، محمد ایوب قادری۔ مطبوعہ: کراچی ۱۹۵۷ء)

رئیس احمد، جعفری، ندوی (متوفی ۱۹۶۸ء) اپنی ایک اہم تاریخی کتاب ''بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد'' میں لکھتے ہیں:

''مذکورہ سطور میں ہم نے، غدر ۱۸۵۷ء کے، جن ہیروؤں کا ذکر کیا ہے
اُن میں سے، صرف جنرل بخت خاں اور مولانا فضلِ حق، خیر آبادی
دو، ایسی شخصیتیں ہیں، جنھوں نے، دہلی کے محاربات غدر میں، مرکز نشیں ہو کر، حصہ لیا ہے۔''

(ص ۸۳۴۔ ''بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد'' مؤلّفہ: رئیس احمد، جعفری، ندوی۔ مطبوعہ: لاہور۔ ۱۹۵۶ء)

معروف غیر مقلّد مؤرخ، غلام رسول مہؔر (متوفی ۱۹۷۱ء) لکھتے ہیں:

''مولانا (فضلِ حق، خیر آبادی) پہنچے، تو مسلمانوں کو، جنگ پر، آمادہ کرنے کی غرض سے
با قاعدہ، ایک فتویٰ، مرتّب ہوا۔ جس پر عُلمائے دہلی سے دستخط لیے گئے۔
میرا خیال ہے کہ، یہ فتویٰ، مولانا فضلِ حق ہی کے مشورہ سے، تیار ہوا تھا۔
اور، انھیں نے، عُلمائے کرام کے نام بھی، تجویز کیے، جن سے، دستخط لیے گئے۔''

(ص ۲۰۰۔ ''۱۸۵۷ء کے مجاہد''۔ مؤلّفہ: غلام رسول مہؔر۔ طبعِ سوم، لاہور ۱۹۹۱ء)

مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبر آبادی (متوفی ۱۹۶۸ء) لکھتے ہیں:

''ہنگامۂ ۱۸۵۷ء رُونما ہوا۔ مولانا فضلِ حق، اَلْوَر سے، دہلی آئے۔
جنرل بخت خاں نے، نقشۂ اقتدار، جما رکھا تھا۔
اِستفتا، مولانا (خیر آبادی) نے لکھا۔
مفتی صاحب (صدر الدین، آزرؔدہ، دہلوی) اور دیگر عُلما نے فتویٰ دیا۔''

(ص ۴۸۔ ''غدر کے چند عُلما'' مؤلّفہ: مفتی انتظام اللہ، شہابی، اکبر آبادی۔ مطبوعہ: دینی بک ڈپو، دہلی)

فاضلِ دار العلوم دیوبند، مولانا سعید احمد، اکبر آبادی
سابق صدر شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ لکھتے ہیں:

''مولانا (فضلِ حق، خیر آبادی) بلند پایہ عالمِ دین ہونے کے ساتھ، رئیسانہ طور وطریقِ زندگی رکھتے تھے۔
لیکن، اس کے باوجود، ان کی ایمانی جرأت وجسارت اور دینی حمیت وغیرت کا، یہ عالَم تھا کہ:
انھوں نے ہر چیز سے بے نیاز ہو کر، دہلی کی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ کے بعد
جہاد کے واجب ہونے پر، ایک نہایت ولولہ انگیز تقریر کی۔
اور اس کے بعد، ایک اور فتویٰ کا اِعلان ہوا، جس پر صدرُ الصُّدور، مفتی صدرُ الدین خاں، آزرؔدہ
مولانا فیض احمد، بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں، اکبر آبادی اور دوسرے عُلما کے دستخط تھے۔''

(ص ۴۲۔ ''ہندوستان کی شرعی حیثیت'' مؤلّفہ: مولانا سعید احمد، اکبر آبادی۔ مطبوعہ: علی گڑھ۔ ۱۹۶۸ء)

ایک انگریز مُخبر، تُراب علی، اپنی رپورٹ، مؤرخہ ۲۸ر اگست ۱۸۵۷ء میں لکھتا ہے:

''مولوی فضلِ حق، جب سے دہلی آیا ہے، شہریوں اور فوج کو
انگریزوں کے خلاف اُکسانے میں مصروف ہے۔
......مولوی فضلِ حق کے کہنے پر، شاہزادے، اب حملہ کرنے والی فوج کے ساتھ
محاذ پر جاتے ہیں اور عموماً، سبزی منڈی (دہلی) کے پُل پر، لڑتے ہیں۔

(ص ۱۵۹۔ ''۱۸۵۷ء کے غداروں کے خطوط''۔ مؤلّفہ: سید عاشور کاظمی۔ مطبوعہ: انجمن ترقیِ اردو ہند۔ دہلی)

پروفیسر، خلیق احمد نظامی (شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) لکھتے ہیں:

''پھر، اقتصادی اعتبار سے بھی یہ حقیقت، فراموش نہیں کی جاسکتی کہ:
ہندوستانی سپاہی، جو، بہادر شاہ (ظفر) کے گرد، جمع ہو گئے تھے
انھیں، سخت ترین مالی دشواریاں، پیش آ رہی تھیں۔
آئے دن، فوج کے ضروری اِخراجات کے لئے روپے، قرض لینے کی ضرورت پڑتی تھی۔
ایسی صورت میں کوئی فوج، بے فکری کے ساتھ، کام نہیں کر سکتی۔
(انگریز مُخبر) منشی، جیون لال نے، اپنے روزنامچہ میں، بہادر شاہ ظفر اور مولانا فضلِ حق کی، یہ گفتگو، نقل کی ہے:
بہادر شاہ نے جب مولوی (فضلِ حق) صاحب کو حکم دیا کہ:
تم اپنی اَفواج کو، لڑانے کے لئے لے جاؤ۔ اور انگریزوں کے خلاف لڑاؤ۔
تو، انھوں نے کہا: افسوس، تو اِسی بات کا ہے کہ:
سپاہی، اُن کا کہا نہیں مانتے، جو، اُن کی تنخواہ دینے کے ذمہ دار نہیں۔''

ص ۲۲۰۔ ''غدر کی صبح وشام''۔ مطبوعہ: دہلی ۱۹۲۶ء۔

(ص ۳۶۔ ''۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ'' مرتّبہ: پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ مکتبہ ندوۃُ المصنّفین۔ اردو بازار، دہلی)

شاہی طبیب اور بہادر شاہ ظفر کے خصوصی معالج، حکیم احسنُ اللہ خاں (برطانوی آلۂ کار) کا بیان ہے کہ:

دوسرے روز، مولوی فضلِ حق آئے، اور نذر، پیش کی۔

وہ، باغی فوج (انقلابی فوج) کی، بڑے زور و شور سے تعریف کر رہے تھے۔

انھوں نے بہادر شاہ ظفر سے کہا کہ: اب، وقت کا تقاضا ہے کہ:

باغیوں (انقلابیوں) کو، رقم اور سامانِ رسد کی مدد پہنچائی جائے۔

تاکہ انھیں کچھ سہارا ہو۔

بادشاہ نے کہا: رقم، کہاں ہے؟ رہا، رَسد کا معاملہ، تو، وہ، پہنچی تھی۔ مگر، ناکافی تھی۔

اور اس کی وجہ، ان باغیوں (انقلابیوں) کا، عوام کے ساتھ، غلط رَوَیَّہ ہے۔

مولوی (فضلِ حق) صاحب نے کہا: حضور کے، تمام ملازمین، نااہل ہیں۔

دور اور نزدیک کے تمام حکّام سے رقم کا مطالبہ کرنے کی اجازت دیجیے۔

میرا لڑکا (عبدالحق، خیرآبادی) اور اَعِزَّہ، تحصیل کا، کام، انجام دیں گے۔ اور، رَسد بھی فراہم کریں گے۔

بادشاہ نے جواب دیا: آپ تو، یہیں ہیں۔ انتظام سنبھال لیجیے۔

مولوی (فضلِ حق) صاحب نے جواب دیا:

میرے لڑکے اور دوسروں کو، گوڑ گانْوا (میوات) کی

تحصیل داری اور کلکٹری کا، پَروانۂ تقرُّری، جاری کیا جائے۔ وہ، سب انتظام کر لیں گے۔

اور، اَلْوَر، جھجھر، بلب گڑھ اور پٹیالہ کے راجاؤں کے نام (مطالبۂ رقم کے لئے) پَروانے، جاری کیجیے۔

پٹیالہ کا راجہ، اگر چہ، انگریزوں سے ملا ہوا ہے، لیکن، اگر، دوستانہ، مراسلت کی جائے، تو وہ، ساتھ آجائے گا۔

بادشاہ نے بتایا کہ: پیرزادہ عبدالسلام کی درخواست پر، بخت خاں نے راجہ پٹیالہ کو

ایک پروانہ بھیج دیا ہے۔ مگر، ابھی تک، اس کا جواب نہیں آیا ہے۔

مولوی (فضلِ حق) صاحب نے کہا:

میں، اپنے بھائی (فضلِ عظیم) کو، جو، راجہ کے یہاں، ملازم ہیں، ان کو، لکھوں گا کہ وہ، جلد جواب بھجوائیں۔

مولوی (فضلِ حق) صاحب، جب بھی بادشاہ کے یہاں آتے، بادشاہ کو، مشورہ دیتے کہ:

جہاد کی مُہم میں، اپنی رعایا کی ہمت افزائی کریں۔ اور ان کے ساتھ، باہر (میدانِ جنگ) بھی نکلیں۔

فوجی دستوں کو، جس حد تک ممکن ہو، بہتر معاوضہ دیں۔

ورنہ، انگریز، اگر، جیت گئے، تو نہ صرف خاندانِ تیمور، بلکہ تمام مسلمان، نیست و نابود ہو جائیں گے۔''

(ص ۲۳۔ روزنامچہ: **حکیم احسنُ اللہ خاں**۔ مرتّبہ: ڈاکٹر سید معین الحق۔ مطبوعہ کراچی)

انگریز حامی مؤرخ، مولوی ذکاءُاللہ، دہلوی (متوفی ۱۹۱۰ء) نے لکھا ہے کہ:

ضلع گوڑ گانْوا (میوات) کے زمین داروں کی طرف سے درخواست آئی کہ:

سارے ضلع میں، بدنظمی ہے۔ کوئی حاکم، انتظام کے لئے، بادشاہ کے پاس سے بھیجا جائے۔

بادشاہ نے یہ کام، مولوی فضلِ حق کے، سپرد کیا۔ مولوی (فضلِ حق) صاحب، عالمِ متبحر، مشہور تھے۔

وہ، اَلْوَر (میوات) سے، ترکِ ملازمت کر کے دہلی آئے تھے۔

انھوں نے، بادشاہ کے لئے، ایک ''دستورُالعمل'' لکھا تھا۔''

(ص ۶۸۷۔ **تاریخِ عروجِ سلطنتِ انگلشیہ**۔ مطبوعہ: دہلی ۱۹۰۳ء۔ مؤلّفہ: مولوی ذکاءُاللہ، دہلوی۔ متوفی ۱۹۱۰ء)

چُنّی لال (انگریز مُخبر) اپنی رپورٹ میں، لکھتا ہے:

مولوی فضلِ حق اپنے مواعظ سے، عوام کو، مسلسل بھڑکا رہے ہیں۔''

(فائل ۱۲۷۔ **اخبار دہلی**۔ رپورٹ از چُنّی لال)

زمانۂ ۱۸۵۷ء کے، کوتوالِ شہر دہلی، سید مبارک شاہ کا بیان ہے کہ:

بہادر شاہ نے جنرل بخت خاں، مولوی سرفراز علی اور مولوی فضلِ حق پر مشتمل

ایک ''کِنگ کونسل'' بنائی تھی۔ مبارک شاہ ہی نے اسے، ایک جگہ ''پریوی کونسل'' لکھا ہے۔''

(ص ۱۸۲ و ۱۸۳۔ **''عظیم انقلابِ ۱۸۵۷ء''**۔ مؤلّفہ: سید معین الحق۔ مطبوعہ: کراچی ۱۹۶۸ء)

انگریز مُخبر، تُراب علی نے لکھا ہے کہ:

بہادر شاہ نے چھ فوجیوں، اور چار معزَّز شہریوں پر مشتمل، جو، مجلسِ انتظامی، تشکیل دی تھی، اُس کے ایک اہم ممبر، مولانا فضلِ حق، خیرآبادی تھے۔'' (ص ۱۵۹۔ **''۱۸۵۷ء کے غدّاروں کے خطوط''**۔ مطبوعہ: دہلی)

محقق و مؤرخ، مہدی حسین نے لکھا ہے کہ:

اس مجلس کے ڈائریکٹر، مولانا فضلِ حق، خیرآبادی تھے۔'' (ص ۱۸۲۔ **بہادر شاہ، دوم**۔ مطبوعہ: کراچی)

وقارُالحسن صدیقی، سابق ڈائریکٹر آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا۔

وسابق او، ایس، ڈی، رضا لائبریری، رام پور (اتر پردیش، انڈیا) لکھتے ہیں:

انگریزوں کے جاسوس، گوری شنکر نے ۲۸/اگست ۱۸۵۷ء کی رپورٹ میں لکھا ہے کہ:

مولوی فضلِ حق، جب سے دہلی آیا ہے، شہریوں اور فوج کو

انگریزوں کے خلاف اُکسانے میں مصروف ہے۔

وہ، کہتا پھرتا ہے کہ: آگرہ گزٹ میں، برطانوی پارلیمنٹ کا ایک اعلان پڑھا ہے۔

جس میں انگریزی فوج کو، دہلی کے تمام باشندوں کو، قتل کر دینے

اور پورے شہر کو مسمار کر دینے کے لئے کہا گیا ہے۔

آنے والی نسلوں کو یہ بتانے کے لئے کہ یہاں، دہلی شہر، آباد تھا
شاہی مسجد کا، صرف ایک مینار، باقی چھوڑا جائے گا۔"

Indian Office London, Mutiny No 170, PP.442-443

(ص ۱۴۔ پیش لفظ۔ "**تاریخِ آزادیِ ہند ۱۸۵۷ء**"۔ مطبوعہ: رضا لائبریری، رام پور۔ یو پی، انڈیا)

رئیس احمد، جعفری، ندوی (متوفی ۱۹۶۸ء) لکھتے ہیں:

"اور، ان سب سے بالا، اُن (فضلِ حق، خیر آبادی) کی خصوصیت یہ تھی کہ:
وہ، بہت بڑے سیاست داں، مفکر، اور مدبر بھی تھے۔
مسندِ درس پر بیٹھ، کر، وہ، علوم وفنون کی تعلیم دیتے تھے۔
اور، ایوانِ حکومت میں پہنچ کر، دوررَس فیصلے کرتے تھے۔
وہ، بہادر اور شجاع بھی تھے۔
غدر (۱۸۵۷ء) کے بعد، نہ جانے کتنے سورما، اور رزم آرا
ایسے تھے، جو، گوشۂ عافیت کی تلاش میں مارے مارے، پھرتے تھے۔
لیکن، مولانا فضلِ حق، خیر آبادی
اُن لوگوں میں تھے، جو، اپنے کیے پر، پشیماں نہیں تھے۔ انھوں نے سوچ سمجھ کر، میدان میں، قدم رکھا تھا۔
اور اپنے اِقدام وعمل کے نتائج بھگتنے کے لئے، حوصلہ مندی اور دلیری کے ساتھ، تیار تھے۔
سراسیمگی، دہشت، اور خوف، یہ، ایسی چیزیں تھیں، جن سے، مولانا، بالکل، ناواقف تھے۔"

(ص ۸۵۴۔ "**بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد**"۔ مؤلّفہ: رئیس احمد، جعفری، ندوی۔ مطبوعہ: لاہور۔ ۱۹۵۶ء)

علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی کے فرزند، مولانا عبدالحق، خیر آبادی (متوفی ۱۸۹۸ء)
سابق صدر مدرس، مدرسہ عالیہ، کلکتہ کے بارے میں انگریز مؤرخ، ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر لکھتا ہے:

"موجودہ ہیڈ مولوی، اُس عالمِ دین کے صاحب زادے ہیں
جن کو ۱۸۵۷ء کے غدر نے نمایاں کر دیا تھا۔ اور جنھوں نے اپنے جُرموں کا خمیازہ، اِس طرح بھگتا تھا کہ:
بحرِ ہند کے ایک جزیرے (اَنڈمان ونکوبار رکالا پانی) میں، تمام عمر کے لئے، جلاوطن کر دیے گئے تھے۔
اس غدّار عالمِ دین (فضلِ حق، خیر آبادی) کا کتب خانہ
جس کو، حکومتِ ہند نے، ضبط کر لیا تھا، اب، کلکتہ کالج میں، موجود ہے۔"

(ص ۲۰۳۔ "**ہمارے ہندوستانی مسلمان**"۔ مؤلّفہ: ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر۔
مطبوعہ: اَلکتاب انٹرنیشنل۔ مُرادی روڈ، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025)

گذشتہ مستند تاریخی حوالوں سے، یہ حقیقت، روزِ روشن کی طرح، واضح ہو چکی ہے کہ:

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی نمایاں ترین شخصیت کا نام ہے: قائدِ جنگِ آزادی، علاّمہ فضلِ حق، خیر آبادی
جو، دہلی کے معروف ومقبول صدرُ الصّدور، مفتی صدرُ الدین، آزردہ، دہلوی کے رفیقِ درس اور گہرے دوست
تھے۔ کیوں کہ، یہ دونوں حضرات، علاّمہ فضلِ امام، خیر آبادی (صدرُ الصّدور دہلی) وشاہ عبدالقادر، محدّث دہلوی
وشاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی کے شاگرد تھے۔
اور ان کی سرپرستی ورہنمائی، مجاہدینِ جنگِ آزادی کو حاصل تھی۔
لال قلعہ، دہلی پر بھی، علاّمہ فضلِ حق، خیر آبادی کا، بے پناہ اثر تھا۔
اور بہادر شاہ ظفر کے آپ، مُعتمد ومُقرَّب مُشیر تھے۔ جس کی دستاویزی شہادت کے لئے
برطانوی جاسوس، تُراب علی وجیون لال وچنّی لال اور حکیم احسنُ اللہ خاں کی مذکورہ رپورٹیں، کافی ہیں۔

اور شاہی افواج کے کمانڈر اِن چیف، جنرل بخت خاں نے آپ ہی سے مل کر
جنگِ ۱۸۵۷ء کے مختلف پہلوؤں پر مشورہ کے بعد، آپ ہی کا، انتخاب کیا کہ:
جہاد کی ضرورت واہمیت پر، شاہجہانی جامع مسجد، دہلی میں آپ کی ولولہ انگیز تقریر ہو۔
اور آپ ہی کے قلم سے، جہاد کا اِستفتا، مرتّب ہو۔ جسے دیگر علما کی تصدیق وتائید کے ساتھ، جاری کیا جائے۔
اس طرح، دینی، علمی، سیاسی، ہر جہت اور ہر پہلو سے، آپ کا قائدانہ اور مؤثر کردار
جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی تاریخ کا ایک اہم ترین باب ہے۔

سرزمینِ مرادآباد کے عظیم فرزند، مجاہدِ جنگِ آزادی وعاشقِ رسول، مولانا سید کفایت علی، کافیؔ، مرادآبادی
(شہادت ۱۸۵۸ء) کے بارے میں، سید محبوب حسین، سبزواری، مرادآبادی لکھتے ہیں:

"اسی دَوران، نواب خان بہادر خاں روہیلہ کو، ایک خط، مولوی سید کفایت علی، کافیؔ کا، مرادآباد سے ملا۔
جس میں، نوابِ رام پور کی قوم دشمن سرگرمیوں کا تفصیل سے تذکرہ تھا۔
نواب خان بہادر روہیلہ نے یہ خط، جنرل بخت خاں کو دکھایا۔ اور نواب رام پور کی غدارانہ حرکتوں سے
آگاہ کیا۔ اور، رام پور کی فوجی مداخلت سے جو حالات، پیدا ہو چکے تھے، اُن کے، سَدِّ باب کی گفتگو کی۔
نواب خان بہادر نے، جنرل بخت خاں کے مشورہ سے محمد شفیع رسالدار کو مع رسالہ کے
مرادآباد جا کر قیام کا، مشورہ دیا۔" (**اخبارُ الصّنادید**۔ حکیم نجم الغنی خاں، رام پوری)

مرادآباد کی جنگِ آزادی کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: "**مرادآباد! تاریخِ جد وجہدِ آزادی۔**"
مؤلّفہ: سید محبوب حسین، سبزواری، مرادآبادی۔ مطبوعہ: اسلامی بک ہاؤس۔ مرادآباد۔ اتر پردیش، انڈیا)

۲۵/اپریل ۱۸۵۸ء کو، مرادآباد پر، انگریزوں کے دوبارہ قبضہ کے بعد
بتاریخ ۱۶/رمضان ۱۲۷۴ھ/۳۰/اپریل ۱۸۵۸ء، مولانا کافیؔ کو، انگریزوں نے گرفتار کر لیا۔
۴/مئی ۱۸۵۸ء کو، آپ کا مقدمہ، پیش ہوا۔ اور سرسری ونمائشی سماعت کے بعد، ۶/مئی کو، آپ کی پھانسی کا

فیصلہ سنا دیا گیا۔ نہایت صبر و استقلال اور خندہ پیشانی کے ساتھ آپ نے یہ ظالمانہ فیصلہ سنا۔
پھانسی کے فیصلے پر، فوراً، عمل بھی ہوا۔

مولانا کافیؔ، جب، پھانسی کے پھندے تک، قدم بہ قدم، آگے بڑھ رہے تھے
تو، اپنی ایک تازہ اور ایمان افروز نعت کے یہ اشعار، بڑے ترنم اور وجد و ذوق کے ساتھ، گنگنا رہے تھے:

کوئی گل باقی رہے گا، نَے چمن، رہ جائے گا — پر، رسول اللہ کا، دینِ حَسَن، رہ جائے گا
ہم صفیرو! باغ میں ہے، کوئی دَم کا چہچہا — بلبلیں، اُڑ جائیں گی، سونا چمن، رہ جائے گا
اطلس و کمخواب کی، پوشاک پر، نازاں، نہ ہو — اس تنِ بے جان پر، خاکی کفن، رہ جائے گا
جو، پڑھے گا صاحبِ لَـــوْلاک کے اوپر، درود — آگ سے محفوظ، اُس کا، تن بدن، رہ جائے گا

سب فنا ہو جائیں گے، کافیؔ و لیکن حشر تک
نعتِ حضرت کا، زبانوں پر، سخن، رہ جائے گا

(''**۱۸۵۷ء کے شُعَرا**''۔ مؤلَّفہ: امداد صابری، دہلوی۔ مطبوعہ: دہلی)

مولانا امداد صابری، دہلوی نے مراد آباد کے ثقہ عُلما: حضرت مولانا محمد عمر، نعیمی، مراد آبادی
وحضرت مولانا ظفر الدین، نعیمی، مراد آبادی، وغیرہ سے تحقیق کر کے
اپنی تاریخی کتاب ''**۱۸۵۷ء کے شُعَرا**'' مطبوعہ: دہلی میں لکھا ہے کہ:

مولانا کافیؔ کی شہادت و تدفین کے، تقریباً، تیس (۳۰) سال بعد
کسی کھدائی میں آپ کی قبر، کُھل گئی تو، مسلمانوں کے ایک جمِ غفیر نے دیکھا کہ:
حضرت کافیؔ شہید کا جسمِ اطہر، بوقتِ شہادت، جیسا تھا، بالکل اُسی طرح، تر و تازہ تھا۔
اور حشرات الارض نے آپ کے جسم کو، کسی طرح کا نقصان، نہیں پہنچایا تھا۔
ایسے ہی عُلما و قائدین و مجاہدین کے لئے اور خود، مولانا کافیؔ کے لئے
آپ ہی کے یہ نعتیہ و دعائیہ اشعار، بصد خلوص، پیش ہیں کہ:

یا اِلٰہی! حشر میں، خَیرُ الوریٰ کا ساتھ ہو — رحمتِ عالَم، محمد مصطفیٰ کا ساتھ ہو
یا اِلٰہی! ہے یہی، دن رات، میری اِلتجا — روزِ محشر، شافعِ روزِ جزا کا ساتھ ہو

بعد مرنے کے بھی، کافیؔ کی ہے، یارب! یہ دعا
دفترِ اشعارِ نعتِ مصطفیٰ کا ساتھ ہو

ooo

تحریکِ فضلِ حق شناسی و اسلاف شناسی

معزز قارئین، ماضی قریب کی چار سالہ جماعتی سرگرمیوں سے واقف ہیں کہ:

۲۰۱۱ء میں پورے ملک کے اندر ''فضلِ حق شناسی'' کی تحریک، بڑی سرگرمی اور کامیابی کے ساتھ چلائی گئی۔ اور متعدد مقامات پر سیمینار و کانفرس کے انعقاد کے ساتھ، متعدد کتب و رسائل کے ذریعہ، امامُ الحکمۃِ والکلام، مولانا فضلِ حق خیر آبادی (وصال ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) کی حیات و خدمات کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کیا گیا۔

خصوصیت کے ساتھ، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں آپ کے اور متعدد دیگر عُلماے اہلِ سنّت کے بے مثال کارناموں کو نمایاں کیا گیا، جس سے مذہبی حلقے نیز، سیاسی و صحافتی حلقے بھی متأثر ہوئے اور اِس تحریک کو ہر طرف سے تائید و حمایت حاصل ہوئی

اور باشعور خواص و عوام نے اِسے تحسین و آفرین کی نظر سے دیکھا۔
ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور کی کد و کاوش سے تیار شدہ
ایک ضخیم ''علاَّمہ فضلِ حق خیر آبادی نمبر'' ابھی منتظرِ طباعت و اشاعت ہے۔
اَسلاف شناسی کی تحریک بھی کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔
اور پہلے مرحلے میں یہ دو بڑے پروگرام ہوئے:

(الف) ''امامِ اعظم ابو حنیفہ سمینار و کانفرنس'' گوونڈی، بمبئی۔ مؤرخہ ۲۱ تا ۲۳ دسمبر ۲۰۱۲ء۔
اس سمینار و کانفرنس کا اِنتظام و انصرام، خانقاہِ قادریہ ایوبیہ، پپرا کنک، ضلع کوشی نگر۔ مشرقی اتر پردیش (انڈیا) کی طرف سے ہوا۔ اساتذۂ اشرفیہ مبارک پور کی نگرانی میں
اس کا ضخیم مجموعۂ مضامین و مقالات بنام ''انوارِ امامِ اعظم'' شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔

(ب) امامِ اعظم ابو حنیفہ سمینار و کانفرنس۔ قیصر باغ، لکھنؤ۔ مؤرخہ ۲۴، مارچ ۲۰۱۳ء۔
اِس کانفرنس و سمینار کا انتظام و انصرام، دارُ العلوم حنفیہ رضویہ، رِنگ روڈ، لکھنؤ کی طرف سے ہوا۔ جس کے کنوینز: مولانا محمد اقبال قادری اور قاری محمد احمد بقائی تھے۔

اساتذۂ اشرفیہ، مبارک پور کی نگرانی میں اِس سیمینار و کانفرنس کے
مضامین ومقالات اور دیگر تفصیلات، زیرِ ترتیب ہیں۔
رضویات کے سلسلے میں اور حال و مستقبل قریب کی سرگرمیوں سے متعلق
''**عرفانِ مذہب ومسلک**'' طبعِ اخیر: مارچ ۲۰۱۴ء کی مندرجہ ذیل تحریر، حاضرِ خدمت ہے:
''اپنے سلیمُ الطبع قارئین کو، اِس تحریر کے ذریعہ
راقمِ سطور، یہ خوش خبری دینا بھی ضروری سمجھتا ہے کہ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ تعالیٰ عظیم الشان پیمانے پر ایک علمی وفقہی سیمینار و کانفرنس (**امام احمد رضا سیمینار و کانفرنس، بمبئی**) کا اِنعقاد، سرزمینِ بمبئی میں ہونے والا ہے جو نہایت عظمت واہمیت واِفادیت کا حامل ہوگا اور اِس سیمینار و کانفرنس کے ذریعہ ابوحنیفۂ ہند، فقیہِ اسلام، امام احمد رضا قادری، برکاتی، بریلوی قُدِّسَ سِرُّہٗ (وصال ۲۵؍صفر ۱۳۴۰ھ/ ۲۸؍اکتوبر ۱۹۲۱ء) کی دینی وفقہی وعلمی خدمات کا مختلف جہتوں سے اِحاطہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اِنْ شَاءَ اللّٰہ
ملک کے معروف عُلما وارباب فکر وقلم، اِس '**امام احمد رضا سیمینار و کانفرنس**'' میں شرکت فرمائیں گے۔ حضرت مولانا محمد احمد اعظمی مصباحی، صدرُ المدرسین، الجامعۃُ الاشرفیہ، مبارک پور اور حضرت مفتی محمد نظام الدین رضوی مصباحی، صدر شعبۂ افتا، الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور کی ہدایت ونگرانی میں اِس سیمینار و کانفرنس کا اِنعقاد ہوگا۔
اِن حضرات کے معاوِن کی حیثیت سے راقمِ سطور (یٰس اختر مصباحی) بھی
شریکِ سیمینار و کانفرنس رہے گا۔ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ تبارکَ وتعالیٰ۔
اِس سیمینار و کانفرنس کا منصوبہ ''**امام اعظم ابوحنیفہ سیمینار و کانفرنس**''، **بمبئی**
منعقدہ دسمبر ۲۰۱۲ء کے معاً بعد ہی بنایا گیا تھا اور ایک پوسٹر کے ذریعہ
اِس ''**امام احمد رضا سیمینار و کانفرنس**''، بمبئی کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا۔
مقامِ مسرت ہے کہ فقیہِ اسلام، امام احمد رضا، قادری، برکاتی بریلوی کے صد سالہ جشن کی تیاری، شروع ہوگئی ہے۔ صد سالہ جشنِ یومِ رضا (از ۱۳۴۰ھ/۱۴۴۰ھ) کے سلسلے میں رضا اکیڈمی بمبئی وامام احمد رضا اکیڈمی، صالح نگر، بریلی شریف کے زیرِ اہتمام واِنصرام، چند عُلماے کرام منصوبہ کے مطابق اپنے متعلقہ فرائض کی تکمیل میں شب وروز مصروف ہیں۔

جشنِ صد سالہ کی پہلی میٹنگ، کلیر شریف میں زیرِ سرپرستی، امینِ مِلّت، حضرت پروفیسر سید محمد امین میاں، قادری، برکاتی، سجادہ نشین: خانقاہِ عالیہ قادریہ، برکاتیہ، مارہرہ شریف ہوئی۔
جس کی رپورٹ، محمد عارف رضوی، رضا اکیڈمی ممبئی کی طرف سے
ہفت روزہ مسلم ٹائمز، ممبئی میں اِس طرح، شائع ہوئی:
''دیارِ حضرت سیدنا علاء الدین صابر کلیری (کلیر شریف) میں واقع ''دارُ العلوم قادریہ صابریہ برکاتِ رضا'' میں ایک اہم مِٹنگ ہوئی، جس کا بنیادی مقصد، دس گیارہ سال بعد
مجدِّدِ اعظم، امام احمد رضا کے جشنِ صد سالہ کے موقع پر آپ کی گراں قدر حیات وخدمات کو عصری اسلوب میں دنیا کے سامنے پیش کرنے کا خاکہ تیار کرنا ہے۔
تاکہ بلیغ اور حکیمانہ اسلوب اپنا کر دانشور طبقے میں امام احمد رضا کا جامع تعارف کرایا جائے اور آپ کی کتابوں کو عربی، انگریزی اور بعض دوسری معروف زبانوں میں منتقل کر کے
انھیں ایشیا ویورپ کے اصحابِ علم وفضل وارباب فکر ودانش تک پہنچایا جائے۔
مِٹنگ کی سرپرستی، امینِ مِلّت، حضرت سید محمد امین میاں صاحب قبلہ، قادری، برکاتی، مارہروی سجادہ نشین خانقاہِ عالیہ قادریہ، مارہرہ شریف
اور صدارت، رئیس التحریر، علّامہ یٰسٓ اختر مصباحی، بانی وصدر دارُ القلم دہلی نے فرمائی۔
علّامہ یٰسٓ اختر مصباحی نے فرمایا کہ:
رضویات پر گراں قدر کام کرنے والے پروفیسر محمد مسعود احمد، مجدِّدی، مظہری، دہلوی (متوفی ۲۱؍ربیع الآخر ۱۴۲۹ھ/ ۲۸؍اپریل ۲۰۰۸ء کراچی۔ پاکستان) عَلَیْہِ الرَّحْمَۃ
جن کا آج عرسِ چہلم بھی ہے، انھوں نے کوئی پندرہ بیس سال قبل، امام احمد رضا کی حیات وخدمات کا خاکہ تیار کیا تھا۔ اس خاکہ میں کچھ حذف واضافہ کر کے اس کے مطابق، رضویات کے ماہر اصحابِ علم وقلم سے ایسی تفصیلی ومحقِّقانہ سوانح، مُرتَّب کرائی جائے
جس کو رضویات کے حوالے سے ''انسائیکلوپیڈیا'' کہا جا سکے۔
مِٹنگ میں یہ بھی طے ہوا کہ اعلیٰ حضرت قُدِّسَ سِرُّہٗ کی کتابوں اور آپ پر لکھی جانے والی کتابوں پر گہری نظر رکھنے والے حضرات کو مدعو کر کے مرکزی جگہ پر ایک سمینار بھی منعقد کیا جائے۔
حضرت امینِ مِلّت، گُلِ گلزارِ قادریت، مُدَّ ظِلُّہٗ الْعَالِی نے اس تحریک کا خیر مقدم کرتے

ہوئے بڑے حوصلہ افزا کلمات ارشاد فرمائے۔ اوراعلیٰ حضرت **قُدِّسَ سِرُّہٗ** کی حیات وخدمات
کامختصر مگر جامع تعارف پیش کرتے ہوئے آپ کے جشنِ صد سالہ کی تیاری سے متعلق منعقدہ
اِس مِٹنگ کو مستحسن اِقدام قرار دیا۔ اوررضویات کے حوالے سے
پروفیسر محمد مسعود احمد **عَلَیْہِ الرَّحْمَۃ** کے کارناموں کو خراجِ تحسین پیش کیا۔
ساتھ ہی یہ بھی یقین دِہانی کرائی کہ:
امام احمد رضا کی حیات وخدمات پر مشتمل کتابیں تیار کرنے میں ہمارا ہر ممکن تعاون رہے گا۔
مگر، یہ کام،مل جل کر کرنے کا ہے، تنہا نہیں ہوسکتا۔
آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اس تعلق سے سمینار، یا۔ بڑے پیمانے کی مِٹنگ
امام احمد رضا کے شہر، بریلی شریف میں ہو، تو زیادہ بہتر ہے۔
حضرت مولانا آلِ مصطفیٰ مصباحی اور رضا اکیڈمی ممبئی کے بانی وسکریٹری جنرل
الحاج، محمد سعید نوری نے امید ظاہر کی کہ:
اِس تعلق سے جامع منصوبہ بندی اور ٹھوس لائحۂ عمل جلد ہی تیار کرلیا جائے گا۔
تاکہ بعد میں قلّتِ وقت کا شکوہ نہ ہو۔
مِٹنگ میں ماہرِ رضویات، پروفیسر محمد مسعود احمد، مجدّدی، **عَلَیْہِ الرَّحمۃ** کے عرسِ چہلم کی
مناسبت سے اُن کی روح کو ایصالِ ثواب بھی کیا گیا۔ اور اُن کے لئے دعاے مغفرت کی گئی۔
متعدد عُلماے کرام نے مِٹنگ میں شرکت کی۔ حضرت امینِ مِلّت، سید محمد امین میاں
صاحب **مُدَّظِلُّہُ الْعَالِی** کے دعائیہ کلمات پر، مِٹنگ کا اختتام ہوا۔''
(ہفت روزہ **مسلم ٹائمز**، بمبئی۔ شمارہ ۱۶ تا ۲۲ جون ۲۰۰۸ء)

اِس سلسلے کی دوسری مِٹنگ، مؤرخہ ۱۰ر فروری ۲۰۱۰ء کو، استاذِ گرامی، بحرالعلوم، مفتی عبدالمنان
اعظمی کی سرپرستی اور برادرِ مکرّم، مولانا محمد احمد اعظمی مصباحی، صدرُ المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور
کی صدارت میں امام احمد رضا اکیڈمی، صالح نگر، بریلی شریف میں ہوئی۔
تیسری مِٹنگ بھی امام احمد رضا اکیڈمی صالح نگر، بریلی شریف میں مؤرخہ ۲۲ر ربیع الآخر
۱۴۳۴ھ/ مارچ ۲۰۱۳ء کو ہوئی۔ اور چوتھی مِٹنگ، المجمع الاسلامی، مبارک پور میں
مؤرخہ ۱۲ر اپریل ۲۰۱۳ء کو برادرِ مکرّم، مولانا محمد احمد اعظمی مصباحی کی صدارت میں ہوئی۔

(ص ۲۰۰ تا ص ۲۰۳۔ **عرفانِ مذہب ومسلک**۔ طبعِ اخیر، مارچ ۲۰۱۴ء)
اصحابِ علم وفضل واَربابِ فکر و دانش، بالخصوص نوجوان عُلما، جو قوم وملّت کا قیمتی سرمایہ
اور اس کا روشن مستقبل ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہدایات پر اپنی خصوصی توجہ مبذول کریں
تو بڑی حد تک اُن مقاصد واَہداف کو حاصل کرنے میں مدد مل سکتی ہے
جن سے اِغماض واِعراض کر کے کوئی بھی قوم جماعت، سُرخ رو اور کامیاب نہیں ہوسکتی۔
''اپنے فرائض اور ذِمّہ داریوں کو صحیح طور پر سمجھنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے
ہمیں اپنے اکابر واسلاف کے نقشِ قدم پر چلنا ہوگا اور ان کی دینی وعلمی زندگی کے
ہر پہلو سے ہمیں رہنمائی، حاصل کرنی ہوگی۔
اپنے اکابر واسلافِ کرام کو جاننا، ان کی خدمات سے واقف رہنا
ان کے ارشادات وتعلیمات پر عمل کرنا اور دوسروں کے سامنے ان کا تعارف کرانا
یہ ہمارا مذہبی ومِلّی اور قومی فریضہ ہے۔
جس طرح کوئی سعید وصالح اولاد، نیک بخت لڑکا، اپنے آبا واَجداد کا ذکر کرتا ہے
اُن کی تعریف کرتا ہے۔ اور ذِکر وتعریف سن کر قلبی مسرت، حاصل کرتا ہے
اُسی طرح بلکہ اُس سے بھی زیادہ، اپنے اکابر واسلاف کا، اور جتنی بھی نمایاں اور ممتاز اسلامی
شخصیات ہیں، اُن سب کا، حسبِ ضرورت واہمیت وافادیت، ذکر وبیان، ہمیں کرتے رہنا چاہیے۔
تاکہ نئی نسل بھی اُن سے واقف ہو۔ اور یہ وراثت، نسل در نسل آگے کی طرف منتقل ہوتی رہے۔''
(۲۰۵۔ **عرفانِ مذہب ومسلک**۔ طبعِ اخیر۔ مارچ ۲۰۱۴ء۔ دہلی ولاہور)

○○○

اکابرِ سَوَادِ اعظم اہلِ سُنَّت و جماعت

متحدہ ہندوستان کے اندر، مجموعی طور سے، دُعاۃ و مبلّغینِ اسلام اور صوفیہ و مشائخ ِکرام کی مَساعیِ جمیلہ سے ہی، قلوبِ اہلِ ہند، مائل، بہ اسلام اور پھر، مشرَّف، بہ اسلام ہوئے۔ جب کہ مسلم فاتحین وسلاطین کو، صرف اپنی حکومت وسلطنت سے، سروکار، رہا اور دعوت وتبلیغِ اسلام کے فریضہ سے، وہ، عموماً غافل اور محروم وتہی دست، رہے۔ یہ کُلّیہ نہیں، مگر، لِلاَکثرِ حُکمُ الکُل کا ضابطہ ہی، ان پر صادق آتا ہے۔

یہاں، اِختصار کے ساتھ، اکابر صوفیہ ومشائخِ اسلام اور عُلماے کرام میں سے، اُن چند نُفوسِ قُدسیہ کے اَسماے گرامی، دَرج کیے جارہے ہیں، جنھوں نے اسلام کی اعلیٰ تعلیمات اور اس کے پاکیزہ اخلاق کو، عملی شکل میں پیش کرتے ہوئے اپنے خونِ جگر سے شجرِ اسلام کی آبیاری کی اور رفتہ رفتہ، پورے خطّۂ ہند کو، باغ و بہار اور سرسبز وشاداب بناڈالا۔ جس کے سایۂ رحمت میں، **کاروانِ سَوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت**، اپنی منزلِ مقصود کی جانب، ہمیشہ، رَواں دَواں رہا۔

حضرت سید علی ہجویری، داتا گنج بخش لاہوری (ولادت ۴۰۰ھ/۱۰۰۹ء۔ وصال ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) حضرت سید محمد صُغریٰ، بلگرامی (ولادت ۵۶۴ھ۔ وصال، شعبان ۶۴۵ھ) حضرت خواجہ معینُ الدین، چشتی اجمیری (ولادت ۵۳۷ھ/۱۱۴۲ء۔ وصال، رجب ۶۳۲ھ/۱۲۳۵ء) حضرت شیخ بہاءُ الدین زکریا، سُہروردی، ملتانی (ولادت ۵۶۶ھ/۱۱۷۰ء۔ وصال ۶۶۶ھ/۱۲۶۷ء) حضرت خواجہ قطبُ الدین بختیار، کاکی، دہلوی (ولادت ۵۰۵ھ۔ وصال، ربیع الاول ۶۳۳ھ) حضرت خواجہ فریدُ الدین مسعود، گنج شکر (ولادت ۵۷۵ھ/۱۱۷۹ء۔ وصال، محرمُ الحرام ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء) حضرت مخدوم علی احمد علاءالدین صابر، کلیری (ولادت ۵۹۲ھ/۱۱۹۴ء۔ وصال ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء) شیخ شمس الدین تُرک پانی پتی (وصال ۷۱۸ھ) حضرت شیخ شرف الدین بوعلی قلندر، پانی پتی (وصال ۷۲۴ھ) محبوبِ اِلٰہی، خواجہ نظام الدین اولیا، دہلوی (ولادت ۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء۔ بدایوں۔ وصال ۱۷/ربیع الآخر ۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء۔ دہلی) خواجہ نصیر الدین محمود، چراغ دہلی (وصال رمضان ۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء) مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ، منیری (ولادت ۶۶۱ھ۔ وصال ۷۸۲ھ/۱۳۸۰ء) حضرت مخدوم، جہانیاں جہاں گشت (ولادت ۷۰۷ھ/۱۳۰۸ء۔ وصال ۷۸۵ھ/۱۳۸۳ء) امیرِ کبیر، سید علی ہمدانی، کشمیری (ولادت ۷۱۴ھ۔ وصال ۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء) حضرت مخدوم، سید اشرف جہانگیر سمنانی، کچھوچھوی (ولادت ۷۰۹ھ۔ وصال ۲۸/محرم ۸۰۸ھ/۱۴۰۴ء) خواجہ سید محمد، بندہ نواز گیسو دراز

(وصال ذوالقعدہ ۸۲۵ھ) مخدوم علی بن احمد، مہائمی (وصال ۸۳۵ھ/۱۴۲۲ء) شیخ احمد عبد الحق چشتی، رودولوی (وصال ۸۳۶ھ) مخدوم شیخ، سارَنگ، اَوَدِھی (وصال، شوال ۸۵۵ھ/نومبر ۱۴۵۱ء) مخدوم شاہ صفی عبد الصَّمد، سائیں پوری رصفی پوری (وصال محرم ۹۴۵ھ/جون ۱۵۳۸ء) شیخ حسین محمد، سکندر آبادی (وصال، شعبان ۹۷۸ھ/۱۵۷۱ء) حضرت شیخ سلیم چشتی (ولادت ۸۸۴ھ/۱۴۷۹ء۔ وصال ۹۷۹ھ/۱۵۷۱ء) مخدوم شاہ محمد مینا، چشتی، لکھنوی (وصال صفر ۸۸۴ھ/۱۴۷۹ء) مخدوم شیخ سعد الدین، خیرآبادی (وصال، ربیع الاول ۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء) مخدوم شاہ صفی، عثمانی، چشتی (وصال ۹۴۵ھ/۱۵۳۷ء) شیخ عبد القدوس، غزنوی، چشتی، گنگوہی (وصال ۹۴۵ھ/۱۵۳۷ء) شیخ عبد الرَّزَّاق، قادری، جھنجھانوی (وصال ۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء) شیخ علی مُتَّقی بُرہان پوری (وصال ۹۷۵ھ/۱۵۶۸ء) شیخ وجیہُ الدین، علوی، احمد آبادی، گجراتی (وصال ۹۷۸ھ/۱۵۷۰ء) شاہ کمال، کیتھلی، قادری (وصال ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء) شاہ نظام الدین بھکاری، کاکوروی (وصال ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء) شیخ جلالُ الدین، تھانیسری (وصال ۹۸۹ھ) سید شاہ جُنید، قادری، غازی پوری (وصال ۹۹۹ھ/۱۵۹۰ء) شیخ عبد الوہاب متقی، بُرہان پوری (وصال ۱۰۰۱ھ) خواجہ، محمد عبد الباقی، باقی بِاللہ، نقشبندی، دہلوی (وصال ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۲ء)

صاحبِ "سَبعِ سَنابل"، میر سید عبد الواحد، بلگرامی (ولادت ۔ ۹۱۶ھ۔ وصال، رمضان ۱۰۱۷ھ/۱۶۰۸ء) شیخ حَسَن، کشمیری (وصال ۱۰۵۱ھ/۱۶۴۱ء) امامُ المحدِّثین، حضرت شیخ عبد الحق محدِّث دہلوی (ولادت محرم ۹۵۸ھ/۱۵۵۱ء۔ وصال ربیع الاول ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) مجدِّدِ اَلفِ ثانی شیخ احمد، فاروقی، سرہندی (ولادت، شوال ۹۷۱ھ/۱۵۶۴ء۔ وصال ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء) میر سید عبد الجلیل، بلگرامی، مارہروی (ولادت، رَجب ۹۷۲ھ/۱۵۶۵ء۔ بلگرام۔ وصال، صفر ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء۔ مارہرہ مُطَہَّرہ) دیوان جی، محمد رشید، عثمانی، جون پوری (ولادت ۱۰/ذی القعدہ ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱ء۔ وصال ۹/رمضان ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء) صاحبُ البَرکات، سید شاہ برکتُ اللہ، قادری مارہروی (ولادت، جمادیٰ الآخرہ ۱۰۷۰ھ/۱۶۶۰ء۔ بلگرام۔ وصال عاشورۂ محرم ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹ء۔ مارہرہ مطہَّرہ) حضرت شاہ ولی اللہ، محدِّث دہلوی (ولادت ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء۔ وصال ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) وغیرھُم۔ رِضْوَانُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِم اَجْمَعِیْن۔

اِن اَصحابِ علم وفضل واَربابِ زُہد وتقویٰ کے بعد، تیرہویں صدی ہجری میں

جن عُلما وصوفیہ ومشائخ ِکرام نے، کاروانِ عشق وعرفان کی رہنمائی کا شرف حاصل کیا اور سَوَادِ اعظم اہلِ سُنَّت و جماعت کو، صراطِ مستقیم پر گامزَن رکھا، اُن کی ایک اِجمالی فہرست

کچھ اِس طرح ہے:

شمس العارفین ،سیدشاہ، آلِ احمد،اچھے میاں،مارَہروی (ولادت ۱۱۶۰ھ ۔وصال،ربیع الاول ۱۲۳۵ھ/جنوری ۱۸۲۰ء)بحرالعلوم،مولانا عبدالعلی،فرنگی محلی ،لکھنوی (ولادت ۱۱۴۴ھ۔ وصال ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) بیہقیِ وقت، قاضی ثناءاللہ،مجدّ دِی، پانی پتی (وصال ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) حضرت شاہ محمد اجمل الہ آبادی (ولادت ۱۱۶۰ھ ۔ وصال ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء) عارفِ حق ،مولانا شاہ نورُ الحق ،فرنگی محلی لکھنوی (وصال ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء)سِراجُ الھِند ،مولانا شاہ عبدالعزیز،محدِّث دہلوی (ولادت ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء۔وصال،شوال ۱۲۳۹ھ/جون ۱۸۲۴ء) حضرت شاہ، غلام علی،نقشبندی،مجدِّدی، دہلوی (ولادت ۱۱۵۸ھ ۔وصال ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء) حضرت شاہ ابوالحسن فرد، پُھلواری (ولادت ۱۱۹۱ھ۔ وصال ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۹ء)حضرت مولانا جمال الدین،فرنگی محلی ،لکھنوی (وصال،ربیع الآخر ۱۲۷۶ھ/۱۸۶۰ء)حضرت شاہ احمد سعید، مجدِّدی، دہلوی، مہاجرِ مدنی (ولادت ۱۲۱۷ھ۔ وصال ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء)امامُ الحکمۃِ و الکلام مولانا فضلِ حق، خیرآبادی (ولادت ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء۔وصال ۱۲/صفر ۱۲۷۸ھ/۲۰/اگست ۱۸۶۱ء)مفتی صدرُ الدین آزردہ، دہلوی (ولادت ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۸ء۔وصال ۲۴/ربیع الاول ۱۲۸۵ھ/۱۶/جولائی ۱۸۶۸ء)حضرت مولانا عبد الحلیم، فرنگی محلی ،لکھنوی (ولادت ۱۲۰۹ھ۔ وصال شعبان ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء)سَیفُ اللہِ الْمَسْلُول ،مولانا فضلِ رسول،عثمانی، بدایونی (ولادت ۱۲۱۳ھ۔وصال ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) خاتمُ الاکابر، سیدشاہ، آلِ رسول، احمدی ،قادری برکاتی، مارَہروی (ولادت رجب ۱۲۰۹ھ/ ۱۷۹۵ء۔ وصال ۱۸/ذوالحجہ ۱۲۹۶ھ/دسمبر ۱۸۷۹ء)حضرت مولانا، نقی علی، قادری، برکاتی ،بریلوی (ولادت ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء۔وصال ذوالقعدہ ۱۲۹۷ھ/دسمبر ۱۸۸۰ء وَغیرھُم۔

رِضْوَانُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْھِمْ اَجْمَعِیْن۔

اور، چودہویں صدی ہجری (نصفِ اول) جس میں مختلف ایمان شکن اور گمراہ کن تحریکوں تنظیموں اور جماعتوں نے جَنم لے کر،صدیوں کے مسلسل ومتوارِث،اسلامی عقائد ونظریات کو تہ وبالا کرنا شروع کیا اور عظمتِ توحید وناموسِ رسالت پر حملے کیے جانے لگے

تو،مندرجہ ذَیل عُلماے حق اور مجاہدینِ صف شکن،ان کے مَدِّ مُقابل ،صف آرا ہو گئے۔

اور آج بھی، سَوادِ اَعظم اہلِ سُنَّت و جماعت کا قافلۂ حیات وکاروانِ فکر وخیال ،اپنے انھیں اَسلافِ کرام کی روحانی قیادت ورہنمائی میں اپنی منزلِ مقصود کی جانب، رَواں دَواں ہے۔

حضرت مولانا عبدالحیِّ ،فرنگی محلی ،لکھنوی (ولادت ۱۲۶۴ھ۔ وصال، ربیع الاول ۱۳۰۴ھ/

دسمبر ۱۸۸۶ء) حضرت مفتی ارشاد حسین، مجدِّدی،رام پوری (ولادت ۱۲۴۸ھ۔ وصال ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء) حضرت مولانا شاہ فضلِ رحمٰن، گنج مراد آبادی (ولادت ۱۲۰۸ھ۔ وصال ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء) حضرت مولانا غلام دستگیر،قصوری، لاہوری (وصال ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء) حضرت مولانا عبد القادر، عثمانی، قادری، بدایونی (ولادت ۱۲۵۳ھ۔ وصال ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء) حضرت مولانا سید عبدالفتّاح،حَسنی ،قادری ،معروف بہ سید اشرف علی،گلشن آبادی (وصال،صفر ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) حضرت مولانا سید عبد الصَّمد ، مودودی، چشتی، سَہسوانی (ولادت شعبان ۱۲۶۹ھ/جنوری ۱۸۵۳ء۔ وصال، جمادیٰ الآخرہ، ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) حضرت مولانا ہدایتُ اللہ رام پوری ثُمَّ جون پوری (وصال رمضان ۱۳۲۶ھ/ستمبر ۱۹۰۸ء) حضرت مولانا غلام قادر ہاشمی بھیروی ،پنجابی (وصال، ربیع الاول ۱۳۲۷ھ/اپریل ۱۹۰۹ء) حضرت مولانا خیرالدین دہلوی (ولادت ۱۲۴۷ھ/ ۱۸۳۱ء ۔ وصال، رجب ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء) حضرت مولانا وصی احمد محدِّث سورتی، پیلی بھیتی (وصال ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء) حضرت مولانا شاہ احمد رضا، حنفی ،قادری، برکاتی بریلوی (ولادت ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء۔وصال ۲۵/صفر ۱۳۴۰ھ/۲۸/اکتوبر ۱۹۲۱ء) حضرت شاہ ابوالخیر مجدِّدی، دہلوی (ولادت ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء۔ وصال ۔ ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء) مولانا سید عینُ القُضَاۃ نقشبندی ،لکھنوی (وصال ،رجب ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۵ء) مولانا محمد قیامُ الدین عبدالباری، فرنگی محلی لکھنوی (وصال ،رجب ۱۳۴۴ھ/جنوری ۱۹۲۶ء) مولانا عبدالاُحد، محدِّث پیلی بھیتی (ولادت ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۳ء۔وصال ۱۳۵۲ھ/ دسمبر ۱۹۳۳ء) مولانا سید دیدار علی، اَلْوَرِی ثُمَّ لاہوری (ولادت ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۶ء۔اَلْوَرْ، میوات ۔ وصال، رجب ۱۳۵۴ھ/ اکتوبر ۱۹۳۵ء۔ لاہور) حضرت سید شاہ علی حسین ،اشرفی ، کچھوچھوی (ولادت ۱۲۶۶ھ۔ وصال ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۶ء) حضرت سید شاہ، مہر علی، گولڑوی ، پنجابی (ولادت ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۷ء۔ وصال،صفر ۱۳۵۶ھ/ مئی ۱۹۳۷ء) حضرت مولانا سید سلیمان اشرف، بہاری ثُمَّ علی گڑھی (وصال ربیع الاول ۱۳۵۸ھ/اپریل ۱۹۳۹ء) مولانا فضلِ حق ،رام پوری (ولادت ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء۔وصال ۱۳۵۸ھ/۱۹۴۰ء) حضرت مولانا حامد رضا، بریلوی (وصال ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) حضرت مولانا یار محمد، بندیالوی، پنجابی (وصال محرمُ الحرام ۱۳۶۷ھ/دسمبر ۱۹۴۷ء) حضرت مولانا محمد امجد علی اعظمی، رضوی (وصال ۲/ذوالقعدہ ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) حضرت مولانا محمد نعیم الدین، مرادآبادی (وصال، ذوالحجہ ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) وَغیرھُم۔رِضْوَانُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْھِمْ اَجْمَعِیْن ۔

اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ۔ (سورۂ مجادلۃ۔ آیت ۲۲)

مآخذ و مراجع

جن سے براہِ راست، اِستفادہ کیا گیا

(۱) اسباب بغاوت ہند	سرسید احمد خاں۔	خدابخش لائبریری، پٹنہ
(۲) استاذ العلما	حبیب الرحمٰن، شیروانی	دارالمصنّفین، اعظم گڑھ
(۳) اِظہارُالحق	مولانا رحمتُ اللہ، کیرانوی	دارُابن الھیثم، قاھرہ۔۲۰۰۵ء
(۴) اکمل التاریخ	ضیاءالقادری، بدایونی	تاج الفحول اکیڈمی، بدایوں
(۵) انوار ساطعہ	عبدالسمیع بیدلؔ رام پوری	مبارک پور، اعظم گڑھ۔یوپی
(۶) آثارُالصّنادید	سرسید احمد خاں	اردو اکاڈمی، دہلی۔۲۰۰۰ء
(۷) آثارِ رحمت	امداد صابری، دہلوی	ٹمیامحل، دہلی
(۸) آزاد کی کہانی	عبدالرّزّاق، ملیح آبادی	مکتبہ اشاعتُ القرآن، دہلی
(۹) الحیاۃ بعد المماۃ	فضلِ حسین، بہاری	اَلکتاب انٹرنیشنل بٹلہ ہاؤس نئی دہلی
(۱۰) اخبارالصّنادید	نجم الغنی، رام پوری	رضا لائبریری، رام پور
(۱۱) انتخابِ خلافت	محمود اِلٰہی	اردو اکیڈمی، لکھنؤ
(۱۲) انقلاب ۱۸۵۷ نمبر		ماہنامہ نیادور، لکھنؤ ۲۰۰۷ء
(۱۴) خیر آبادیات	اُسیدُالحق محمد عاصم قادری	تاج الفحول اکیڈمی، بدایوں۔۲۰۱۱ء
(۱۵) اکرؔ شاد	سید سلیمان اشرف	مکتبہ قادریہ، لاہور، طبعِ دوم ۱۹۸۱ء
(۱۶) انسائیکلوپیڈیا آف بدایوں۔جلدِ دوم		مجلّہ ''بدایوں'' کراچی۔۲۰۰۴ء
(۱۷) انقلابِ ۱۸۵۷ء	پی، سی، جوشی	قومی کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی۔۱۹۹۸ء

(۱۸) اہلِ حدیث اور سیاست	نذیر احمد، رحمانی	جامعہ سلفیہ، بنارس۔۲۰۰۰ء
(۱۹) ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما	انتظام اللہ، شہابی، اکبرآبادی	دینی بکڈپو، اردو بازار، دہلی ۶
(۲۰) باغی ہندوستان	فضلِ حق خیرآبادی عبدالشاہد شیروانی، علی گڑھی	المجمع الاسلامی، مبارکپور طبعِ چہارم۔۱۹۸۵ء
(۲۱) بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد	رئیس احمد جعفری، ندوی	کتاب منزل، لاہور۔۱۹۵۶ء
(۲۲) بزرگانِ دارالعلوم دیوبند	ابوسلمان شاہجہاں پوری	فرید بک ڈپو، ٹمیامحل، دہلی
(۲۳) پیغامِ عمل	یٰسین اختر مصباحی	دارُالقلم، دہلی۔طبع دوم ۲۰۰۲ء
(۲۴) تاریخ عروج سلطنت انگلیشہ	ذکاءاللہ، دہلوی	دہلی۔۱۹۰۳ء
(۲۵) تاریخ مشائخ چشت	شیخ زکریا، کاندھلوی	سہارن پور
(۲۶) تواریخ عجیب (کالاپانی)	محمد جعفر تھانیسری	تعلیمی بورڈ، دہلی
(۲۷) تاریخ جنگِ آزادیِ ہند ۱۸۵۷ء	خورشید مصطفٰی رضوی	رضا لائبریری، رام پور۔۲۰۰۰ء
(۲۸) تذکرۃ الرشید	عاشق اِلٰہی میرٹھی۔	مکتبہ خلیلیہ، میرٹھ۔۱۹۰۸ء
(۲۹) تذکرۂ عُلماے ہند۔	رحمٰن علی	کراچی۔۱۹۶۱ء
(۳۰) تذکرۂ کاملانِ رام پور	احمد علی خاں شوق	خدابخش لائبریری، پٹنہ
(۳۱) تصویر کا دوسرا رُخ	ایڈورڈ تھامسن رشیخ حُسام الدین	اردو اکاڈمی، لاہور۔۱۹۴۷ء
(۳۲) حدائق الحنفیہ	فقیر محمد، جہلمی	ادبی دنیا، ٹمیامحل، دہلی
(۳۳) حیاتِ اعلیٰ حضرت	محمد ظفرالدین بہاری	رضا اکیڈمی، ممبئ۔
(۳۴) حیاتِ جاوید	خواجہ الطاف حسین حالؔی	قومی کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی۔طبعِ پنجم ۲۰۰۴ء
(۳۵) حیاتِ شبلی	سید سلیمان ندوی	دارالمصنّفین، اعظم گڑھ
(۳۶) خان بہادر خاں شہید	سید الطاف علی بریلوی	کراچی۔۱۹۶۶ء
(۳۷) داستانِ شرف	امداد صابری، دہلوی	محمد سعید خاں، پہاڑی اِملی دہلی۔۱۹۷۹ء

(۳۸) داستانِ غدر	راقم الدّولہ ظہیر دہلوی	اریب پبلیکیشنز، پٹودی ہاؤس، نئی دہلی
(۳۹) دلّی کی آخری بہار	راشد الخیری/ضمیر حسن، دہلوی	اردو اکاڈمی، دہلی۔۲۰۰۳ء
(۴۰) رضا علی بریلوی اور جنگ آزادی	شہاب الدین رضوی	رضا اکیڈمی، بمبئی
(۴۱) سوانح قاسمی	مناظر احسن گیلانی	دار العلوم دیوبند
(۴۲) سیرتِ اعلیٰ حضرت	حسنین رضا، بریلوی	مکتبہ مشرق، کانکر ٹولہ، بریلی۔۱۹۸۳ء
(۴۳) سرگذشت دہلی	درخشاں تاجور	رضا لائبریری، رام پور
(۴۴) سیرتِ سید احمد شہید	ابوالحسن علی ندوی	مجلسِ تحقیقات، ندوۃ، لکھنؤ
(۴۵) شاہ ولی اللہ دہلوی اور اُن کے اصحاب	محمود احمد، برکاتی، ٹونکی	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی۔۲۰۰۶ء
(۴۶) فصلِ حق! چند عنوانات	خوشتر نورانی	ادارہ فکرِ اسلامی۔دہلی۔۲۰۱۱ء
(۴۷) عُلمائے ہند کا شاندار ماضی	سید محمد میاں، دیوبندی	کتابستان، گلی قاسم جان، دہلی ۶
(۴۸) غدر کے چند عُلما	انتظام اللہ، شہابی	دینی بکڈپو، اردو بازار، دہلی
(۴۹) فضلِ حق خیرآبادی	محمود احمد برکاتی	برکات اکیڈمی، کراچی
(۵۰) فضلِ حق خیرآبادی	سلمہ سیہول	مکتبہ قادریہ، لاہور
(۵۱) گُلِ رعنا	عبدالحئی، رائے بریلوی	دار المصنّفین، اعظم گڑھ
(۵۲) لال قلعہ کی ایک جھلک	ناصر نذیر فراق دہلوی	اردو اکاڈمی، دہلی۔۲۰۰۶ء
(۵۳) مرادآباد! تاریخ جدّ و جہدِ آزادی	سید محبوب حسین، سبزواری	اسلامی بک ہاؤس، مرادآباد مارچ ۲۰۰۰ء
(۵۴) مرحوم دہلی کالج	عبدالحق	انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی اشاعتِ سوم ۱۹۸۹ء
(۵۵) مسلمانوں کا روشن مستقبل	سید طفیل احمد منگلوری	مکتبۃ الحق، جوگیشوری، بمبئی ۲۰۰۱ء
(۵۶) مطالعۂ بریلویت	خالد محمود	حافظی بک ڈپو، دیوبند
(۵۷) مفتی صدرُ الدین آزردہ	عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی۔۱۹۷۷ء
(۵۸) مہرِ منیر	فیض احمد، گولڑوی	مکتبہ ماہِ نور، مٹیا محل، دہلی ۶

(۵۹) مقاماتِ خیر	ابوالحسن زید فاروقی	درگاہ شاہ ابوالخیر، چتلی قبر، دہلی
(۶۰) موجِ کوثر	محمد اِکرام	ادبی دنیا، مٹیا محل، دہلی
(۶۱) ہمارے ہندوستانی مسلمان	ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر	اَلکتاب انٹرنیشنل، بٹلہ ہاؤس نئی دہلی ۲۵
(۶۲) ہندوستان میں وہابی تحریک	قیام الدین احمد	مکتبۃ الفہیم، مئو، یوپی
(۶۳) ہندوستان کی شرعی حیثیت	سعید احمد اکبرآبادی	علی گڑھ
(۶۴) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک	مسعود عالم ندوی	مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی
(۶۵) واقعاتِ دارُالحکومت دہلی	بشیر الدین، دہلوی	اردو اکاڈمی، دہلی۔۱۹۹۵ء
(۶۶) ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ	خلیق احمد نظامی	ندوۃُ المصنّفین، اردو بازار دہلی۔۱۹۷۱ء
(۶۷) ۱۸۵۷ء۔ پہلی جنگِ آزادی	میاں محمد شفیع	اریب پبلی کیشنز نئی دہلی۔

وبعض دیگر کتب ورسائل اور مجلّات وجرائد

○○○

اَشْرَفِیَّہ، مذہبِ اسلاف کا ہے پاسباں

نتیجۂ فکر:۔ یٰسٓ اختر مصباحی

اشرفیہ،''باغِ فردوس'' اور مہکتا گلستاں
اشرفیہ،''حافظِ مِلّت'' کا باغ و بوستاں
اشرفیہ،تازہ گلشن کی طرح عَنبرفشاں
اشرفیہ،روزِروشن کی طرح ہے ضَوفشاں
اشرفیہ،شوکتِ علمی کا اِک روشن نشاں
اشرفیہ،فکرِمستقبل کا اِک تازہ جہاں
اشرفیہ،کارواں درکارواں ہردَم رَواں
اشرفیہ،فوجِ ''مصباحی'' کا میرِکارواں
اشرفیہ،عزم وہمت کی مجسّم داستاں
اشرفیہ،رِفعت وعظمت میں ہے عرش آستاں
اشرفیہ، ہے وقار و عظمتِ اِسلامیاں

اشرفیہ، مذہبِ اسلاف کا ہے پاسباں
اشرفیہ، مَنہَجِ اسلاف کا روشن بیاں
اشرفیہ، مسلکِ احمدرضا کا ترجَماں
اشرفیہ، فکرِ تازہ کا مہکتا گلستاں
اشرفیہ، فکرودانش کا ہے بحرِ بے کراں
اشرفیہ، روشن وتاباں ہے مثلِ کہکشاں
اشرفیہ، علم وحکمت کا ہے اِک کوہِ گراں
اشرفیہ، ''قُطبِ مینارِ'' جہانِ سُنّیاں
اشرفیہ،شہرِ علمی کا ہے ''تاجِ شہ جہاں''
اشرفیہ، اَوج ورِفعت میں ہے رَشکِ آسماں
اشرفیہ، صبحِ نَوکی ہے نَویدِ قُدسیاں
زندہ باد، اے اشرفیہ! ''اَزہرِ ہندوستاں''
''چومتا ہے تیری پیشانی کوجھک کر آسماں''

○○○